www.Pklibrary.com
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماھنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
مارچ 2024
قیمت 200 روپے
بانی
معراج رسول

www.Pklibrary.com
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماهنامه
سسپنس ڈائجسٹ
مارچ 2024
قیمت 200 روپے
بانی
معراج رسول

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

مدیرہ

یمنیٰ احمد

نائب مدیر

اطہر حسین

مارکیٹنگ وسرکولیشن منیجر

محمد شہزاد خان

0333-2256789

انشائیہ

جون ایلیا

نشیان کے تین سوال

ایک نوجوان ہے نشیان۔ اسے آپ میں سے ہزاروں لوگ جانتے ہوں گے۔ وہ میرا ہمزاد ہے۔ نشیان لفظ اور معنی میں جیتا ہے اور لفظ اور معنی میں مرتا ہے۔ میں نے اس نوجوان کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔

”خوش نہیں دیکھا؟ جون ایلیا! یہ تم نے کیا کہا؟ یہ کہو کہ میں نے اسے ہمیشہ طیش کی یا عذاب زدگی کی حالت میں دیکھا۔“

”ہاں، مجھے یہی کہنا چاہیے تھا۔ آج کل موصوف میرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں تو کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ میں آگیا ہوں۔ جناب نشیان ایک خداداد گھر میں رہتے ہیں جو امار وہ بستی سے قدرے دور شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف کھنڈر ہیں۔ جناب نشیان کو اپنے اس ”صحرائی محل“ کا گرد و پیش بہت پسند ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ کھنڈر یونانیوں کے زمانے کی یادگار ہیں۔ میرے اور نشیان کے درازمو، انبوہ ریش اور دانش مند بزرگ چچا دیمتراطیس نے حافظے میں محفوظ رکھنے کے لیے اکثر فرمایا ہے۔ ”فرزندو! سنو کہ امار وہ بستی کے مغرب میں مغیلاں کے پیڑوں کے خاتمے پر پتھروں کا سات ہاتھ کا شکستہ اور کم نمود سا جو ابھار ہے، وہ سیلوکس یونانی کی قبر ہے۔“

چچا دیمتراطیس نے ہمیں اور بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں جو ہم نے لکھ لی ہیں۔ گویا معلومات اور نکات کا ایک بیش بہا خزینہ ہے جو ہم دونوں کو عطا فرمایا گیا ہے۔ امار وہ بستی کے چرواہے بریر کا بیان ہے کہ چچا گزشتہ طوفان کے زمانے میں اکانوے برس کے ہو چکے تھے۔ خدا چچا کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم اور ان کی عاطفت اور شفقت دائم رکھے۔

”تذکرہ ہو رہا تھا نشیان کا اس کے یہ دم چھلا کہاں سے آگئے؟“ میں اپنے آپ سے بولتا ہوں۔

”دم چھلا، یعنی چچا دیمتراطیس کا تذکرہ! جون ایلیا یہ کیا بے ہودگی ہے۔ چچا دیمتراطیس کا تذکرہ نشیان کے تذکرے کا دم چھلا ہے! شرم نہیں آئی تمہیں یہ کہتے ہوئے؟ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا یونانی خدوخال اور الجھے ہوئے بالوں والا نشیان۔“

چلو چھوڑ دو معاف کر دو۔ تمہیں کڑاڑوں سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ چچا کی کیا بات ہے۔ وہ تو سراپا دانش ہیں۔ تو اب نشیان کا ذکر شروع کرتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس آکر ٹھہرتا ہے تو ہم دونوں ایک ہی بستر پر سوتے ہیں، ایک ہی رکابی میں کھاتے ہیں اور ایک ہی کٹورے میں پیتے ہیں۔ ہم دونوں صبح کو ایک ہی ساتھ گھر سے نکلتے ہیں اور پھر شہر اور شہریوں سے تھک کر ایک ہی ساتھ گھر پلٹتے ہیں۔

اس وقت میں اور نشیان ایک بیزار شام بھگت رہے ہیں۔ نشیان نے آج کچھ شعر کہے ہیں جن میں سے تین کا مفہوم یہ ہے۔

”میرے دل میں شام کا آزار آٹھہرا ہے۔ پر نجانے دنیا میں آج کیا ٹھہری؟“

”رات ہم آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ وہ صرف عرض سخن ہی کی مجلس تھی۔ آخر میں یہ بات ٹھہری کہ جو کچھ کہا گیا وہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔“

”سب کے راستے جدا جدا تھے۔ آخر سب کا ایک ہی راستہ ٹھہرا۔“

میرے ہمزاد نشیان نے تین باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شام کی اذیت میں مبتلا ہے، پر نہیں جانتا کہ دوسرے بھی اس کی اس اذیت میں اس کے ساتھ ہیں یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہی ہے کہ جو بات بھی کہی جا رہی ہے، وہ پہلے ہی کہی جا چکی ہے تیسری بات جو اس نے کہی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم زندگی بھر اپنے اپنے راستے پر چلتے رہتے ہیں پر ہمیں زندگی کے آخری لمحے میں اس سچائی کا تجربہ ہوتا ہے کہ ہم سب جو الگ الگ سمتوں میں چلے جا رہے تھے، آخرکار ہمیں ایک ہی سمت کا رخ کرنا تھا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ آخر میں سمجھ میں آنے والی یہ بات اگر شروع ہی میں جان لی جائے تو پھر مجھ میں اور اس شخص میں جو میری ہر بات کو غلط جانتا ہے، بھلا کیا جھگڑا باقی رہے گا۔ ہم کس بات کے حق میں دلیل دیں گے اور کس بات کے خلاف دلیل سنیں گے اور ہاں، اگر ہم سوچنے کی طرح سوچیں تو ہمارے حریف کی دلیل کسی طرح بھی ہماری دلیل سے کم مضبوط نہیں ہے اور ہماری دلیل بھی کسی طرح ہمارے حریف کی دلیل سے کم مضبوط نہیں۔ اے عزیز، بات یہ ہے کہ سارے جھگڑے عقیدوں، مسلکوں اور مشربوں کے سارے جھگڑے دو دلیلوں کے باہمی جھگڑے ہیں جو زید اور بکر پیش کرتے ہیں۔ زید بکر کے یقین کو غلط گردانتا ہے اور بکر زید کے یقین کو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کا یقین دو طرفہ طور پر غلط ہے یا پھر یہ ہے کہ زید کا یقین بھی درست ہے اور بکر کا بھی۔ میرے دوستو! تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ آخر میں میری یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ میں عقیدوں، مسلکوں اور مشربوں کے جھگڑے کو ایک ٹھٹول اور مخول گردانتا ہوں۔ زید ہو یا بکر، ان میں سے کوئی بھی عقل و ہوش کی حالت میں یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ حقیقت اور صداقت کا سارا سرمایہ اسی کی جیب میں ہے۔ اگر تم دونوں ایسی کوئی بات کہتے ہو تو میں تمہیں ”تلقین“ کی عبارت یاد دلاؤں گا جو ایک گروہ میں تدفین کے وقت پڑھی جاتی ہے۔

”اے فلاں ابنِ فلاں سن اور سمجھ، جب تیرے پاس دو مقرب فرشتے آئیں......“

اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہیں تمہارے خدا، تمہارے رسول، تمہارے مسیح، تمہارے بھگوان اور تمہارے اوتاروں کی قسم! بتاؤ کہ کیا تم زندگی بھر سننے کی طرح سنتے اور سمجھنے کی طرح سمجھتے ہو؟ کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں نے زندگی بھر سننے کی طرح سنا اور سمجھنے کی طرح سمجھا۔ بس اے دوستو! آج مجھے تم سے یہی کہنا تھا اور اپنے ہمزاد نشیان کی یاد دلائی تھی۔ یہ امر بے مصلحت نہیں ہے اور پھر یہ کہ خود نشیان مصلحتوں کی ایک مصلحت ہے۔ وہ آئندہ مقام بیان و بلاغ میں قیام کرے گا اور سننے والوں کے کشکول دانش سے بھرے گا۔

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

مارچ 2024ء کا سسپنس آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ملک بھر میں الیکشن کی گہما گہمی اور ہلچل اپنے عروج پر ہے اور ساتھ ہی پرچے کی تیاریاں بھی جاری ہیں۔ اب چاہے یہ الیکشن ہوں یا سلیکشن، نتائج کے بعد دیکھنا ہے کہ حکومت کی باگ ڈور کا قرعہ فال جس کے بھی نام نکلتا ہے...... وہ اپنے وعدوں اور دعوؤں میں کتنا سچا اور عوام کی امیدوں پر کتنا کھرا اترتا ہے۔ یوں تو ہر سیاسی جماعت نے دوسری سیاسی جماعت کا اگلا پچھلا تمام ریکارڈ آئینے کی طرح سامنے لاکر رکھ دیا ہے مگر ماضی میں اپنے اپنے دورِ قیادت کے دوران اپنے دامن پر لگے داغ کی بابت کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا...... عوام کا اعتبار تو عرصہ ہوا ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو چکا ہے بالخصوص کراچی میں...... اب تو ان کرچیوں کو سمیٹ کر پھر سے اس قوم کو متحد اور ان کے اعتماد کو بحال کرنے کی باری ہے اور یہ ذمے داری دیکھیے کون اور کس طرح نبھا پائے گا...... یا ہمیشہ کی طرح عوام کی امیدوں پر پانی پھیر دیا جائے گا...... ہر طاقتور طبقہ طاقت کے بل پر ہر بار نئی بساط بچھاتا ہے اور نئی سیاسی چالوں کے ساتھ ساتھ کئی بازیاں لگتی ہیں اور پھر کوئی بازی گر بازی مات کر دیتا ہے...... ایسے تمام سیاسی بیانات الیکشن کی مہم کے دوران بہت عروج پر رہتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان سب کے بیچ عوام محض تماشائی بنے کھڑے رہ جاتے ہیں...... حیرت کی بات یہ ہے کہ لوگوں کے عوامی مسائل کا ادراک ہمیشہ ان قائدین کو الیکشن کی مہم کے دوران ہی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انہیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کس قدر مشکل حالات اور مسائل کا شکار ہیں۔ یہ اگرچہ افسوس کا مقام تو ہے مگر آنے والے کل کی اچھی امیدیں قوم کو مایوس نہیں ہونے دیتیں۔ دعا ہے کہ برسرِ اقتدار آنے والی جماعت کو اللہ پاک اقتدار کے ساتھ ساتھ عقلِ سلیم اور دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ بھی عطا کرے۔ تمام سیاسی لیڈر عوام کو الیکشن کے دوران تو بڑے سہانے خواب دکھاتے ہیں۔ اللہ کرے ان کی تعبیر بھی خوبصورت نکلے، الٰہی آمین ...... آخر میں بہت ساری دعائیں اور نیک تمنائیں فتح پانے والی جماعت کے لیے اور ساتھ ہی چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

☩ روبینہ اشعر، کراچی سے تبصرہ کر رہی ہیں۔ ”فروری کا شمارہ حسبِ معمول جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل پر کسی گاؤں کی حسینہ مسکراتی ہوئی براجمان نظر آئی۔ ٹائٹل پسند آیا۔ فہرست پر سرسری نگاہ ڈالی اور پھر جون ایلیا کا علم وفکر سے بھرپور انشائیہ ”سقراط سے سرمد تک“ پڑھا۔ انہوں نے صحیح فرمایا کہ کس قدر مظلوم تھے ہمارے پیشرو اور کس قدر بدنصیب ہیں ہم کہ ہمیں انسانوں کی اس دنیا میں ہمیشہ علم اور عقل کی اہمیت ثابت کرنا پڑتی ہے۔ خطوط کی محفل میں اس بار کرسیِ صدارت عبدالجبار رومی کے حصے میں آئی۔ یقیناً ان کا شاندار تبصرہ اس کرسی کا حق دار تھا۔ ہمارا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ دیگر احباب میں سید محی الدین اشفاق، سبیتا شاہ، ملک وحید، انجم فاروق ساحلی کی شرکت بھرپور رہی۔ جنید علی کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح خوب رہا۔ زویا صفوان کی تحریر ”جنگجوئے صف شکن“ کا تیسرا اور آخری حصہ بھی خوب رہا۔ تیمور کے بعد خانہ جنگی ہوگی۔ شاہ رخ اور الغ خان کی باہمی کوششوں سے تیموری سلطنت ہندوستان سے عراق تک برقرار رہ پائی مگر یہ بھی سمرقند کو تیمور کے عہدِ حکومت کے برابر نہ پہنچا سکے۔ بلاشبہ جنگجوئے صف شکن (تیمور) دنیا کا آخری فاتح تھا اور اس کے بعد کوئی انسان تلوار کے زور پر ایسی طاقت حاصل نہ کر پایا۔ غوشیہ شبیر کی ”آلۂ قتل“ عمدہ تحریر تھی۔ شفیق انصاری کی خودداری کو سوشل میڈیا پر تبصروں نے کس پنچی اور اس کا بھرم بیچ چوراہے پر پھوٹا اور آلۂ قتل بنا بابر کا چند انچ کا موبائل۔ عیوق بخاری کی تحریر ”خطرناک درندہ“ پسند آئی۔ چار دوست خزانے کی تلاش میں نکلے اور انہیں کامیابی بھی ملی اور وہ جنگلی درندوں سے بچ کر آ گئے مگر انسان نما درندوں سے نہ بچ سکے اور لٹ گئے۔ صحیح کہا گیا ہے کہ انسان اگر انسان نہ رہے تو اس سے بڑا اور خطرناک درندہ کوئی نہیں۔ مرزا امجد بیگ کی ”شکنجہ“ بھی خوب رہی۔ عمرانہ نے منصوبے کے تحت گل زمان کو چوری کے کیس میں پھنسایا اور بیگ صاحب کی کڑی محنت اور جرح کے باعث سازش کا پردہ فاش ہوا اور اصل ملزم کو قانون نے اپنے شکنجے میں لے لیا۔ صائمہ دانش کی ”مہلک کھیل“ زبردست تحریر تھی۔ للی کو دل کا غبار نکالنے کے لیے جو کھیل ملا اس نے کھیلا اور وہ جانتی تھی کہ اس مہلک کھیل میں اسے جیت اور ہار ایک ساتھ ملنے والی تھی۔ آصفہ ضیا احمد کی ”پوشیدہ راز“ اچھی تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ”جنگ باز“ اچھی جا رہی ہے۔ عاطر شاہین کی ”نقب زن“ کچھ خاص نہیں لگی۔ عائشہ نصیر کی تحریر ”تخریب کار“ اچھی لگی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ”میران سید شاہ بھیکہ“ میں ایک عظیم اور مقدس بزرگ کے بصیرت افروز واقعات پڑھنے کو ملے۔ اے آر راجپوت کی تحریر ”دکھن“ بھی خوب رہی۔ کہانی کے آخر میں کالو کے حالات جان کر افسوس ہوا۔ ناہید سلطانہ اختر کی ”وہی راستے وہی مرحلے“ کا آخری حصہ زبردست رہا۔ حسن آرا کو اپنی غلطی کا احساس بہت دیر میں ہوا اور شاہ مراد سے دوبارہ رشتہ جوڑنا چاہا لیکن بے سود۔ کبھی کبھی ایک فرد کی غلطی پورے گھرانے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ زبردست تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں تمام اشعار خوب رہے۔ کترنوں کا انتخاب بھی اچھا رہا۔“

☩ جنید علی کی ملتان سے آمد۔ ”معزز قارئین! آئیں، ذرا الگ انداز میں سسپنس کے تازہ شمارے پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ حسبِ معمول سسپنس میں بھرپور انداز میں سویٹ ڈشز کا انتظام کیا گیا ہے۔ سرورق حسبِ روایت ہے شاندار...... اور فہرست ہے ذائقہ دار اور فہرستی صفحہ تو صرف ٹریلر ہے کہ پورا شمارہ ہے خاص الخاص۔ ”آپ کے خطوط“ سلسلہ ”لذیذ کھیر“ کے مانند ہے جس میں تمام تبصرہ نگار زعفران، بادام، پستہ، کھوپرے اور کھوئے کے لوازمات کی طرح کھیر میں شامل ہیں یعنی رومی بھائی کی آمد پر خوشی ہوئی اور آمد ہر بار ہونی چاہیے، وہیں ان کی سرورق پر گفتگو کیا کمال کی تھی

اور واقعی سال نو کا سرورق پسندیدہ اور جاذبِ نظر تھا۔ کراچی سے حسبِ روایت دلچسپ تبصرے کے ساتھ روبینہ اشعر کی پُرخلوص دعائیں کاش ملک پاکستان کے حق میں قبول ہو جائیں۔ فتح پور لیہ سے واحد تبصرہ نگار، جے ڈی پی کے دیرینہ ساتھی محی الدین اشفاق بھی عمدہ انداز میں شریک محفل ہیں جن کی حاضری سسپنس کے لیے ضروری ہے، ویسے ہی جیسے ملک وحید، انجم فاروق ساحلی اور سبیتا شاہ کی مختصر مگر جامع حاضریاں کسی سے کم نہیں مگر ہر بار رعایت نہیں ملتی کہ اگلی بار طویل نشست بھی ہونی چاہیے۔ آپ سب یہ ہماری درخواست سمجھ لیں یا سسپنس کی عدالت کا آرڈر، ٹھیک ہے نا؟ ہاں، آپ تمام کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ سالانہ تبصرہ پسند کیا۔ پہلا تجربہ تھا اور ساتھ ڈر بھی تھا کہ پتا نہیں سسپنس کے لیول کا ہوگا یا نہیں اور کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ جون ایلیا نے ”سقراط سے سرمد تک“ کے دورانیے میں ہونے والے ان گنت معاملات کو موضوعِ بحث بنایا جس میں ہم پڑھنے والوں کے لیے بہت سی نصیحتیں شامل ہیں وہیں یہ سلسلہ ہر بار ملتان کے لذیذ ”اخروٹی سوہن حلوے“ کے مانند پسندیدہ رہتا ہے۔ تاریخی صفحات پر زویا صاحبہ نے تین اقساط میں عرق ریزی سے ”جنگجوئے صف شکن“ میں تیمور کی جرأت و بہادری اور اسلام کی خاطر اس کے عملی کارناموں کی تاریخی داستان رقم کی۔ اس قسط میں شامل مختصر شاعری بھی پسند آئی۔ دنیا کو الوداع کہتے ہوئے تیمور کی اپنے ساتھیوں کو کی گئی نصیحتیں کارآمد تھیں اور یہ تحریر پڑھ کر چاشنی سے تیار کردہ گھر کا بنا ہوا گرما گرم ”بیسن کا حلوا“ ہمیں یاد آیا۔ غوثیہ شبیر اپنی خوبصورت تحریر کے ساتھ حاضر تھیں جو ایک معیاری و اصلاحی تحریر تھی۔ بابر اور اس کی زوجہ نے نیکی کر کے اس کی حسبِ معمول تشہیر ضروری سمجھی جس کا نتیجہ شفیق صاحب کی موت کی صورت میں نکلا۔ نیکی کر دریا میں ڈال کے مصداق انسان کو صلہ اللہ سے ہی طلب کرنا چاہیے کہ لوگوں سے خلوصِ دل سے کی گئی نیکی کی تعریفیں بھی نیکی کا اصل مقصد ختم کر دیتی ہیں اور فیس بک پر اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ خواتین و حضرات داد و تحسین اور ہمدردیاں انجانے لوگوں سے وصول کرنے کے لیے ہر عام سے عام بات پر پوسٹ کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو درست نہیں اور یہ ہی تحریر میں بتایا گیا ہے۔ ہاں، یہ تحریر ٹھنڈے ٹھار باداموں سے تیار کردہ ”ربڑی“ سے کم نہیں تھی۔ اس بار بھی رنگ برنگے خوشبو دار ذائقہ دار ”زردے“ کی کمی کو پورے کرتے ہوئے ”شہ زور“ کی تازہ قسط شامل رہی۔ نجل اب شکر ہے خیریت سے ہے۔ نیلی کو عالم شاہ شریکِ سفر بنانا چاہتا ہے جو موی کی یادوں کے حصار میں ہے۔ عمار نے پری وش کو بچانے کے لیے جوش میں آ کر ہندو سپاہی کو واصلِ جہنم کر دیا مگر آگے جا کر نقصان ہو سکتا ہے۔ عیوق بخاری کی تحریر ”خطرناک درندہ“ میں شرپسند دوستوں کی بدحواسیوں کا سنسنی خیز احوال پڑھ کر لطف آیا جو دولت کے چکر میں خطرناک درندوں سے تو بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے مگر آخر میں خود ہی لٹ گئے اور ہاتھ کچھ نہ آیا اور یہ کہانی پڑھ کر فریزر کی شیریں اور پستوں کی گارنشنگ کے ساتھ تیار کردہ ”رس ملائی“ کا پیالہ ہمارے گمان میں آیا۔ مرزا امجد صاحب نے ایک شریر و شرپسند بچے واصف جس نے سب کی ناک میں دم کر رکھا تھا اور اس کی والدہ عمرانہ صاحبہ کے سنگین جرائم کی داستان دلچسپ انداز میں سنائی جس کے آخر میں شاطر عمرانہ صاحبہ نے منہ کی کھائی۔ عجیب عورت تھی جو اپنی غلطی ماننے اور اپنے بچے کی تربیت درست کرنے کے بجائے زمان کو چوری کے الزام میں اندر کروا دیا اور اپنے بچے کو مزید شہ دے رہی تھی مگر آخر میں سب سچ سامنے آ گیا اور اس ماہ کی سسپنس کی عدالت نے مزیدار اور مختلف لوازمات سے تیار ”لبِ شیریں“ کا مزہ دیا۔ ”مہلک کھیل“ جسے ٹوٹے ہوئے دل والی اور خطرناک چال چلنے والی حسینہ نے شاطرانہ انداز میں کھیلا، پڑھ کر ہمیں بہت اچھا لگا۔ شین اور ایڈن جو زندگی کے نئے سفر پر جا رہے تھے۔ انہیں نہیں پتا تھا کہ ابدی سفر پر ہی مہلک کھیل کی وجہ سے روانہ ہو رہے ہیں اور یہ تحریر ہمیں ٹیڑھی میڑھی گرما گرم شیرے میں تر ہوئی ”جلیبیوں“ کے مانند لگی۔ ”محفل شعر و سخن“ کے رنگارنگ اشعار کو پڑھ کر اگر مینگو فلیور کی پُرلطف ”کریمی آئسکریم“ سے تشبیہ دیں تو کیسا رہے گا؟ اپنی انا اور خود ساختہ انتقام کی آڑ میں انسان کسی کی جان لینا معمولی بات سمجھتا ہے اور پستی کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے جیسے آصفہ ضیا کی طویل تحریر میں انوراگ نے کیا جس نے اپنا بدلہ لینے کے لیے نیلا آکاش منزل کے مکینوں کی زندگیوں سے کھیلا اور آخر میں پکڑے جانے پر اقبالِ جرم کیا اور یہ تحریر لذت سے بھرپور خالص کھوئے سے تیار کردہ گرما گرم ”گاجر کے حلوے“ کی پلیٹ سے کم نہ تھی جس میں چھوٹے چھوٹے رس گلے بھی شامل تھے۔ پورے شمارے میں اگرچہ تمام ڈشز ”تحریریں“ کسی سے کم نہیں تھیں مگر اس بار کی رنگارنگ کارنر کو میٹھا نیشنز نے تھوڑا سا اور کچھ میٹھا ہو جائے کے مصداق ”ڈیری ملک چاکلیٹ“ کی کمی بھی پوری کی۔ ”نقب زن“ میں کم ظرف حامد نے اپنے مخلص دوست زمان کے گھر کی عزت پر دوستی کی آڑ میں وار کرنا چاہا مگر خود آخرکار اپنی زندگی کی بازی قدرت کے ہاتھوں ذلیل ہو کر ہار گیا۔ انسان کچھ غلط کرنے سے پہلے اگر ان کے منفی نتائج پر غور کر لے تو آخر میں نقصان نہ اٹھائے۔ خیر، یہ تحریر پڑھ کر کاجو اور پستے سے تیار کردہ ”قلاقند“ کا گمان ہوا۔ عائشہ نصیر کی حسبِ معمول زبردست ترجمہ زاد تحریر پر ہم خالص ملائی سے تیار کردہ میٹھی ”چم چم“ کا ذکر کریں تو غلط نہ ہوگا کہ مصنفہ ہر بار تجسس سے بھرپور کہانی لاتی ہیں اور زیرِ مطالعہ تحریر ”تخریب کار“ میں جولیا کی پیشہ ورانہ کارکردگی عروج پر تھی جس نے اپنی ذہانت سے شاطر میری شلنگ کا راز فاش کر دیا جس نے سارا معما حل کر دیا۔ سسپنس کے ایک اور مستقل سلسلے میں ”میران سید شاہ“ کی ایمان افروز داستان پڑھ کر روح کو سرشار کیا۔ تحریر ”دلہن“ راجپوت صاحب کی معاشرتی کہانی تھی جس میں نازو کے شوہر کا فیصلہ درست تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جیسا ایک اور معاشرے کی تلخیوں کا سامنا کرے ورنہ عام طور پر اس طبقے کے لوگ ایسا نہیں سوچتے بلکہ اولاد کو بھی ذریعۂ معاش تصور کرتے ہیں مگر تحریر میں ایک نئی سوچ دی گئی، ویل ڈن۔ وہیں باداموں سے مزین ”بیسن کی مٹھائی“ کا ہمیں گمان ہوا۔ ناہید صاحبہ کی تحریر کا آخری حصہ بھی بہترین تھا جس میں حسن آرا کو عقل اس وقت آئی جب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا اور صرف پچھتاوا کرنا ہی مقدر تھا اور آخری کہانی کو ”موتی چور کے لڈو“ کا ذکر کرنا بہتر رہے گا۔ (ویلڈن جنید علی...... پنج رنگی مٹھائی کا ڈبا آپ نے پیش کیا، اچھا لگا)۔“

✠ عیوق بخاری کی پہلی خوشگوار آمد سادھوکی پنجاب سے۔ ”ہلکی ہلکی بارش کے خوبصورت موسم میں خط لکھنے کے لیے کاغذ قلم اٹھایا ہے۔ طویل

عرصہ پڑھنے اور اب کچھ عرصے سے لکھنے کے بعد پہلی بار خطوط کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ صبح کے وقت آنے والی بارش محض چند منٹ کی رہی لیکن اس کے بعد بادلوں کے ٹکڑوں میں سے نکلتا سورج دُھلا دُھلا اور خوب روشن لگ رہا ہے۔ شدید دھند اور گہرے بادلوں کے بعد موسم کی اس صورتِ حال سے ایک بڑی خوبصورت سی امید پیدا ہوئی کہ وطن اور اہلِ وطن پر اس وقت جو مشکلات و مسائل کے بادل ہیں، ان شاء اللہ وہ بھی ایک دن رحمتوں کی بارش سے چھٹ جائیں گے۔ کئی بار بالخصوص پچھلے چند ماہ سے خط لکھنے کے بارے میں سوچا لیکن پڑھنے، پڑھانے اور لکھنے میں اتنا مصروف رہی کہ ان چند الفاظ کے لیے وقت نہ نکال پائی۔ مطالعہ کرنا میرے لیے ہمیشہ بہت دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔ سردیوں میں کمبل اوڑھ کر، گرمیوں کی طویل دوپہروں میں چھٹیاں گزارتے ہوئے مختلف رسالے پڑھنا کتنا دلچسپ ہے، یقیناً مطالعے کے شوقین اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ پڑھتے پڑھتے لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو میٹرک کے دوران ہی لڑکھڑاتی شاعری اور ٹیڑھے میڑھے افسانے، مضمون لکھے پھر چند سال بعد ڈائجسٹ میں لکھنے کا خیال آیا تو ادھر تحاریر بھجوائیں جو میرے خیال میں اتنی اچھی نہیں تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ردی کی ٹوکری کی نذر نہ ہو جائیں لیکن ادارے کی ذرہ نوازی کہ کہانیاں شائع ہونا شروع ہو گئیں۔ اللہ کے کرم، ادارے کے تعاون اور اپنی بہنوں کے گھر کے کام میں ہیلپ کی بدولت میں لکھ رہی ہوں۔ برسوں جاسوسی رسالے، عمران سیریز پڑھنے، مرزا امجد بیگ کی تحریریں جن میں قتل، جرائم کا خوب ذکر ہوتا ہے اور جرم و سزا پر مبنی ڈرامے، مووِیز دیکھنے کے بعد ایسی ہی کہانیاں بنانا اللہ کے کرم سے زیادہ مشکل نہیں رہا۔ جنید علی کا تبصرہ ہمیشہ ہی اچھا رہا لیکن جنوری والا تو سب سے زیادہ نمبر لے گیا۔ سالانہ رپورٹ اور مجھ ناچیز کی کئی کہانیوں کے ذکر نے مجھے گویا ایک اعزاز بخشا ہے۔ بھئی آپ ہیں تو ہم ہیں۔ بڑی تقویت ملتی ہے اس عزت افزائی سے۔ جنید علی کا فروری کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ ان شاء اللہ بہت جلد طویل تحریر آپ کے سامنے ہوگی۔ انجم فاروق ساحلی نے وقت کی قلت میں سوچ و فکر کے لیے آیتِ مبارکہ کا حوالہ دے کر بڑا مفصل سبق دیا ہے، جزاک اللہ۔ اللہ آپ کو صحت دے، آمین۔ عبدالجبار رومی کو کرسیِ صدارت مبارک ہو۔ سب پرانے ساتھیوں کو لوٹ آنا چاہیے۔ نہ صرف خود رسالے سے جڑیں بلکہ اپنے آس پاس والوں کو بھی بتائیں کہ انتہائی ارزاں قیمت پر اتنی بڑی تفریح اس زمانے میں کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔ روبینہ اشعر، سید محی الدین اشفاق، سبیتا شاہ، ملک وحید کے تبصرے بڑی خوبصورتی سے تحاریر کا احاطہ کرتے نظر آئے۔ خط لمبا ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ آپ سب پر مزید بات کروں گی۔ سلامت رہیں۔ لکھتے رہیں اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں اور ذہن میں رکھیں کہ آپ کا قلم ہماری تحریروں کے تبصرے کے لیے اٹھتا ہے تو ہمارا قلم چلتا ہے۔ آپ کی کرم نوازی ہمیں لکھنے کے لیے تحریک دیتی ہے۔ کہانیوں پر تبصرہ کافی مشکل لگ رہا ہے کیونکہ سبھی کمال ہیں۔ بالخصوص غوثیہ شبیر کی ''آلۂ قتل''، عاطر شاہین کی ''نقب زن'' خوب رہیں۔ ناہید سلطانہ اختر کی ''وہی راستے وہی مرحلے'' متوقع انجام کے ساتھ ختم ہوئی اور بہت پسند آئی۔ شاعری مجھے بہت پسند ہے اس لیے سارے ہی شعر پسند آئے اور کترنیں بھی کمال تھیں۔ ادارہ، تبصرہ نگاروں، لکھاریوں کے لیے دعا گو۔''

☸ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ سے چلے آ رہے ہیں۔ ''اپنے پسندیدہ رسالے کو پورا پڑھ چکے ہیں۔ کرسیِ صدارت پر بیٹھے عبدالجبار رومی انصاری صاحب بہت اچھے لگے۔ احساس کے ساتھ احساس شامل ہونے سے بڑی دلکش اور خوب صورت اپنائیت ملی ہے۔ بس اب جڑے رہیے رسالے اور ہمارے ساتھ۔ روبینہ اشعر صاحبہ آپ نے اہلِ وطن کے لیے جو دعا کی ہے اللہ کرے وہ جلد قبول ہو، آمین۔ سبیتا شاہ کو بروقت رسالہ ملا پھر بھی اتنا مختصر تبصرہ؟ خیر کوئی بات نہیں، حاضری دے رہی ہیں یہ بھی اچھا ہے۔ جنید علی کا غیر نصابی سرگرمیوں میں شریک ہونے کو پسند کرنا بہت پسند آیا۔ درست کہا آپ نے جنید علی، واقعی کھیل کا میدان یا تقریر کرنا ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ اعتماد، برداشت، حوصلہ، جسمانی صحت اور بوریت کا خاتمہ غیر نصابی سرگرمیوں کے فوائد ہیں۔ سب نوجوانوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیے۔ ملک وحید اور انجم فاروق ساحلی سے بھی نصف ملاقات ہوئی۔ واہ ساحلی صاحب! ماشاء اللہ آپ نے قرآن کی آیت کے ذریعے درس دے دیا ہے۔ کمال آدمی ہیں بھئی۔ مختصر سے تبصرے میں بھی اپنی دھاک بٹھا دی۔ اللہ آپ کو صحت دے تاکہ ہم آپ کا طویل تبصرہ پڑھیں، آمین۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب۔ سب سے پہلے ناہید سلطانہ اختر کی ''وہی راستے وہی مرحلے'' کا آخری حصہ پڑھا۔ حسن آرا کے ساتھ وہی ہوا جس کی وہ مستحق تھی۔ اچھی کہانی تھی۔ رائٹر صاحبہ کو مبارک باد۔ غوثیہ شبیر کی ''آلۂ قتل'' سبق دیتی تحریر ہے۔ بابر کی غلطی نے ایک خوددار شخص کو مار ڈالا۔ ہمیں سوشل میڈیا کے استعمال میں ذرا احتیاط کرنا چاہیے۔ جو بات دو کے درمیان ہو، اسے پوری دنیا کے سامنے رکھنا ہرگز دانش مندی نہیں ہے۔ تحریر پڑھ کر شاید کئی لوگوں کو سبق ملے۔ عیوق بخاری کی ''خطرناک درندہ'' پڑھی۔ گھنے جنگل میں چار دوستوں کا سیر سپاٹا کرنا ایڈونچر سے بھرپور تھا۔ کہانی میں رائٹر نے بڑے اچھے انداز میں بتایا ہے کہ اگر انسان اپنی اخلاقی اقدار ختم کر دے تو اس سے بڑا اور خطرناک درندہ کوئی بھی نہیں۔ وہ جو جنگلی جانوروں، خونخوار درندوں، شدید طوفان سے بچ گئے تھے، اپنے ہی جیسے کے ہاتھوں سے نہ بچ سکے اور ''انسان'' کی وحشت و لالچ کا شکار ہو گئے۔ انوکھے موضوع پر لکھی گئی یہ کہانی بہت اچھی لگی۔ غور کرنا چاہیے ہمیں اپنے آپ پر کہ ہم ایسے نہ بنیں کہ حیوانوں کی حیوانیت بھی کم پڑ جائے۔ عاطر شاہین کی ''نقب زن'' میں ایک کم ظرف دوست کا انجام پڑھا۔ بُروں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ باقی تمام کہانیاں بھی قابلِ تعریف ہیں۔ ساتھیوں کے لیے دعا گو۔''

☸ عبدالجبار رومی انصاری، قصور سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''انکل جون کی یہی بات کافی ہے کہ ہم پر قوم اور ملک کے اَن گنت حقوق ہیں مگر ہم ان میں سے اب تک کوئی حق ادا نہیں کر سکے اور جب تک ملک پر چور لٹیرے مسلط رہیں گے، ہم اس کے حقوق ادا کر ہی نہیں سکتے۔ اداریہ سے سو فیصد

متفق ہیں۔ دل کی بات کی ہے مگر ہائے رے افسوس، ہماری بے شعور عوام آج بھی انہی کا نام لے رہی ہے۔ بس عقل ماتم کرے ہے۔ لیجیے رومی انصاری بھی صدارت کے مستحق ٹھہرے۔ محبت والے ہیں نا بھی کان دھر لیے، ہاہاہا۔ ارے روبینہ اشعر جی بیس اکیس سال کہاں، پچاس سال کی بات کریں بلکہ جب سے پیارا وطن آزاد ہوا تبھی سے سازشوں میں گھرا ہوا ہے۔ بس دعا ہے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ سید محی الدین اشفاق کی باتیں بھی بہت اچھی لگیں۔ سیتا شاہ بھی لحاف میں دبکی ہوئی اس دفعہ مختصر تبصرہ ہی کر پائیں۔ جنید علی کا تبصرہ خوب رہا۔ ارے ہم غائب نہیں ہوئے۔ دراصل رسالہ لیٹ ملا تھا تو تبصرہ بھی نہ لکھ پائے پھر بھی ہم حاضر جناب۔ تہِ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو اپنے ہر تبصرے میں ہمیں یاد رکھا۔ جنگجوئے صف شکن کا تیسرا حصہ خوب رہا۔ تیمور کی بڑی سلطنت چین کو فتح کرنے کی خواہش ادھوری رہی اور سرد موسم نے بڑھاپے کی دہلیز پر اس کی جان لے لی۔ تیمور کے بعد شاہ رخ اور الغ نے انتشار زدہ سلطنت کو کسی حد تک سنبھال لیا مگر تیمور ایسی شان و شوکت اور جنگجوئے صف شکن کو وہ نہ پہنچ پائے۔ زویا صفوان کی تاریخی کہانی زبردست رہی۔ ”بدنی چوٹ کا نشان ندارد، اندرونی چوٹیں وارد“ حسام بٹ کی ”شکنجہ“ میں مرزا امجد بیگ کی آسودہ سانس خارج ہوئی اور ساتھ ہی عمرانہ کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی جب بیگ صاحب کی تفتیش نے اس کے سبھی جھوٹ بے نقاب کر دیے، بہت عمدہ تحریر۔ ”پوشیدہ راز“ میں نیلا آکاش کا کردار رمن تو پر اسرار نکلا۔ بے وقوف کی روپالی سے یکطرفہ محبت نے نیلا آکاش کے خاندان کو نشٹ کر کے رکھ دیا۔ آخر میں من موہنی اور جے کی شادی تو نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ روپالی کی طرف سے وہ بہن بھائی تھے۔ مارنے کے بجائے انہیں الگ کر دیا جاتا لیکن پھر رمن کی بے وقوفی اور اس کی ڈور بھی تو کسی نے ہلائی تھی نا، سو سیٹھانی اور راجیشوری کے کہنے پر دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ آصفہ ضیاء احمد کی کہانی بھی بہت عمدہ رہی۔ ”جنگ باز“ میں سہراب، شینا کے علاوہ کشتی کے سب ہی مسافر لقمۂ اجل بن گئے۔ یوں سہراب اور شینا مل گئے مگر تیز بہاؤ والی آبی گزرگاہ میں گر کر وہ مرتے مرتے بچے۔ انسان کو اپنی شکست، اپنے زوال کو قبول کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے ورنہ بھٹکتا ہی رہے اور پھر اسی حوصلے کی بنا پر شاہ مراد خود بھی اور بیٹی ایقہ کو بھی کامیاب بنا گئے۔ ان دونوں باپ بیٹی کی محبت قطبی ستارے ایسی تھی جو اپنی جگہ قائم رہی اور مشکل وقت میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رکھا۔ بکھری اولاد یکجا ہوئی مگر اپنے لیے جیتی حسن آرا ایک موقع اور کے لیے بس آ بلے۔ جلن اور سوز دل ہی سمیٹ پائی۔ شاہ مراد نے تو کاسگنل دے کر اسے چلتا کیا، وہی راستے وہی مرحلے۔ ناہید سلطانہ اختر کی کہانی بے حد پسند آئی۔ ”دیکھ کالو، یہ بچہ بڑا ہو کر ہمارا سہارا بنے گا“ اور کالو نے جب نازو سے سالوں پرانی پوٹلی کھلوائی تو دل گرفتہ سی نازو کالو سے لپٹ گئی۔ چاروں دوستوں کی خوفناک جنگل میں واک ڈرے سہمے دوستوں نے جڑی بوٹیوں اور خزانے کی صورت بہت کچھ حاصل بھی کر لیا مگر جنگلی درندوں سے بھی بڑے انسانی درندوں سے وہ کچھ نہ بچا سکے اور لٹے پٹے زخمی واپس پہنچے۔ عیوق بخاری کی ”خطرناک درندہ“ سحر انگیز جنگل کہانی عمدہ رہی۔ خودسر اور خود پسند لڑکی نیلی نے عالم کے دل کے تار چھیڑ دیے۔ دوسری طرف پری وش کو اکیلے میں فوجیوں نے گھیرا تو وہ بھی شیرنی بن گئی اور پھر ان دیکھا خنجر اس کی مدد کو آ پہنچا جس سے ایک فوجی تو جان سے گیا اور پری وش کی جان بچی۔ ”شہ زور“ بہت عمدہ جا رہی ہے۔ اسما قادری نے لفظ بہ لفظ تانا تانا بُن کر دشمنوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔“

✱ سیتا شاہ کا خط ڈیرہ غازی خان سے۔ ”کئی دنوں کی لگاتار اور ٹھٹھرتی سردی کے بعد سورج اور سسپنس کی ایک ساتھ آمد نے موڈ خوشگوار کر دیا۔ ٹائٹل گرل نے بھی شاید ہماری طرح کافی دنوں بعد سردی کی دھوپ کا احساس پایا تھا۔ اسی لیے طمانیت بھری مسکراہٹ لیے ہوئے تھی۔ حسبِ سابق سب سے پہلے جون ایلیا کے انشائیے سے مستفید ہوئے اور پھر خطوط کی محفل کی طرف بڑھے جہاں عبدالجبار رومی انصاری دلچسپ و شاندار تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت سنبھالے ہوئے تھے، مبارک باد۔ ملکی حالات کے بارے میں کہا کہ اللہ کرے کہ وطن عزیز کو ایک بے لوث اور مخلص قیادت ملے۔ سید محی الدین اشفاق، روبینہ اشعر اور ملک وحید کا تبصرہ بھی زبردست رہا۔ جنید علی نے ہمیشہ کی طرح بہترین تبصرے کے ساتھ انٹری دی۔ واقعی غیر نصابی سرگرمیاں مطالعہ ہو یا کھیل، انتہائی ضروری ہیں۔ وقت اچھا گزر جاتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو بڑھانے اور اظہار، دونوں کا موقع ملتا ہے۔ انجم فاروق ساحلی کی اگلی تحریر کا انتظار رہے گا۔ تبصرہ اچھا تھا۔ اب ذکر کہانیوں کا۔ ”آلۂ قتل“ تحریر غوشیہ شبیر، اچھے موضوع پر لکھی گئی تھی۔ شفیق کے کیے گئے احسانات کو گنوا کر اور اس کی معاشی بدحالی کو دوسروں کے سامنے لانے میں یقیناً بابر کا کوئی غلط مقصد نہ تھا مگر شفیق جیسا خوددار انسان اپنے حالات کا بھرم ٹوٹنا برداشت نہ کر پایا۔ عیوق بخاری کی تحریر ”خطرناک درندہ“ دلچسپ تحریر تھی۔ مہم جوئی کے شوقین چار دوست جنگلی جانوروں کا شکار بننے سے تو بچ گئے مگر انسانی درندوں نے ان کا شکار کر لیا۔ صحیح ہے کہ شکل خوفناک ہونے سے درندہ نہیں بنا جاتا، ارادہ خطرناک ہونا چاہیے پھر انسان سے بڑا کوئی درندہ نہیں۔ عاطر شاہین کی تحریر ”نقب زن“ بھی شاندار تحریر تھی۔ حامد کی گھٹیا حرکت پر زمان کا طیش میں آنا اور ردعمل دینا بنتا تھا مگر زمان جو ارادہ کر چکا تھا اس سے وہ قاتل بننے جا رہا تھا اور پھر اچھی قسمت سے نہ صرف وہ ایک جرم کرنے سے بچ گیا بلکہ اس کے بھرم کا بتا کسی اور کے ہاتھوں کٹ گیا۔ اے آر راجپوت کی ”دکھن“ بہت اچھی تحریر تھی۔ نازو نے اپنی ممتا کی تسکین کے لیے غلط قدم اٹھانا چاہا لیکن کالو کی اس اذیت نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا جو وہ خود برداشت کر رہا تھا۔ کسی بچے کو اپنے ماں باپ اور گھر سے دور کیے جانے کا غم کالو سے بہتر کون جانتا تھا۔ ”شہ زور“ زبردست رہی۔ مہلک کھیل، پوشیدہ راز اور تخریب کار بھی دلچسپ و شاندار تحاریر تھیں۔ محفل شعر و سخن میں تمام انتخاب ہی لاجواب تھے تاہم ثمینہ احمد اور وردہ جنید کے انتخاب بازی لے گئے۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ دعا ہے کہ خطوط کی محفل میں نئے اور پرانے لکھنے والے مزید شامل ہوتے رہیں، آمین۔ سسپنس گزشتہ ماہ (جنوری) بروقت مل تو گیا تھا اور پڑھ بھی لیا تھا مگر تبصرہ لکھنے تک موسمی نزلہ زکام نے اچھے سے تبصرہ لکھنے نہیں دیا۔ مختصر میں بات سمیٹنا پڑی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شمارہ لاجواب تھا۔ سسپنس اور اس کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو۔“

خانۂ طلسمات

اے آر راجپوت

آنے والا وقت ہمیشہ کسی طلسم کے مانند ہوتا ہے جس کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا کہ انسانوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے گا لیکن... گزرا وقت اپنے حالات اور واقعات کے حوالے سے گزشتہ عہد کے نقش کو دائم کردیتا ہے... یہ داستان بھی ایک ایسے ہی دور کو واضح کرتی ہے جس میں سلطنت کے رموز اور بادشاہت کے کرداروں کے بھید کچھ الگ ہی داستان سنا رہے ہوتے ہیں۔ محبت کے جذبے کو تسلیم نہ کرنے والی شہزادی کو جب کسی کے خاموش عشق کی انتہا کا علم ہوا تو دل میں پیدا ہونے والی خلش نے اس سے جینے کی خواہش ہی چھین لی... اور ضمیر پر کسی کی محبت کا قرض لے کر جینا اسے بھی گوارا نہ تھا لہذا بہت وقار اور خاموشی کے ساتھ اس نے اپنے چاہنے والے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ تو کیا مگر... انتہائی مختلف اور منفرد انداز میں۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

خورشید سحر بلند ہو چکا تھا۔ اس کی زریں کرنیں بلند عمارات اور مقدس طلسم خانے کی بلندی پر نثار ہوکر بڑا دل فریب منظر پیش کر رہی تھیں مگر اس وقت لوگ اس کی خوبصورتی سے بے خبر نئے بادشاہ کے دیدار کی دھن میں چلے جا رہے تھے۔

اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جو نئے بادشاہ کی تاج پوشی کو ایک تہوار کی طرح منا رہے تھے مگر اسی مجمعے میں کچھ سنجیدہ قسم کے لوگ بھی شامل تھے جو بادشاہت کے کئی دور دیکھ چکے تھے اور پرانے بادشاہ کلکی بن حربیا کو بھولے نہیں تھے جسے موت کے گھاٹ اتار کر نئے بادشاہ نے خود تاج پہنا تھا۔

یہ دو معمر سردار کوش اور کنعان تھے اور تیسرا فرد کوش کا شاگرد نوجوان ساحر معدانوس بن دازمل ان سے متفق تھا اور خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ بوڑھے کوش نے زیر لب کہا۔

”حکومت ایک اکھاڑا بن گئی ہے۔ نیا پہلوان پرانے پہلوان کو پچھاڑ کر اپنی فتح کا اعلان کر دیتا ہے اور ہم اس کی برتری کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ آخر یہ کھیل کب تک کھیلا جاتا رہے گا؟“

”ہزاروں لاکھوں افراد اس زندگی سے مطمئن ہیں اور ہم دو کیا کر سکتے ہیں۔ بس، جو کھیل دکھایا جائے، دیکھتے رہو۔“ کنعان نے جواب میں کہا۔

”ہوں۔“ کوش نے ایک ہمکاری بھری اور نیچی آواز میں بولا۔ ”معاملہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم ایک تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور جب ہم ہی کچھ نہیں کر سکتے تو ان ہزاروں سے گلہ کیسا؟“

”آپ نے درست فرمایا معزز کوش!“ کنعان کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ رقص کرگئی۔ ”آپ ان لاکھوں انسانوں کے مذہبی پیشوا ہیں اور میں فوج کا ایک بڑا عہدیدار۔ ہم بادشاہ کا حکم ماننے کے لیے مجبور ہیں تو یہ بے چارے بے بس عوام جن کی اکثریت علم اور قوت کے مضمون سے بھی نا آشنا ہے، کیا کر سکتے ہیں۔ پچھلے کتنے انقلاب میں نے خاموشی سے دیکھے اور آپ نے سیکڑوں بداعتدالیوں سے نظریں چرائیں۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

”ہوں۔“ کوش نے اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ”جو کچھ اب تک ہوتا رہا وہ ناقابل برداشت تھا مگر نیا بادشاہ خرطیش بن کلکی سب سے زیادہ سفاک اور بے رحم ثابت ہوگا اور اس کا بھتیجا جو ابھی سے اقتدار کا طلبگار ہے، وہ اس سے بھی زیادہ۔“

”وہ تو ظاہر ہے۔ خرطیش نے اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتار کر حکومت حاصل کی ہے۔“ کنعان شاید کچھ آگے بھی کہتا مگر شور کی آواز نے ان تینوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

پھر یہی وہ وقت تھا جب نوجوان ساحر معدانوس بن دازمل نے انہیں مخاطب کیا اور بولا۔

”معزز عالم کوش اور معزز سپہ سالار کنعان! ان گھنٹیوں اور باجوں کا شور اس بات کی علامت ہے کہ بادشاہ کی سواری قصر سے برآمد ہوا چاہتی ہے۔“

دیکھتے ہی دیکھتے خرطیش بن کلکی کی سواری برآمد ہوئی۔ دستور کے مطابق کوش نے آگے بڑھ کر نعرہ لگایا۔ سپہ سالار فوج کنعان نے سلامی دی اور محافظ دستے نے اس سواری کو اپنے جلو میں لے لیا۔

آٹھ گھوڑوں کی اس سواری میں بادشاہ خرطیش کے ساتھ پندرہ سالہ شہزادی حوریا بنت خرطیش بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ مضبوط اور دراز قد، روشن آنکھوں اور ذہین چہرے والی یہ شہزادی دور ہی سے مردانہ دلیری کی مالکہ نظر آتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے زیورات کا استعمال بہت کم کیا تھا۔ اس کے شانے کشادہ تھے اور بیٹھنے کے انداز میں دلبری کے بجائے ایک وقار اور تمکنت نظر آتی تھی۔

غرضیکہ ہر نظر اسی پر مرکوز تھی۔ اس سواری کے عقب میں دوسری شاہی سواری تھی جس میں بادشاہ کی بھتیجی دلیقیہ بنت کوریش تھی۔ بوٹے سے نازک بدن اور خوبصورت چہرے والی شہزادی دلیقیہ عجوبہ روزگار تھی۔ اس کا جھلملاتا لباس اور قیمتی زیورات اس کے بے پناہ حسن میں چار چاند لگا رہے تھے۔ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا اور اس سواری کے ساتھ ساتھ آنے والی تیسری سواری میں بادشاہ کا بھتیجا ابراحس بن اتریب تھا۔

شاہی خاندان کے یہ چار افراد تھے اور ہزاروں کا جلوس تھا جو کشاں کشاں میدان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لوگ ٹولیوں میں بٹ کر باتیں کر رہے تھے اور نئے بادشاہ کے ساتھ ابھرتے سورج کی عبادت کے لیے میدان میں جمع ہو رہے تھے جہاں بادشاہ کو پہلی بار خطاب بھی کرنا تھا۔

☆☆☆

حضرت یوسف علیہ السلام سے پہلے قبطی حکمرانوں کی تاریخ بہت قدیم ہے اور ان کی حکومت کا زمانہ بھی بہت طویل گزرا ہے۔ سب سے پہلے انہی لوگوں نے اپنی حکومت اور

سکونت کے لیے مصر اور اطرافِ مصر کو پسند کیا تھا۔
قبطیوں کے بارے میں مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ حام بن نوح کی اولاد ہیں۔ یہ قبط بن حام بن نوح سے منسوب کیے جاتے ہیں اور انہوں نے مصر کو مستقل آباد کیا تھا۔ یہاں پر مدتوں ان کی حکومت رہی۔
سب سے پہلے یہاں بنصر بن حام سردار منتخب ہوا جس نے مرتے وقت سرداری اپنے بیٹے مصر بن بنصر کے حوالے کی۔ مصر بن بنصر نے اس علاقے کو یمن، عریش اور اہلیہ وفرسیہ تک پھیلایا جس کے باعث یہ تمام علاقے اس کے نام کی نسبت سے ''مصر'' کہلائے۔
مصر بن بنصر نے بڑی طویل عمر پائی اور ہر لمحہ حکومت کی وسعت میں صرف کیا۔ اس کے بعد اس کا فرزند قبط بن مصر بادشاہ بنا، پھر ارشمون بن مصر، پھر صاثم۔ یوں یکے بعد دیگرے سب اپنے اپنے طور پر اسے وسعت دیتے رہے۔
اس دوران یہاں کی حکمرانی عورتوں کے حصے میں بھی آئی۔ عورتوں کے دورِ حکومت میں عمالقہ بادشاہ سدوم نے حملہ کر کے ان کی حکومت ختم کی۔ اسی زمانے میں شداد بن مداد نے مصر کے علاقے پر فوج کشی کی اور قبضہ کر لیا جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے قبطیوں کو بہت بڑی طاقت استعمال کرنا پڑی تھی۔ اس وقت ہر حکمران حکومت کو استحکام دے کر نئے علاقے اور شہر آباد کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شہر اتریب، شہر یمن، عین شمس اور چند دوسرے علاقے آباد ہوئے تو سحر و طلسمات میں عبور رکھنے والوں نے جگہ جگہ جادو گھر بنائے پھر وقت کے ساتھ ساتھ سلطنت کو ترقی دینے کا مقصد بدلتا گیا۔
یہ سب کچھ ناموری اور عظمت حاصل کرنے کی خاطر کیا جانے لگا پھر عیش کے لیے عشرت کدے بنے۔ اس کے ساتھ ساتھ عقیدوں میں بھی فرق آنے لگا۔
جب ستاروں کی پرستش کرنے والا بادشاہ کلکی بن حربیا برسرِ اقتدار آیا تو عیش و عشرت کے سوا ہر مقصد ختم ہو گیا۔ اس کی غفلت کے سبب تمام اختیارات پر اس کا بھائی ابن حربیا قابض ہو گیا۔ یہ بات اس کے سخت گیر اور عیش پسند بیٹے خرطیش کو پسند نہ آئی تو اس نے ایک دن اپنے باپ کلکی بن حربیا کو جو نشے میں مدہوش تھا، قتل کر ڈالا اور تخت پر قبضہ کر لیا۔
اس وقت اس کام میں اس کا چالاک بھتیجا ابراحس بھی شریک تھا جو اس سے زیادہ اقتدار کا متوالا، حسن پرست، پکا شرابی اور عیش کوش تھا۔ شہزادی ولیقیہ اسے بھائی تھی مگر خرطیش کا ولی عہد بننے کے لیے وہ شہزادی حوریا کو بھی اپنا لینا چاہتا تھا۔ اس وقت خرطیش سے اس کا یہی معاہدہ ہوا تھا کہ وہ شہزادی حوریا سے شادی کر کے خرطیش کے بعد اقتدار سنبھالے گا۔
میدان میں پہنچ کر سب سے پہلے خرطیش نے اپنی عبادت کی اور مصریوں نے اس کی پیروی کی پھر تمام اراکین سلطنت اور علماء نے اپنی اپنی نشستیں سنبھالیں۔ بعد ازاں مصری دوشیزاؤں نے دستور کے مطابق بادشاہ کی سلامتی کے لیے دعائیہ گیت گائے جنہیں سب نے بے حد احترام سے سنا۔ اب بادشاہ کے اشارے پر مذہبی عالم کوش کھڑا ہوا اور اہلِ مصر سے مخاطب ہو کر بولا۔
''عظیم قبطیو! سب سے پہلے میں تمہیں نئی حکومت کی مبارکباد دیتا ہوں پھر مقدس آفتاب سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس حکومت کو استحکام و پائیداری عطا کرے اور ہمارے بادشاہ کو وہ جرأت و ہمت عطا فرمائے جو ہمارے قدیم سرداروں میں تھی۔''
اس جملے نے بیشتر حاضرین کو متاثر کیا۔ انہوں نے تالیاں بجائیں۔ معزز کوش نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے کہا۔
''قبطیو! تم ایک عظیم قوم ہو اور تمہاری نسل بہت پرانی ہے۔ تم حام بن نوح کی اولاد ہو۔ نوح کے طوفان میں یہ دنیا برباد ہو گئی تھی۔ تب نوح کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث سے دوبارہ دنیا آباد ہوئی اور ساری مخلوق نے جنم لیا۔ تمہارا جدِاعلیٰ حام بن نوح ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ دنیا کی حکومت اور جاہ و جلال کے سب سے بڑے مالک تم ہو۔ میرے بچو! اس ملکیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگو اور محض عیش و عشرت کا شکار ہو کر رہ جاؤ۔ سورج دیوتا نے جو عزت اور عظمت تمہیں عطا کی ہے، اس کا صحیح استعمال کرو اور دنیا پر ثابت کر دو کہ تم ایک عظیم قوم ہو۔ سورج دیوتا کے پرستارو! میری عمر کا بیشتر حصہ حصولِ علم میں صرف ہوا ہے۔ علم میں نے کتابوں سے بھی حاصل کیا ہے، انسانوں سے بھی، حالات و واقعات سے بھی اور وقت سے بھی اور پوری ایک صدی کے واقعات مجھے یاد ہیں۔'' وہ ایک ذرا رکا اور پھر کہنا شروع ہوا۔
''بچو! اس کے ساتھ ہی میرا سب سے بڑا تجربہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی عقل صحیح کاموں میں استعمال کرتا ہے، اس کی عقل میں کبھی فتور نہیں آتا۔ لہٰذا اپنے تجربے کی روشنی میں، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی عقل، اپنی نظر اور

اپنی قوت کا صحیح استعمال کرو اور خود کو ضائع مت کرو ورنہ وقت تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔‘‘

معزز کوش کی تقریر مختصر مگر جامع اور صداقت سے بھرپور تھی۔ اس کا ہر لفظ سامعین کے دل میں اتر گیا تھا۔ لہٰذا دیر تک تالیوں کا بم بج ابھرتا رہا پھر بادشاہ خرطیش نے تقریر کے لیے اٹھنا چاہا تو شور کا انداز بدل گیا۔

اس کے چاہنے والے اٹھ اٹھ کر نعرے لگانے لگے۔ چند لمحے اسی ہنگامے کی نذر ہوئے۔ جب خرطیش نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا تو خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھنے لگے یہاں تک کہ سکوت چھا گیا۔ تب اس نے کہا۔

’’عظیم حام بن نوح کے فرزندو! جو کچھ معزز کوش نے فرمایا، تم سب نے سنا۔ مقدس دیوتا کی قسم! اس سے بڑی نصیحت کوئی انسان کسی انسان کو نہیں کرسکتا۔ ہم دیوتاؤں کے شکرگزار ہیں کہ ان کی عنایت سے کوش جیسا عظیم اور معزز انسان ہم میں موجود ہے۔ ان کے پند و نصائح کے بعد ہمارے پاس تمہارے لیے کوئی نصیحت نہیں ہے بجز اس کے کہ تم ان کے علم سے فیض حاصل کرو۔ ہم اپنی طرف سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں نہ حکومت کا شوق ہے نہ ہم اقتدار کے بھوکے ہیں۔ ہم عرصہ دراز سے حاکموں کی غفلت دیکھ رہے تھے۔ صرف تم لوگوں کی بھلائی کے لیے تخت و تاج سنبھالنے پر مجبور ہوئے۔ اب ہم تمہیں یہ بتانے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ ہم نہ عیش کو برداشت کریں گے نہ وقت کا زیاں چاہیں گے بلکہ ہم مسلسل اپنے علاقے کو وسعت دیں گے اور فوج کو مضبوط بنائیں گے۔ اس کام میں تم بھی ہمارا ساتھ دو اور یکجہتی کے ساتھ ایک دوسرے کی بھلائی کی کوشش کرو۔‘‘

یہ تقریر سن کر مجمعے میں نعرہ ہائے تحسین کا شور بلند ہوا۔ ان کے ذہنوں نے بھی بادشاہ کی اس بات کو قبول کیا۔ خرطیش بن حربیا نے اطمینان سے ان سب کو دیکھا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے بولا۔

’’اب میں چند خدمات مناسب افراد کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ جو لوگ جس عہدے پر فائز ہیں، وہ بدستور بحال رہیں گے۔ ان کے علاوہ میں نوجوان معدانوس بن دازمل کو طلسم خانے کا داروغہ مقرر کرتا ہوں اور ان کے سحر اور علم نجوم سے توقع کرتا ہوں کہ وہ مقدس طلسم خانے میں رہ کر اہلِ مصر کو مستقبل میں پیش آنے والے شر و فساد سے بچانے کی تدابیر کریں کیونکہ وہ ایسا سحر جانتے ہیں جن سے بے جان مجسموں اور تصویروں میں جان ڈال کر مستقبل کے بارے میں دریافت کیا جاسکتا ہے۔‘‘

اس عنایت پر نوجوان جادوگر معدانوس کھڑا ہوا اور جھک کر بادشاہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔

’’عالی قدر بادشاہ! غلام اپنا فرض پوری ذمے داری سے ادا کرنے اور وفادار رہنے کا عہد کرتا ہے۔‘‘

سب نے دیکھا، بڑی بڑی ذہانت سے پُر آنکھوں والا یہ جوان پیشانی پر سیاہ رومال باندھے، کانوں میں سونے کی بالیاں پہنے دور ہی سے علم سحر کا ماہر نظر آرہا تھا۔ اس کا قد دراز، چہرہ خوبصورت اور لب و لہجے سے پختگی اور اعتماد عیاں تھا۔

اس وقت بڑے بڑے معمر نجومی نوجوان ساحر کے داروغہ بن جانے کو اپنی توہین محسوس کررہے تھے مگر سب جانتے تھے کہ معدانوس نے اپنا ہر لمحہ عظیم کوش کی صحبت میں رہ کر علم حاصل کیا ہے اور ایسا منتر ایجاد کرچکا ہے جو بے جان مجسموں میں جان ڈال دیتا ہے لہٰذا وہ اس عزت کا مستحق تھا۔ معدانوس شکریہ ادا کرکے بیٹھا تو بادشاہ نے کہا۔

’’اب ہم نوجوان ایمین بن ولید کو بیرونی علاقوں میں پیغام بری کا ذمے دار بناتے ہیں۔ پہلے یہ خدمت معزز ولید بن داریم انجام دیتے تھے اور جس خوبصورتی سے برسوں انہوں نے یہ فرض ادا کیا، ہم سب اس کے معترف ہیں مگر اب وہ دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ ان کی کمی اب ایمین بن ولید ہی پوری کرسکتا ہے۔‘‘

اس اعلان کے ساتھ ہی مجمعے نے دیکھا کہ دراز بالوں والا ایک نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں سمندروں جیسی گہرائی و گیرائی پائی جاتی تھی اور چہرے پر چٹانوں جیسی سختی تھی۔ اس نوجوان نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ بادشاہ خرطیش نے ایک اور اعلان کیا۔

’’اب ہم اپنے برادر زادے ابراحس بن اتریب کے بارے میں وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی دلیری کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم انہیں شاہی فوج کا سپہ سالار اعلیٰ مقرر کرتے ہیں۔‘‘

اس اعلان پر ابراحس کے حامی اور بادشاہ کے خوشامدیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اس گونج میں سب نے دیکھا کہ گندمی رنگت، قدرے فربہ جسم اور تیز آنکھوں والا جوان کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں کی گردش حسن پسندی اور نشست و برخاست کا انداز عیش کوشی کی گواہی دے رہا تھا۔

اس وقت مجمعے میں سے اکثریت نے کنعان کی طرف دیکھا جو فوج کا اعلیٰ افسر اور برسوں سے اس خدمت پر مامور تھا۔ آج بادشاہ نے اسے معزول تو نہیں کیا تھا مگر نوجوان ابراحس کو شاہی فوج کا افسرِ اعلیٰ بنا کر اس پر فوقیت ضرور دے دی تھی لیکن لوگوں کی توقع کے برخلاف کنعان کے رخ پر نہ تو حیرت تھی اور نہ ہی ناپسندیدگی۔

وہ بڑے سکون سے اپنی نشست پر بیٹھا ہوا بادشاہ کے احکامات سن رہا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ نے چند لوگوں کو ان کی بہترین کارکردگی پر ترقی اور انعامات سے نوازا اور کچھ کو نئی ہدایات دیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مجمع جس جوش و خروش سے جمع ہوا تھا، اسی طرح آج کی تقریب پر اظہارِ خیال کرتا ہوا رخصت ہوگیا۔

اس شب ابراحس بن اتریب کی خاص نشست گاہ میں اس کا مصاحب ایمین بن ولید بادشاہ کی عنایات کو سراہتے ہوئے محوِ گفتگو تھا۔ اس نے مجمعِ عام میں تو بس بادشاہ کا شکریہ ادا کیا تھا مگر اس وقت باقاعدہ وفاداری کا عہد کرتے ہوئے ابراحس بن اتریب سے کہہ رہا تھا۔

''شہزادہ عالی! میں عرصے سے آپ کا مصاحب ہوں اور اب یہ عظیم عہدہ ملنے کے بعد عہد کرتا ہوں کہ تاحیات وفاداری سے منہ نہیں موڑوں گا۔''

ان الفاظ پر ابراحس مسکرا دیا پھر کچھ سوچنے کے بعد بولا۔

''آج معدانوس ہمارے ساتھ نہیں آیا جبکہ عموماً وہ ہمارے ساتھ رہتا تھا۔''

ایمین نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''حضور! معدانوس آپ کا مصاحب اور دوست ضرور ہے مگر دراصل ابتدا ہی سے اس کی وفاداریاں بادشاہ کے ساتھ ہیں۔ مجمعِ عام میں آپ نے غور نہیں فرمایا کہ اس نے صرف بادشاہ کا وفادار رہنے کا عہد کیا اور یوں بھی عموماً وہ آپ کے خیالات سے متفق نہیں ہے۔ ہمیشہ محفل عیش و طرب پر تنقید کرتا ہے۔''

''ہوں......'' ابراحس نے گہری اور پرسوچ ہنکاری بھری اور بولا۔ ''یہ بات ہم نے ہمیشہ محسوس کی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ معزز عالم کوش کا خاص شاگرد ہے جو علمِ نجوم اور سحر کے ماہر ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے۔''

''ہاں، آپ کی یہ بات بھی درست ہے۔'' ایمین نے صفائی سے کام لیا۔ ''معدانوس نے وہ منتر ایجاد کیا ہے جو بے جان تصویروں اور مجسموں میں جان ڈال کر انہیں توانائی اور قوت بخش دیتا ہے۔ اس لیے اسے تنہائی کی بھی ضرورت ہے تاکہ غور و فکر اور مطالعہ کر سکے پھر بھی اسے آپ کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے تھا اور......''

ابراحس نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی۔ ''خواہ ہمیں معدانوس جیسے علم دوست اور صاحب عمل دوست کو چھوڑنا ہی کیوں نہ پڑے مگر ہم اپنی محفلوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔''

اس جملے پر ایمین ہنس دیا اور بولا۔ ''اور ایمین بن ولید آپ سے وفاداری کا عہد کر چکا ہے۔ وہ ہر محفل اور ہر حالت میں حضور کا ساتھ دے گا۔'' ابراحس یہ بات سن کر ہنس دیا اور رازداری کے انداز میں بولا۔

''اگر وفادار رہنے کا عہد کرتے ہو تو پھر کچھ کر کے دکھاؤ۔ تم نے کہا تھا نا کہ کنعانیوں کی فوج کا سپہ سالار جیرون دور دراز کے مال کی خبر رکھتا ہے؟''

''شہزادے!'' ایمین نے ادب سے کہا۔ ''غلام کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ اس عہدے کا کچھ تو فائدہ حاصل کرنا چاہیے اور اس کا بڑا فائدہ یہی ہوگا کہ دور دراز کے علاقوں کا ہی نہیں، دور دور کے ملکوں کا مال بھی آپ کو ملے گا۔ آپ مطمئن رہیے۔ جیرون اس کام کا ماہر ہے۔''

ادھر ایک مصاحب شہزادے سے عہدِ وفا باندھ رہا تھا ادھر دور، بہت دور دوسرا مصاحب طلسم خانے کی عجوبہ روزگار عمارت میں بیٹھ کر ہزاروں مجسموں اور مورتیوں کی موجودگی کے باوجود ایک مورت کے تصور میں گم تھا۔

یہ تھا معدانوس بن دازل جو چشمِ تصور سے شہزادی حوریا کو دیکھتے ہوئے کچھ عجیب بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ مردانہ عزم و ہمت کی مالک خوبصورت شہزادی ایک لمحے، ایک ساعت میں اس کی سب کچھ ہوگئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ عشق بھی ہوا تو کس سے جس سے اظہار بھی ممکن نہیں۔ کہاں اس طلسم خانے کا داروغہ اور کہاں ایک شہزادی، بادشاہ کی اکلوتی بیٹی، تخت و تاج کی مالکہ حوریا بنت خرلیش جو محبت کے جذبے پر یقین ہی نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ ستارے ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ چاند نے شہ سوارِ مشرق کی آمد کے خیال سے رختِ سفر باندھ لیا تھا۔ نسیم سحری سرگوشیوں میں پیغامِ صبح سنا رہی تھی اور یہ تمام آثارِ سحر انسانوں سے زیادہ ان مخلوقات کو متاثر کر رہے تھے جو نہ قوتِ گویائی رکھتے تھے، نہ عقلِ سلیم مگر پھر بھی اس سہانے وقت نغمہ سنج تھے۔

یوں صبح یہ وقت ہر روز آتا۔ ایسے میں مخمورانِ بادہ نشاط تو خوابِ غفلت کے مزے لیتے لیکن عیش و عشرت کے

اس ماحول میں وہ ہستیاں ایسی بھی تھیں جو وقت کے تغیر سے مزہ لیتیں۔ طیورانِ خوش نوا کے نغمے سننا اور انہیں خود معنی عطا کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

یہ تھیں ہم عمر، ہم ذوق شہزادیاں جو چچازاد بہنیں کم اور دوست زیادہ تھیں۔ شہزادی حوریا اور شہزادی ولیقیہ...... ایک کھری اور صاف گو، دلیر اور جرأت مند لڑکی۔ دوسری شاعرانہ مزاج اور دھیمے لہجے میں بولنے والی سلجھی ہوئی دوشیزہ۔

غرضیکہ دونوں شہزادیاں مختلف فطرت رکھتے ہوئے بھی آپس میں بہترین دوست تھیں۔ دونوں عموماً سحر خیزی سے لطف اندوز ہونے چمن میں آجاتی تھیں لیکن آج صرف ولیقیہ ہی چہل قدمی میں مصروف نظر آرہی تھی۔

وہ چمن کے دوسرے گوشے کی طرف بڑھتی اور پلٹ آتی۔ یہ انداز انتظار کی غمازی کررہا تھا۔ اسے انتظار تھا شہزادی حوریا کا مگر وقت گزرتا رہا اور وہ نہ آئی۔

اس وقت ولیقیہ کا مختصر لباس اور درمیانہ قد صبح کے لباس میں بڑا جاذب نظر لگ رہا تھا۔ دراز گیسو پشت پر پھیلے ہوئے تھے، صبح کی تازگی حسن کی رعنائیوں میں اضافہ کررہی تھی۔ وہ حوریا کے نہ آنے کی جھلاہٹ سے بچنے کے لیے کچھ گنگناتی ہوئی ٹہل رہی تھی۔

اب صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی اور شاہی محل کی عمارات صاف نظر آنے لگیں۔ اس محل کے ساتھ ہی دوسرا محل شہزادہ ابراحس بن اتریب کا تھا۔ ان دونوں کے عقبی چمن یوں ملے تھے کہ درمیانی باڑھ ہٹا کر محل کے مکین دوسری طرف جاسکتے تھے۔ اکثر رات کو وہ اسی طرح شہزادہ ابراحس سے ملنے جاتی تھی لیکن صبح چونکہ شہزادی حوریا کے ساتھ ہوتی اس لیے وہ ابراحس کے محل میں عقبی چمن سے نہ جاتی تھی۔ ویسے بھی ابراحس دیر تک سونے کا عادی تھا لہٰذا صبح کے وقت ملاقات ممکن نہ تھی۔

اس وقت وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے رخ پر مدھم مدھم مسکراہٹ اور ابراحس کے محل کی جانب دیکھ کر کچھ سوچنا ان جذبات کی غمازی کررہے تھے جو اس کے دل میں شہزادے کے لیے تھے۔ انہی جذبات سے مغلوب وہ ٹہلتے ٹہلتے روش کے اس کنارے پر پہنچی جدھر شہزادے کے محل کے چمن کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ موڑ پر پہنچ کر وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ اسے کسی کی موجودگی کے احساس نے چونکا دیا۔ اچانک ہی شہزادہ ابراحس اس کے سامنے آگیا اور اسے دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''کیسی رہی؟''

''گویا کہ آپ ہمیں ڈرانا چاہتے تھے؟'' شہزادی ولیقیہ نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' ابراحس برجستہ بولا۔ ''ہم ایسی گستاخی تو نہیں کرسکتے۔ بس ذرا شہزادی کی ہمت آزما رہے تھے۔''

''تو اس آزمائش میں آپ نے ہمیں کیسا پایا؟'' ولیقیہ نے جلدی سے پوچھا۔

''جو ہم چاہتے ہیں، آپ وہی ثابت ہوئیں۔'' شہزادہ ابراحس بولا۔ ''یعنی کہ گھوڑا دوڑانے اور تلوار چلانے والی شہزادی بھی کسی نرم ونازک لڑکی کی طرح سہم بھی جائے اور ہم اسے یوں چمٹالیں۔'' کہتے کہتے ابراحس نے اس کے مختصر سے وجود کو بانہوں میں کس لیا اور وہ سمٹ گئی۔ چند لمحے اسی بےخودی کی نذر ہوگئے پھر ولیقیہ اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے بولی۔

''آج اتنی صبح کیسے بیدار ہوگئے؟''

''آج ہمیں الہام ہوا تھا کہ آفتاب پر کوئی بادل نہیں ہے لہٰذا ہم طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے نکل آئے۔''

شہزادی ولیقیہ جھینپ سی گئی اور بولی۔ ''واقعی آپ گفتار کے بھی غازی ہیں مگر یہ بتایئے کہ آفتاب پر بادل سے کیا مراد ہے؟''

''آپ اغماض نہ برتیے۔'' ابراحس بولا۔ ''جب بھی آپ چمن میں آتی ہیں، شہزادی حوریا آپ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ایسے میں ہم بےتکلفانہ نہیں مل سکتے۔''

''کیوں؟'' ولیقیہ نے کہا۔ ''وہ کوئی معمر تو نہیں۔ ہماری ہم عمر ہیں اور پھر علم ودانش اور برجستہ گوئی میں بھی ہم سے بڑھ کر ہیں۔ ان میں اور ہم میں ایک ہی تو فرق ہے کہ وہ بادشاہ کی دختر اور تاج وتخت کی وارث ہیں لیکن وہ تو بعد کی بات ہے اس وقت تو......''

مگر ولیقیہ کی بات مکمل نہ ہوپائی کیونکہ اس وقت شہزادہ ابراحس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ نہ جانے اشتعال سے یا حسد سے۔ چند لمحے وہ خود کو سنبھالتا رہا پھر بولا۔

''شہزادی ولیقیہ! کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم ملکہ بنو اور میں تاج وتخت کا حق دار؟''

''اس کے بغیر ہم مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔'' ولیقیہ نے کہا۔ ''میرے لیے ملکہ بننے سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ میرے ہیں۔''

''اوہو۔'' ابراحس اس کی یہ بات سن کر جھنجلا گیا اور بولا۔ ''تم محبت کی اس قدر دیوانی کیوں ہو آخر؟ اس کے علاوہ بھی تو زندگی میں بہت کچھ ہے۔ کیا تمہارے خیال میں

تاج وتخت کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟"

"میں تو اسے کچھ سمجھتی ہی نہیں، نہ ان امور میں حصہ لینا چاہتی ہوں۔" ولیقیہ نے معصومیت سے جواب دیا۔ تب ہی شہزادہ ابراحس کے رخ پر ناگواری آگئی۔ اسی لہجے میں بولا۔

"شہزادی ولیقیہ! میں تاج وتخت حاصل کروں گا اور تم ملکہ بنو گی لہٰذا خود کو ابھی سے اس انداز میں ڈھالنا شروع کردو۔"

"مگر تخت کی وارث تو......"

"تخت کی وارث حوریا بنت خرطیش ہے۔ اتنا ہی حق دار ابراحس بن اتریب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرا باپ میرے بچپن ہی میں مرگیا اور شہزادی حوریا بنت خرطیش کا باپ زندہ ہے اور بادشاہ ہے۔" ابراحس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو ولیقیہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

اس کے دل کی بات اسے آج معلوم ہوئی تھی۔ چند لمحے وہ تعجب سے دیکھتی رہی۔ غالباً ابراحس بھی اس بدلتی ہوئی سوچ کو بھانپ گیا اور جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔

"ولیقیہ! اپنا حق حاصل کرنے کا اختیار ہمیں بھی ہے۔ تم ہمیں صرف گفتار کا غازی سمجھتی ہو، اس کے علاوہ بھی کچھ جانتی ہو؟"

ولیقیہ نے اطمینان سے اسے دیکھا۔ اپنے سینے میں پیدا ہونے والے بے شمار خدشات کو دبایا اور بولی۔

"تمام لوگ یہی کہتے ہیں کہ آپ عیش پسند اور مجلسی شہزادے ہیں۔"

"عیش وعشرت تو سب ہی حکمران کرتے ہیں۔" شہزادے نے اسے ایک بار پھر بانہوں میں کس لیا اور بولتا رہا۔ "محفلیں وقت گزارنے کے لیے ہی تو سجاتے ہیں۔ جس دن ولیقیہ اور مصر کی حکومت ہمیں مل جائے گی، ہم سب کچھ چھوڑ دیں گے۔"

پھر دیر تک وہ گم رہے۔ صبح کی روشنی پھیلنے لگی تو انہیں ہوش آیا تب ہی ولیقیہ بولی۔

"اب ہمیں جانے دیجیے۔ کنیزیں ہمیں تلاش کرتی ہوئی ادھر آئیں تو کیا کہیں گی۔"

"کہیں گی کہ مستقبل کے شاہ اور ملکہ محبت کررہے ہیں۔" ابراحس نے مذاق کیا تو ولیقیہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ اس کا ذہن شہزادی حوریا بنت خرطیش کے تصور سے پاک تھا اور اس دوپہر شہزادی حوریا بنت خرطیش کی صحبت میں بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے بالکل ہی اس خیال کو فراموش کر بیٹھی۔ تب ہی شہزادی حوریا نے کہا۔

"آج ہم بہت دیر سے بیدار ہوئے اور صبح کی سیر میں تمہارا ساتھ نہ دے سکے۔"

"ہوں......ہم دیر تک چمن میں آپ کا انتظار کرتے رہے۔" ولیقیہ نے کہا۔ "پھر شہزادہ ابراحس آگئے۔"

"اوہو۔" حوریا مذاق کے انداز میں ہنس دی۔ "پھر اچھا ہی ہوا کہ ہم تمہارے ساتھ نہ تھے۔ سنا ہے دو محبت کرنے والے کسی تیسرے کو برداشت نہیں کرسکتے۔"

اس لمحے ولیقیہ کا چہرہ گلابی ہوگیا۔ حوریا نے اسے تعجب سے دیکھا اور سوچا۔ 'محبت پر ایمان لے آنے والی لڑکیاں کس قدر سادہ لوح ہوتی ہیں۔'

ولیقیہ نے دھیرے سے کہا۔

"آپ محبت پر یقین نہیں رکھتیں جب ہی تو ایسا سوچتی ہیں ورنہ یقین مانیے محبت کرنے والے بہت بڑے دل کے مالک ہوتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی حوریا شرارت پر اتر آئی اور بولی۔

"ولیقیہ! کیا تم بہت بڑے دل کی مالک ہو؟"

"کبھی آزما دیکھیے۔" ولیقیہ نے برجستہ کہا۔

"ہم تو تمہیں جانتے ہیں مگر تم سے کوئی اگر شہزادہ ابراحس کو مانگے تو تم سخاوت کا مظاہرہ کروگی؟"

ولیقیہ چونک گئی پھر دھیرے سے بولی۔ "یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

حوریا قہقہہ مار کر ہنسی اور بولی۔ "اپنی سب سے بڑی دولت کو دینے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں جاتا اور بڑے دل کی مالک بن رہی ہو۔ اچھا ذرا سوچ کر دیکھو کہ شہزادہ ابراحس کسی اور کو دے سکتی ہو؟"

"آپ محبت کیجیے تو جان جائیں گی کہ عورت جس مرد سے محبت کرتی ہے، اسے کسی اور کے سپرد نہیں کرسکتی۔"

"ہم محبت کے قائل ہی نہیں۔" شہزادی حوریا مسکرادی۔ "اور یاد رکھنا، محبت کا دوسرا نام غرض ہے۔ انسان کو جب بھی محبوب سے زیادہ فائدہ مند اور بہتر ہستی نظر آجاتی ہے تو محبت کے دعوے کرنے والا یہ انسان اپنی سوچ کا مرکز بدلنے میں ذرا بھی دیر نہیں کرتا۔"

ولیقیہ نے یہ بات بہت غور سے سنی اور جیسے فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"میں تو دنیا کی تمام نعمتیں دے کر بھی شہزادہ ابراحس کو کسی اور کے حوالے نہ کروں۔" یہ کہتے کہتے اس کی حالت کیا ہوئی، اس کا اندازہ کرنے میں حوریا کو مطلق دیر نہ لگی۔ اس نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی۔

''تم واقعی ایک محبت کرنے والی لڑکی ہو۔'' پھر ایک دم سے بات بدل کر بولی۔ ''سنا ہے طلسم خانے کے داروغہ معدانوس نے کوئی خاص مورتی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ طلسم خانہ ضرور دیکھیں اور معزز معدانوس سے ملیں۔ کیا تم بھی ایسا محسوس کرتی ہو؟''

''ہاں۔'' شہزادی ولیقیہ نے جلدی سے کہا۔ ''ہم بھی طلسم خانہ دیکھنا اور بے جان مورتیوں سے مستقبل کا حال معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ معدانوس کی سحر اور عمل کی قوت نے اہلِ مصر کو مرعوب کر رکھا ہے اور جب سے انہوں نے نیا منتر ایجاد کیا ہے، تب سے تو ان کی شہرت بلندیوں کو چھو رہی ہے۔'' یہ کہتے کہتے ولیقیہ کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ مسکرادی اور بولی۔ ''مگر ایک بات سے ڈر لگتا ہے۔ اگر آپ طلسم خانے تشریف لے گئیں اور نوجوان ساحر آپ کے حسن سے مسحور ہو گیا تو؟''

اس بار حوریا کھلکھلا کر ہنس دی اور بولی۔ ''اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوئی اور نوجوان ساحر ولیقیہ بنت کوریش کے حسن سے مسحور ہو گیا تو شہزادہ ابراحس کیا کریں گے؟''

جملہ دلچسپ تھا لہٰذا ولیقیہ بھی ہنس دی۔ نہ جانے کون سی سوچ اسے گلنار کیے دے رہی تھی اور وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔ بڑی بڑی مخمور آنکھوں میں شوخی تھی۔ بھرے بھرے عارض، خفیف سا زنخداں اس کے حسن میں جاذبیت پیدا کر رہے تھے۔ اس نے بڑے فخر و غرور اور بڑے ہی اعتماد سے کہا۔

''جس طرح میں شہزادہ ابراحس کو کسی کے حوالے نہیں کر سکتی، اسی طرح وہ بھی اپنی محبت کے درمیان کسی کو برداشت نہیں کریں گے۔''

حوریا نے محبت اور محبوب پر اس قدر اعتماد کے انداز کو تعجب سے دیکھا اور مسکرادی۔ شاید اس وقت کچھ کہنا یا محبت کی مخالفت کرنا اسے پسند نہ تھا لہٰذا اس نے بات بدلی اور کہا۔

''بہرحال، طلسم خانہ تو ہم بعد میں دیکھیں گے، آج تو ہم نے ایک اور چیز دیکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''کیا؟'' ولیقیہ نے اسے معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا دیکھ کر سوال کیا۔ یوں موضوع بدلنا اور حوریا کا ایک خاص انداز سے مسکرانا توجہ طلب تھا۔ اس نے کہا۔

''ضرور کوئی خاص بات ہے۔ کیا ہمیں نہیں بتائیں گی کہ وہ کیا چیز ہے؟''

حوریا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ ''محفل رقص و سرود۔ سنا ہے آج شب یہ محفل گرم ہوگی۔''

''مگر آپ اسے کہاں سے دیکھیں گی؟'' ولیقیہ نے تعجب سے پوچھا۔ ''شاہی خاندان کی عورتوں کو مردوں کی اس محفل میں شرکت کرنے کی اجازت کب ہے؟''

''بالائی منزل کے ان کمروں سے جن کی بلند کھڑکیاں نیچے ہال میں کھلتی ہیں۔'' حوریا نے معنی خیز اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

☆☆☆

یوں اسی شب بادشاہ خرطیش طویل و عریض ہال میں حسینانِ مصر کے درمیان بیٹھا شراب کے نشے میں شباب کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اس محفل میں شہزادہ ابراحس بھی موجود تھا اور ایمین بھی، بادشاہ کے مصاحب بھی تھے اور شہزادے کے خوشامدی مصاحب بھی اور یہ سب مبالغہ آمیز تعریف کر کے بادشاہ کے نفس کو اور بڑھا رہے تھے۔

عیش و عشرت کے لیے مختص اس ہال کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ بالائی منزل میں چاروں طرف کے کمروں کی اونچی کھڑکیاں اسی ہال میں کھلتی تھیں اور جب یہ سب کھول دی جاتیں تو اس ہال کی گنجائش چوگنی نظر آتی۔ یہاں ہر بادشاہ محفل عیش و طرب ہی منعقد کرتا تھا اور اس زمانے میں شاہی خاندان کی خواتین کے لیے ان محفلوں میں شرکت پر پابندی تھی کیونکہ یہی وہ جگہ ہوتی تھی جہاں باپ بیٹے، چچا بھتیجے اور بھائی بھائی رشتوں اور عمروں کو فراموش کر دیتے تھے۔

اس وقت مصر کی بہترین رقاصائیں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور مصر کے یہ معززین اپنی حیثیت، اپنے مذہب اور عمروں کو بھلا کر محفل میں شریک تھے۔ ان کی بھوکی اور ننگی نظریں رقاصاؤں کے جسموں کو ٹٹول رہی تھیں۔ گھنگروؤں کی آواز، واہ واہ کا شور اور ہائے ہائے کی صدائیں فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں اور ہال کی روشنیوں کے طوفان میں یہ رقاصائیں امیروں اور رئیسوں کی بے تابی دیکھ دیکھ کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ایک ناچنے والی اپنے سر پر شراب سے بھرا جام رکھ کر رقص کر رہی تھی۔ اس کے فن کا یہ انداز سب کے لیے بڑا انوکھا تھا۔ شہزادہ ابراحس جیسے دیوانہ ہو گیا۔ وہ بولا۔ ''مقدس معبود کی قسم! آج سے قبل ایسا رقص ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔''

بادشاہ خرطیش نے بھتیجے کی جانب دیکھا اور فخر سے بولا۔ ”مابدولت نے مصر کی بہترین رقاصاؤں کو محض تمہارے لیے طلب کیا ہے ورنہ تم جانتے ہو کہ مابدولت عیش وعشرت پسند نہیں کرتے۔“

”عالی جاہ!“ ایمین نے خوشامد اور چاپلوسی کے انداز میں کہا۔ ”اتنا اعلیٰ ذوق حضور کے سوا بھلا کس کا ہو سکتا ہے؟“

ادھر یہ گفتگو جاری تھی ادھر رقاصہ ناچ رہی تھی۔ وہ ہر امیر کے سامنے یوں جھکتی جیسے یہ جام اسی کے لیے ہے مگر جب وہ جام کی طرف ہاتھ بڑھاتا، رقاصہ سیدھی ہو کر دوسرے کی طرف بڑھ جاتی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ لبریز جام ذرا بھی نہ چھلکتا تھا۔ دوسری ناچنے والیاں اس رقاصہ کو حد درجہ رشک کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں کیونکہ کسی کی توجہ ان کی طرف نہیں تھی۔ سب ہی اس بجلی کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت بادشاہ خرطیش کے لبوں پر معنی خیز تبسم اور نظروں میں ایک خاص تحریر تھی اور شاید رقاصہ نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔

اب یوں رقاصہ نے بھی رقص میں اور تیزی کے ساتھ چابکدستی پیدا کی اور بادشاہ کی طرف بڑھی تو وہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا۔ پھر جونہی رقاصہ اپنے مخصوص انداز میں اس کے روبرو جھکی، بادشاہ نے جام کو شرفِ قبولیت بخشنے کے بجائے رقاصہ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا پھر جیسے دیوانہ ہو گیا اور چلایا۔

”تخلیہ...... تخلیہ......“

یہ سنتے ہی امراء ورؤسا تیزی سے باہر نکلنے لگے۔ ناچنے والیاں ہال کے دروازوں کی طرف دوڑیں۔ سازندوں نے اپنے ساز اٹھائے اور شہزادہ ابراحس بھی اپنے مصاحبوں کے سہارے لڑکھڑاتے قدموں سے ہال سے نکل گیا۔

بالائی منزل کے ایک تاریک کمرے میں پردے کے پیچھے بیٹھی شہزادیوں نے انگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ یہ وہی منظر تھا جسے دیکھ کر بادشاہ خرطیش نے اپنے باپ کلکی بن حریا کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دونوں شہزادیوں نے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی سے ہٹ گئیں۔

☆☆☆

اس طلسم خانے میں ہر دور کے مصر کا سب سے بڑا ساحر اور کسی بہترین منتر کی ایجاد کا مالک داروغہ مقرر کیا جاتا تھا۔ وسط شہر میں جادو کا یہ گھر واقعی عجوبۂ روزگار تھا۔ دور سے یہ ایک گنبد نظر آتا تھا۔ اس کے چاروں جانب گولائی میں بلند اور کشادہ سیڑھیاں تھیں جو دور سے بے حد خوشنما نظر آتی تھیں۔

دونوں شہزادیوں کو شاہی محافظ اور خدمت گار اسی طلسم خانے کی عمارت کی طرف لے جارہے تھے جس کے دروازے پر سیاہ لباس میں ملبوس چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں کا ہار پہنے نوجوان ساحر معدانوس کھڑا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ استقبال کے لیے چند قدم آگے بڑھا اور سر کو قدرے جھکا کر بولا۔

”غلام معزز شہزادیوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔“

اس کے جواب میں شہزادی حوریا اور شہزادی دلیقیہ نے خوشی کا اظہار کیا اور بولیں۔

”ہم عظیم منتر کے موجد اور مصر کے مایہ ناز ساحر کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔“

اس وقت معدانوس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے نظر اٹھا کر شہزادی حوریا کو دیکھا۔ اس کے حسین چہرے پر جرأت اور دلیری کی چھاپ نظر آرہی تھی۔ شہزادی ہوتے ہوئے بھی اس نے معمولی ساز یور استعمال کیا تھا۔ معدانوس نے سوچا یہ ایک غیر معمولی شخصیت کی مالک ہے۔ تب ہی نہ جانے پاسِ ادب یا رعبِ حسن سے اس نے نظریں جھکالیں۔ اسی وقت شہزادی دلیقیہ نے اسے دیکھا اور بولی۔

”معزز معدانوس! اس عجائب گھر کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں گے؟“

”کیا عزت مآب شہزادیوں نے پہلی بار طلسم خانے کو عزت بخشی ہے؟“ معدانوس نے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ شہزادی حوریا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم یہاں پہلی بار آئے ہیں۔“

”یہ میری خوش نصیبی ہے کہ حضور اس سحر خانے میں تشریف لائیں۔“ معدانوس نے کہا۔ ”تشریف لایئے۔ غلام آپ کو ایک ایک چیز دکھائے گا۔“

شہزادی نے دیکھا کہ اس سے چند قدم ہٹ کر چلنے والے ساحر کا چہرہ سیاہ لباس میں بہت دلفریب اور جاذب نظر لگ رہا تھا۔ اگرچہ ساحروں کے مخصوص سیاہ لباس کے علاوہ کانوں میں بالیاں اور گلے میں کھوپڑیوں کا ہار پہنے ہوئے تھا مگر مصر میں کوئی جادوگر اتنا خوبصورت نہ تھا جتنا کہ معدانوس۔

شہزادی حوریا نے اس دن بھی اسے تعریفی انداز میں دیکھا تھا اور آج بھی وہ یہی بات محسوس کر رہی تھی۔ اسی وقت معدانوس نے ادب سے کہا۔

”عزت مآب شہزادی! یہ بلند عمارت جو باہر سے ایک گنبد نظر آتی ہے، ابتدا میں ایک طویل وعریض ہال تھا جہاں بیٹھ کر مصر کے پرانے ماہرین سحر کبھی جادو کے تجربات

کرتے، کبھی ہواؤں سے اردگرد کا حال دریافت کرتے پھر دریا کی لہروں سے آنے والے حالات کی بابت پوچھنے کے لیے انہیں سفر کرنا پڑتا تو اس ہال سے باہر نکلتے۔ ابتدا میں یہی... طریقے ان کے پاس تھے۔'' کہتے ہوئے معدانوس عمارت کے کئی حصوں سے گزرتا ہوا ایک خالی گوشے کی طرف بڑھا اور آگے بولا۔

''حضور اس بات سے آگاہ ہیں کہ علم سحر پر مختلف ادوار میں تجربات ہوتے رہے۔ عرصے تک لوگ عمارت کو بھی جادو گھر سمجھتے رہے مگر یہاں سے ہٹ کر تجربہ کرنے والوں نے ثابت کر دیا کہ عمارت کی نہیں بلکہ اس کی بلندی اور چہار جوانب رخ ہونے کے سبب تلے لوگ دور دور کی آوازیں سنتے ہیں اور سن سکتے ہیں۔ پھر سحر نے نئی نئی شکلیں اختیار کیں۔

''یہ زندگی بگاڑنے اور بنانے، توڑنے اور جوڑنے میں استعمال کیا جانے لگا۔ سیکڑوں میل دور بیٹھے شخص کی خرابی بڑی آسان ہوگئی۔ اس کا چھوٹا سا پتلا بنا کر اس پر عمل کیا جاتا اور اس شخص پر یہ عمل اثر کرتا۔ پھر اسی علم میں ان تمام امور کا توڑ بھی ساتھ ساتھ دریافت کیا گیا۔ بہت سے ماہرین اسرار وسحر نے اس عمل کو صرف تخریب کے لیے استعمال کیا، تعمیر کا خیال کم ہی لوگوں کو آیا۔ کبھی کبھی اس علم کے ماہرین میں مقابلے بھی ہوتے مگر ان تمام باتوں کی وضاحت کر کے حضور کی سمع خراشی نہیں کروں گا کیونکہ اس وقت آپ صرف طلسم خانہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ لہٰذا میں بتاؤں کہ جادو کا یہ گھر صرف ایک ہال نہیں بلکہ اب اس کے متعدد حصے ہیں اور سب سے خاص حصہ یہ ہے جہاں انسانوں اور حیوانوں کی تصویریں اور مجسمے ہیں۔ ہم اپنا خاص منتر ان تصویروں پر پڑھتے ہیں تو مستقبل میں پیش آنے والے حادثات اور واقعات ان تصویروں پر واضح ہوتے ہیں اور ہم اندازہ کر لیتے ہیں کہ کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔''

دونوں شہزادیوں نے معدانوس کی گفتگو بڑے غور سے سنی اور اشتیاق سے اس حصے کو دیکھا جہاں چاروں طرف دیواروں پر سیاہ چادریں تنی ہوئی تھیں اور ان سیاہ چادروں پر ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ شہزادی حوریا نے اپنے مخصوص اور متین لہجے میں کہا۔

''اور اب آپ نے وہ منتر ایجاد کیا ہے جو ان تصویروں اور مجسموں میں جان ڈال دیتا ہے؟''

''حضور نے درست فرمایا۔ غلام کا یہ منتر بہت جلد تکمیل تک پہنچ جائے گا پھر غلام اس کی باقاعدہ نمائش کرے گا۔''

''معزز معدانوس!'' ولقیہ نے دریافت کیا۔ ''جب واقعات بے جان تصویروں اور مجسموں پر اثر انداز ہوتے ہیں تو کیا ہر انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے یا صرف اسے علم کے ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں؟''

''معزز شہزادی!'' معدانوس نے نہایت احترام سے کہا۔ ''عام لوگ صرف یہ جان سکتے ہیں کہ کچھ ہو رہا ہے مگر واقعات کس کے ساتھ پیش آنے والے ہیں، اس کا اندازہ صرف ساحر اور جادوگر ہی لگا سکتے ہیں۔''

''کیا آپ ہمیں مستقبل کی کچھ جھلکیاں دکھا سکتے ہیں؟'' ولقیہ نے جلدی سے کہا۔

یہ سن کر معدانوس نے ایک نظر شہزادی حوریا کی جانب ڈالی اور ادب سے بولا۔ ''اس امر کی اجازت غلام کو شہزادی حوریا سے لینا ہوگی۔''

''اگر معزز معدانوس کو دشواری نہ ہو تو ضرور دکھائیے۔'' شہزادی حوریا نے جواب میں کہا۔

نوجوان ساحر نے سر جھکا کر کہا۔ ''حضور کے حکم کی تعمیل خادم کا اولین فرض ہوگا۔''

پھر یہی وہ وقت تھا جب شہزادی حوریا نے اچانک سے پھر سوال کیا۔

''معزز ساحر! کیا مستقبل میں آنے والے حالات دیکھ کر اہل مصر ایسی تدبیریں کر سکتے ہیں کہ خرابی سے محفوظ رہیں؟''

اس سوال پر جیسے معدانوس کے قدم لڑکھڑا سے گئے۔ اس نے جلدی سے سنبھالا لیتے ہوئے کہا۔

''عالی مقام شہزادی! انسان کتنا بھی صاحب علم اور مقتدر ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ سو میں سے ستانوے واقعات کو تدبیر سے روکا جا سکتا ہے مگر ہر شخص کے لیے سو میں سے تین باتیں ضرور ایسی ہوتی ہیں جن کا علاج اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوصف ہم انہیں وقوع پذیر ہونے سے روک نہیں سکتے۔ وہاں انسانی طاقت بے اثر ثابت ہوتی ہے اور یہی تین واقعات باقی ستانوے واقعات پر غالب آجاتے ہیں۔''

یہ باتیں کرتے کرتے نوجوان ساحر اس خاص حصے کے وسط میں پہنچ گیا پھر اس نے آنکھیں بند کر کے بلند آواز سے ایک منتر پڑھا پھر جنتر پھونکا...... پل کے پل ایک جانب دیوار پر لگی تصویروں میں بجلی سی کوند گئی اور یہ لکیریں پردے پر مختلف انداز میں چمکنے لگیں۔ ان تصویروں میں ایک ہنگامہ سا بپا ہوا۔ کئی جگہ آگ لگ گئی پھر ایک نازک سی عورت نے ایک مرد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس وقت

دلیقیہ کی چیخیں نکل گئیں۔

شہزادی حوریا نے فوراً حکم دیا۔ ''اسے بند کریں۔''

معدانوس نے حکم سنتے ہی دوسرا منتر پڑھا تو نمایاں تصویریں معدوم ہو کر حسبِ سابق لکیروں میں بدل گئیں۔

اس وقت شاہی خدمت گار، محافظ اور شہزادی حوریا چشمِ حیرت بنے ہوئے تھے۔ یہ تصویریں چند لمحوں کے لیے نمایاں ہوئی تھیں مگر ہنگامے کے سوا کچھ نہ تھا۔

شہزادی حوریا کے رخ پر غور و فکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔ اسی لمحے معدانوس نے دلیقیہ سے کہا۔

''غلام، شہزادی سے معافی چاہتا ہے کہ انہیں اس منظر سے تکلیف ہوئی۔''

''کاش! ہم اس کے بعد بھی دیکھ سکتے مگر ہماری ہمت جواب دے گئی۔ بھلا کیا کوئی عورت کسی مرد کو قتل کر سکتی ہے؟'' شہزادی دلیقیہ نے دریافت کیا مگر معدانوس کوئی جواب نہ دے سکا۔

اسی وقت شہزادی حوریا جانے کے لیے مڑی تو سب اس کے پیچھے چلنے لگے۔ معدانوس نے جھک کر شہزادیوں کا شکریہ ادا کیا اور وہ سب طلسم خانے سے باہر آ گئے۔

جس وقت یہ لوگ شاہی سواریوں میں بیٹھ رہے تھے، نوجوان ساحر سیاہ پردوں کے عقب سے دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

''شہزادی! اچھا ہی ہوا کہ آپ نے یہ تماشا بند کرنے کا حکم دے دیا ورنہ آپ اس کے بعد جو کچھ دیکھتیں، آپ کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگتی کہ تمام حالات کس کے ساتھ پیش آنے والے ہیں۔''

جب تک حسین شہزادی کی سواری نظر آتی رہی، نوجوان ساحر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اس طرح سانس لی جیسے وہ دوبارہ اسے کبھی نہ دیکھ پائے گا۔

اس کے بعد اس نے طلسم خانے کا دروازہ بند کیا اور ایک نئی مورت بنانے کی تیاری کرنے لگا۔ ہر مورت اور مجسمہ بنانے کے بعد وہ اس کا نام رکھنے کا عادی تھا مگر اس مورتی کا نام اس کے ذہن میں پہلے ہی سے موجود تھا اور یہ نام تھا ''شہزادی حوریا بنت خریطش......''

☆☆☆

عین اس وقت جب نوجوان معدانوس نے طلسم خانے کا دروازہ بند کر کے جیسے خود پر دنیا کی خوشیوں کے دروازے بند کر لیے تھے، شہزادی دلیقیہ، شہزادی حوریا سے کہہ رہی تھی۔

''ہم خوفزدہ ہو کر چیخ اٹھے اور آپ نے حکم دینے میں عجلت کی ورنہ اس نازک سی عورت کے بعد کے حالات بھی دیکھ سکتے تھے جس نے ایک ادھیڑ عمر مرد کو قتل کیا تھا۔ آخر ہماری قوم میں اتنی جرأت مند اور دلیر عورت کون ہو سکتی ہے؟''

''جو کوئی بھی ہے......'' شہزادی حوریا نے کہا۔ ''جادو اور جادو کی یہ قوت بڑی حیرت انگیز چیز ہے اور سب سے زیادہ متاثر کن چیز معدانوس کا علم ہے۔ سنا ہے کہ تصویروں میں جان ڈال دینے کا عمل اور منتر اس کی اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔''

دونوں شہزادیاں دیر تک اس کے عجیب و غریب سحر پر گفتگو کرتی رہیں پھر اچانک ہی دلیقیہ نے پوچھا۔

''شہزادی! نوجوان ساحر آپ کو کیسا لگا؟''

''کون...... معدانوس؟'' شہزادی نے جیسے یہ الفاظ کہنے کی آڑ میں خود کو جواب کے لیے تیار کیا اور اگلے ہی لمحے خیالات کو جمع کر کے بولی۔ ''اس کے علم اور جادو کی قوت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ہمیں بھی اس کے ان اوصاف کا اعتراف ہے۔''

''ان اوصاف سے ہٹ کر وہ کیسا ہے؟'' دلیقیہ جیسے وضاحت چاہتی تھی۔

''دلیقیہ......!'' شہزادی حوریا نے براہ راست نام لے کر اسے مخاطب کیا اور آگے بولی۔ ''یاد رکھو، کوئی شخص اپنے اوصاف سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس دنیا کے بازار میں ہر شے کی قدر و قیمت کسی سبب سے ہے۔ تمہاری اس لیے ہے کہ تم ایک حسین لڑکی ہو، شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ میری اس لیے کہ میں بادشاہِ وقت کی بیٹی اور تاج و تخت کی وارث ہوں۔''

''شہزادی! آپ کی سوچ بڑی عجیب اور منفرد ہے۔''

''تمہاری اس ساحر کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' شہزادی حوریا نے دریافت کیا۔

''شہزادی!'' دلیقیہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیا اور بولتی رہی۔ ''اگر ہم ابراحس سے محبت نہ کرتے تو یقیناً ساحر معدانوس کو پسند کر لیتے کیونکہ اس میں ہر وہ صفت موجود ہے جسے کوئی بھی شہزادی پسند کر سکتی ہے مگر یقین کیجیے جس شخص کی نظروں میں ہم آپ کے لیے چاہت محسوس کر لیں، اس کے لیے اپنی پسند کا اظہار کر دینا ایک گناہ سمجھتے ہیں۔''

اس آخری جملے نے حوریا کو چونکا دیا۔ ابھی تک وہ دلیقیہ کے اس سوال کو عام انداز میں لے رہی تھی مگر اب اس نے تعجب سے دیکھا۔ کچھ پوچھ نہ سکی مگر جیسے مجسم سوال بن گئی۔

''ہاں۔'' دلیقیہ نے پوری طرح وضاحت کی۔

''شہزادی! ہم نے معدانوس کی نظروں میں آپ کے لیے وہ چاہت دیکھی ہے، محبت کی وہ آگ دیکھی ہے جو خود اسی کو جلا کر خاک کر دے گی۔'' ولیقیہ شوخ ہونے کے باوجود اس وقت اتنی سنجیدہ تھی کہ حوریا اسے مذاق نہ سمجھ سکی۔ وہ چند لمحے سکتے کے عالم میں خاموش رہی پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''ایسی نادانی کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہماری شادی کسی عام انسان سے نہیں ہوسکتی اور عشق اور محبت کے ہم قائل نہیں۔'' لیکن یہ کہتے کہتے شہزادی حوریا نے خود اپنے الفاظ کا کھوکھلا پن محسوس کرلیا اور ولیقیہ اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

رات گہری ہوگئی تھی لہٰذا یہ محفل برخاست ہوگئی۔ شہزادی حوریا اپنی خواب گاہ میں چلی گئی اور ولیقیہ ابراحس سے ملاقات کے لیے...... لیکن یہ ملاقات نہ ہوسکی کیونکہ شہزادہ ابراحس آج کنعان کے مہمانوں کی مدارات میں معروف تھا اور جس وقت ولیقیہ اپنی خواب گاہ میں ابراحس سے ملاقات نہ ہونے پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی، اس وقت ابراحس کی خاص نشست گاہ میں چند مصاحبین خواتین اور دوستوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔

کنعان کی فوج کا سپہ سالار اعلیٰ جیرون، شام کا ایک بڑا تاجر عرطفہ اور ایمین بن ولید بیٹھے ہوئے تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا اور مختلف موضوعات پر گفتگو جاری تھی۔ جیرون نے کہا۔

''معزز شہزادے! میں کنعان کی فوج کا سپہ سالار اعلیٰ ہوں۔ میرے لیے کنعان چھوڑنا آسان نہیں ہے مگر ایمین بن ولید نے آپ کا تذکرہ اس انداز سے کیا کہ میں حاضر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔''

''معزز سپہ سالار! ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایمین بن ولید نے ہم سے آپ کی تعریف بھی اس طرح کی تھی کہ آپ تشریف نہ لاتے تو ہم خود کنعان پہنچ جاتے۔'' شہزادے نے جام لبریز کرتے ہوئے کہا۔

جیرون کو شہزادے کا یہ اخلاق بہت پسند آیا۔ اس نے اپنے جام کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور بولا۔

''میری خواہش ہے کہ آپ اب بھی کنعان کو عزت بخشیں۔''

''ضرور۔'' شہزادہ ابراحس نے کہا۔ ''ہمارا تردد مٹ جائے تو ہم اس علاقے میں ضرور آئیں گے۔''

''ہوں...... ایمین بن ولید نے ہمیں آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ ہم اس بات کو جائز سمجھتے ہیں کہ آپ کو اپنا حق کھونا نہیں چاہیے اور پھر یہ بات عقل سے بالاتر ہے کہ شہزادے کی موجودگی میں کسی شہزادی کو ولی عہد مقرر کیا جائے۔''

سپہ سالار جیرون نے آہستہ سے شہزادے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تو جیسے تکلیف بڑھ گئی۔ اس نے شراب پیتے پیتے نشے میں بہک کر جیرون سے اپنے مطلب کی باتیں شروع کردیں۔

''معزز دوست! اس وقت ہماری سب سے بڑی الجھن یہی ہے کہ بادشاہ خرطیش، حربیا بن کلکی کے بڑے فرزند اور بادشاہت کے جائز وارث ہیں۔ متعدد شادیوں میں آخری بیوی سے شہزادی حوریا نے جنم لیا۔ اب وہ بادشاہ کی اکلوتی اولاد ہیں۔ وہ انہیں اپنا وارث بنانے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ ہمارے والد اتریب اور شہزادی ولیقیہ کے والد کوریش دونوں حربیا بن کلکی کے چھوٹے فرزند تھے مگر ان کی عمروں نے وفا نہ کی، تب ہماری پرورش بادشاہ خرطیش نے کی۔ ہمیں وہ سب اعزاز نصیب ہیں جو کسی شہزادے کو مل سکتے ہیں۔ صرف تاج وتخت ہم سے دور کر دیے گئے ہیں۔''

جیرون نے مخمور نظروں سے شہزادے کو دیکھا اور بولا۔

''آپ شہزادی حوریا سے محبت کرنے لگیں، شادی کرلیں پھر تاج وتخت آپ کو مل جائے گا۔''

''ہم سے یہی ایک بھول ہوگئی۔'' شہزادہ ابراحس نے تاسف سے ہاتھ ملے۔ ''چند برس قبل ہمیں شہزادی ولیقیہ کا حسن بھا گیا اور ہم نے ان سے شادی کا اعلان کردیا۔ بادشاہ خرطیش نے ہمیں اس بات کی اجازت بھی دے دی۔''

جیرون نے نشے کے عالم میں یہ بات سنی اور بولا۔

''آپ شہزادی ولیقیہ کو راستے سے ہٹادیں اور شہزادی حوریا سے راہ ورسم بڑھائیں تو یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہوسکتا ہے۔''

☆☆☆

القصہ...... ادھر شہزادہ ابراحس اپنی خاص محفلوں میں تاج وتخت کے حصول کی تدبیریں سوچ رہا تھا، ادھر ادھیڑ عمر بادشاہ خرطیش عیش وعشرت میں ڈوب کر اپنی عقل بری طرح ضائع کررہا تھا۔ ہر دوسری رات کسی دور دراز علاقے کی حسینہ خرطیش کی خدمت میں پیش کی جاتی۔ بادشاہ صرف دو راتیں اس کے ساتھ گزارتا اور تیسری رات اسے واپس بھیج دیا جاتا۔

ان دنوں مصر اور اطرافِ مصر کی ہر خوبصورت لڑکی کی عزت خطرے میں پڑی تھی۔ یوں وقت گزرتا رہا۔ شہزادی

ولقیہ، ابراحس کی محبت کا دم بھرتی رہی۔ شہزادہ تخت وتاج حاصل کرنے کے منصوبے سوچتا رہا اور اندرونِ خانہ سازشیں کرتا رہا۔

بادشاہ نئے نئے سامان دریافت کر کے اپنی ذمے داریوں سے غافل ہوتا رہا اور شہزادی حوریا بڑی ہی چوکس اور ہوش مند نظروں سے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے آنے والے حالات پر غور کرتی رہی۔

ایسے میں کئی نئی باتوں نے جنم لیا۔ مصر میں خبر مشہور ہوئی کہ طلسم خانے کے داروغہ معدانوس نے ایک مورتی بنانی شروع کی ہے جسے وہ تکمیل سے پہلے کسی کو نہیں دکھائے گا اور اس مورتی کو وہ مستقبل کے حالات جاننے کے لیے نہیں بلکہ پرستش کے لیے بنائے گا۔

اس خبر سے اہلِ مصر چونک گئے۔ ہمیشہ سے وہ بادشاہ کی مورت کی پرستش کرتے تھے مگر یہ کیسی مورتی ہوگی؟ وہ سمجھ نہ سکے تو اشتیاق بڑھتا گیا اور جگہ جگہ یہی مورتی موضوعِ گفتگو بننے لگی۔ اس کے ساتھ ہی سنا گیا کہ کنعان کے سپہ سالار جیرون نے شہزادہ ابراحس کو چند خوبصورت لڑکیاں بطور تحفہ بھیجی ہیں۔

ان واقعات کے کچھ ہی دن بعد اہلِ مصر حیرت سے منہ میں انگلیاں دبا کر رہ گئے۔ بادشاہ خرطیش نے اعلان کیا تھا کہ مصر کی تمام حسین دوشیزائیں خواہ وہ کسی کی بھی دختر ہوں، بادشاہ کے سامنے پیش کی جائیں۔ یہ بات شرفاء کے لیے ناقابلِ برداشت تھی لہٰذا دبی دبی زبان میں بادشاہ کی مخالفت ہونے لگی جسے بزورِ قوت دبایا جانے لگا۔

ادھر مخالفت شروع ہوئی، ادھر شہزادہ ابراحس کی ملاقاتیں بادشاہ کے ساتھ شروع ہوگئیں۔ اس نے شہزادی حوریا کے لیے وہ جال تیار کیا تھا جو اپنے نہیں، بادشاہ خرطیش کے ہاتھ سے اس پر پھینکنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

بڑے دنوں کے بعد بادشاہ خرطیش نے شہزادی حوریا کو اپنی خاص نشست گاہ میں طلب کیا تھا۔ شہزادی کو طلبی کا سبب معلوم نہ تھا مگر جب وہ اس کی خدمت میں پہنچی تو اس کمرے کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز پردے پھیلے ہوئے تھے اور بادشاہ ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بے تکلفانہ نیم دراز تھا۔

یہ نشست گاہ وہ تھی جہاں وہ صرف شاہی خاندان کے قریبی افراد سے ملاقات اور نجی قسم کی گفتگو کرتا تھا۔ شہزادی حوریا کمرے میں داخل ہوگئی۔ ادب سے سلام کیا تو بادشاہ

خرطیش نے اسے بغور دیکھا۔ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ اب وہ جوان ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ شگفتہ اور غازے کے بغیر بھی چمک رہا تھا۔

بادشاہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ یقیناً وہ مصر کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے اور حسن کے علاوہ اس کی ایک اور صفت اسے مصر کی تمام عورتوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ صفت اس کی دلیری، جرأت مندی اور اعتماد ہے۔

دوسرے ہی لمحے بادشاہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے بولا۔

”حوریا! جب تم نشست گاہ کی طرف آرہی تھیں تو یہاں سے کون جا رہا تھا؟“

شہزادی حوریا نے تعجب سے دیکھا اور جواب میں بولی۔

”ہمارا خیال ہے کہ ابھی ابھی نشست گاہ سے آپ کے مشیر واپس گئے۔ ہم نے انہیں دور سے دیکھا مگر قیاس کہتا ہے کہ سفید لباس میں وہی ہو سکتے ہیں۔“

”تم کافی باریک بین اور ذہین ہو۔“ بادشاہ نے کہا۔ ”امید ہے کہ اب بھی ذہانت سے کام لوگی۔ سنو، مابدولت نے کئی ہفتوں کے غور و فکر کے بعد تمہارے لیے ایک فیصلہ کیا ہے۔ تم بھی غور و فکر کے بعد ہی جواب دینا۔“

شہزادی نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا مگر اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی، وہ خود ہی بولا۔

”حوریا! ان دنوں اہلِ مصر جس تیزی سے ہماری مخالفت کر رہے ہیں تم جانتی ہو۔ بہت سے لوگ تو کھلم کھلا حکم عدولی کر رہے ہیں۔“ بادشاہ سانس لینے کو رکا تو شہزادی نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”معاف کیجیے گا بابا جان! اس وقت ہم آپ کو بادشاہ تصور کر کے نہیں بلکہ اپنا عزیز باپ سمجھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اچانک اہلِ مصر بغیر کسی سبب کے تو آپ کے مخالف نہیں بن گئے؟“

بادشاہ حواس باختہ سا رہ گیا۔ لمحے بھر کو اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کی تمام بے اعتدالیوں کو اس کے سامنے واضح کر دیا ہے مگر دوسرے ہی لمحے وہ خود پر قابو پا کر بولا۔

”اس وقت موضوعِ بحث اہلِ مصر نہیں بلکہ بات صرف یہ ہے کہ ہم تمہاری شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“

اس فیصلے پر شہزادی حوریا حیران رہ گئی مگر بادشاہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور آگے بولا۔

”مابدولت ہمیشہ سے اس بات کے تمنائی تھے کہ ہماری اکلوتی بیٹی جو بے شمار اوصاف سے مالا مال اور تخت و تاج کی وارث ہے، اس کے لیے اتنا ہی اعلیٰ نسب رشتہ

ہمیں چاہیے اور یوں اب مابدولت کے خیال میں تمہارے لیے سب سے مناسب شہزادہ ابراحس ہیں۔''

''جی......!'' شہزادی حوریا غیر ارادی طور پر چیخ اٹھی مگر فوراً ہی بادشاہ کی حیثیت کا خیال کر کے معذرتی لہجے میں بولی۔ ''معاف کیجیے، ہم سے گستاخی ہوئی مگر ہم یہ نہیں جان سکے کہ شہزادے کو چند برس قبل آپ اپنی بھتیجی سے شادی کی اجازت دے چکے ہیں۔ اس سے آج ہمیں کیوں منسوب کر رہے ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ شہزادہ ابراحس اور شہزادی ولیقیہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟''

''شہزادہ ابراحس اس محبت سے دستبردار ہو گئے ہیں۔'' بادشاہ نے کہا۔

''کیوں؟'' شہزادی حوریا نے قدرے طنز سے کہا۔ ''کیا تخت وتاج کے لیے؟''

''نہیں۔'' بادشاہ خرطیش نے اطمینان سے کہا۔ ''انہیں تخت وتاج کی ضرورت نہیں بلکہ تخت وتاج کو ان کی ضرورت ہے۔ موجودہ حالات کسی ولی عہد کے متقاضی ہیں۔''

''آپ انہیں ولی عہد نامزد فرما دیجیے۔'' شہزادی حوریا نے اطمینان سے کہا۔ ''ہم تخت وتاج سے دستبردار ہو جاتے ہیں مگر یاد رکھیے، کوئی عیش پرست انسان تخت وتاج سے انصاف نہیں کر سکتا۔ ہمیں ان سے بھی کوئی اچھی توقع نہیں ہے لیکن آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم اقتدار طلب نہیں کریں گے لیکن یہ شادی ہمیں پسند نہیں۔''

''اس کی وجہ؟'' بادشاہ نے قدرے ناگواری سے دریافت کیا۔

''کیونکہ کسی دوسرے کی چیز لینا ہماری فطرت نہیں ہے اور یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ شہزادہ ابراحس، شہزادی ولیقیہ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ صرف مصلحت وقت کے تحت ہمیں اپنائیں گے۔''

''وہ شہزادی ولیقیہ سے محبت نہیں کرتے۔''

''چلیں مان لیا کہ ان کی محبت میں غرض شامل نہیں مگر شہزادی ولیقیہ تو صرف انہی سے محبت کرتی ہیں۔'' شہزادی حوریا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اب ہم اجازت چاہتے ہیں۔ امید ہے حضور ہمیں مجبور نہیں کریں گے۔''

بادشاہ خرطیش نے اپنی بیٹی کو تعجب سے دیکھا۔ شہزادی کے لہجے کی پختگی، ذہانت اور علم قابلِ تعریف تھے لہٰذا اس کا اس طرح اس بات کو ٹھکرا دینا ناپسندیدہ ہونے کے باوصف بادشاہ کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر وہ دیکھتا رہا اور شہزادی جس طرح آہستہ روی اور ادب سے حاضر ہوئی تھی، اسی طرح سلام کر کے واپس لوٹ گئی۔ بادشاہ خرطیش نے تالی بجائی اور رات کے لیے نئے احکامات دینے لگا۔

عین اس وقت جب وہ عیش ونشاط کی محفل میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کا خاص مصاحب اور قصر شاہی کے امور کا منتظم اعلیٰ ہامان اس کی خوشامد میں مصروف تھا، بادشاہ رقص دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہامان! مصر کی اس لڑکی کے بارے میں تُو نے معلومات حاصل کیں؟''

''عالی جاہ!'' ہامان بولا۔ ''اس کے بارے میں تو غلام بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ بوڑھے عالم عمران کی دختر ہے۔ اس کا نام مریم ہے۔ وہ اس قدر حسین ہے کہ مصر میں کوئی اس کی برابری نہیں کر سکتا مگر بوڑھا عالم عمران حصولِ علم کے لیے جگہ جگہ پھرتا ہے لہٰذا مصر میں کم ہی قیام رہا۔ پچھلے ہی دنوں وہ یہاں پہنچا ہے۔''

''اگر وہ لڑکی اتنی حسین ہے تو مابدولت کے حکم کی تعمیل کیوں نہیں ہوئی؟''

''عالی جاہ! بوڑھا عالم عمران اس فعل کو غلط قرار دیتا ہے۔'' ہامان نے جواب دیا۔

''اگر ہم اس لڑکی سے شادی کر لیں تب بھی؟'' بادشاہ نے مضطرب خاطر انداز میں سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' ہامان نے ادب سے کہا۔ ''بوڑھا عالم اس کے لیے بھی رضامند نہیں ہے۔''

یہ سن کر بادشاہ اشتعال سے دیوانہ ہو گیا اور بولا۔

''تم نے یہ بات مابدولت کو پہلے کیوں نہ بتائی؟''

''عالی جاہ! یہ آخری بات غلام نے آج ہی معلوم کی ہے اور آج غلام اسی لیے حاضر ہوا تھا مگر حضور محفل......''

''یہ محفلیں ہم اسی لیے آراستہ کرتے ہیں کہ مابدولت سکون چاہتے ہیں مگر ہر لڑکی کے ساتھ مابدولت کو سکون نہیں مل سکتا۔ اب مابدولت اندازہ کر چکے ہیں کہ ہمیں اسی بوڑھے عالم کی دختر کی ضرورت ہے۔ وہ رضامند نہ ہو تو لڑکی کو زبردستی اٹھا لاؤ۔ مصر کے جس گوشے میں ہو، ڈھونڈ لاؤ۔ مابدولت صرف دو دن کی مہلت دیتے ہیں۔ جاؤ، فوراً جاؤ۔''

اس دھڑ پر محفل درہم برہم ہو گئی۔ رقاصائیں خوفزدہ ہو کر سمٹ گئیں۔ سازندوں کے ہاتھ سازوں پر جم گئے اور خوشامدی ادب سے کھڑے ہو گئے۔

ادھر یہ سب ہو رہا تھا ادھر شہزادی حوریا اپنی نشست گاہ میں بیٹھی تعجب سے شہزادی ولیقیہ کو دیکھ رہی تھی۔ کمرا روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ولیقیہ کے رخ پر لاعلمی اور

حیرت تھی۔
آج اچانک ہی شہزادی حوریا نے اسے تنہائی میں طلب کیا تھا اور حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے اسی سکوت کی نذر ہو گئے پھر شہزادی حوریا نے آہستہ سے کہا۔
''ولیقیہ! تم ابراحس سے روز ملتی ہو؟'' ولیقیہ اس سوال پر قدرے جھینپی پھر آہستہ سے جواب میں کہا۔
''شہزادی! ان دنوں ابراحس بہت مصروف ہیں۔ ہر روز تو نہیں مگر دوسرے دن ضرور ملاقات ہوتی ہے۔''
''ان کی مصروفیات کیا ہیں؟'' شہزادی نے نشست کے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے سوال کیا۔
''کہہ رہے تھے بادشاہ کی بہت مخالفت ہو رہی ہے۔ دوسرے بیرونی علاقوں کی کچھ مصروفیات ہیں۔ اس کے علاوہ بھی......''
ولیقیہ کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ شہزادی نے اچانک پوچھا۔ ''شہزادہ ابراحس اور تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ بادشاہ نے کئی برس قبل منظوری بھی دے دی تھی۔''
''شہزادے کی بہت سی مصروفیات رکاوٹ ہیں۔'' شہزادی ولیقیہ نے جواب دیا۔
''ولیقیہ!'' شہزادی حوریا نے انداز بدلا اور بولی۔
''آج میں تم سے ذاتی قسم کی وہ گفتگو کر رہی ہوں جو مجھے نہیں کرنی چاہیے مگر یہ بہت ضروری ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جس دن تم شہزادے سے ملاقات نہیں کرتیں اس دن کوئی پیغام بھیجتی ہو اور اگر بھیجتی ہو تو کس طرح؟''
پے در پے کئی سوالوں نے شہزادی کو چونکا دیا اور دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ شہزادی حوریا نہ چھوڑی تھی، نہ اسے اس کی محبت سے کوئی غرض تھی پھر ان سوالوں کا مطلب کیا تھا؟ اس نے سوچا مگر اس کے آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔
''مجھے جو پیغام بھی دینا ہوتا ہے اپنی کنیز کے ذریعے بھیجتی ہوں۔''
''ہوں...... آج سے تم یہ تمام پیغامات، گلدستہ اور دیگر اشیا ایک نئی کنیز کے ہاتھ بھیجوگی جو شہزادے سے بہت مختصر سوالات کرے گی اور بس۔'' شہزادی حوریا نے جیسے حکم صادر کیا اور اپنے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''اور ہاں، غور سے سنو۔ باپردہ اور گم گو کنیز تم خود بنوگی۔''
شہزادی ولیقیہ چونک گئی۔

☆☆☆

''نئی کنیز'' جب طویل راہداریاں، چمن، اونچے برآمدے اور متعدد سیڑھیاں طے کر کے شہزادہ ابراحس کے محل میں پہنچی تو تھک سی گئی۔ اس وقت شہزادہ اپنے خاص مصاحب ایمین کے ساتھ بیٹھا محوِ گفتگو تھا۔ یہ گفتگو کیا تھی؟ کسی کو خبر نہ تھی مگر جونہی غلام نے اطلاع دی جناب قصر سے کنیز آئی ہے تو شہزادہ اور ایمین جیسے چونک گئے۔
شہزادے کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ اس نے باریابی کی اجازت دی تو کنیز ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ لیے حاضر ہوئی۔ پہلے شہزادے کے روبرو سلام کے لیے جھکی پھر ادب سے گلدستہ پیش کر کے بولی۔
''حضور! شہزادی صاحبہ نے بھیجا ہے۔''
شہزادے نے بالکل اس طرح جیسے کوئی عام سی چیز لیتے ہیں، اس سے گلدستہ لیا۔ لگتا تھا کچھ کہنے یا خوشی کا اظہار کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔
''شہزادی سے ہمارا شکریہ کہنا۔'' پھر اچٹتی سی نظر ڈال کر بولا۔ ''تم دلبر تو نہیں، پھر کون ہو؟''
''حضور! کنیز کو روشن آرا کہتے ہیں۔ دلبر علیل ہے۔''
''اوہ۔'' شہزادے نے اس سے رخ موڑا۔ بالکل یوں جیسے جانے کی اجازت دے دی ہو۔ اسی وقت کنیز نے جھک کر سلام کیا اور لوٹ آئی مگر جب وہ اس کمرے کی متعدد کھڑکیوں کے پاس سے گزر رہی تھی تو اس نے ہونے والی گفتگو کی آواز نمایاں طور پر سنی۔ شہزادہ ابراحس کسی عام انسان کی طرح کہہ رہا تھا۔
''ہائے...... ہم کیا کریں۔ جو کچھ چاہتے ہیں اس کے حصول کی توقع نہیں۔''
اس وقت ایمین بن ولید نے ہنس کر کہا۔
''شہزادے! لگتا ہے آپ تخت و تاج سے زیادہ تخت والی کو چاہنے لگے ہیں۔''

☆☆☆

اس شب شہزادی ولیقیہ اپنے چمن میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھی ہوئی شہزادے کے جملوں پر غور کر رہی تھی جو اس نے ایمین سے کہے تھے۔ اس کی محبت کی حقیقت کو اگر بالکل عریاں تو نہیں کیا تھا تو بہت حد تک واضح ضرور کر دیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ برسوں اس کی دیوانہ وار محبت کے جواب میں شہزادہ اسے بے وقوف بناتا رہا ہے۔ وہ افسردہ سی بیٹھی تھی اور اس کے سامنے بیٹھی ہوئی شہزادی حوریا اس کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔
شہزادے کے محل سے واپسی کے بعد اس نے تمام

حالات اسے بتا دیے تھے اور اب خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے ابی سکوت کی نذر ہو گئے پھر وہ بولی۔

''ولیقیہ! یہ تمام حالات ہم نے تمہارے گوش گزار صرف اس لیے کیے ہیں کہ تم حقیقت جان جاؤ۔ ہمارا مقصد تمہیں دکھ دینا ہرگز نہیں تھا۔''

شہزادی ولیقیہ نے یہ جملہ کسی سوچ کے عالم میں سنا اور اندوہ گیں آواز میں بولی۔

''شہزادی! ہمیں آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ ہاں، اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ وہ برسوں ہمیں محبت کے نام پر دھوکا دیتے رہے، غرض برتتے رہے مگر تعجب ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ وہ شروع ہی سے اپنی محبت کا مرکز آپ کو بنا سکتے تھے۔''

''انہوں نے تمہیں اپنی محبت کا مرکز محض اس لیے بنایا کہ دادا جان (بادشاہ کلکی بن حربیا) کی زندگی میں ان کا خیال تھا کہ تخت و تاج انہیں ملے گا۔ وہی بیٹوں کی واحد نرینہ اولاد تھے اور تم شاہی خاندان کی سب سے حسین شہزادی ہو۔ اقتدار اور حسن...... یہی دو چیزیں انہیں طلب ہیں مگر اب تخت کے لیے ہمیں نامزد کر دیا گیا تو ان کا فیصلہ بدل گیا اور سوچ کی یہ تبدیلی چند دن میں ظاہر نہیں ہوئی۔ اسی دن سے ہے جس دن ابا جان خرطیش بن کلکی نے تاج پہنا تھا۔ ہماری نظروں نے یہ سب اسی دن محسوس کر لیا تھا۔''

اب تک شہزادی ولیقیہ بہت حد تک سنبھل چکی تھی، بولی۔ ''انہوں نے غرض برتی یا محبت لیکن ہم نے حقیقت میں انہیں چاہا مگر اب آپ کو گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ اگر تخت و تاج کو ان کی ضرورت ہے اور ہمیں فراموش کر کے وہ یہ سب حاصل کر سکتے ہیں تو ہم اپنی محبت سے دستبردار ہوتے ہیں۔''

اس جملے پر شہزادی حوریا کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے قدرے اشتعال کے عالم میں کہا۔

''ہم تمہارے جذبات کی قدر کرتے ہیں مگر تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ تخت و تاج کو ابراحس کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہ کوئی عیش پسند بادشاہ تخت سے انصاف کر سکتا ہے، نہ حکومت کی ذمے داریاں پوری کر سکتا ہے۔ انہیں صرف ہوس ہے، حرص ہے۔ وہ اقتدار کی بھی ہو سکتی ہے، حسن کی بھی اور شراب کی بھی۔ غرضیکہ جو چیز نہ ملے گی، اسی کو طلب کریں گے۔ جہاں تک تمہارے فیصلے کا تعلق ہے، تم کچھ مت کہو۔ ہم ابا جان سے کہہ چکے ہیں کہ اگر حکومت کی ذمے داریاں وہ اٹھا سکتے ہیں تو ہم سے محبت کرنے کا ڈھونگ نہ رچائیں بلکہ ولیقیہ سے شادی کر لیں۔ ہم خود ان کے حق میں حکومت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ آخر ہم مدتوں سے حکومت اور حکمرانوں کا انجام دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا ایسے اقتدار کی ہمیں کوئی طلب نہیں ہے۔''

شہزادی ولیقیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس عظمت کے سامنے لمحے بھر کو اسے محسوس ہوا کہ ابراحس بہت چھوٹا انسان ہے۔ اس وقت حوریا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''تم اطمینان سے دہرا کھیل کھیلتی رہو جیسے کہ وہ خود کھیل رہے ہیں۔ یاد رکھنا، محلوں کے بہت سے راز شہزادیاں نہیں، کنیزیں جانتی ہیں لیکن ہمیں ہر بات سے آگاہ کرتی رہنا۔''

اس کے بعد...... ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ شام کو شہزادی ولیقیہ اور شہزادہ ابراحس کسی تنہا گوشے میں ملتے تو شہزادے کی محبت میں گرمجوشی ہوتی۔ کبھی چاہت کا اظہار کرتا، کبھی شادی کے وعدے اور جس دن شہزادی ایک کنیز کا روپ دھار کر پیغامات لے کر جاتی تو اپنی محفلوں میں بیٹھا ہوا شہزادہ صرف تخت و تاج کا دلدادہ یا شہزادی حوریا کا ہی طلبگار نظر آتا۔

ان محفلوں سے واپس آتے ہوئے وہ نت نئی خبریں سن لیتی۔ ایک بار اس نے سنا کہ کنعان کے سپہ سالار جیرون نے ایک بڑی رقم کے عوض کنعان کی چند حسینائیں شہزادہ ابراحس کو بھیجی ہیں۔ اس خبر کے چند روز بعد تک شہزادہ ابراحس نے کسی سے ملاقات نہ کی۔ یہاں تک کہ شہزادی ولیقیہ سے ملا اور نہ اس کی ''کنیز'' سے۔

پھر خبر ملی کہ بادشاہ خرطیش کی عیش پرستی کے سبب عوام اس کے مخالف ہو گئے ہیں۔ سرعام اس کے خلاف نعرے لگتے ہیں۔ یہ خبر اور کئی ذرائع سے بھی محل میں آ چکی تھی۔ دونوں شہزادیاں دیر تک اسی موضوع پر بات کرتی رہیں۔ بادشاہ خرطیش اور شہزادہ ابراحس دونوں ہی عیش و عشرت کے دلدادہ تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ انہی میں گم ہوتے جا رہے تھے۔

کچھ وقت اور بیت چلا تو خبر ملی...... طلسم خانے کے داروغہ معدانوس بن دازل نے وہ عجیب و غریب مورتی مکمل کر لی ہے مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ اس مورتی کی نمائش نہیں کریں گے کیونکہ وہ انہوں نے صرف اپنی پرستش کے لیے بنائی ہے۔ خلقت کو اس مورتی کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا مگر معدانوس اس کی نمائش سے انکار کر چکا تھا۔

یوں وقت گزرتا رہا۔ ولیقیہ کنیز کا روپ دھار دھار کر اپنے محبوب کی اصلیت دیکھتی رہی اور نئے نئے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے۔ بادشاہ نے شہزادی حوریا کو پیغام بھیجا۔

''مسلطنت کی بقا کے لیے شہزادہ ابراحس کا رشتہ منظور کرلو۔''
شہزادی نے جواب دیا۔ ''ابراحس صرف ولیقیہ کے ہیں۔ وہ ولیقیہ سے محبت نہیں کرتے مگر وہ تو ان سے محبت کرتی ہے۔''
جواب وہی پرانا تھا۔ بادشاہ پھر اپنی عیاشیوں میں مصروف ہوگیا اور شہزادہ ابراحس کی مصروفیات کچھ اور بڑھ گئیں۔
ایک دن شہزادی ولیقیہ کنیز کے روپ میں شہزادہ ابراحس کی خدمت میں پہنچی تو ایمین بن ولید حاضر خدمت تھا اور ان دونوں کے درمیان گفتگو بڑی راز داری سے ہورہی تھی۔ کنیز نے جھک کر سلام کیا تو شہزادے نے اسے روک لیا۔ ایمین بن ولید کو رخصت کر کے شہزادی کا پیغام سنا اور بولا۔
''گزشتہ شام شہزادی صاحبہ سے ہماری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا تھا کہ وہ خود کو کچھ کمزور محسوس کر رہی ہیں۔ ہم نے ان کے لیے ایک مقوی سفوف منگوایا ہے۔ اسے روزانہ دودھ میں ملا کر پلانا ہے۔ یہ خدمت تمہیں انجام دینی ہے اور ان کے حال سے ہمیں آگاہ بھی کرتے رہنا ہے۔''
کنیز نے وہ سفوف لے لیا۔ شہزادے نے چند اور ہدایات دیں، اس کی مقدار بتائی، پابندی کا حکم دیا اور کنیز کو رخصت کر دیا۔ اس وقت ولیقیہ متعجب تھی۔ اس نے ملاقات کے دوران کسی کمزوری یا علالت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔
اس دن دونوں شہزادیاں جان گئی تھیں کہ شہزادے نے نیا جال پھینکا ہے اور جب یہ سفوف بلی پر استعمال کیا گیا تو اس پر غشی طاری ہوگئی پھر معاملہ سمجھنے میں انہیں چنداں دیر نہ لگی۔
شہزادی حوریا نے کہا۔ ''یہ بتدریج اثر کرنے والا زہر ہے جو شہزادہ تمہیں دینا چاہتا ہے۔ میں یہ بات بادشاہ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔'' یہ سنتے ہی ولیقیہ نے اسے روکا اور بڑی راز داری سے بولی۔
''شہزادی! آپ اس معاملے کو راز ہی رکھیے اور زہر رکھ لیجیے۔ بوقت ضرورت کام آئے گا اور پھر بادشاہ پوری طرح شہزادے کی حمایت اور عیش و عشرت میں مبتلا ہیں۔ اب جو کچھ کرنا ہے، آپ ہی کو کرنا ہے۔''
شہزادی حوریا نے اسے تائیدی نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ اب سب کچھ ہمیں خود کرنا ہے اور ہم وہ کریں گے جو کسی نے نہ کیا ہوگا۔''
پھر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اگلے دن کنیز شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آج بھی ایمین بن ولید موجود تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ کنیز نے سلام کر کے کہا۔
''حضور! آج کنیز کو شہزادی حضور نے نہیں بھیجا بلکہ وہ خود ان کی کیفیت بیان کرنے حاضر ہوئی ہے۔''
''بہت خوب۔'' شہزادہ بولا۔ ''تم ایک ذمے دار اور کارآمد کنیز ہو۔ بتاؤ شہزادی کیسی ہیں؟''
''شہزادی علیل ہیں۔ گزشتہ شب دودھ پی کر انہیں خوب نیند آگئی تھی۔''
یہ سنتے ہی شہزادے کے رخ پر تازگی سی آگئی۔ اس نے کہا۔
''تم جاؤ اور شہزادی کی دوا اور آرام کا مکمل خیال رکھنا اور ہمیں آگاہ کرتی رہنا۔''
حکم سنتے ہی کنیز نے جھک کر سلام کیا اور پلٹ آئی مگر اس دن اس نے کھڑکیوں کی قطار کے نیچے سے گزرتے ہوئے دانستہ اپنی چال سست کر دی۔ اس وقت ایمین بن ولید کہہ رہا تھا۔
''شہزادے! یہ سفوف کنعان کے مشہور طبیب سے بمشکل حاصل کر سکا ہوں۔''
''ہوں۔'' شہزادہ ابراحس نے کہا۔ ''شہزادی حوریا کو شادی میں یہ عذر ہے نا کہ ولیقیہ مجھے چاہتی ہے۔ اس

مشورہ

ایک آدمی مسجد میں اس طرح اذان دیا کرتے تھے کہ لوگوں کو چڑ محسوس ہوتی تھی۔ مسجد کا متولی بڑا مروت پسند تھا۔ اس نے مؤذن سے کہا کہ اس مسجد کے کچھ اور مؤذن ہیں۔ میں انہیں بھی رقم دیتا ہوں۔ میں تمہیں دس دینار دیتا ہوں۔ تم فی الحال کسی اور مسجد میں چلے جاؤ تاکہ دوسروں کو بھی موقع دے سکوں۔ معاملہ طے ہوگیا۔
کچھ دن بعد متولی ایک جگہ سے گزرا۔ وہاں اسے وہ مؤذن مل گیا۔ متولی نے حال پوچھا تو مؤذن نے کہا۔ ''آپ نے مجھ پر بہت ظلم کیا کہ دس دینار کے بدلے نکال دیا۔ حالانکہ اب میں جس جگہ ہوں وہاں مجھے بیس دینار دیتے ہیں کہ میں کہیں اور چلا جاؤں لیکن میں اس رقم کو قبول نہیں کر رہا ہوں۔''
متولی نے کہا۔ ''ہرگز قبول نہ کرنا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں پچاس دینار تک دینے پر تیار ہوجائیں گے۔''
(مرسلہ: جہانگیر بدر، راولپنڈی)

کے بعد وہ کیا بہانہ کرے گی۔"

"مان جائیں ہماری ترکیب۔ حصولِ تخت میں پیش آنے والی تمام رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی مگر مجھے نہ بھول جائیے گا۔"

پھر شہزادے نے کیا جواب دیا، نہ کنیز نے سنا نہ اسے ضرورت تھی۔ ہاں، اس شام شہزادی ولیقیہ اور شہزادے کی ملاقات ہوئی تو شہزادی جیسے نیند کے عالم میں تھی اور یہ کیفیت شہزادے کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس نے کہا۔

"یہ سفوف باقاعدہ لیتی رہو، بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

اس رات شہزادی حوریا نے دن بھر کی روداد سنی اور وہی پرانی بات دہرائی اور بولی۔

"شہزادی ولیقیہ! ہمیشہ یاد رکھنا کہ محبت غرض اور ضرورت کا پُرکشش نام ہے۔" اور آج پہلی بار شہزادی ولیقیہ نے یہ بات سن کر اسے جھٹلایا نہیں۔ آج اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ شہزادہ نہ اس سے محبت کرتا ہے، نہ حوریا سے، بلکہ اسے صرف تخت و تاج چاہیے۔

☆☆☆

ان دنوں مصر کی حالت کچھ عجیب تھی۔ بادشاہ خرطیش عیش و عشرت کے پیچھے دیوانہ ہو چکا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ نہ اسے اپنے مذہب کی پروا تھی نہ شاہی خاندان کے افراد کا خیال۔ اس کے سامنے جو بھی آتا، عیش و عشرت کی نذر ہو جاتا۔

اس کی آنکھیں اور کان کھلے ہوئے تھے اور ان کانوں تک صرف شہزادے کی رسائی تھی۔ وہ اندرونِ خانہ سازشیں کر کے تخت چاہتا تھا لیکن بادشاہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کیونکہ بادشاہ کے مرتے ہی شہزادی حوریا تخت نشین ہو جاتی۔ لہٰذا شہزادی کو اپنا کر تخت تک پہنچنے کو وہ سہل سمجھ رہا تھا۔

ادھر شہزادی دور بیٹھ کر بھی اس کی ہر چال سمجھ رہی تھی۔ ہر چال کاٹ رہی تھی مگر شہزادہ ہر بار ایک نئی تدبیر سوچ لیتا۔ اب اس نے ولیقیہ کو زہر دے کر حوریا تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر لیا تھا۔ اس بار شاید حوریا چراغ پا ہو کر کوئی قدم اٹھا لیتی مگر انہی دنوں مصر میں وہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے تخت و تاج کے لیے خود فیصلہ کر دیا۔

ان دنوں بادشاہ خرطیش کی طبیعت چند دن سے مضطرب و بے قرار تھی۔ اس کی وجہ سیاسی حالات نہ تھے، نہ ہی اس کی وجہ یہ تھی کہ شہزادہ ابراحس نے شادی کا پیغام دیا اور شہزادی حوریا نے انکار کر دیا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مصری عالم عمران اپنی خوبصورت بیٹی مریم کو لے کر مصر سے فرار ہو گیا تھا۔

ایسے میں بادشاہ کے مصاحب اپنی ہر کوشش آزما چکے تھے اور جوں جوں مریم کے پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی، بادشاہ دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اس بات کو کافی وقت ہو گیا تھا۔ جس مصاحب کو اس نے مریم کو حاضر کرنے کے لیے دو دن کی مہلت دی تھی، اسے ناکامی کا اعتراف کرنے پر قتل کرا دیا گیا تھا۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی بہادر اس کام کے لیے مامور ہوئے مگر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ وجہ ان کی ناکامی رہی۔

آج اس نے ایک نئے سردار زوردج کو طلب کیا تھا۔ زوردج ہاتھ باندھے بادشاہ کے روبرو کھڑا ہوا تھا۔ مصر عالم کی خوبصورت بیٹی کے بارے میں استفسار کے جواب میں اس نے کہا۔

"حضور والا! غلام کی معلومات کے مطابق مصری عالم عمران اپنی دختر کی حفاظت کے لیے جگہ جگہ پھر رہا ہے۔ ابھی تک حضور کے خوف سے کسی جوان نے اس کی بیٹی سے شادی کی جرأت نہیں کی کیونکہ حضور کے ہرکارے ہر جگہ اس عالم کا پیچھا کر رہے ہیں مگر آج ہی خبر ملی ہے کہ ہر جگہ حضور کے ہرکاروں کے تعاقب سے گھبرا کر وہ عالم اپنی دختر سمیت پھر مصر لوٹ آیا ہے مگر کہاں ہے؟ یہ کسی کو خبر نہیں ہے۔"

بادشاہ نے بڑے غیظ و غضب کے عالم میں یہ سب سنا اور غصے سے بولا۔

"زوردج! ہم تمہیں آج کا دن دیتے ہیں۔ رات گہری ہونے سے قبل اس بڈھے اور اس کی بیٹی کو حاضر کرو اور اگر بڈھا اپنی بیٹی دینے پر راضی ہو جائے تو اسے عزت مت دینا بلکہ سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر موت کے گھاٹ اتارنا اور لڑکی کو ہماری خدمت میں حاضر کر دینا۔"

☆☆☆

شام گہری ہو چلی تھی۔ زوردج کے آدمی مصر کے گوشے گوشے میں پھیل گئے تھے مگر ابھی تک ناکام تھے۔ ایسے میں شہزادی حوریا نے اچانک طلسم خانے جا کر اپنے اسلاف کے مجسموں کو دیکھنے اور معدانوس سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

اسے یہ فیصلہ کرنے اور طلسم خانے میں پہنچنے میں دیر نہ لگی مگر اس نے جونہی سیڑھیاں طے کر کے اندر داخل ہونا چاہا، معدانوس نے اس کا استقبال کرنے کے بعد عرض کیا۔

"حضور! طلسم خانے کے داروغہ کی حیثیت سے میں

کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔" اور پھر اجازت ملنے پر معدانوس نے کہا۔ "جناب! آج کی شب آپ طلسم خانے میں تنہا داخل ہوسکتی ہیں، کوئی اور نہیں۔"

بات عجیب تھی مگر معدانوس نہ صرف طلسم خانے کا داروغہ بلکہ نجومی اور مستقبل کے تمام رازوں سے واقف بھی تھا لہٰذا شہزادی نے یہ بات ماننے میں عذر نہ کیا۔ وہ شاہی خدمت گاروں اور محافظوں کو عمارت کے نیچے انتظار کا حکم دے کر اس جادو گھر میں داخل ہوگئی۔ اس وقت معدانوس نے اپنی بنائی ہوئی مورتی پر سیاہ کپڑا ڈال دیا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ جس کی پرستش کرتا ہے، اسے کسی کو دکھانا نہیں چاہتا۔ شہزادی کے استفسار پر اس نے کہا۔

"حضور! آپ سب اس مورتی کو ضرور دیکھیں گے مگر ابھی دیوتاؤں کی طرف سے اسے دیکھنے کا وقت نہیں آیا۔"

شہزادی جو اس کے علم سے مرعوب تھی، خاموش ہوگئی پھر اس نے اسلاف کے مجسمے دیکھے۔ ان کے بارے میں دیر تک معدانوس سے گفتگو کی لیکن ابھی وہ واپس نہ ہو پائی تھی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ باہر شاہی ہرکارے اعلان کررہے تھے۔

"بادشاہ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ مقدس معدانوس طلسم خانے سے باہر تشریف لے آئیں۔ مصری عالم اور اس کی دختر کی تلاش کے لیے طلسم خانے کی تلاشی بھی ضروری ہے اور معدانوس یہ بھی بتائیں کہ لڑکی کہاں ہے؟"

اس وقت معدانوس کا چہرہ پسینے سے تر ہوگیا۔ اس نے کمزور آواز میں کہا۔ "آج شب کوئی مرد طلسم خانے میں داخل نہیں ہوسکتا۔"

مگر اس کی آواز دب کر رہ گئی کیونکہ شاہی ہرکارے نیچے سے تعمیل حکم کے لیے چلا رہے تھے۔ اس لمحے شہزادی سب کچھ سمجھ گئی۔ اس نے کہا۔ "مقدس معدانوس! اگر آپ نے بوڑھے عالم اور اس کی لڑکی کو پناہ دی ہے تو ہم آپ کی مدد کریں گے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو شاہی ہرکاروں کو تلاشی لے لینے دیجیے۔"

یہ سن کر معدانوس احترام سے اس کے سامنے جھک گیا اور بولا۔ "معزز شہزادی! معمر عالم اور اس حسینہ کو کہیں پناہ نہ ملی تو غلام نے انہیں پناہ دی ہے اور وہ طلسم خانے میں موجود ہیں مگر غلام ایک مجبور لڑکی کو شاہ کے حوالے نہیں کرے گا۔"

"ہم اس کی حفاظت میں آپ کی پوری مدد کریں گے۔" شہزادی نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد معدانوس نے شاہی ہرکاروں کو مخاطب کرکے کہا۔ "معزز سردارو! مصری عالم اپنی دختر کو میرے طلسم خانے میں چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں آج کی شب کسی کو طلسم خانے میں داخل ہونے کی اجازت نہ دوں گا۔ ہاں، معمر عالم کی بیٹی کو تمہارے حوالے کرسکتا ہوں۔"

چشم زدن میں یہ خبر بادشاہ تک پہنچ گئی تو اس نے کہا۔ "اگر معدانوس آج رات طلسم خانے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے رہے تو ہمیں اعتراض نہیں۔ ہاں، لڑکی ہمیں ہر صورت میں ملنی چاہیے۔"

یہ سن کر معدانوس نے جواب میں کہا۔ "شہزادی کی سواری واپس جائے گی تو میں لڑکی کو آپ کے حوالے کردوں گا۔"

رات نے آہستہ آہستہ اپنا ابتدائی پیراہن اوڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی پھیل گئی۔ مصر کی گلیوں اور بازاروں میں بڑی دیر تک چہل پہل رہی۔ جگہ جگہ آج کے واقعے پر تبصرہ ہوتا رہا۔ کہیں بوڑھا عالم موضوعِ سخن تھا، کہیں اس کی بیٹی کے بے پناہ حسن کا تذکرہ۔ کہیں معدانوس جس نے اسے پناہ دی تھی اور کہیں بادشاہ کی ہوس پرستی۔

یوں لوگ دبی دبی زبان سے اعتراض کررہے تھے۔ غرضیکہ دیر تک یہی ہوتا رہا پھر لوگ منتشر ہوگئے۔ اس رات بادشاہ خرطیش کا کمرا شمع و فانوس کی کثرت سے روشن تھا اور اس روشنی میں نقاب میں چہرہ چھپائے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر پڑا ہوا بھاری ریشمیں پردہ ہٹا اور بادشاہ خرطیش نشے کے عالم میں کمرے میں داخل ہوا۔ شراب روز کی طرح اس نے آج بھی پی لی تھی لیکن اتنی نہیں پی تھی کہ بالکل ہی ہوش و خرد سے بیگانہ ہوجاتا۔ اسے علم تھا کہ آج زودہج کی ثابت قدمی کی وجہ سے بوڑھے عالم کی خوبصورت بیٹی اس کی خواب گاہ میں پہنچ چکی ہے۔ لہٰذا آنے والے وقت کے تصور سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے خوشی سے مغلوب ہوتے ہوئے اس طرف دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا پھر چند قدم چل کر وہاں تک جا پہنچا جہاں وہ حسین لڑکی بیٹھی تھی۔ بادشاہ نے نشے سے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"رخ سے نقاب اٹھادو۔ مابدولت تمہیں بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔"

لڑکی نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا تو بادشاہ چند قدم اور قریب آگیا۔ یہ قربت اتنی تھی کہ وہ گھبرا اٹھی مگر

دوسرے ہی لمحے سنبھل کر کھڑی ہوگئی۔ نقاب ہنوز اس کے رخ پر پڑا تھا۔ ہاں، خوبصورت ہاتھ نظر آرہے تھے جن کی لرزش اس کی سراسیمگی کا اظہار کررہی تھی۔ ادھر بادشاہ کے دل میں یہ خوبصورت کانپتے ہوئے ہاتھ بُری طرح آگ لگا رہے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح چند قدم اور آگے بڑھا اور محبت سے بولا۔

''لڑکی! تو نقاب کیوں نہیں ہٹا دیتی۔ آخر اس قدر ضدی کیوں ہے؟''

لڑکی گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت اس کے دل میں نفرت اور حقارت کے جذبات انتہا پر پہنچ چکے تھے۔ اس کے پیچھے ہٹ جانے کو بادشاہ نے گھبراہٹ پر محمول کیا اور بولا۔

''ہم بدولت وہ چہرہ دیکھنے کو بے قرار ہیں جس نے ہمیں مسلسل بے قرار کر رکھا ہے۔ ہمارے کان تیری آواز سننے کے لیے بے تاب ہیں۔'' کہتے کہتے بادشاہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹی۔ بادشاہ نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے دیوانوں کی طرح کہا۔

''لڑکی! تو خوشی سے ہمارے قریب آجا۔ ہم تیرے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگا دیں گے اور تیری ہر بات پر سر جھکا دیں گے۔''

مگر اس بار بھی جواب نہ پا کر بادشاہ نے حیرت سے دیکھا۔ اتنا بے تاب وہ کسی بھی لڑکی کے لیے نہیں ہوا تھا۔ اس وقت کچھ حیرت اور بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ اور پیچھے ہٹی۔ وہ اس پر جھپٹنے کے لیے کچھ اور آگے بڑھا اور اس وقت تک ان دونوں کے درمیان صرف اتنا فاصلہ رہ گیا تھا کہ ایک ہی جست میں بادشاہ اسے پکڑ سکتا تھا۔ اس کی حالت کتے جیسی تھی جو اپنے شکار کو بالکل نزدیک پا کر دیوانہ ہو جاتا ہے۔

ہوس نے اس پر پوری طرح غلبہ پا لیا تھا۔ وہ بے قابو ہو کر ایک بار پھر جھپٹا اور قریب تھا کہ لڑکی کا نقاب نوچ کر اسے قابو کر لیتا کہ خود اپنا نقاب اٹھاتے ہوئے لڑکی پہلی بار بولی تو بادشاہ کو اس آواز اور چہرے نے چونکا دیا۔

لڑکی نے کہا۔ ''آپ یہ چہرہ دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں تو دیکھیے۔''

بادشاہ خرطیش کا نشہ لمحہ بھر میں ہرن ہو گیا۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے شہزادی حوریا کھڑی تھی۔ وہ ایک تعجب تلے چیخ اٹھا۔

''حوریا......!''

''جی ہاں!'' حوریا نے نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''اس بوڑھے عالم کی بیٹی کی عزت بچانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا جو آپ کی رعایا ہے، آپ کی حفاظت میں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بادشاہ قوم کا باپ ہوتا ہے اور آپ ایسے باپ ہیں جو خود اولاد کی عزت لوٹتے ہیں۔''

اگلی صبح ایک خبر نے اہلِ مصر کو چونکا دیا۔

''بادشاہ خرطیش کو شہزادی حوریا نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔''

☆☆☆

اس واقعے کے بعد جب شہزادی حوریا نے اپنی حکومت کا اعلان کیا تو کسی نے نہ پوچھا کہ شہزادی نے بادشاہ خرطیش کو کس طرح مارا ہے۔ خنجر سے یا زہر دے کر؟ اب وہ ان کی ملکہ تھی جس نے جشنِ تاج پوشی کے بعد نئی زندگی کا آغاز کیا تھا اور انہیں امن و سکون اور عزت کا یقین دلایا تھا۔

یوں جہاں ہزاروں انسانوں نے اطمینان اور خوشی کی سانس لی، وہاں ایک ہستی مصر میں ایسی بھی تھی جو بے قرار و مضطرب تھی اور حوریا کی تاج پوشی اور اس جشن کو اپنی توہین سمجھ رہی تھی۔ یہ ہستی تھی شہزادہ ابراحس بن اتریب!

بادشاہ خرطیش کی ہلاکت اور شہزادی حوریا کی بادشاہت کا اعلان سننے کے بعد اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال آرہا تھا۔ قوت اور مقابلہ...... اپنا حق حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ لہٰذا حوریا کے اعلانِ حکومت کے فوری بعد اہلِ مصر نے سنا کہ شہزادہ ابراحس بن اتریب نے ملکہ حوریا کے خلاف بغاوت کر دی اور کنعان کے سپہ سالار جیرون سے مدد لی ہے۔

''مصر کی بادشاہت میرا حق ہے۔ میں اسے بہر صورت حاصل کروں گا۔'' اس نے کہا۔

''میں ہر مقابلے کے لیے تیار ہوں۔'' ملکہ حوریا کا جواب تھا۔

اس فیصلے کے بعد مصر کی فوج ملکہ حوریا کی حمایت میں اور کنعان کی فوج اور اس فوج کا سپہ سالار جیرون، شہزادہ ابراحس بن اتریب کے ساتھ رہا۔ اعلانِ جنگ ہوتے ہی بڑے جوش و خروش کے ساتھ لڑائی شروع ہوئی۔ اس دور کے دستور کے مطابق پہلے شخصی لڑائی ہوئی پھر باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا۔

ہر دستہ بڑی جاں بازی سے لڑا۔ دونوں طرف کے سردار بڑے اولوالعزم اور دلیر تھے۔ ایک جانب نمائش کے لیے شہزادہ ابراحس مگر دراصل کنعان کی بڑی فوج کا سالار جیرون تھا۔ دوسری جانب نوجوان، خوبصورت مگر حد

درجہ ذہین اور دلیر ملکہ حوریا تھی۔

دونوں جانب جنگ کا مکمل سامان موجود تھا، ہتھیار تھے اور جوش و خروش تھا مگر پہلے دن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ جو دلیر جنگ میں حصہ لے رہے تھے، وہ طبل کے بجتے ہی اپنے ٹھکانوں پر جاکر آرام کرنے لگے مگر جو عیش پسند اور صرف اقتدار کے دلدادہ دکھاوے کے لیے شریک تھے، اس وقت اپنے خیمے میں محسوس کررہے تھے کہ شراب کے بغیر رات نہیں گزر سکتی۔

پہر رات کی اخیر ساعتیں تھیں۔ آسمان پر چمکنے والے ستارے تاریکی کو کاٹ تو نہ سکتے تھے لیکن قریب کی چیزوں کو نمایاں ضرور کررہے تھے۔ ایسے میں ایک گھڑسوار بڑی آہستہ روی سے میدان کا چکر لگاتے ہوئے جیسے اپنی فوجوں کا معائنہ کررہا تھا۔

یہ کنعانی فوج کا سالار جیرون تھا۔ میدان کا چکر لگاتے ہوئے جونہی وہ وسط میں پہنچا تو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا اس جانب گھوڑے پر سوار ایک عورت مصری فوج کا معائنہ کررہی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ رات کے اس حصے میں فوج کا معائنہ کرنے والی ملکہ حوریا ہے۔

گھڑسوار عورت چند قدم کا فاصلہ طے کرکے قدرے نزدیک پہنچی تو ستاروں کی مدھم مدھم روشنی میں جیرون اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ جیرون نے سنا تھا کہ حوریا کسی کی محبت پر یقین نہیں کرتی، کسی سے مرعوب نہیں ہوتی۔ اس کی ذہانت، علم اور برجستہ گوئی کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ پھر اس نے سنا حوریا نے باپ کو موت کے گھاٹ اتار کر خود اپنی بادشاہت کا اعلان کیا ہے۔

یہ سب سن سن کر اس نے اپنے ذہن میں ملکہ حوریا کا جو خاکہ بنایا تھا، یہ اس سے بالکل مختلف ملکہ تھی۔ جیرون نے اس خوبصورت اور روشن چہرے والی حسین لڑکی کو آنکھیں جھپکا کر دیکھا اور جیسے مسحور ہوکر رہ گیا۔ چند لمحے حیرت سے تکتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”خاکسار ملکۂ مصر کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے۔“

ملکہ حوریا نے اسے دیکھا اور تعجب سے بولی۔ ”ہم کنعان کے سپہ سالار معزز جیرون کا سلام قبول کرتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے سادہ لباس اور عام لوگوں کی طرح میدان میں آنے کے باوصف انہوں نے کیسے اندازہ کرلیا کہ ہم ملکہ ہیں؟“

اس ذہانت پر جیرون متاثر ہوکر ہنسا اور بولا۔ ”اگر یہی سوال ملکہ سے کیا جائے کہ ملکہ نے کیسے سمجھ لیا ہے کہ ہم کنعان کے سپہ سالار ہیں؟“

ملکہ نے مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ ”رات کے اس حصے میں آرام کے وقت فوجوں کا معائنہ سپہ سالار ہی کرسکتا ہے۔ ہم نے اسی بنا پر آپ کو پہچان لیا۔“

جیرون ملکہ سے از حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے کئی بار ملکہ کو سر سے پیر تک دیکھا اور احترام سے بولا۔

”ملکۂ عالیہ! اگرچہ یہ بڑی گستاخی ہے مگر غلام یہ کہنے پر مجبور ہے کہ حضور کا حسن، نزاکت اور عمر اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ حضور یوں میدانِ جنگ میں تشریف لائیں۔“

ملکہ نے لحظہ بھر کو اسے دیکھا اور بولی۔ ”معزز جیرون! جب ہر طرف محاذ قائم ہوجائیں اور بہت سے لوگوں کی ضرورتوں کا احساس ہو تو کون حکمران ہے جو میدان میں آکر مقابلہ نہ کرے۔ ہم نے عرصے سے محسوس کیا کہ ہمارے حکمران اپنی غرض کے لیے کام کرتے ہیں۔ انہیں نہ اس سرزمین سے محبت ہے، نہ رعایا کی پروا۔ تب ہم اپنی ذات کو فراموش کرکے محض اس لیے میدان میں آئے ہیں کہ یہ سرزمین اور اس کے باشندے ہمارے ہیں اور انہیں ہماری ضرورت ہے۔“

اس ملاقات میں جیرون ملکہ سے بہت مرعوب ہوگیا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”ملکۂ عالیہ! غلام آپ سے متفق ہے اور آنے والی صبح کنعان کی افواج کو ملکۂ مصر کے ساتھ دیکھے گی۔“

واقعی دوسری صبح کنعانی اور مصری فوجیں متحد ہوچکی تھیں۔ اس دن شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے شہزادہ ابراحس کو ملکہ حوریا کے روبرو لایا گیا تو وہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی شہزادی ولیقیہ کو دیکھ کر متعجب رہ گیا۔ شہزادی ولیقیہ نے کہا۔

”شہزادہ ابراحس! آپ مجھے دیکھ کر یقیناً متعجب ہوں گے کیونکہ آپ کے خیال میں، میں آپ کے دیے ہوئے زہر کا شکار ہوچکی ہوں۔“

اس وقت شہزادے کی حالت دگرگوں تھی۔ اس نے کہا۔ ”شہزادی ولیقیہ! حقیقت یہ ہے کہ ابراحس نے ہمیشہ آپ ہی سے محبت کی ہے۔ ہاں، تخت و تاج کے حصول کو وہ ہمیشہ سے اپنا حق سمجھتا رہا ہے اور اب بھی سمجھتا ہے۔“

مگر شہزادی ولیقیہ نے بڑے ہی طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ”شہزادے! اب ولیقیہ بنت کوریش کسی کی محبت پر یقین نہیں کرسکتی اور آپ کو ملکہ کے حوالے کرتی ہے۔“

اس کے بعد ملکہ حوریا نے اعلان کیا۔ ''شہزادی ولیقیہ نے اپنے مجرم کو ہمارے حوالے کردیا ہے۔ ہم اسے اپنے محسن جیرون کے حوالے کرتے ہیں۔ اگر معزز سپہ سالار جیرون ہمارا ساتھ نہ دیتے تو ہم یقیناً مقابلہ نہ جیت سکتے۔ اس کے ساتھ ہی ہم اہلِ مصر کے سامنے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے بعد بھی مصر پر کوئی مرد حکمران نہیں ہوگا بلکہ ہم شہزادی ولیقیہ کو ولی عہد نامزد کرتے ہیں۔''

لوگوں میں دیر تک ایک غلغلہ اور داد و تحسین کا بم چ ابھرتا رہا۔ اہلِ مصر بہت خوش تھے۔ مردوں کی عیاشیوں اور مظالم سے تنگ آکر وہ عورتوں کی حکومت کو غنیمت جان رہے تھے۔

اس دن ملکہ حوریا نے اپنے محسنوں اور دلیروں کو انعامات تقسیم کیے اور بولی۔ ''معزز جیرون بھی انعام کے مستحق ہیں مگر یہ فیصلہ وہ خود کریں گے اور آج جو کچھ ہم سے مانگیں گے، ہم عطا کریں گے۔''

یہ اعلان سنتے ہی کنعانی فوج کا سپہ سالار بڑے ادب اور احترام سے جھکا اور بولا۔ ''ملکۂ عالیہ نے انعام دینے کا وعدہ تو فرمایا ہے مگر یہ یقین نہیں دلایا کہ غلام اپنی حیثیت سے بڑھ کر بھی کچھ مانگ سکتا ہے......!''

مگر جیرون کا فقرہ مکمل ہونے سے قبل ہی ملکہ نے کہا۔ ''کیا کنعان کا بہادر سپہ سالار ہماری فراخ دلی اور سخاوت پر یقین نہیں رکھتا؟''

جیرون جھینپ سا گیا اور بولا۔ ''حضور کی سخاوت پر یقین ہے اسی لیے غلام اپنی حیثیت سے بڑھ کر طلب کرنے کی بات کررہا ہے۔ اگر حضور جان بخشی کا وعدہ فرمائیں تو عرض ہے کہ یہ کنعانی سپاہی ملکہ سے محبت کرنے لگا ہے اور اب اسے قابلِ پرستش ملکہ کا ہاتھ درکار ہے۔''

اس دلیری اور جرأت کے مظاہرے پر مجمع جیسے سناٹے میں آگیا مگر ملکہ وعدہ کرچکی تھی لہٰذا بولی۔ ''اگرچہ ہمارا شادی کرنے کا کوئی خیال نہ تھا مگر ہم معزز جیرون کو مایوس نہیں کریں گے۔''

اس محفل کے بعد مصر میں دو اہم باتیں ظہور میں آئیں۔ شہزادہ ابراحس کو سزائے موت اور ملکہ حوریا اور جیرون کی شادی۔ ملکہ حوریا نے اپنا وعدہ پورا کردیا تھا مگر اسے مرد کی محبت پر یقین نہ تھا لہٰذا اگلی صبح اس کی خواب گاہ سے جیرون کی لاش برآمد ہوئی۔

☆☆☆

ملکہ نے جیرون کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور باقاعدہ حکومت کرنے لگی۔ شہزادی ولیقیہ اب اس کی دستِ راست تھی۔ اس نے اپنی حکومت میں بہت سے تعمیری کام کرائے۔ طلسم خانے کو وسعت دی، مصر کے اطراف واکناف میں جادو گھر تعمیر کرائے، اسکندریہ کا منارہ بنوایا لیکن عجیب بات تھی کہ اپنی حکومت میں وہ کبھی طلسم خانے نہیں گئی۔ یہاں تک کہ برسوں بعد ایک دن اسے معلوم ہوا کہ طلسم خانے کا داروغہ معدانوس بن دازل اپنی اس مورتی کی پرستش کرتے کرتے مرگیا ہے جس کی نمائش سے اس نے انکار کردیا تھا۔

اس دن ملکہ نے حکم دیا۔ ''معزز معدانوس کو پورے اعزاز کے ساتھ طلسم خانے سے باہر لایا جائے، ان کی ممی تیار کی جائے اور انہیں شاہی خاندان کی ممیوں کے ساتھ محفوظ کردیا جائے پھر ان کی معبود مورتی کی نمائش کی جائے۔''

اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ معدانوس بن دازل کے جسم کو محفوظ کرلیا گیا پھر طلسم خانے سے اس عجیب و غریب مورتی کو بصد احترام نکال کر اس کی نمائش کی گئی۔

ہزاروں افراد جو برسوں سے اسے دیکھنے کے تمنائی تھے، جلوس کی صورت میں جاتے اور متعجب ہوکر لوٹ آتے۔ ان سب کی زبان پر ایک ہی نام تھا۔

''یہ مورتی تو ملکہ حوریا کی ہے۔ مقدس معدانوس زندگی بھر ان کی پرستش کرتے رہے۔''

ملکہ حوریا نے یہ جملے سنے تو جیسے اسے سکتہ ہوگیا۔

اس دن اہلِ مصر توقع کررہے تھے کہ اب ملکہ طلسم خانے میں جائے گی اور اس مورتی کا دیدار کرے گی مگر اگلی صبح ملکہ بیدار نہ ہوئی کیونکہ وہ ابدی نیند سوگئی تھی۔

چند دن بعد مصر کی نئی ملکہ ولیقیہ نے معدانوس اور حوریا کی ممیوں کو بھیگی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

''ملکہ حوریا! عمر بھر تم محبت کے جذبے سے انکار کرتی رہیں مگر آج مان گئیں اور سچ کہو کیا تم نے محبت کا یقین آتے ہی جان نہیں دے دی؟''

اس وقت ملکہ کے بند لب اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ ہار گئی ہے۔

ماخذات:

تاریخ مصر، آرتنا باسائی۔ تاریخ مصر، صفدر حیان۔ ادوار گم گشتہ، یلدا بلارکی، مترجم امین خاکانی

اوور آورز کیفے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور بھڑکیلے لباس میں ملبوس وہ لڑکی جس طرح اندر داخل ہوئی، معلوم ہوتا تھا اس کے پیچھے کوئی عفریت لگا ہو یا پھر...... شاید اس کا دلال۔

ہاں، ٹریسا وین رائٹ اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے لیکن وہ پریشانی نہیں چاہتی تھی جب تک کہ اسے پتا نہ ہو کہ اس کی تلاش میں کون اس کے کیفے تک آسکتا ہے۔

اس نے اسٹین لیس اسٹیل کے نیپکن ہولڈر کو آخری بار کپڑے سے صاف کیا اور پھر اس لڑکی کا جائزہ لیا جو اب کاؤنٹر کے سامنے والے اسٹول پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کی عمر اتنی نہیں تھی۔ شاید بائیس یا تئیس سال۔ اس کی سبز آنکھیں کاجل اور مصنوعی پلکوں کے بوجھ تلے دبی دبی سی لگ رہی تھیں۔ اس کے مختصر بلاؤز کے بٹن اس کے شباب کو چھپانے میں ناکامی کا اعلان کرتے نظر آرہے

بدفطرت

عائشہ نصیر

یہ بات تو طے ہے برائی کا انجام ہمیشہ برائی پر ہوتا ہے... لیکن کچھ لوگ اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں... برا کرکے اچھائی کی توقع رکھتے ہیں... وہ بھی خود کو بہت عقلمند سمجھتی تھی لیکن قدرت نے اس کی ساری عقلمندی کو مندی عقل ثابت کردیا۔

چہرے پر معصومیت کا نقاب ڈالنے والی

ایک بدفطرت حسینہ کی

کارفرمائیاں

تھے۔ شارٹ اسکرٹ، پرنیٹ کے موزے پہنے اس کے پیروں میں لیدر لانگ بوٹس تھے۔ سنہری بالوں کی ہائی پونی ٹیل بنائے اور ناخنوں کو سیاہ رنگ میں رنگے، اس کا حلیہ چیخ چیخ کر اس کا پیشہ بتا رہا تھا۔

جب ٹریسا نے اس لڑکی کو مینیو کارڈ دیا تو اسے تھامتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ٹریسا کا اندازہ تھا کہ یہ لڑکی شاید سڑک پار سے آئی تھی جس طرف ڈرور ڈریم کیفے تھا۔ ٹریسا اچھی طرح جانتی تھی وہاں کیا ہوتا تھا۔ بدقماش اور شرابی ٹرک ڈرائیوروں کو وہاں ڈرگز بھی ملتی تھی اور لڑکیاں بھی۔ ان ٹرکوں اور ٹریلرز کے مالکان کے لیے وہاں کروم کیجلس، گندی ویڈیوز، اے ٹی ایم اور انٹرنیٹ کیوسک تک کا انتظام تھا۔ ٹریسا کے رن ڈاؤن لعل ڈائنر کے برعکس ڈرور ڈریم کیفے چوبیس گھنٹے سرگرم رہتا تھا اور صرف کیفے ہی نہیں، وہاں کا پارکنگ لاٹ بھی۔ کبھی پیشہ ور عورتیں گاڑیوں میں سر گھسا کر گاہکوں کو لبھاتیں، کبھی آوارہ اچکے چاقو کے زور پر وہاں آنے والوں کی جیبیں لوٹتے نظر آتے۔

ٹریسا عورت کا آرڈر لینے کے لیے مڑی اور اس کا دل دھڑک اٹھا جب اس نے اس پرانے ٹرک کے ہارن کی آواز سنی۔ یہ اس کے آنے کا اعلان تھا۔

ٹریسا نے مڑ کر پرانی کافی باہر پھینکی اور کاؤنٹر پر تازہ کافی کا مگ رکھا۔ جب تک وہ اندر نہ آتا، ٹریسا اس کا کھانا نہیں لگاتی تھی اور اسے ہمیشہ پتا ہوتا تھا کہ وہ کیا آرڈر کرے گا۔

وہ چاہتی تھی، خدا جانتا تھا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی کہ وہ اسے ایک تھکی ہوئی، بدمزاج عورت نہ سمجھے۔ وہ یہ بھی بتا سکتی تھی کہ راوک ڈی کیلیب اس میں دلچسپی لے رہا تھا جب ہی تو ہمیشہ ڈنر کے لیے اسی کے ڈائنر کا انتخاب کرتا ورنہ وہ سڑک پار ڈرور ڈریم کیفے بھی جا سکتا تھا اور اندر آنے سے پہلے اپنے پیٹر بلٹ ٹرک کا ہارن بجا کر اسے آمد سے مطلع بھی کرتا۔ یہ ان کے بیچ ایک اشارہ تھا۔

اس کی نظر اس پیشہ ور لڑکی پر پڑی جو کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائے، ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی تھی۔ ٹریسا نے فیصلہ کیا کہ یہ لڑکی انتظار کر سکتی ہے...... اور کیفے کے پیچھے بنے اپنے رہائشی کوارٹر میں چلی آئی۔

اس نے آئینے میں دیکھا پھر اپنے سرخ بالوں کو سامنے سے سنوارتے ہوئے اپنے پپوٹوں کی ڈھلکی ہوئی جلد پر نیلے آئی شیڈو کا ایک کوٹ لگایا۔ رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر غازہ لگاتے ہوئے اسے اپنے ہونٹوں کے اطراف میں جھریاں کچھ زیادہ ہی نمایاں لگ رہی تھیں مگر فی الحال وہ ان سے نمٹنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کسی زمانے میں اس کی تنی ہوئی چمکتی جلد اس وقت ان پھولوں کے مانند تھی جو خزاں کی طرف مائل ہو۔

وہ مڑ کر سامنے سے واپس چلی گئی۔ اس نے اس سنہری بالوں والی لڑکی کی متجسس نظروں کو نظرانداز کیا۔

راوک کو اب کسی بھی وقت دروازے سے اندر آنا چاہیے تھا۔ کسی بھی وقت۔

گلی کے اس پار سے چمکتے نیون میں ٹریسا نے دیکھا، وہ اپنی لاگ بک کو سینے سے لگائے گریس کے داغوں سے اٹے لاٹ کے فرش پر اس بلی کے بچے کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا تھا جو اس بھیگے موسم سے سہما ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ ریک سے مویشی چیخ رہے تھے۔ امونیا اور کھاد کی تیز بو اس نم فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

راوک ڈی کیلیب کافی قدآور اور مضبوط جسامت کا مالک تھا اور ابھی تک کاؤبوائے ہیٹ پہنتا تھا۔ اس کی آواز بھاری اور آنکھیں گہری تھیں جس میں کبھی کبھی مزاح کے رنگ ابھرتے مگر ساتھ ہی ساتھ ایک ناقابلِ بیان تاثر بھی تھا۔ ایک انتباہ جیسے کہہ رہا ہو...... دور رہو، مجھ سے بھڑنا مت...... اور ٹریسا نے اسے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔

لیکن اس کے علاوہ وہ ایک اچھا کاؤبوائے تھا۔ ٹریسا اس کے بارے میں سب جانتی تھی۔ وہ مردوں پر ایک اتھارٹی تھی۔ ایک سابقہ پیشہ ور عورت سے زیادہ مرد کے دل کو اور کون جان سکتا ہے۔ ہاں ٹریسا بھی ماضی میں جسم فروشی کے دھندے سے وابستہ رہ چکی تھی۔ وہ خوش قسمت تھی کہ اس سے زندہ نکل آئی۔ اب اس کے پاس سر چھپانے کو چھت تھی، اچھا کھانا تھا۔ ورنہ اس کام میں پھنسی عورتیں اور لڑکیاں بمشکل ہی اپنی عمر کی چوتھی دہائی دیکھ پاتی تھیں لیکن ٹریسا یہ خود پر خدا کی مہربانی خیال کرتی تھی کہ وہ وقت پر اس دلدل سے نکل آئی تھی اور اس دوران جو تھوڑی بہت رقم اس نے پس انداز کی تھی، اس سے اس اوور آورز کیفے کی ڈاؤن پیمنٹ کر دی جس کی وہ اب اکیلی مالک تھی۔ دراصل اس کیفے کے پچھلے مالک نے سڑک کے اس پار ڈرور ڈریم کیفے کے قیام کے دو ماہ بعد ہی ہار مان لی تھی۔ ظاہر ہے وہاں آنے والے گاہکوں اور ڈرائیوروں کو جو مل رہا تھا وہ فراہم کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ایک سیدھا سادہ آدمی تھا۔

”میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ اس نے ٹریسا کے ساتھ سودا کرتے ہوئے اعتراف کیا تھا۔

ٹریسا نے فوری طور پر تمام ملازمین کو برطرف کر دیا

اور کھانا پکانے، صفائی ستھرائی اور ویٹنگ ٹیبل کا سارا کام خود سنبھال لیا۔ اس نے اکاؤنٹنگ کا ایک آن لائن کورس کیا اور بک ورک اور سرکاری فارموں سے نمٹنا سیکھا۔ اوور آورز کیفے اب مکمل طور پر ایک دن وومن شو تھا۔

نیون کی جھلملاتی روشنی میں ثریا نے راوک کو بلی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ باہر سے گرینائٹ اور اندر سے کسی جیلی کی طرح نرم۔ اس نے کبھی کسی بلی کو ٹھوکر نہیں ماری، کسی ڈھلتی عمر کی عورت پر طنز نہیں کسا، کسی ویٹریس سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ راوک ڈی کیلیب ایک سچا جینٹل مین تھا۔ اب تو وہ دونوں کافی اچھے دوست تھے مگر راوک نے باقاعدگی سے یہاں تب سے آنا شروع کیا جب ثریا نے یہ کیفے خریدا۔ تقریباً ایک سال پہلے ثریا نے نوٹس کیا کہ راوک کی انگلی سے شادی کی انگوٹھی غائب ہو گئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب ثریا کو راوک کے لیے اپنے احساسات کا ادراک ہوا۔ اسے اس بات سے خوشی ہوئی کہ راوک اب شادی شدہ نہیں رہا۔

جب وہ کیفے کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو ثریا کے اعصاب الرٹ ہوئے۔ سنہری بالوں والی بھی چونکتے ہوئے راوک کی جانب متوجہ ہو کر اس کا جائزہ لینے لگی۔ ثریا نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے راوک کا آرڈر لے گی پھر اس لڑکی کی جانب توجہ دے گی۔

"ارے دیکھو تو کون آیا ہے؟" ثریا نے اسے دیکھتے ہی خوشی سے پکارا۔ راوک مسکراتے ہوئے اس اسٹول پر براجمان ہوا اور اطراف کے ماحول میں ڈینم اور چمڑے کی خوشبو بکھرا دی۔

ثریا نے دھڑکتے دل کے ساتھ بھاپ اڑاتی کافی کا کپ اس کے سامنے رکھا۔ اس نے اپنے چہرے سے چھلکتی وارفتہ آمیز خوشی چھپانے کی کوئی زحمت نہیں کی تھی۔

"گاڈ! میں آج سارا دن کافی تکلیف میں رہا۔" راوک نے اعلان کیا۔ شکایت کے بجائے اس کا انداز ایسا تھا جیسے ایک طویل مشکل دن گزار کر گھر آنے کے بعد وہ اپنی بیوی سے بات کر رہا ہو۔

"ارے...... کیا ہوا؟" ثریا متفکر ہوئی۔

"میری پیٹھ...... پچھلے آٹھ گھنٹوں سے مسلسل ڈرائیونگ کا نتیجہ۔" راوک نے ایک نظر سنہری بالوں والی کو دیکھا اور جلدی سے اپنی نظریں واپس مینیو کی طرف موڑیں۔ شاید اس کی نظر بلا ارادہ اس طرف چلی گئی تھی۔

تب ہی ثریا کو اچانک ہی احساس ہوا کہ آج اس ڈائنر میں اس کے علاوہ بھی ایک عورت موجود ہے۔ وہ فوراً ہی اس کے پاس گئی۔ اس نے ایپرن کی جیب سے پیڈ نکالا۔ ثریا کی آنکھوں میں یکدم ہی ایک سرد پتھریلی کیفیت ابھر آئی تھی۔ "آپ کا آرڈر؟"

"اوہ...... میں...... مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں صرف بارش سے بچنا چاہتی تھی۔" لڑکی سر ہلاتے ہوئے قدرے ہکلا کر بولی۔

"ایک منٹ۔" ثریا چونک گئی۔ کیا اس لڑکی کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا؟

ثریا نے محتاط نظروں سے راوک کی طرف دیکھا۔ وہ اب لاتعلق بنا اپنی پاکٹ نائف سے اپنے ناخن صاف کر رہا تھا۔

"تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔" ثریا نے تیزی سے کہا۔ "یہ کوئی موٹیل نہیں ہے۔"

اس لڑکی کے چہرے پر خوف و ہراس تھا۔ "میں واپس نہیں جا سکتی...... نہیں جا سکتی۔ میرے پاس اور کوئی جگہ نہیں، خاتون۔"

ثریا کا جسم اکڑ گیا۔

اب راوک بھی اپنے اسٹول پر آہستہ آہستہ اس طرف گھوم رہا تھا۔ اس کا جسم تن چکا تھا اور چہرہ سپاٹ تھا۔

"اس نے...... اس نے مجھے مارا۔ میں واپس نہیں جا سکتی۔ پلیز! مجھے کی کوشش کرو۔" وہ لڑکی اب منت کر رہی تھی۔

"تو یہ بات میں پولیس کو بتاتا۔" ثریا مڑی اور ٹیلی فون کی طرف چل دی۔

"پلیز! مجھے اپنے بچے کے بارے میں سوچنا ہے۔"

راوک اپنا چاقو بند کر کے اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے اب پوری طرح اس لڑکی کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

ثریا نے خاموشی سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا مگر وہ راوک کا چہرہ دیکھ سکتی تھی۔ اس نے بلی کے بچے کے بارے میں سوچا۔ بارش سے بھیگا کسی کونے میں چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ راوک اس کے لیے بھی فکرمند تھا اور اب اس لڑکی کی بات پر اس نے راوک کی آنکھوں میں اترتی بے چینی بھانپ لی تھی۔

"نہیں...... نہیں۔" ثریا سوچ کر گھبرا گئی۔ اسے راوک کو یہ تاثر نہیں دینا چاہیے کہ وہ کوئی بدمزاج درشت عورت ہے جسے کسی کی مجبوری اور پریشانی کی کوئی پروا نہیں۔

اس نے کن انکھیوں سے راوک کی طرف دیکھا اور پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس لڑکی کی طرف بڑھی۔

"اوہ، ہنی!" ثریا نے کمزوری سے کہا۔

''مجھے واپس جانے پر مجبور مت کرو، پلیز!'' لڑکی کا دھیما لہجہ سرگوشی نما تھا۔ سبز آنکھوں میں خوف لیے وہ ملتجی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' ثریا کی نظر اس کے میلے بلاؤز سے جھانکتے بازو کے ٹیٹو پر گئی اور پھر راوک کی سمت۔ وہ اب بھی خاموش تھا۔

''تم تب تک یہاں رہ سکتی ہو جب تک اپنا کوئی دوسرا انتظام نہیں کرلیتیں پھر ہم دیکھیں گے کہ ہم تمہارے لیے کیا کرسکتے ہیں۔''

ثریا کے اس اقدام پر راوک کی آنکھوں میں واضح ستائش ابھر آئی۔ ثریا نے اندرونی خوشی محسوس کی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟ مجھے تمہارا نام معلوم ہونا چاہیے۔'' ثریا کو اچانک خیال آیا۔

''لیزی...... لیزی نویل۔'' کہتے ہوئے وہ اچانک ہاتھ پیر چھوڑ کر اسٹول سے گرنے لگی۔ راوک ایک جھٹکے سے اپنے اسٹول سے اٹھا۔

''بہتر ہے کہ میں نائن ون ون کو کال کروں۔'' ثریا بڑبڑائی۔ ''اسے پچھلے کمرے میں لے جانے میں میری مدد کرو۔ ہم اسے میرے بیڈ پر لٹا دیں گے جب تک کہ ایمبولینس نہیں آجاتی۔''

''نہیں۔'' لڑکی بند آنکھوں سے کراہی۔ ''نہیں، ایسا مت کرنا۔ وہ مجھے ڈھونڈ لے گا تو چھوڑے گا نہیں۔ پلیز! میرے پاس آج سارا دن کچھ کھانے کو نہیں تھا اسی لیے چکر آگیا، بس۔''

''کمینہ۔'' راوک غصے سے بولا۔ ''یہ کون حیوان ہے جس کے ساتھ تم رہ رہی تھیں؟''

راوک اس لڑکی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر ثریا کے کوارٹر میں لے آیا اور اسے نرمی سے بستر پر لٹا دیا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس کوئی ہیلتھ انشورنس بھی نہیں ہوگی۔'' راوک اب دروازے میں کھڑا پریشانی سے لیزی نویل کو گھور رہا تھا۔

ثریا سینے پر ہاتھ باندھے لیزی کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اسے اس لڑکی کے رویے میں بہت سی باتیں کھٹک رہی تھیں جیسے جب ثریا نے اس کا نام پوچھا تو وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی جیسے سوچنے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر کرسمس ٹری کو دیکھ کر اس نے جھٹ سے اپنا نام بتایا۔ ثریا یقین سے کہہ سکتی تھی یہ اس کا اصلی نام نہیں تھا مگر وہ اپنی یہ سوچ راوک کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیزی نویل کا حلیہ واضح تھا۔ وہ کوئی ورجن میری نہیں تھی۔ یہ بات تو راوک بھی جانتا ہوگا مگر اس وقت اسے وہ لڑکی صرف ایک مصیبت زدہ مظلوم دکھائی دے رہی تھی تو ثریا درمیان میں مداخلت نہیں کرسکتی تھی۔ فی الحال اسے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔

''تمہیں اچھے کھانے کی ضرورت ہے اور کوئی ایسا جو تمہارا خیال رکھ سکے۔ تم جب تک چاہو یہاں آرام کرسکتی ہو۔'' ثریا نے مضبوطی سے کہا۔

''اوہ، میڈم! میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔'' لڑکی خوشی سے مسکرائی۔

اگر ثریا کو کوئی شبہ تھا بھی کہ وہ صحیح کر رہی ہے یا غلط تو راوک کو اپنی طرف عقیدت سے دیکھتا پا کر اس کے سارے واہمے ہوا ہوگئے۔

''تم بہت اچھی ہو ثریا!'' وہ واقعی متاثر تھا۔

ثریا کے چہرے پر سرخی چھائی۔ ''یہ کم سے کم ہے جو میں کرسکتی تھی۔''

وہ دونوں کمرے سے نکل کر کیفے میں آئے۔

''مجھے لگتا ہے کہ مجھے اب جانا چاہیے۔ بس مویشیوں کو ایک نظر دیکھ لوں۔''

''لیکن تم نے کھانا نہیں کھایا۔'' ثریا نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

''کوئی بات نہیں۔ میری بھوک ختم ہوگئی ہے۔'' اس کے بعد اس نے اپنا بٹوا نکالا اور سو ڈالر کے دو بل نکال کر ثریا کے حوالے کردیے۔ ''اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو شاید اس سے کچھ مدد ہوجائے۔ پتا نہیں وہ اپنے اسپتال کے اخراجات کا کیا کرے گی۔''

ثریا نے رقم کی طرف دیکھا اور پھر راوک کی طرف۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک مظلوم اور کمزور لڑکی کے لیے فکرمند ہے۔

وہ گلاس ڈور کھولنے لگا پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ راوک کا ہاتھ اس کے شانے پر آٹھہرا تھا۔ ثریا کا دل کسی نوخیز لڑکی کی طرح دھڑک گیا۔ راوک نے پہلے کبھی اسے نہیں چھوا تھا۔

''تم نے اس لڑکی کی مدد کرکے بہت اچھا کیا ثریا! مجھے تم پر فخر ہو رہا ہے۔''

خوشی کے مارے اس نے شرماتے ہوئے ٹائل کے فرش کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے سر اٹھایا۔ ''میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ ایسا کوئی بے حس ہی ہوگا جو ایک مجبور مصیبت زدہ لڑکی کو سڑک پر مرنے کے لیے چھوڑ دے۔'' اس نے کہا۔

''اور اس کے بچے کو بھی۔'' راوک آہستگی سے بولا۔

☆☆☆

لیزی نوبل کافی تیزی سے صحت یاب ہوئی تھی۔ وہ جوان تھی اور ٹریسا جانتی تھی جوان لوگوں کو ٹھیک ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ بس تھوڑا سا پروٹین اور چند وٹامنز۔

اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے لیزی کو ان دو سو ڈالر کے بارے میں بتادیا جو راوک نے اس کے لیے دیے تھے اور لیزی نے فوراً ہی اس کا مطالبہ کردیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اسے اپنے پہلے میڈیکل اپائنٹمنٹ کے لیے اس کی ضرورت ہے۔

وہ صبح ٹریسا کے پرانے فورڈ میں نکلی اور بارہ گھنٹے بعد نشے میں دھت ہوکر واپس آئی۔ چہرے پر ہنوز گھٹیا میک اپ کیے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں دو شاپنگ بیگز تھے۔ ایک میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے پلاسٹک کی بالیاں نکالیں جو روشنی میں رنگ بدلتی تھیں اور ایک گلابی کرلز کے ساتھ سنہری بالوں کی وگ نکالی۔ اس میں ٹریسا کو کہیں بچوں کے کپڑے نظر نہیں آئے۔

''میڈیکل اپائنٹمنٹ کیسی رہی؟'' ٹریسا نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ویل، ایک مزے کی بات بتاؤں گرینڈ ماں! اس کمینے بڈھے کھوسٹ ڈاکٹر نے میڈیکل انشورنس کے بغیر مجھ سے بات کرنے سے ہی انکار کردیا۔ یہ تو شرم کی بات ہے۔ اس کے لیے کوئی قانون ہونا چاہیے۔''

ٹریسا کے گال غصے سے پھڑک اٹھے۔ اس بچ طوائف نے اسے دادی ماں کہا۔ ''لیکن یہ جاننے کے لیے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں کہ تمہیں پریگنینسی میں شراب نہیں پینی چاہیے۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں۔'' اس نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا۔

''نہیں۔'' لیزی نے طنز کیا۔ ''میرا بے بی کافی مضبوط ہے۔'' اس نے اپنا پیٹ تھپتھپایا۔ ''اسے شراب پسند ہے اور سگریٹ بھی۔'' اپنا نیا پرس ٹٹولتے ہوئے سگریٹ پیکٹ اور نیا لائٹر نکالا اور سگریٹ جلاتے ہوئے دھواں ٹریسا کے چہرے پر اڑادیا۔

''تم...... تم...... چھوٹی...... کتیا۔'' ٹریسا نفرت سے بڑبڑائی۔

''بس بھی کرو دادی ٹریسی! اگر اس نیک دل راوک ڈی کیلیب نے تمہیں اپنی چھوٹی لیزی سے ایسی ظالمانہ باتیں کرتے سن لیا تو کیا سوچے گا؟'' وہ اب واضح طور پر اس کا تمسخر اڑا رہی تھی۔

ٹریسا کا دماغ جلنے لگا۔ غصے کے باعث اس کے پورے جسم پر لرزہ سا طاری ہوا۔ اسی وقت ان دونوں نے راوک کے ٹرک کا ہارن سنا اور جب وہ لاٹ میں داخل ہوا، لیزی اگلے ہی پل اس کا استقبال کرنے کو دروازے سے باہر تھی۔

وہ چھوٹی بلی آج پھر کہیں سے نکل آئی تھی۔ راوک نے جھک کر اس پر ہاتھ پھیرا تو لیزی سرعت سے اس کے پاس پہنچی اور گھٹنے ٹیک کر اس بلی کے بچے کو اپنی بانہوں میں اٹھالیا۔ یہ منظر کافی دلکش تھا جس میں لیزی ایک نرم دل اور ہمدرد لڑکی نظر آرہی تھی۔

کچھ دیر بلی کے بچے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد لیزی نے ایک بار پھر جھک کر اسے زمین پر چھوڑا۔ اس طرح جھکتے ہوئے اس کے کشادہ گریبان سے جھانکتے اس کے شباب کے نظارے اتنے طاقتور تھے کہ اگر کوئی اس سے نظر چراتا تو وہ انسان نہ ہوتا۔ راوک بھی یہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ جم سا گیا۔

دور کھڑی ٹریسا یہ سب دیکھتے ہوئے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ قسم کھا سکتی تھی کہ لیزی نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی۔

ٹریسا نے گھوم کر تازہ کافی کا مگ کاؤنٹر پر رکھا۔ جب وہ دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے، ٹریسا نے راوک پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر ایسی جاندار مسکراہٹ تھی جو ٹریسا نے اس سے پہلے کبھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

لیزی تیزی سے ٹریسا کے پاس آئی اور آرڈر پیڈ چھین کر ہاتھ میں پنسل لیے راوک کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ بالکل ٹریسا کی طرح۔

''دادی ٹریسی نے مجھے بتایا کہ وہ پیسے آپ نے دیے تھے۔'' لیزی نے آہستہ سے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ کو معلوم ہو کہ میں نے وہ پیسے کچھ ڈائپرز، کمبل اور بچے کے کپڑوں پر خرچ کیے۔ جن کی ضرورت پڑے گی۔''

ٹریسا کی روح تڑپ اٹھی۔ اس بار لیزی نے راوک کے سامنے اسے دادی کہا تھا۔ ''چھوٹی کتیا۔''

''مدد کرکے خوشی ہوئی۔'' راوک خوش دلی سے بولا۔ ''ڈاکٹر سے ملاقات کیسی رہی؟''

''یہ نہیں ہوا۔'' لیزی نے چہرے پر اداسی طاری کی۔ ''اس نے کہا میری میڈیکل انشورنس کے بغیر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا۔'' لیزی نے آنکھوں کو یوں مسلا جیسے آنسو چھپانے کی کوشش کررہی ہو۔ ''لیکن تم میری فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوجاؤں گی۔ جب ڈیلیوری کا وقت آئے گا تو میں

نہیں بنائی تھی مگر اس وقت لیزی کی مکاری کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ کوئی بھی جھوٹ بول سکتی تھی۔

''میں ایک بیلچہ لے کر آتی ہوں۔'' ٹریسا نے سرد لہجے میں کہا۔

راوک نے کافی تیزی سے وہ زمین کھود کر ایک گڑھا تیار کیا اور نرمی سے مخمل میں لپٹی بلی کو اس قبر میں اتار دیا۔ وہ تینوں ایک منٹ کے لیے اس قبر کے گرد خاموش کھڑے رہے پھر راوک دھیرے سے دعائیہ الفاظ بدبدانے لگا۔

''مجھے افسوس ہے سویٹی کہ ہم اس کے لیے کسی باکس کا انتظام نہیں کر پائے۔'' راوک نے جاتے جاتے کہا۔

اور ٹریسا لفظ ''سویٹی'' پر کانپ کر رہ گئی۔

☆☆☆

راوک تین دن بعد واپس آیا تھا۔ ٹریسا نے گلاس وال سے انہیں پارکنگ میں دیکھا۔ وہ اور لیزی نویل بانہوں میں بانہیں ڈالے اندر آرہے تھے۔

''ہمارے پاس آپ کو بتانے کے لیے کچھ ہے۔'' لیزی نے اندر آتے ہی چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں کافی دنوں سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔'' راوک نے کہا۔ ''اور اب ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ بات سب سے پہلے تمہیں پتا چلنی چاہیے۔''

لیزی کھلکھلائی۔ ''کیونکہ آپ میری اور راوک، ہم دونوں کی واحد باہمی دوست ہیں۔''

ٹریسا ساکت ہوئی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اسے کیا بتانا چاہ رہے تھے۔

''لیزی ٹھیک کہتی تھی، تم جانتی ہو......'' راوک نے آہستہ سے کہا۔ ''اس کے بن باپ کے بچے کو یہ دنیا کوئی موقع نہیں دے گی۔ اس معصوم بلی کی موت نے یہ ثابت کر دیا۔ اسی لیے میں نے مس لیزی کو شادی کی پیشکش کی اور مس لیزی نویل نے مجھ سے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کردی ہے۔ میں اس کے بچے کو اپنا نام دوں گا۔''

''اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری میڈ آف آنر بنیں، دادی ٹریسی!'' لیزی کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

ٹریسا کا دل چاہا وہ لیزی کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کردے، اس کے بال نوچے، اس کے چہرے پر گرم کافی پھینک دے لیکن اس نے کہا تو صرف اتنا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس خوشی کے موقعے پر میں ایک نیا لباس ضرور خریدوں گی۔''

''اور اس کی بیوی کے طور پر کمپنی میرے ہیلتھ انشورنس کی ادائیگی کرے گی۔'' لیزی نے کہا۔ ''اور لائف انشورنس۔ اگر میرے شوہر راوک ڈی کیلیب کے ساتھ کوئی بھی حادثہ پیش آیا تو میرا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔''

بے آواز، ٹریسا صرف سر ہلا سکی۔ وہ ان گندے برتنوں کو گھور رہی تھی جنہیں اس نے دھویا نہیں تھا۔ ایک ڈالر کی ٹپ گندی پلیٹ کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔ بیکن اور انڈوں کی شدید بو سے اس کا جی الٹنے لگا۔

ٹریسا جانتی تھی کہ لیزی کے لیے اس شادی کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ جانتی تھی کہ کوئی بچہ نہیں تھا۔ لیزی کو صرف راوک کی لائف انشورنس پالیسی سے مطلب تھا اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتی تھی۔ ٹریسا کو اب لیزی کی بدفطرتی کا اچھی طرح اندازہ ہوچکا تھا۔

راوک ڈی کیلیب، ٹریسا کا محبوب، کیا ایک لاش میں بدلنے والا تھا؟ ٹریسا سوچ کر ہی لرز گئی۔ اس نے لیزی کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔

اگلے تمام ہفتے ٹریسا کے ذہن میں جنگ چھڑی رہی۔ اس نے حالات کا تجزیہ کیا اور سوچا، کیا وہ پولیس کو بلائے؟ مگر وہ انہیں کیا بتائے گی کہ اسے ڈر ہے کہ لیزی کیا کرسکتی ہے؟ وہ صرف اس گفتگو کا تصور کرسکتی تھی۔

کیا وہ راوک کو بتائے؟ لیکن یہاں وہ پہلے سے ہی جانتی تھی کہ کیا ہوگا۔ لیزی صاف مکرتے ہوئے اسی پر الزام دھر دے گی کہ وہ اس سے جلتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ راوک کے سامنے اس کا بدنام ماضی بھی بے نقاب کردے۔

ٹریسا کو احساس ہوا کہ اب راوک کو بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور اسے یہی کرنا تھا۔

زہر لیزی کا پسندیدہ طریقہ تھا۔ بہت اچھے...... تو اس بار بھی زہر ہی استعمال ہوگا۔ ٹریسا نے عزم باندھا۔

ویسے بھی آدھا وقت تو لیزی نشے میں دھت رہتی تھی۔ ٹریسا کے لیے یہ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا، اگر وہ اس کی شراب کی بوتل میں اینٹی فریز ملا دے۔ وہی اینٹی فریز جس سے اس نے اس معصوم بلی کے بچے کی جان لی تھی۔

ٹریسا نے دروازے میں کھڑے ہوکر نفرت بھری نظروں سے اس عورت کی طرف دیکھا جو اسے قاتل بنا رہی تھی۔

لیزی صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ انداز میں بے فکری نمایاں تھی۔ آج راوک کے آنے کا دن نہیں تھا اس لیے بھی وہ اپنا ہیجان خیز آدھا ادھورا مختصر لباس پہنے سامنے والے ڈرور ڈریم کیفے کی طرف جانے کی تیاری میں تھی۔ اس کا جسم کہیں سے بھی ایک حاملہ عورت کا جسم نہیں لگ رہا

تھا۔ لیزی بھی یہ بات جانتی تھی اسی لیے تو جب راوک کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ اپنا میٹرنٹی اسموک ڈریس پہن لیتی اور اس کے نیچے اپنے پیٹ پر پیڈنگ چڑھا دیتی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے ٹریسا سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ راوک کے سامنے اس کی پول کھول سکتی ہے۔

ٹریسا اپنے رہائشی کوارٹر میں واپس آئی۔

قتل...... کیا وہ واقعی قتل پر غور کر رہی تھی؟

مگر لاش کا کیا؟ اسے اچانک بلی کی تازہ قبر کا خیال آیا۔ اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

وہ بلی کی قبر کو مزید گہرا کرے گی پھر لیزی کی لاش کو پلاسٹک شیٹ میں لپیٹ کر اس میں پھینک دے گی۔

ہر مسئلے کا حل تھا۔ اس کے باوجود ٹریسا کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ زبردستی کے مارچ پر ہو اور اس کا ہر ایک قدم ایک پہاڑ کی سمت جا رہا ہو۔

راوک کو مطمئن کرنے کے لیے بھی اس نے کہانی سوچ لی تھی۔ وہ بے چارہ پہلے ہی اپنے اور لیزی کے عمروں کے فرق کے باعث کچھ کھسیاہٹ کا شکار تھا۔ اسے قائل کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ لیزی کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔

ٹریسا نے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔ اس کی آنکھیں نیند کی کمی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے کل کے دن اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اسے کافی ٹال چکی تھی۔ اگلے تین دن تک راوک کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور ٹریسا کی تیاری مکمل تھی۔

اس نے بلی کی قبر کو گہرا کیا اور لیزی کے ووڈ کا مکس میں اینٹی فریز ملا دیا۔

مگر پھر...... اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

یہ شام کا وقت تھا جب ٹریسا دیگر گاہکوں سے فارغ ہو کر لیزی کے انتظار میں تھی۔ اس کا کافی کا کپ پکڑا ہوا ہاتھ کانپ گیا جب اس نے گلاس وال کے پار لیزی کو سامنے والے ڈرور ڈریم کیفے کی۔۔۔ پارکنگ میں کھڑے ٹرک میں چڑھتے دیکھا۔ اسی وقت بیرونی دروازہ کھلا اور راوک اندر داخل ہوا۔ ٹریسا نے بے اختیار ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

راوک حیران نظر آیا۔ اس نے ابھی تک لیزی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈبے میں جوتوں کا ایک چھوٹا جوڑا نیچے رکھتے ہوئے اس نے ٹریسا کی طرف دیکھا۔ ”بچے کے لیے۔“

”وہ سامنے ہے۔“ ٹریسا نے سرگوشی کی۔ باوجود کوشش کے اس کی آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ ”سڑک کے اس پار۔“ وہ آخر کار کامیاب ہوگئی۔ ”وہ گلی کے اس پار ہے۔“

راوک ایک لمحے کو ساکت ہوا پھر اس نے پلٹ کر دیکھا اور اگلے ہی پل وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

ٹریسا اسے ڈھلتی شام کی روشنیوں میں دیکھ سکتی تھی اور دیکھ رہی تھی۔ وہ اس ٹرک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

لیزی نوبل جب ٹرک سے نیچے اتری، تب ہی اس کی نظر راوک پر پڑی۔ وہ اپنے اسی مخصوص مختصر اور واہیات لباس میں تھی۔ لمبی ٹانگوں سے چپکی پتلون، وسیع گریبان والا ناکافی سا ٹاپ جس سے اس کا چپٹا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔

پہلے پہل اس کی آنکھوں میں خوف اور بے یقینی ایک ساتھ ابھرے۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ راوک اس طرح اچانک ہی چھاپا مار سکتا ہے۔ اس کی آمد غیر متوقع تھی کیونکہ آج اس کے آنے کا دن نہیں تھا۔

راوک اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ اس کے بازو اس کے پہلو میں بے بسی سے لٹک رہے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے کون اس وقت زیادہ بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔ لیزی اچانک راوک کو اپنے سامنے دیکھ کر یا پھر راوک اس کا یہ روپ دیکھ کر۔

مگر وہ لیزی تھی۔ اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ پانسا پلٹ چکا تھا۔ اب نہ کسی وضاحت سے بات بنتی تھی نہ مگرمچھ کے آنسوؤں سے۔ اسی لیے ایک مکارانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اس نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راوک کو انگلی دکھائی اور ڈرور ڈریم کیفے میں غائب ہوگئی۔

ایک گہری سانس بھرتے ہوئے ٹریسا نے چھوٹے جوتے اٹھائے، لیزی کا سامان اکٹھا کیا اور باہر رکھے کچرے کے ڈبے میں پھینک آئی۔

اس کی آنکھوں میں شکر گزاری کے آنسو تھے۔ وہ قاتل بننے سے بچ گئی تھی۔ لیزی نام کا ڈراؤنا خواب ختم ہو چکا تھا۔ اب اسے کبھی لیزی نوبل کی شکل نہیں دیکھنا پڑے گی۔

اور راوک...... وہ جانتی تھی کہ اس میں کچھ وقت لگے گا لیکن وہ سنبھل جائے گا۔ کچھ المیہ گیت سن کر، ہائی وے کی میلوں کی ریت چھان کر، چند آنسو بہا کر، راوک پھر سے پہلے والا راوک بن جائے گا۔

اسے یقین تھا۔

⌘⌘⌘

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا.. پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان
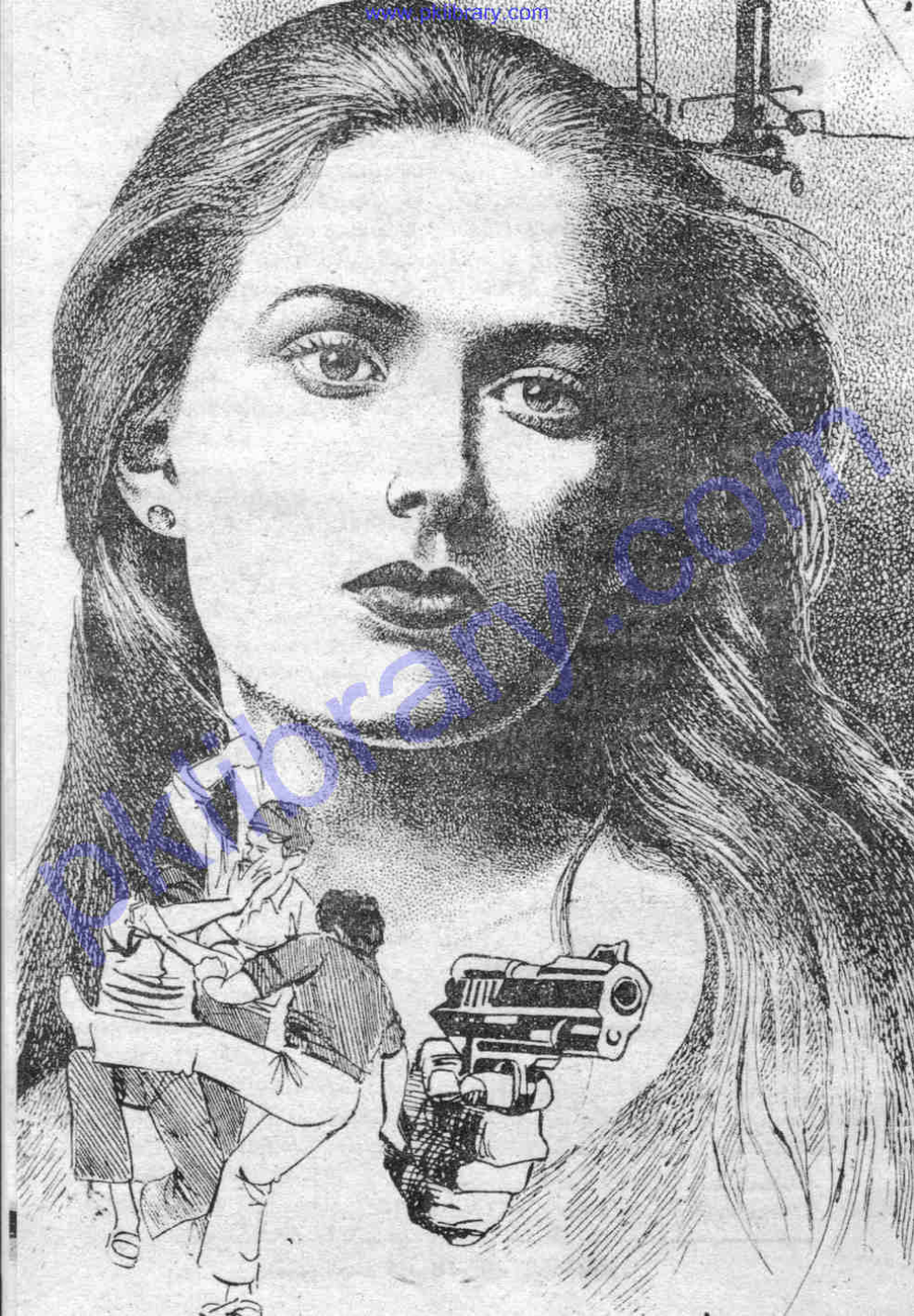
گذشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کردیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کررہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کرکے ماردیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کردیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کرکے اسے ان کے حوالے کردیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کردیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کرلیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کرکے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہوجاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنالیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگادیتے ہیں۔ عالم شاہ، نجل اور سرمد انڈیا روانہ ہوجاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ بنگلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہوجاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہوجاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے نجل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ علینہ پاکستان میں ثوبیہ

سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے نجل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہوجاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر۔۔ لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدر الدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کرا لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے "را" کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، نجل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آجاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ نجل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آجاتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہوجاتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آجاتی ہے۔ معاذ اور وکی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ موی کی تدفین ہوجاتی ہے۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشریٰ قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشریٰ اپنی دوست کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشریٰ کو لے کر انڈر گراؤنڈ ہوجاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل یمی کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وکی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وکی زخمی ہوجاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہوجاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وکی اور بشریٰ بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کرا دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہوجاتا ہے۔ عرفان اللہ کی سیکریٹری صوفیہ کو خفیہ ادارے کے لوگ اٹھا لیتے ہیں لیکن صوفیہ وہاں اپنی جان دے دیتی ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ نجل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ نجل اسپتال میں زیرِ علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ معاذ۔ وقاص وغیرہ کے ساتھ علینہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ نجل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یوآن منگ، اینڈریو کے ذریعے نجل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ عالم نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہوجاتا ہے۔ نجل کا آپریشن کامیاب رہتا ہے تاہم اس کا ایک ہاتھ اور نچلا دھڑ ناکارہ ہوجاتا ہے۔ ادھر معاذ کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ ایک کشمیری لڑکی کی مدد کرنے کی پاداش میں بھارتی سپاہی اسے گرفتار کرنے بنجامن کی دکان پر ریڈ کرتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بھارتی فوجی اپنے سپاہی کے قاتل کی تلاش میں بنجامن کی دکان تک آگئے تھے۔

''ہیلو سر! کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟'' بنجامن جو اس سے بھی پہلے ان لوگوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہو چکا تھا، عاجزی سے پوچھنے لگا۔

''عمار کون ہے تمہارے ایمپلائز میں؟'' درشت لہجے میں کیا گیا سوال جہاں اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا گیا وہیں بنجامن کے چہرے کی رنگت بھی تبدیل ہوئی۔

''میں عمار ہوں۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' اس سے ضبط نہیں ہوا اور دو قدم مزید آگے آیا۔

''خدمت کے بچے! چل کر بیٹھ گاڑی میں۔ آج ہم خود تیری خدمت کریں گے۔'' اس کا لہجہ مزید جارحانہ ہوگیا۔

''پر اس نے کیا کیا ہے؟ یہ تو بہت شریف اور کام سے کام رکھنے والا نوجوان ہے۔'' بنجامن نے ایک بار پھر ان لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''پیچھے ہٹو۔ یہ نہ ہو کہ ایک دہشت گرد کی طرفداری کرنے کے جرم میں، میں تمہیں بھی اریسٹ کرسکتا ہوں۔'' اس نے بنجامن کو جھڑکا۔ اس کی زبان سے نکلا دہشت گرد کا لفظ اتنا ہولناک تھا کہ ہر شخص ہی اپنی جگہ لرز کر رہ گیا اور نہایت ترحم سے اس نوجوان کو دیکھا جو چند دن کے ساتھ میں ہی اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

''تو تم پاکستان آرمی کی قید سے فرار ہو کر جامی تک پہنچی تھیں اور اس نے سمندر کے راستے تمہیں غیر قانونی طور پر یہاں بھجوادیا؟'' وہ ڈیوڈ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اس سے طنزیہ لہجے میں مخاطب تھا۔

''کوئی شک؟'' وہ سونیا تھی۔ اس کے لہجے پر کنفیوز ہوئے بغیر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''شک تو ہے پر مسئلہ یہ ہے کہ تمہارے پاس خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے ثبوت پورے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اپنا لہجہ تبدیل نہیں کیا۔

''بس تو پھر بہتر ہے کہ تم اپنا منہ بند ہی رکھو۔'' اس نے ڈیوڈ کی عمر کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

''نہیں رکھ سکتا میں اپنا منہ بند۔ تم ماں بیٹی کی حماقتوں کی وجہ سے میرا یہاں بنا بنایا سیٹ اپ تباہ ہوگیا ہے۔ سب سے بڑھ کر کثیر سرمایہ لگا کر قائم کی جانے والی وہ لیب تباہ ہوگئی ہے جہاں پروفیسر اینڈریو بے حد اہم تجربے میں معروف تھا اور کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔'' ڈیوڈ کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا اور اس کے غصے کی وجہ بھی سامنے آگئی۔

''غیر یقینی حالات کبھی بھی پیش آسکتے ہیں۔ یہ تمہاری ذمے داری تھی کہ ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کا انتظام کر کے رکھتے۔'' ڈیوڈ کے غصے کی شدت اس کے اطمینان پر اثر انداز نہ ہوسکی۔

''یہ تم اور تمہاری ماں تھیں جن کی وجہ سے وہ باسٹرڈ معاذ یہاں تک پہنچا اور اس نے سب تباہ کر کے رکھ دیا۔ اگر تمہاری ماں اسے پوری طرح ٹریننگ دینے اور اپنا وفادار بنانے میں ناکام رہی تھی تو اسے میدان میں کیوں اتارا تھا؟ لیکن وہ کیا خاک اس لڑکے کی تربیت کرتی، اس سے تو اپنی بیٹی بھی نہ سنبھالی گئی۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر تم نے تنظیم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اب بھی اسی کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہو۔'' ڈیوڈ نے اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔

''تم یہ سب کہہ سکتے ہو لیکن جو مجھ پر گزری ہے، وہ شاید ہی کوئی سمجھ سکے۔ تنظیم سے غداری کا داغ اپنے دامن پر برداشت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میری ماں اور میں نے اپنی پوری پوری زندگی تنظیم کو دی ہے۔ ہماری طرف انگلی اٹھانے سے پہلے تم یہ تو دیکھ لیتے کہ ہمارا سب کچھ تنظیم کا ہے۔ نہ ہم نے کبھی اپنی ذات کے لیے کچھ کمایا، نہ دنیا کے کسی حصے میں جائدادیں کھڑی کیں، نہ کبھی اپنی خواہش سے کسی تفریح کے لیے گئے، نہ خود کو محبت کرنے یا اپنی پسند سے شادی کرنے کا حق دیا۔ دیکھو میری طرف......'' اس نے بلند آواز میں کہتے ہوئے انگوٹھے سے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھ جیسا حسن دنیا میں کتنی عورتوں کو نصیب ہوتا ہے؟ میں کسی راستے پر چلوں تو لوگ گردن موڑ موڑ کر میری طرف دیکھتے ہیں لیکن میں نے صرف اور صرف تنظیم کے مفادات کی خاطر حسین نوجوانی میں اس موٹے، بھدے، کم عقل، کم شکل اور عمر دراز داراب خان سے شادی کرنا قبول کرلیا تھا۔''

''اور یقیناً اسی محرومی کو مٹانے کے لیے ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکے پر مرمٹیں؟'' ڈیوڈ کو ایک بار پھر طنز و تشنیع کا موقع مل گیا۔

''شٹ اپ!'' سونیا اس کی بات سن کر پہلے غرائی پھر پست لہجے میں بولی۔

"وہ کوئی عشق وشق نہیں تھا۔ میں ٹرانس میں تھی۔ اس نے میرے ساتھ کچھ ایسا کیا تھا کہ میرا دماغ میرے بس میں نہیں تھا۔"

"تم کہنا چاہتی ہو کہ وہ کوئی ہپناٹسٹ یا جادوگر ہے؟" ڈیوڈ نے اپنی ایک ابرو چڑھائی۔

"مجھے نہیں پتا کہ وہ کیا ہے لیکن کچھ تو ہے جو کبھی کسی کے قابو میں نہ آسکا۔ پروفیسر وکٹر نے اس پر کتنا کام کیا لیکن ہم کبھی اسے اپنی مرضی پر نہ چلا سکے۔ یہاں تک کہ وکٹر کی وہ خاص ڈیوائس بھی اس کے آگے فیل ہوگئی جو دماغ کے سگنل وصول کر کے کسی شخص کا کھوج لگانے میں مدد دیتی ہے۔ وہ زندہ تھا اور ہمارے ساتھ ایک ہی شہر میں موجود تھا لیکن اس کے غائب ہونے پر ڈیوائس نے ہمیں کوئی سگنل نہیں دیا۔ ہم اپنے تمام وسائل استعمال کر کے بھی اسے تلاش نہیں کر سکے اور نہ ڈیوائس نے کوئی اشارہ دیا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ وہ زندہ ہی نہیں ہے لیکن وہ زندہ تھا اور ہمارے خلاف مسلسل کارروائیاں کر رہا تھا۔" وہ ذرا سانس لینے کو رکی۔

"اور تم...... تم جو مجھے اتنی باتیں سنا رہے ہو، تم اس کے خلاف کیا کر سکے؟ وہ تمہاری ساری محنت برباد کر کے خود چائنا کی گود میں جا بیٹھا اور تم یہاں اپنے زخموں کو چاٹتے محض مجھ پر طنز اور الزامات کی بوچھاڑ کرنے کے لیے بیٹھے رہ گئے۔" اس بار اس نے ڈیوڈ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی۔

"چائنا کا رویہ بہت عجیب ہے۔ ایک طرف وہ ہمارے ملک سے تجارتی اور کاروباری معاہدے کر رہا ہے تو دوسری طرف ہمارے مخالفین کی پشت پناہی بھی کر رہا ہے۔ لیب کی تباہی ہمارا بہت بڑا نقصان ہے۔ حالات ایسے ہوگئے تھے کہ جو کچھ بچا، ہمیں خود ختم کرنا پڑا۔ وہ سارے مغوی جوان برفانی پہاڑی غاروں میں چھپے ہوئے تھے اور وہ جو کمک لینے کے لیے نکلے تھے، سب کو چن چن کر ہلاک کرنا پڑا۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے اور وہ ہمارے کسی مخالف یا سرپھرے صحافی سے جا ٹکراتے تو بڑی مشکل ہوجاتی۔ بھارتی سرکار نے تو صاف ہاتھ اٹھا لینا تھا کہ انہیں ان سارے معاملات کی کوئی خبر نہیں۔" ڈیوڈ نے اپنے دکھڑے رونے شروع کردیے۔

"یہی میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں۔ نقصان دونوں کا ہوا ہے تو کیا بہتر نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو الزام دینے کے بجائے دشمن کے خلاف مل کر کارروائی کریں؟" سونیا نے اس بار اپنا لہجہ نرم کرلیا۔

"میں تم لوگوں کو الزام اس لیے دیتا ہوں کہ رابیل سے انتخاب میں غلطی ہوئی ہے۔ اس نے ہم سب کے لیے ایک مصیبت کو چن لیا ہے۔" ڈیوڈ کو میڈم ایکس سے پرانی پرخاش تھی جو اسے اس کے خلاف بولنے سے روک نہیں پاتی تھی۔

"چنا تو انہوں نے ایک نایاب ہیرا ہی تھا، وہ اور بات کہ ہمارے پاس ایسے قابل جوہری ہی نہیں تھے جو اسے تراش پاتے۔"

"تم بہت متاثر ہو اس سے؟" ڈیوڈ کو میڈم ایکس کے حق میں دی گئی دلیل میں بھی اس کا معاذ سے عشق دکھائی دیا۔

"جب تک مخالف کی خوبیوں کو تسلیم نہ کیا جائے، اس سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب آپ مان لیتے ہیں کہ وہ کس لیول پر کھڑا ہے تب ہی اس کے لیول کے مقابلے کی تیاری کرتے ہیں۔" سونیا نے اس بار بھی بردباری کا مظاہرہ کیا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تم سے مزید بحث نہیں کروں گا کیونکہ اصل جوابدہی تو تمہیں تنظیم کے بڑوں کے سامنے ہی کرنی ہے اور اس کے لیے تم جانے ہی والی ہو۔" ڈیوڈ نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"میں تمہاری مشکور ہوں کہ تم نے میری فرمائش پر پہلے ہی سے سارے انتظامات کررکھے تھے۔"

"اٹس اوکے۔ یہاں کوئی کام انجام دینا میرے لیے اتنا ہی آسان ہے جتنا اپنے ملک میں ہوسکتا ہے۔" ڈیوڈ نے بے نیازی سے شانے اچکا کر جواب دیا۔ وہ اپنے اس رویے میں حق بجانب تھا۔ سونیا کی آمد سے پہلے پہلے اس کے لیے پاسپورٹ، ٹکٹ اور دوسرے سفری دستاویزات کا انتظام اس نے محض چند فون کالز پر ہی کر ڈالا تھا اور اب وہ چند گھنٹوں کے آرام کے بعد مزے سے اڑان بھرنے کے لیے تیار تھی۔

"ایسا ہی سیٹ اپ ہمارا پاکستان میں بھی تھا جسے شدید نقصان پہنچا ہے لیکن خیر، کوئی بات نہیں۔ ہم دوبارہ سب ٹھیک کرلیں گے۔ ہماری جڑیں اب بھی وہاں موجود ہیں۔ ان جڑوں سے تنا، شاخیں اور پھول پتے پھوٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔" اس نے جانے ڈیوڈ کو تسلی دی یا خود کو۔

"تمہاری فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہیں اب ائرپورٹ کے لیے نکل جانا چاہیے۔" اس بار ڈیوڈ نے بحث سے گریز کیا اور ایک بار پھر کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اس سے سنجیدگی سے بولا۔

''اوکے...... گڈ بائے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈیوڈ نے اس سے ہاتھ ملایا۔ باہر ڈرائیور گاڑی سمیت اس کا منتظر تھا۔ ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے وہ سارا وقت یاد آیا جو اس نے معاذ کے ساتھ انڈیا میں داخل ہونے کے بعد گزارا تھا۔ اسے اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش، اس کا بار بار جل دے جانا اور پھر گدھے کے سر پر سے سینگ کی طرح غائب ہوجانا۔ اس کے غیاب کے عرصے میں وہ اس کی تلاش میں کیسے ماری ماری پھری تھی۔ اسے سب یاد تھا۔ معاذ کی تلاش کے اس عرصے میں ہی اس نے اس کے لیے اپنے جذبات کو ٹٹولا تھا اور دھیرے دھیرے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوگئی ہے۔ موقع ملنے پر وہ اس پر اپنے ان جذبات کو ظاہر بھی کرگئی تھی لیکن معاذ کے پاس جواب میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس عورت کے سحر میں مبتلا تھا جو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ خود پسندی کو ایک طرف رکھ کر حقائق کی آنکھ سے بھی دیکھتی تو تجل شاہ کو حسن، تعلیم، ذہانت اور دیگر صلاحیتوں میں خود سے بہت پیچھے پاتی تھی۔

تجل شاہ میں تھا ہی کیا؟ ایک دولت مند گھرانے کی عام سی لڑکی جسے اس دنیا کے بارے میں ڈھنگ کی معلومات بھی نہیں تھیں۔ جس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ چادر اور چار دیواری میں گزارا تھا اور جو کبھی معاذ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی لیکن معاذ کی آنکھوں میں دیکھو تو بس وہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ ایک ایسے انمٹ نقش کی صورت جسے سونیا کا چکاچوند کردینے والا حسن بھی ماند نہیں کرسکتا تھا۔

''میڈم!'' ائرپورٹ پہنچ کر ڈرائیور نے اسے پکارا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل کر ماحول میں واپس آئی۔

''ٹھیک ہے، تم واپس چلے جاؤ۔'' اپنا چھوٹا سا سفری بیگ لے کر گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ اس نے ساری زندگی اسی طرح سفر کیا تھا کہ کبھی کہیں کوئی اپنا اسے رخصت کرنے یا استقبال کے لیے موجود نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا نام نہاد شوہر داراب خان بھی نہیں جس نے اس کے بے تحاشا حسن سے متاثر ہوکر اسے اپنی زندگی میں شامل تو کرلیا تھا لیکن اپنی عیاشی کے علاوہ اس کے پاس بھی اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کے اس طرح کے ناز نخرے اٹھا سکتا۔

''یہ ناز نخرے ایک عام سی گھریلو عورت کے عام سے شوہر ہی اٹھاتے ہیں سونیا بی بی! کسی سیکرٹ ایجنٹ کو یہ سب نہیں ملتا۔ اگر ملے بھی تو اس میں حقیقت سے زیادہ دکھاوا ہوتا ہے اور دونوں فریقین میں سے کوئی ایک لازماً دوسرے کو دکھ دے رہا ہوتا ہے۔'' کسی نے اس کے اندر سے ہی سرگوشی کرکے اسے آئینہ دکھایا لیکن اس کے پاس سر جھٹک کر آگے بڑھ جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ائرپورٹ کے جگمگاتے ماحول میں سنہری بالوں والی وہ لڑکی جس نے ہاف آستینوں والے سنہری بلاؤز کے ساتھ سیاہ لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا، حسب معمول کئی نظروں کو اپنی طرف مرکوز کیے ہوئے تھی لیکن حسن کی آنکھوں میں حسبِ روایت بے نیازی تھی۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ڈیپارچر لاؤنج کی ایک کرسی پر بیٹھنے تک اس کا یہ انداز برقرار رہا۔ اس کی فلائٹ میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے یونہی وہاں موجود افراد پر ایک نظر دوڑائی تو ایک شناسا چہرے نے توجہ کھینچ لی۔ چونکی یوں کہ چہرہ بے شک شناسا تھا پر انداز اجنبی۔

☆☆☆

''سنا ہے تم کئی برس پہلے اپنے گھر سے غائب ہوگئے تھے اور اب واپس آئے ہو تو تمہاری یادداشت غائب ہوچکی ہے۔ تمہیں اپنے بارے میں کچھ بھی ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔'' اسے بنجامن کی دکان سے گرفتار کرکے آرمی کے ایک مرکز میں لایا گیا تھا اور آنے کے ساتھ ہی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھوں کے ساتھ ایک جوان افسر کے سامنے پیش کردیا گیا تھا۔ افسر کے پاس اس سے متعلق تفصیلات پہلے ہی موجود تھیں جن کی روشنی میں وہ اس سے مخاطب تھا۔

''جو کچھ آپ فرمارہے ہیں، مجھے بھی اپنے بارے میں یہی معلوم ہے۔''

''مطلب؟'' اس کی بے نیازی سے دیے جواب پر آفیسر نے ایک آئی برو اچکائی اور وضاحت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب یہ کہ مجھے اپنے ماضی کے متعلق کچھ یاد نہیں ہے۔ مجھے اپنے بارے میں بس اتنا یاد ہے کہ میں زندگی گزارنے کے لیے محنت مزدوری کرتا تھا اور رزق کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا پھرتا تھا۔ خانہ بدوشی کی اس زندگی میں ایک دن مجھے ایک اچھا آدمی مل گیا۔ اس آدمی کو بھی جانے مجھ میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ مجھ پر مہربان ہوگیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس ملازمت بھی دی اور تعلیم اور ہنر بھی۔ مجھے اپنے بارے میں تجسس تو تھا کہ میں کون ہوں؟ میرا گھر کہاں ہے، ماں باپ کون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ...... لیکن میں اس شخص کی ملازمت میں خوش تھا۔ ایک دن اتفاق سے

وہاں جبار علی نامی ایک شخص آیا اور مجھے کافی دیر گھور گھور کر دیکھنے کے بعد مجھ سے پوچھا کہ تم عمار ہو نا؟ میں کیا جواب دیتا۔ مجھے تو خود اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے اور میرے ماضی کو جانتا ہے۔" وہ سانس لینے کے بہانے رکا اور دزدیدہ نظروں سے آفیسر کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ بہت تحمل سے اس کی داستان سن رہا تھا اور ابھی تک کسی جارحانہ رویے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اسے گرفتار کر کے لانے والے سپاہیوں کا رویہ البتہ معاندانہ رہا تھا اور گرفتاری کے وقت اس کی طرف سے کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اسے راستے میں زدوکوب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ وہ خاموش رہا تھا اور جواب میں کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا تو ان کے غصے کو ہوا نہیں مل سکی تھی اور وہ اسے صحیح سلامت یہاں تک لے آئے تھے۔

"میں نے جبار علی کو صاف بتا دیا کہ میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں عمار ہوں یا کوئی اور۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ تم عمار ہی ہو جو ایک دن اچانک اپنے والدین کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور تب سے اب تک ان بیچاروں کو تمہاری کوئی خبر نہیں ہے۔ پھر وہی مجھے آغا جان اور بی بی کے پاس لے کر آیا۔ ان دونوں کے خلوص اور پیار نے مجھے یقین دلا دیا کہ میں ان کا کھویا ہوا بیٹا عمار ہی ہوں۔ فرض کریں کہ اگر میں عمار نہیں بھی ہوں تو مجھ جیسے بے گھر اور بے نشان شخص کے لیے کیا برا ہے کہ اسے ایک گھر اور چاہنے والے ماں باپ مل گئے ہیں۔" اس نے بے حد سادگی سے اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔

"یہ جبار علی کون ہے؟" افسر کا یہ سوال ایک پل کے لیے اسے خاموش کروا گیا لیکن پھر متانت سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے کہ اس سوال کا درست جواب میرے حق میں نہیں ہے لیکن میں آپ کو وہی بتاؤں گا جو سچ ہے۔ جبار علی، آغا جان کے پرانے جاننے والوں میں سے ہے۔ شاید کوئی رشتے داری بھی ہے لیکن آغا جان نے مجھے بتایا کہ وہ بہت عرصے بعد ان سے ملنے آیا تھا اور انہیں اس کی آمد حیران کر گئی تھی کیونکہ اس کے متعلق انہیں یہی خبر ملی تھی کہ وہ حریت پسندوں میں شامل ہو گیا ہے۔ بہرحال اس نے مجھے آغا جان کے حوالے کیا اور پہلے ہی کی طرح پھر غائب ہو گیا۔" وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کے متعلق ساری معلومات جمع کر کے بیٹھے ہوں گے اس لیے اسے اپنے متعلق وہی بتایا تھا جو بہت سے دوسرے لوگ بھی جانتے تھے۔

"سنا ہے تم بھی ان آتنگ وادیوں میں شامل ہونے کی نیت سے ہی گھر سے بھاگے تھے اور پھر تمہاری کوئی خبر نہیں ملی تھی؟" اس سوال کو کرتے ہوئے افسر نے خاص طور پر اپنی نظریں اس کی نظروں میں گاڑ دی تھیں۔ یوں جیسے اس کے اندر کی گہرائیوں سے سچ کھوج لائے گا۔

"آپ کی طرح میں نے بھی یہ بات بس سنی ہی ہے۔ مجھے خود تو اپنے بارے میں جتنا یاد ہے، وہ یہی ہے کہ میں سر کی چھت اور روٹی کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ایک بے نام و نشان انسان تھا جسے ایک بھلے آدمی نے سہارا دے کر اس کی زندگی کو آسان بنا دیا۔"

"اس بھلے آدمی کا نام؟"

"مسٹر جوناتھن...... دہلی کے ایک کاروباری آدمی ہیں اور کاروبار کے سلسلے میں ان کا یہاں بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔" اس نے بتایا تو افسر نے گردن کو یوں جنبش دی جیسے وہ یہ بات پہلے سے ہی جانتا ہو اور یقیناً وہ جانتا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے اس کے متعلق کئی ایک سوال کیے جن کے جوابات وہی تھے جو پہلے ہی ہر ایک کے علم میں تھے۔

"او کے۔ میں مانتا ہوں کہ تم نے میرے کسی سوال کے جواب میں جھوٹ نہیں بولا۔ انکل بنجامن نے تمہاری سفارش کی ہے اور اس بات کا وشواس دلایا ہے کہ رات کو تم ان کے گھر ہی تھے اور جو کچھ پیش آیا، اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ کچھ الجھا الجھا سا تھا۔

"انکل بنجامن میرے بابا کے اچھے دوست ہیں اور یہ انہی کے کارن ہے کہ تمہیں یہاں لانے کے ساتھ ٹارچر سیل میں بھجوانے کے بجائے میں نے اپنے پاس بلوا لیا ہے۔ ظاہر ہے تم سچے بھی ہو اور تمہارے ہر سچ کا ثبوت بھی ہے پر جانے کیوں کچھ ایسا ہے جو من میں کھٹکتا ہے اور تمہیں سچا ماننے سے روک رہا ہے۔" اس کی الجھن کی وجہ سامنے آ گئی۔

"میں آپ کی حراست میں ہوں۔ آپ اپنا پورا اطمینان کر لیں۔" اس نے سکون سے جواب دیا لیکن دل ہی دل میں اس شخص کی چھٹی حس کو داد دیے بنا نہیں رہ سکا جو سب ٹھیک نظر آتے ہوئے بھی اس کے اندر کی گڑبڑ کو بھانپ گیا تھا۔

"ہمیں جو کرنا ہے وہ کر لیں گے، پر ابھی تم یہ بتاؤ کہ حاجی شیر خان کی بیٹی سے تمہارا کیا سمبندھ ہے؟"

"کون...... پری وش؟" اس نے افسر کے اچانک موضوع بدلنے پر گویا چونک کر سوال کیا۔

"ہاں، شاید یہی نام ہے اس لڑکی کا۔" اس نے

سامنے پڑے کاغذات پر ایک نظر ڈال کر خود کو انجان ظاہر کرنے کی کوشش کی حالانکہ یہ طے تھا کہ جس کے پیچھے یہ سارا ہنگامہ ہوا تھا، اب تک انہیں اس کا نام کیا، پورا شجرۂ نسب معلوم ہو چکا ہوگا۔

''میں نے سنا ہے کہ ماضی میں میرے اور پری وش کے رشتے کی بات چلی تھی۔ میری آمد کے بعد آغا جان اور بی بی دوبارہ سے یہ بات چھیڑنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں روک دیا تھا۔''

''کیوں، کیا تمہیں وہ لڑکی پسند نہیں تھی؟''

''پسند کی بات نہیں ہے۔ میرا ماننا ہے کہ آدمی شادی جب کرے جب وہ اچھی طرح سیٹ ہو اور بیوی بچوں کو اچھی زندگی دے سکے۔ میری ابھی نئی نئی نوکری لگی ہے۔ سیلری اتنی زیادہ نہیں ہے۔ مجھے پہلے گھر کی مرمت کروانی ہے۔ ساتھ آمدنی بڑھانے کے لیے ہاتھ پیر مارنے ہیں۔ ایسے میں، میں شادی کا ڈھول کیسے گلے میں ڈالوں؟'' اس نے اپنی شادی نہ کرنے کی وجوہات بیان کیں۔

''ہوں...... یہ تو ٹھیک سوچ رہے ہو تم۔'' افسر نے اس کی تائید کی لیکن انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔

''ٹھیک ہے، ابھی تم ویٹ کرو۔ انکل بنجامن وکیل کو تمہاری بیل کے پیپرز دے کر بھیجنے والے ہوں گے۔ وہ پہنچ جائیں تو پھر تم یہاں سے جا سکتے ہو۔'' سوچ بچار کے بعد اس نے جو فیصلہ سنایا، اسے سن کر اس کا دل چاہا کہ ایک زوردار ''یاہو'' کا نعرہ لگائے۔ ایک مشکل ترین مرحلے سے وہ اتنی آسانی سے گزر جانے کی امید نہیں کر رہا تھا۔

''لیکن یاد رہے کہ یہ تمہاری ٹیمپریری بیل ہے۔ ہمیں اطلاع دیے بغیر تمہیں شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔'' افسر کی زبان سے نکلا اگلا حکم اس کی مسکراہٹ کو سکیڑ گیا۔

☆☆☆

''اعظم، اعظم...... رک جاؤ بیٹا! بہت شرارتی ہو گئے ہو آپ۔'' نیلی کھلکھلا کر ہنستے اعظم کے پیچھے آوازیں دیتے ہوئے جا رہی تھی اور وہ شرارت میں مزید تیز تیز بھاگتا جا رہا تھا۔

''بس پکڑے گئے بچو! اب نہیں بھاگ سکتے۔'' آخر کار نیلی نے اسے جا لیا اور اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

''وہ...... وہ۔'' گود میں آنے کے بعد اس نے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی اور انگلی سے ایک سمت اشارہ کرنے لگا۔ نیلی نے دیکھا کہ وہ ایک پاپ کارن کا اسٹال تھا جہاں سے کئی بچے بھی پاپ کارن لے رہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ چلو دلاتے ہیں آپ کو۔'' وہ اسے لیے ہوئے اسٹال کی طرف چلی گئی۔ وہ لوگ اس وقت ایک پبلک پارک میں آئے ہوئے تھے۔ سجل کے اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد آج پہلی بار اعظم کو گھمانے کے بہانے باہر نکلا گیا تھا ورنہ اب سے پہلے تو بس اسپتال اور قیام گاہ کے درمیان ہی چکر لگتے رہتے تھے۔

''چلو آؤ۔ اب آپ کی مما کے پاس چلتے ہیں۔ اتنی دیر سے وہ اکیلی بیٹھی ہوئی ہیں۔'' پاپ کارن لینے کے بعد وہ اعظم کو لیے پارک کے اس گوشے میں پہنچ گئی جہاں سجل ایک وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں اب وہ وہیل چیئر پر تھی۔ وہ نازک آپریشن جس میں اس کی جان چلی جانے کا اندیشہ تھا، اس کی جان تو بخش گیا تھا لیکن نچلے دھڑ کی معذوری ہمیشہ کے لیے مقدر ہو گئی تھی۔ البتہ وہ ہاتھ جو آپریشن سے پہلے ہی ناکارہ ہو چکا تھا، اس کے سلسلے میں ڈاکٹرز نے امید دلائی تھی کہ دواؤں اور فزیوتھراپی کی مدد سے حرکت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' وہ سجل کے قریب پہنچے تو اسے اپنے آپ میں گم پا کر نیلی نے اسے متوجہ کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

''بس یونہی تمہاری اور اعظم کی بانڈنگ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تمہارا ہماری زندگی میں آنا ہمارے لیے ایک نعمت ثابت ہوا ہے۔ اعظم تمہارے ساتھ اتنا مانوس ہو گیا ہے کہ مجھے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ میں اپنے بیٹے کی ضرورتیں اور خواہشیں پوری نہیں کر سکتی۔ تم کسی ماں کی طرح ہی قدم قدم پر اس کے ساتھ موجود ہوتی ہو۔ سچ کہوں تو اب یہ مجھ سے زیادہ تم سے مانوس ہو گیا ہے۔'' سجل نے پاپ کارن کھانے میں مگن اعظم پر ایک محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''ماں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ جو کچھ میں کر رہی ہوں، وہ تو کوئی بھی تنخواہ دار ملازمہ کر سکتی ہے۔'' نیلی نے بے پروائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''فضول مت بولو۔ ملازمہ خدمت بے شک کر سکتی ہے لیکن اتنی محبت نہیں کر سکتی جتنی تم اعظم سے کرتی ہو۔ تمہارے ہونے سے میری معذوری اور بے بسی کا احساس ماند پڑ جاتا ہے۔'' اس بار سجل کے لہجے میں ہلکی سی یاسیت تھی۔ اس نے اپنی معذوری کو بہت صبر کے ساتھ قبول کیا تھا

اوراب پورے وقار کے ساتھ خود کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ایک چلتے پھرتے انسان کے لیے وہیل چیئر پر آ بیٹھنا معمولی صدمہ تو نہیں تھا جس پر وہ اداس بھی نہ ہوتا۔

''آپ اداس اور فکر مند نہ ہوں۔ میں جب تک ممکن ہوا، اعظم کا اسی طرح خیال رکھوں گی۔ میں نے اسے جنم تو نہیں دیا لیکن مجھے لگتا ہے کہ اگر میری کوئی اولاد ہوتی تو مجھے اس سے زیادہ پیاری نہ ہوتی جتنا مجھے اعظم پیارا ہے۔'' سجل کی اداسی نے اس سے اعتراف کروایا۔ اب وہ اعظم کو ایک بینچ پر بٹھا کر خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ وہ پاپ کارن کے ساتھ ساتھ پارک میں کھیلتے بچوں کو دیکھ کر بھی خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''میں نے تمہاری آنکھوں میں اعظم کے لیے ممتا کے جذبات دیکھے ہیں اسی لیے میری خواہش ہے کہ میں رہوں نہ رہوں، تم ضرور میرے بیٹے کے پاس موجود رہو۔'' سجل کے اتنے اصرار نے اسے تھوڑا سا چونکا دیا اور اسے محسوس ہوا کہ سجل اس سے کسی خاص موضوع پر بات کرنا چاہتی ہے۔

''مجھے ادا سائیں نے اپنی خواہش اور تمہارے انکار دونوں کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک بار میں بھی تم سے بات کر کے دیکھ لوں۔ ہوسکتا ہے تم ادا سائیں کے خلوص سے نہ سہی، میری بے بسی سے ہی متاثر ہو کر ہاں کر دو۔''

''سجل......!'' نیلی کو اس کے الفاظ نے تکلیف دی تو بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھی۔

''میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں نیلی! تمہاری موجودگی مجھے اپنے بیٹے کی خوشی اور اچھی تعلیم و تربیت کے لیے لازم و ملزوم محسوس ہوتی ہے۔ تم اسے میری خود غرضی کہہ لو کہ ادا سائیں کی خواہش پوری ہونے میں مجھے اپنا بھی بھلا دکھائی دیتا ہے۔''

''لیکن میں......''

''اس لیکن سے آگے کی ساری باتوں کا مجھے علم ہے۔ ٹھیک ہے، تم مومی سے محبت کرتی ہو اور تمہیں لگتا ہے کہ تم اسے کبھی بھلا نہیں سکتیں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کوئی تمہیں ایسا کرنے کو کہہ بھی نہیں رہا ہے لیکن یہ تو طے ہے نا کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا اور بہتر یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات سے ان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے جو زندہ ہیں۔'' سجل جو کہہ رہی تھی، اس نے وہ خود کر کے دکھایا تھا۔ معظم کے بعد فیصل سے شادی کا فیصلہ صرف اور صرف عالم کی خاطر کیا تھا اس نے۔ یہ اور بات کہ دوسری طرف سے اس رشتے کو نبھانے کی نیت ہی نہیں تھی۔

''اعظم کا تو میں ایسے بھی ساری زندگی خیال رکھ سکتی ہوں۔'' وہ سجل کے ساتھ اس لب و لہجے میں نہیں بول پا رہی تھی جس میں عالم سے پیش آئی تھی۔

''لیکن ہم تمہیں ایک حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ ایسی حیثیت جس میں تمہاری خوشیوں کی بھی ضمانت ہو۔ میرے ادا سائیں بہت نیک دل انسان ہیں نیلی! میں ان کی بہن بن کر نہیں بلکہ تمہاری دوست بن کر تمہیں مشورہ دے رہی ہوں کہ ایسے شخص کو رد نہ کرو۔''

''دل کے تو معاذ بھائی بھی بہت اچھے ہیں۔ اگر وہ واپس آجائیں تو کیا آپ انہیں قبول کر لیں گی؟'' نیلی نے جواباً اس سے ایک ایسا سوال کر ڈالا جس پر وہ ایک پل کے لیے سناٹے میں آ گئی پھر سنبھل کر بولی۔

''اگر میں اس وہیل چیئر پر نہ بیٹھی ہوتی تو ان کا ساتھ میرے لیے باعث فخر ہوتا لیکن اب اس ادھورے وجود کے ساتھ میں ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہوں۔''

''محبت کرنے والے محبوب کا بوجھ بھی خوشی سے اٹھاتے ہیں۔ میں نے مومی کو اس دور میں سنبھالا تھا جب وہ بالکل معذور ہو کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔''

''ایسا ہے تو میں بھی تمہارے معاذ بھائی کی محبت کو آزما کر دیکھ لوں گی لیکن ابھی تو تم اپنی بات کرو کہ تمہیں اعظم کے ماموں جان قبول ہیں یا نہیں؟'' معاذ کے ذکر نے اگرچہ اسے اداس کر دیا تھا لیکن لہجے کو بشاش رکھ کر ہی نیلی سے مخاطب تھی۔

''آپ کا اتنا اصرار ہے تو آزما ہی لیتے ہیں آپ کے بھائی کو۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''بندہ آزمائش پر پورا اترنے کی ضمانت دیتا ہے۔'' عالم شاہ پتا نہیں کب وہاں آیا تھا۔ اچانک مداخلت کی تو اسے اس کی موجودگی کا علم ہوا اور بے نیازی کی جگہ ایک مدھم شرمیلی سی مسکراہٹ نے لے لی۔

☆☆☆

''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ رادھا دیوی ہیں؟'' اس نے کچھ دیر دھلے ہوئے بالکل سادہ چہرے، عام سے ہیئر اسٹائل اور سفید قمیص شلوار پر سفید ہی دوپٹا لیے عورت کو جانچتی نظروں سے دیکھا اور بالآخر خود کو اس سے مخاطب ہونے سے نہ روک سکی۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ چہرے پر حزن لیے، بیواؤں جیسے حلیے والی عورت بھارت

کی ٹاپ ایکٹریس تھی جو سولہ تو کیا، بتیس سنگار کیے لوگوں کو اسکرین پر تھرکتی دکھائی دیتی تھی تو تماش بین جھوم اٹھتے تھے۔ سیٹیوں، تالیوں اور نعروں کا شور ایسے اٹھتا تھا کہ لگتا تھا سنیما کی چھت اڑ جائے گی۔ وہ المیہ اداکاری کرتی تھی تو تماشائیوں کی آہوں اور سسکیوں سے ساری فضا ہی غمزدہ ہو جاتی تھی۔ اس کے ایکشن سین لہو کو گرما دیتے تھے۔ اس کے صرف نام کے ساتھ دیوی نہیں لگا ہوا تھا۔ اس کے چاہنے والے اسے دیوی ہی کی طرح پوجتے تھے۔

''سوری! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے اتنی رکھائی سے جواب دیا کہ سونیا کا یقین متزلزل ہونے لگا۔

''میں سونیا ہوں، معاذ کی دوست۔'' وہ تھوڑی دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ بے شک وہ اس وقت اسکرین کے مقابلے میں بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی لیکن اسے بھی اپنی یادداشت پر ناز تھا اس لیے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی ایک کوشش اور کی۔ یہ کوشش نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور رادھا دیوی جس نے ابھی تک اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا، چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''میں تمہیں دیکھ کر بیک وقت حیرت اور خوشی محسوس کر رہی ہوں۔'' رادھا کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق تھی اس لیے اس نے اس کی زبان سے تصدیق کا انتظار نہیں کیا اور بے تکلفی سے مخاطب ہوئی۔

''حیرت کیسی؟ یہ ائرپورٹ ہے اور یہاں مسافروں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔'' اس کا لہجہ ایک ایسے انسان کا لہجہ تھا جس کی دنیا میں دلچسپی ختم ہو چکی ہو اور جس کے لیے لوگوں سے بات کرنا بھی ایک بوجھ ہو۔

''میں تمہاری یہاں موجودگی پر حیران نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم بھارت کی ٹاپ ایکٹریس ہو اور تمہارے لیے انٹرنیشنل سفر کرنا ایک معمول کی بات ہے۔ میں حیران اس بات پر ہوں کہ تم ان سارے لوازمات کے بغیر کیوں ہو جو تمہارے پروفیشن کا لازمی حصہ ہیں۔'' سونیا نے اس کے لہجے کا بُرا مانے بغیر سادگی سے وضاحت دی۔

''اور خوشی...... خوشی کا کیا کارن ہے؟'' وہاں لہجے میں اب بھی وہی رکھائی تھی۔

''وہ بس ایسے ہی ہے۔'' سونیا ہنس دی۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ اس وقت اس کا دل کسی ٹین ایجر لڑکی کی طرح جذباتی کیفیت کا شکار ہے جسے محبوب کو چھو کر آنے والی ہوا بھی پیاری لگتی ہے۔ رادھا دیوی وہ ہستی تھی جس نے سادھو کی عقیدت میں ایک ایسے وقت میں معاذ کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی جب اس پر سارے راستے تنگ ہو گئے تھے اور یہ پناہ صرف ایک چھت مہیا کر دینے کی حد تک نہیں تھی۔ وہاں معاذ کو نہ صرف ہر ممکنہ سہولت حاصل تھی بلکہ رادھا نے خود کو خطرے میں ڈال کر بھی اس کی خاطر بہت کچھ کیا تھا۔ اس کو پہنچنے والے نقصان کا بھی سونیا کو علم تھا۔

''ویسے تم سے مل کر تو ایک دنیا خوش ہوتی ہے بلکہ ملنا تو بہت بڑا اعزاز ہے۔ تمہارے فینز تو تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہوں گے۔'' وہ ایک حقیقت بیان کر رہی تھی۔

''لیکن تم تو میری فین نہیں ہو۔'' رادھا نے بھی ایک بڑی حقیقت اس کے سامنے رکھ دی۔ سونیا ایک پل کے لیے ششدر ہوئی پھر زور سے ہنس دی۔

''مطلب صرف حسن نہیں ہے تمہارے پاس، ذہین بھی خوب ہو۔''

''صرف حسن کبھی کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتا۔ حسین عورت کے پاس تھوڑا سا دماغ اور کوئی ٹیلنٹ بھی ہونا چاہیے تب ہی وہ اپنے حسن سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔'' وہ روکھے اور سپاٹ لہجے میں بول رہی تھی لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کی طرف سے جواب تو آ رہا تھا۔

''ویل سیڈ!'' سونیا نے اس سے اتفاق کیا۔ ''حسین تو تم بھی کم نہیں ہو۔'' رادھا نے اس کے آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والے سراپا کو گہری نظر سے دیکھا۔

''جو حسن آپ کی من پسند ہستی کی نظروں کو نہ باندھ سکے وہ حسن کس کام کا۔'' اس کے دل کا درد زبان پر آ گیا۔ اس کا عموماً جن لوگوں سے واسطہ رہتا تھا، ان کے سامنے اپنی دلی کیفیت بیان کرنا یا تو ممکن نہیں تھا یا اسے معیوب لگتا تھا اس لیے نہ جانے کیسے ایک ایسی ہستی کے سامنے زبان کھل گئی تھی جس سے بظاہر تعلق ہی نہیں تھا۔

''حسن من پسند ہستی کی نظروں کو باندھ بھی لے تو جس کے نصیب میں ہجر لکھا ہو، وہ محروم ہی رہتا ہے۔'' اس کے لہجے کی کراہٹ نے سونیا کے دل کو جکڑ لیا۔

''کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟'' اس نے بے ساختہ ہی رادھا کا ہاتھ تھام کر ہمدردی سے پوچھا۔

''مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔'' رادھا کہہ کر طنزیہ ہنسی۔

''مطلب؟'' سونیا نے اس سے پوچھا اور پھر خود ہی اس کے دماغ میں کچھ کلک ہوا۔

''کالے خان......!'' اسے رادھا اور کالے خان

کے درمیان موجود عجیب سا تعلق یاد آ گیا۔

''وہ جس نے رادھا کو اتنی دیوانگی سے پوجا تھا کہ عام سی رادھا دیوی کو سچ مچ کی دیوی بنا دیا تھا، وہ نہیں رہا تو رادھا کیسے رادھا دیوی رہتی۔ اسے تو اپنا سنگھاسن چھوڑنا ہی تھا۔'' وہ جو کہہ گئی تھی اس نے سونیا کے پورے وجود کو سن کر ڈالا۔ اس نے اگر خود مئے عشق نہ چکھی ہوتی تو شاید رادھا کے جذبات کو سمجھنے میں مشکل ہوتی لیکن اب وہ جانتی تھی کہ دنیا میں ایک طاقتور ترین جذبہ ایسا ہے جو انسان کو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے کے لیے راضی کر لیتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے باغی ہو گئی تھی۔ اس نے وہ سارے عہد توڑ دیے تھے جن سے اسے کمسنی میں باندھا گیا تھا۔ وہ اس تربیت کو فراموش کر چکی تھی جو اسے اسرائیل کی خدمت کے لیے برسوں دی گئی تھی تو پھر رادھا دیوی کا اپنے سنگھاسن کو ٹھوکر مار دینا بھلا کیا حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں تو خاصی آزاد عورت تھی اور اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکتی تھی۔

''دنیا اس کی شکل وصورت کو دیکھتی تھی۔ وہ خود بھی میرے اور اپنے بیچ شکل کے فرق کو لے کر ڈرتا تھا اور اس کے اس ڈر نے مجھے بھی دنیا کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف نہیں کرنے دیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ میری محبت صرف ایک جذباتیت یا پھر احسان مندی ہے۔ اسے کبھی یہ بات سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ محبت رادھا کے ساتھ پل کر جوان ہوئی ہے اور خون ہی کی طرح رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے۔ تم ہی بتاؤ، خون کو رگوں سے نکال کر بھی بھلا کوئی جیا ہے؟'' اس نے اپنی سرخ پڑتی آنکھوں کے ساتھ سونیا سے سوال کیا۔ سونیا جواب نہیں دے سکی۔ اسے بھی یقیناً جواب درکار نہیں تھا۔ وہ تو بس اس کے اندر کا سچ تھا جو زبان پر آ گیا تھا۔

''رادھا دیوی نے فلمی دنیا سے ریٹائرمنٹ لے لی، یہ خبر تو بھارت کے ہر نیوز پیپر اور نیوز چینل نے دے دی لیکن رادھا دیوی جیتے جی مر گئی، اس کی کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ وہ تو اس سمے ہی موت کا اعلان کرتے ہیں نا جب یہ مٹی کا ڈھیر شریر سانسوں کے بوجھ سے آزاد ہوتا ہے۔'' وہ اپنے اندر کی گھٹن باہر لا رہی تھی اور سونیا کے پاس اس کے ہاتھوں کو تھام کر خاموش دلاسا دینے کے سوا کوئی حل نہیں تھا۔ بعض زخم اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ سامنے والے کے لیے ان پر مرہم رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

''فلم انڈسٹری نے مجھے بہت شہرت اور پیسا دیا لیکن میرے من کی خوشی تو اس کی خوشی میں تھی۔ میں اس کے لیے، اس کی خوشی کے لیے ناچتی تھی، گاتی تھی، سنگار کرتی تھی۔ اب وہ نہیں رہا تو پھر میں یہ سب کیوں کروں؟ مجھے تو بس اس سنسار میں اپنے دن پورے کرنے ہیں تاکہ وہاں...... وہاں آسمانوں میں اس سے مل سکوں۔'' وہ اس انتہا پر تھی جہاں محبوب سے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سونیا کو اس کی بھری جوانی پر ترس آنے لگا اور سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''مانا تمہارا غم بہت بڑا ہے لیکن جب تک سانسیں ہیں جینا تو پڑتا ہے، تو کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ کسی بہتر ڈھنگ سے جیا جائے۔''

''بھگوان کے واسطے مجھے کوئی نصیحت نہ کرنا۔ میں ان نصیحتوں سے گھبرا کر ہی انڈیا سے بھاگ رہی ہوں۔'' رادھا نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

''میں نے بہت کوشش کی کہ انڈیا میں ہی چھپ کر گمنامی کی زندگی جی سکوں لیکن یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی کھوج لگاتا ہوا مجھ تک پہنچ جاتا تھا اور مجھے سمجھانے لگتا تھا کہ اپنے کیریئر کی پیک پر فلم انڈسٹری کو چھوڑنے کا فیصلہ میری بہت بڑی نادانی ہے۔ میں ایسے سارے لوگوں سے بچنے کے لیے انڈیا سے بھاگ رہی ہوں۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا چڑچڑاپن در آیا تھا۔

''لیکن میں تمہیں فلم انڈسٹری دوبارہ جوائن کرنے کا مشورہ نہیں دے رہی ہوں۔ میں تمہیں زندگی کو ڈھنگ سے جینے کا مشورہ دے رہی ہوں۔ زندگی کو خود پر بوجھ بنانے کے بجائے اگر دوسروں کا بوجھ اٹھانے والی بن جاؤ گی تو تمہارا امتحان تھوڑا آسان ہو جائے گا۔'' اس کے نرمی سے دیے گئے جواب نے رادھا کو توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''بہت کمایا ہے نا تم نے فلم انڈسٹری سے تو اب یہ کمائی انہیں لوٹا دو جو جانے کہاں کہاں سے بچت کر کے فلم کے لیے ٹکٹ خریدتے ہیں اور درحقیقت جن کے دم پر یہ ملین بلینز کی انڈسٹری کھڑی ہے۔ غربت کے مارے ایسے لاکھوں لوگ ہیں تمہارے دیس میں جن کی واحد تفریح فلم دیکھنا ہے لیکن جو زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ کچھ کر ڈالو ان لوگوں کے لیے، تمہارا سفر آسان ہو جائے گا۔'' اس نے حیران سی رادھا دیوی کے سامنے اپنی بات کی وضاحت کی اور سیٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہو سکے تو مجھے اور ان سارے لوگوں کو معاف کر دینا جو ایک ایسی جنگ کے سپاہی ہیں جو ہم پر زبردستی مسلط کی گئی ہے اور ہماری خاطر تم بھی جس کی زد میں آ گئی ہو۔'' رادھا کے کندھے کو آہستہ سے چھو کر اس نے کہا اور اس کے جواب کا

انتظار کیے بغیر چل پڑی۔ اس کی فلائٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ ہے یروشلم The City of faith'' مرد نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا کر سرشاری کی کیفیت میں کہا۔

''اور یہاں ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا کہ ہم یہاں موجود ہیں۔'' لانگ کوٹ پر سیاہ اسکارف لیے عورت کی آنکھوں میں بھی جگنو چمک رہے تھے اور وہ بچوں کے سے تجسس سے اپنے سامنے موجود دمشق گیٹ (Damascus gate) کو دیکھ رہی تھی۔ انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو اس دروازے سے گزر کر اندر جا رہا تھا۔

''یہ سب کتنا اپنا اپنا سا ہے نا۔'' اس نے گیٹ کے باہر کپڑا بچھائے اس پر سبزیاں رکھ کر بیچتی عورتوں کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ان عورتوں نے مختلف رنگوں کے گاؤن پہن رکھے تھے اور ان کے سر اسکارف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ واضح طور پر مسلمان عورتیں تھیں۔ یہ مسلمان اکثریتی علاقہ ہی تھا اور اس گیٹ سے گزر کر وہ قدیم یروشلم کے شمالی مسلمان علاقے میں پہنچنے والے تھے۔

''آپ کا دھیان کہاں ہے؟'' اپنی بات کا جواب نہ پا کر عورت نے مرد کو ٹوکا اور اس کے دائیں ہاتھ کی آستین کھینچتے ہوئے بولی۔

''چلیں، اندر چلتے ہیں۔''

''ہاں چلو۔'' مرد جو کہ دائیں جانب موجود فوجی چوکی کا جائزہ لے رہا تھا، اس کے ساتھ چل پڑا۔ اسے چوکی پر سپاہیوں کی اچھی خاصی نفری محسوس ہوئی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق اگر حالات معمول پر ہوں تو چوکی پر سپاہیوں کی تعداد کم ہوتی تھی ورنہ زیادہ۔ اس وقت زیادہ تعداد نظر آنے کا مطلب تھا فضا میں کشیدگی ہے لیکن بازار کی گہما گہمی میں کوئی کمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی جس نسبتاً پتلی گلی میں داخل ہوئے تھے وہاں مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایک تسلسل سے... آمد و رفت جاری تھی۔

''یہ تو کچھ ہمارے عوامی بازاروں جیسا ہی ہے۔'' دونوں اطراف موجود دکانوں، اسٹالز اور چھوٹے مکانات کو دیکھتے ہوئے عورت نے رائے دی۔

''صفائی کے فرق کے ساتھ۔'' مرد نے گرہ لگائی اور یہ حقیقت تھی کہ تنگ گلی اسٹالز اور افراد کی زیادتی کے باوجود بالکل صاف ستھری دکھائی دے رہی تھی۔ نہ تو دیواروں پر چاکنگ تھی، نہ ہی نیچے بچھے پتھر کے فرش پر کوئی کوڑا کرکٹ دکھائی دے رہا تھا۔

''میں اس کی ویڈیو بناتی ہوں۔'' عورت اس کے تبصرے کو نظر انداز کر کے اس پُر رونق بازار کی ویڈیو بنانے لگی۔ کپڑے، پھل، سبزیاں اور مٹھائیاں...... وہاں وہی سب بک رہا تھا جو عموماً بازاروں میں بکتا ہے اور روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لازم ہوتا ہے لیکن ہر شے میں صفائی اور ترتیب کے خاص تناسب نے جگہ کی تنگی کے باوجود منظر کو خوبصورت بنا رکھا تھا۔

''مجھے یہ کھانی ہے۔'' ایک دکان کے سامنے لگے اسٹال کے قریب سے گزرتے ہوئے اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے قدم جکڑے اور وہ فوراً تلوں سے بھرے پتلے بیضوی سلائسوں والی اس بریڈ کی طرف متوجہ ہوئی جس کی تازگی اور خستگی دیکھنے سے ہی عیاں ہو رہی تھی۔

''یہ طبون ہے۔'' مرد نے اس کی فرمائش پر وہ بریڈ خرید کر اسے تھماتے ہوئے مسکرا کر بتایا۔ چھونے پر وہ گرم تھے اور یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی تنور سے نکل کر وہاں پہنچے ہوں۔

''طبون۔'' وہ بریڈ کا ایک حصہ اسے توڑ کر دیتے ہوئے مسکرائی۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں آنے سے قبل یہاں کی ایک ایک چیز کے بارے میں معلومات حاصل کر کے نکلے ہوں گے۔''

''ایک اچھے سیاح کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' مرد نے جوابی مسکراہٹ اچھالتے ہوئے جواب دیا اور بریڈ کا لقمہ منہ میں ڈال کر چباتے ہوئے دل ہی دل میں اس کے خوش ذائقہ ہونے کا بھی اعتراف کیا۔

''سیاح۔'' وہ اس کے منہ سے نکلنے والا لفظ سن کر مسکرائی اور اس کے پیچھے اپنے قدموں کو آگے بڑھایا۔ بازار میں بطور خاص کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا لیکن ان کی طرف سے مکمل احتیاط برتی جا رہی تھی۔ وہ آپس میں گفتگو بھی انگریزی میں کر رہے تھے تاکہ اگر کوئی سن رہا ہو تو اسے بات سمجھ آئے اور وہ ان کو مشکوک نہ گردانے۔

''اب ہم Trifurcation of faith پر موجود ہیں۔'' گلی میں سیدھے چلتے چلتے وہ ایک سہ راہے پر پہنچ کر رک گئے اور مرد نے اسے اطلاع دی۔

''مطلب؟'' اس نے دلچسپی سے دائیں، بائیں اور سامنے نکلتے راستوں کو دیکھا۔

''مطلب یہ کہ ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں

سے اگر بالکل سیدھے چلتے چلے جائیں تو Western wall یعنی دیوارِ گریہ تک پہنچ جائیں گے۔ سیدھے ہاتھ پر Church of Holy Seplechur جانے کا راستہ ہے جہاں عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیا گیا تھا جبکہ بائیں ہاتھ پر......"

"بائیں ہاتھ پر مسجدِ اقصیٰ کو جانے والا راستہ ہے۔" اس نے مرد کی بات مکمل نہیں ہونے دی اور بے پناہ جوش سے بولی۔ ہر مسلمان کی طرح اسے بھی اس مقدس مقام سے محبت تھی اور دل میں کہیں یہ خواہش بھی کہ اس مقدس سرزمین پر سجدہ کرنے کا موقع مل جائے۔ قدرت نے بغیر کسی کوشش کے یہ موقع فراہم کر دیا تھا تو اس کا جوش میں آنا تو بنتا تھا۔

"ہاں، مسجدِ اقصیٰ۔" مرد مسکرایا۔

"آؤ، چلتے ہیں۔" یہ سوال کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی کہ اس سرراہے پر انہیں تینوں میں سے کس راستے پر جانا ہے۔ وہ دونوں سرشار سے بائیں راستے پر چل پڑے۔ خوش دونوں ہی تھے لیکن مرد اظہار کم کرتا تھا۔

"نام؟" یہاں انہیں ایک چھوٹی سی پولیس چوکی پر روک لیا گیا اور ایک پولیس والے نے دریافت کیا۔

"مراد اور یہ میری وائف تانیہ!" اس نے سکون سے جواب دیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے اور اگر انہوں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کر کے خود کو مشکوک نہ بنایا تو بہت آرام سے اس پولیس چوکی سے گزر جائیں گے۔

"مسلم؟"

"یس۔"

"ٹورسٹ؟"

"یس۔" اس نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیتے ہوئے اپنا پاسپورٹ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ یہ گرین پاسپورٹ نہیں تھا۔ گرین پاسپورٹ پر اسرائیل کا ویزا لگ ہی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان نے باوجود اس کے کہ کئی بڑے اسلامی ممالک اسرائیل سے دوستی کا بندھن باندھ چکے تھے، قیام سے لے کر اب تک اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

"او کے۔" پولیس مین نے پاسپورٹ پر سرسری سی نظر ڈالی اور انہیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔

"اگر یہ جان لیں کہ ہم مراد اور تانیہ نہیں بلکہ شہریار عادل اور ماہ بانو ہیں اور ماضی میں ان کے سورماؤں کو خاک چٹا چکے ہیں تو یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں؟" پاسپورٹ جیب میں رکھ کر آگے بڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں جو سوال اٹھا اس کا جواب وہ خود بھی جانتا تھا اور ایک ایک کر کے ماضی کے وہ کردار یاد آتے جا رہے تھے جنہوں نے پاکستان میں اپنی سازشوں کا جال بچھانے کے لیے بہت خوبصورت بہروپ بھر کر اسے بھی نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خدا کے فضل و کرم اور اپنی نیک نیتی کے سہارے نہ صرف اُن سازشوں سے محفوظ رہا تھا بلکہ ان دشمنوں کو فاش شکست بھی دی تھی۔ مار کھا کر بھی وہ سازشی ٹولا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ طاقت کے ساتھ مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ اس لیے اسے اپنی گوشہ نشینی ترک کر کے ایک بار پھر مقابلے کے لیے میدان میں اترنا پڑا تھا اور وہ جی جان سے اس منصوبے میں شامل ہو گیا تھا جس میں سازشیوں کو ان کے گھر میں گھس کر سبق سکھانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

"قبۃ الصخرہ Dome of Rock۔" اپنی سوچوں میں گھرے چلتے اسے ماہ بانو کی آواز نے متوجہ کیا۔ وہ داخلے کے بارہ دروازوں میں سے ایک دروازے سے گزر کر اب Mount of temple کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور سامنے ہی وہ سنہری گنبد نظر آ رہا تھا جس کی خوبصورتی اور شکوہ نے عرصے سے اس مقام کو Photograph building کا درجہ دے رکھا تھا اور کہا جاتا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ تصاویر اسی کی لی جاتی تھیں۔ سونے سے بنے اس گنبد نے اس کی نظروں کو بھی باندھ لیا۔ اموی بادشاہ عبدالملک کا تعمیر کروایا گیا یہ شاہکار اگرچہ مسجدِ اقصیٰ نہیں تھا لیکن اس کی اپنی ایک اہمیت تھی۔

"میں یہاں نوافل ادا کروں گی۔" ماہ بانو مچل گئی۔ اس وقت اسے اپنی اسرائیل آمد کا اصل مقصد یاد نہیں تھا۔ بس ذہن میں یہ تھا کہ وہ اس ارضِ مقدس پر ہے جس کے چپے چپے پر انبیاء کے نقشِ قدم ثبت تھے۔ سو اسے بھی اس مقام پر سجدہ کرنا تھا جو بے شک مسجد نہیں تھا لیکن اس کے لیے مقدس بہرحال تھا۔

"بالکل ادا کرو بلکہ میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔" اس نے فوراً ماہ بانو کی تائید کی۔ وہ آخر اس جگہ کیوں نہ سجدہ کرتا جو اس چٹان پر تعمیر کی گئی تھی جہاں سے روایات کے مطابق نبی کریم ﷺ براق پر سوار ہو کر معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ویسے یہود کے نزدیک بھی یہ مقام مقدس ہے اور وہ اس چٹان کو Foundation stone کا نام دیتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ پہلا مادہ (Matter) ہے جو اللہ نے بنایا اور حضرت آدم علیہ السلام

کی تخلیق کے لیے یہیں سے مٹی لی گئی۔ اتوار کا دن ہونے کے باعث وہاں یہودی بھی کثرت سے آئے ہوئے تھے لیکن انہیں اندرونی حصوں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں صرف مسلمان جاسکتے تھے۔

وہ دونوں چونکہ باوضو ہو کر ہی اپنی رہائش گاہ سے چلے تھے اس لیے نوافل کا ارادہ باندھتے ہی عمل میں تاخیر نہیں کی۔ خوش قسمتی سے رش کے باوجود انہیں آسانی سے جگہ مل گئی۔

''مجھے نیچے بھی جانا ہے۔'' وہ تو گویا مقدس مقامات کی زیارت کے لیے ہی وہاں آئی تھی۔

''ضرور جانا لیکن پہلے میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ایک اور چیز بھی دکھانا چاہتا ہوں۔'' شہریار نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر رسان سے بولا۔ وہ ماہ بانو کی جذباتی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اس لیے ایک بار بھی اسے نہیں ٹوکا تھا۔

''اچھا چلیں، چلتی ہوں۔'' وہ اس کی بات ماننے سے انکار نہیں کرسکتی تھی اس لیے خاموشی سے ساتھ چل پڑی۔

''وہ دیکھو، وہ گولڈن گیٹ ہے۔'' وہ اسے ایک دیوار تک لے گیا اور اوپر سے ہی کھڑے ہو کر ایک جانب اشارہ کیا۔ وہ حرم شریف کے بارہ ابواب میں سے وہ دروازہ تھا جس کے بارے میں تاریخ بتاتی تھی کہ اسے بادشاہ سلیمان عالیشان نے چنوا کر بند کردیا تھا۔ اب بھی اس دروازے کو بند ہی رکھا جاتا تھا۔

''یہ تو بہت شاندار ہے۔'' ماہ بانو نے غور سے اس جانب دیکھا۔ وہاں درمیان میں ایک ستون تھا جس کے دونوں اطراف میں دروازے تھے۔

''کہتے ہیں پہلے یہ ایک ہی دروازہ تھا جس کے دو پٹ تھے۔ داہنی پٹ باب رحمہ (Gate of mercy) اور بایاں پٹ باب توبہ (Gate of repentance)۔''

وہ ماہ بانو کو بتا رہا تھا کہ وہاں فوٹوگرافی کرتا ایک سیاح بہترین زاویہ بنانے کے چکر میں کھسکتا کھسکتا اس سے آٹکرایا۔

''سوری، سوری۔ آئی ایم ویری سوری!'' سیاح نہایت عاجزی اور شرمندگی سے اسے چھو چھو کر اس سے معذرت کرنے لگا۔

''اٹس او کے۔'' اس نے خوش دلی سے اس کی معذرت قبول کی اور ایک بار پھر مڑ کر ماہ بانو کے ساتھ اپنی گفتگو میں مصروف ہوگیا۔

''یہ دروازہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں تینوں مذاہب کے لوگوں کے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہود کے عقیدے کے مطابق ان کا مسیحا جو کہ ہیکل تعمیر کرے گا، اسی دروازے سے داخل ہوگا۔ عیسائیوں کے مطابق حضرت مسیحؑ جب دوبارہ دنیا میں آئیں گے تو اسی دروازے سے آئیں گے جبکہ مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ حضرت مہدیؑ اور حضرت عیسیٰؑ انہی دو دروازوں سے حرم شریف میں داخل ہوں گے اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھیں گے۔'' اس کی روانی سے جاری گفتگو میں کسی اور کو تو کیا، اس کے ساتھ کھڑی ماہ بانو کو بھی علم نہیں ہوسکا تھا کہ ایک پل قبل اس سے ٹکرانے والے سیاح کے ہاتھ سے کوئی شے نکل کر اس کی جیب میں منتقل ہوچکی ہے۔

''میں نے یہاں آنے سے پہلے خود بھی تھوڑی بہت معلومات حاصل کی تھیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے کمپاؤنڈ میں ہی مولانا محمد علی جوہر کا مدفن بھی ہے۔'' ماہ بانو کی یادداشت نے بھی کام کیا۔

''ہاں گیٹ نمبر 7 جسے Babul-Qattanine کہا جاتا ہے کے قریب ہی ان کا مدفن ہے لیکن فی الحال ہمارا وہاں تک جانا ممکن نہیں ہوگا۔ ابھی ہم قبۃ الصخرہ کے نچلے حصے میں چل کر وہاں زیارتیں کرتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ اور دیگر خاص مقامات کی زیارت کے لیے دوبارہ کسی دن یہاں آئیں گے۔'' وہ جانتا تھا کہ مذہبی عقیدت مندی اور حب الوطنی دونوں ہی اس کے خون میں رچی ہوئی ہیں اس لیے جہاں مذہبی مقامات کی زیارت پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا وہیں تحریک آزادی کے عظیم رہنما کی اہمیت سے بھی انکار نہیں تھا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ پہلے ایک جگہ کو اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔'' وہ فوراً راضی ہوگئی۔

وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر قبۃ الصخرہ کے نچلے حصے میں پہنچے۔ یہاں بھی انہوں نے نوافل ادا کیے اور پھر چٹان کے اس حصے کی زیارت کی جس پر واضح طور پر تین انگلیوں اور ایڑی کا نشان دکھائی دیتا ہے۔ اس نشان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ براق کے کھروں کا نشان ہے۔

''اس طاق کے اندر ہاتھ ڈالو ذرا۔'' شہریار نے اسے چٹان کے ساتھ ہی ایک طاق کی طرف متوجہ کیا۔ وہاں کچھ اور خواتین اور بچے بھی طاق کے اندر ہاتھ ڈال ڈال کر باہر نکال رہے تھے۔

''وہ کیا ہے؟''

''تم ہاتھ ڈال کر تو دیکھو۔'' شہریار نے اصرار کیا۔

"یا اللہ! یہ تو خوشبو سے مہک رہا ہے۔" ماہ بانو نے ہاتھ ڈال کر باہر نکالا اور دوسروں کی پیروی میں سونگھ کر دیکھا تو خوشی سے چیخ پڑی۔ وہ لوبان سے ملتی جلتی خوشبو تھی۔

"روایت ہے کہ آقا کریم ﷺ کے چند بال اس چٹان میں دب گئے تھے اسی لیے اس طاق میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ خوشبو میں بس جاتا ہے۔" شہریار نے بتایا تو اس کی مسرت کا رنگ ہی بدل گیا۔ اس بار اس نے اپنے ہاتھ کو سونگھا نہیں بلکہ بڑی محبت اور عقیدت سے آنکھوں اور ہاتھوں سے لگا کر چوم لیا۔

"میں اس مقدس مقام پر آپ کو گواہ بنا کر کہہ رہی ہوں کہ اگر مجھے اپنی زندگی سے کہیں کوئی معمولی سا شکوہ تھا بھی تو آج حاصل ہونے والی نعمتوں کے بعد ختم ہو گیا۔ آج اس وقت میں اس روئے زمین کی سب سے زیادہ خوش نصیب انسان ہوں جسے اس کی اوقات سے بہت زیادہ نواز دیا گیا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ شہریار نے اس کے شانوں کو نرمی سے تھپکتے ہوئے اسے جذباتی سہارا دینے کی کوشش کی اور طاق کے قریب سے خواتین کا رش ختم ہونے پر خود بھی اپنا ہاتھ اندر ڈال دیا۔ قدرت نے اس کے اس ارضِ مقدس پر آنے کے اسباب پیدا کیے تھے تو وہ کیوں نہ اس نعمت سے فیض یاب ہوتا۔ یوں بھی کیا خبر تھی کہ شاید یہ ان کی زندگی کا آخری مشن ہی ہوتا۔

☆☆☆

"تم نے ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے سونیا! اگر تم نے معاذ کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو آج ہم ان حالات میں نہ ہوتے۔" رابیل عرف میڈم ایکس آنکھوں میں ناراضگی لیے اس سے مخاطب تھی۔

"میں شرمندہ ہوں لیکن میں مجبور تھی کہ میرا دماغ میرے اپنے کنٹرول میں نہیں تھا۔" اس نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔

"کیا وہ لڑکا کوئی جادوگر ہے؟" رابیل چڑ سی گئی۔

"جادوگر سے کم بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنی نظروں سے لوگوں کو منٹوں میں اس کا مطیع بنتے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ آئے تو حیدرآباد کے نواب صاحب کے ہاں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل کسی سے معلوم کروا لیجیے گا۔ اس کے علاوہ بھی میں کئی جگہ پر اس کی ساحری کے ثبوت دے دوں گی۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔ وہ تو بس ایک اسٹوڈنٹ تھا جس میں کچھ غیر معمولی صلاحیتیں ضرور تھیں لیکن یہ جادوگری وغیرہ...... نو نو...... نو۔ میرا ذہن اسے قبول نہیں کر رہا۔ میں نے اسے منتخب کرنے کے بعد اس کے بارے میں اچھی طرح ساری معلومات کروائی تھیں۔ اسے نئی نئی چیزیں سیکھنے اور ایڈونچر کا شوق ضرور تھا لیکن اس کے ریکارڈ میں ایسا کچھ شامل نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ وہ جادو یا پراسرار علوم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی تعویذ گنڈوں یا جھاڑ پھونک والا نہیں تھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس طرح کے کسی علم کا مالک ہو؟" میڈم ایکس کو اس کی بات ماننے میں تامل تھا اور وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو ذرا بتائیں کہ وہ کیا سبب تھا جس نے اس کے دماغ پر پروفیسر وکٹر جیسے قابل انسان کا زور نہیں چلنے دیا۔ معاذ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ہمارا مطیع نہیں بنا اور ہر بار اپنی مرضی چلاتا رہا اور اس کا وہ غائب ہو جانا...... اسے بھول گئی ہیں آپ؟ ہم اتنی ایڈوانس ٹیکنالوجی کے باوجود اسے ٹریس نہیں کر سکے اور وہ ہماری ناک کے نیچے جو چاہے وہ کرتا رہا۔" سونیا کے پاس بھی بہت سے دلائل تھے۔

"ٹھیک ہے مان لیا کہ وہ بہت بڑا جادوگر ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ تم اس کے ٹرانس سے باہر کیسے نکلیں اور کیسے تمہیں خیال آیا کہ تمہیں اپنے اصل کی طرف پلٹ جانا چاہیے؟" میڈم ایکس نے اسے گھورا۔

"اس کے لیے ہمیں چائنا والوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جب میں ان کی حراست میں آئی اور انہوں نے پہچان لیا کہ میں ان کے ہاں ماضی میں ہونے والے ایک بم بلاسٹ کا حصہ رہی ہوں تو انہوں نے مجھے معاذ اور اس کے ساتھیوں سے الگ کر کے بالکل الگ سیل میں رکھ دیا۔ وہ مجھ سے کئی دن تک انویسٹی گیشن کرتے رہے لیکن چونکہ میرا دماغ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا تو میں ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے پاتی تھی لیکن بعد میں سوچتی ضرور تھی کہ وہ جن جرائم کو اتنے وثوق سے میرے سر تھوپ رہے ہیں، آخر وہ مجھے یاد کیوں نہیں ہیں۔ کئی دن بعد آہستہ آہستہ مجھے ٹکڑوں ٹکڑوں میں گزری باتیں یاد آنے لگیں لیکن اس وقت تک چائنیز مجھ سے مایوس ہو کر پاکستان کے ساتھ میری واپسی کا معاہدہ کر چکے تھے۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ میں ان کے اور تو کسی کام کی ہوں نہیں تو کیوں نہ مجھے پاکستان سے اپنی دوستی مضبوط کرنے کے لیے استعمال کریں۔ انہیں پتا ہی نہیں چل سکا کہ وہ ایک ایسے موقع پر یہ

کام کر رہے ہیں جبکہ میری یادداشت بحال ہونے لگی ہے۔ اس ساری صورتِ حال سے میں نے اندازہ لگایا کہ معاذ مجھ پر وقفے وقفے سے مسلسل عمل کرتا تھا جس کا اسے میرے قید میں ہونے کی وجہ سے علم نہیں ہوسکا اور میں دھیرے دھیرے اس کے اثر سے باہر آگئی۔'' اس نے بہت تفصیل سے صورتِ حال کا تجزیہ کیا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم اب بھی معاذ کے زیر اثر ہو اور اس کے کسی خاص ایجنڈے پر کام کرنے کے لیے ہمارے درمیان واپس آئی ہو؟''

''بالکل نہیں۔'' اس نے شدت سے میڈم ایکس کے الزام کو رد کیا اور پھر شکایتی لہجے میں بولی۔

''آپ مجھ پر شک کر رہی ہیں؟ مجھ پر...... میں جو آپ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا کرتی تھی، کیا اسی کی حقدار ہوں کہ آپ مجھ پر شک کریں؟''

''حالات نے مجھے اس پر مجبور کر دیا ہے۔ تم جتنا نقصان کر چکی ہو اس کے بعد اس سوال کی گنجائش بنتی نہیں ہے۔ تم نے اپنی حرکتوں سے مجھے تنظیم کے بڑوں کے آگے جتنا شرمندہ کروایا ہے اس کے بعد یہ ان کا احسان ہی ہے کہ اب بھی انہوں نے مجھے ہی تمہیں ڈیل کرنے کے لیے آگے رکھا ہے ورنہ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ کسی اور سے یہ کام لیتے۔'' میڈم ایکس پر اس کے لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے آج بھی اس سے بڑھ کر اپنی تنظیم کی فکر تھی۔

''ٹھیک ہے، تو پھر آپ جیسے چاہیں اپنی تسلی کر لیں۔'' اس نے پھولے ہوئے منہ کے ساتھ پیشکش کی۔

''وہ تو میں ضرور کروں گی اور ثابت کر دوں گی کہ عظیم اسرائیل کے سامنے سگی اولاد بھی میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔'' میڈم ایکس نے اسے بے نیازی سے جواب دیا اور پھر انٹرکام پر کسی کو وہاں آنے کے لیے کہا۔ چند ثانیوں میں ایک لمبا تڑنگا اور خوب کسے ہوئے جسم کا نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''اسے لے جاؤ اور اس کی زبان کھلوانے کے لیے جو حربہ استعمال کرنا چاہو کرو۔ سچ تک پہنچنے کے لیے تمہیں اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ بھی الگ کرنا پڑے تو رعایت نہیں کرنا۔ اگر یہ اسرائیل کے مفادات کے خلاف ہے تو اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' میڈم ایکس کے لہجے کی سختی نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ عورت اسے اس دنیا میں لانے کی ذمے دار تو بے شک ہے لیکن اس کا اپنے وطن کے علاوہ کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

''سوری ڈارلنگ! لیکن کیا کروں۔ تمہاری رگوں میں دوڑتا تمہارے مسلمان باپ کا خون مجھے کبھی تم پر پورا بھروسا نہیں کرنے دیتا۔'' میڈم ایکس نے اس کی اندرونی کیفیت کو بھانپ لیا اور نہایت صاف گوئی سے اپنے عمل کی توجیہہ پیش کی۔ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے اس شخص کے ساتھ چل پڑی جو موت کے فرشتے کی طرح اس کے سر پر سوار تھا۔

☆☆☆

''کہاں چھپایا ہے انہیں، جلدی بتا کہاں چھپایا ہے ورنہ میں تیرا لہو پی جاؤں گا۔'' باہر کو ابلتی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ شخص گل وش کے خاوند کبیر کا گریبان پکڑے اسے بری طرح جھنجوڑ رہا تھا۔ گل وش اور کبیر کی ماں بندوقوں کے سائے میں ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ انہیں گہری نیند سے جگایا گیا تھا اور اب وہ بے بسی سے سجے سنورے گھر میں دندناتے بھارتی سپاہیوں کو اپنی من مانی کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

''ک...... کون؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں جناب؟'' کبیر بھی نیند سے جگائے جانے پر ہڑبڑایا ہوا تھا۔

''تیرے ماں کے خصم کی، سالا ناٹک بازی کرتا ہے ہمارے ساتھ۔'' غصے سے ابلتے اس شخص نے کبیر کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ دے مارا۔ کبیر کا چہرہ طمانچے سے زیادہ اس کے الفاظ کی شدت پر سرخ پڑ گیا لیکن مجبوری تھی کہ پلٹ کر جواب نہیں دے سکتا تھا۔

''میرا یقین کرو، میں نہیں جانتا تم کسے تلاش کر رہے ہو۔ میرے گھر میں تو بس ہم تین ہی لوگ ہیں۔''

''انجان بنتا ہے سالا! جس بات کی ساری وادی کو کھبر (خبر) ہے تو...... حاجی شیر خان کا جمائی ہو کر اس سے انجان بن رہا ہے۔ سالی کے کومل ہاتھوں کی روٹیاں کھانے والے کو کھبر ہی نہیں ہے سالی کے کارناموں کی۔'' اس نے کبیر کو ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے واضح کر دیا کہ وہ کس کی تلاش میں وہاں آیا ہے۔

''وہ لوگ یہاں نہیں آئے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ تم لوگ انہیں ڈھونڈتے ہوئے سب سے پہلے یہیں آؤ گے اس لیے انہوں نے یہاں کا رخ نہیں کیا۔'' ماں اور بیوی کے سامنے مسلسل ہونے والی توہین پر کبیر کی رگوں میں خون ابل رہا تھا لیکن حالات کو بدترین ہونے سے بچانے کے لیے اسے تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا۔

''بکواس مت کر۔ ہمارے کھوجیوں کو ان کے اس

طرف آنے کے صاف اشارے ملے ہیں۔'' اس نے غصے میں کبیر کو ایک اور طمانچہ رسید کیا۔

''اگر وہ یہاں آتے تو اب تک تمہیں مل چکے ہوتے۔ تمہارے ساتھیوں نے میرا پورا گھر ادھیڑ ڈالا ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو تمہیں مل نہ جاتے۔'' اس بار کبیر کی آواز معمولی سی تیز ہوگئی۔

''بھونکتا ہے...... مجھ پر بھونکتا ہے، سالا کتا۔ میں تیرا یہ منہ ہی توڑ دوں گا جس سے تو مجھ پر بھونکنے کی جرأت کر رہا ہے۔'' اس نے کبیر کے منہ پر لگاتار کئی مکے دے مارے۔ مکے اتنے زوردار تھے کہ اس کے ہونٹ پھٹنے کے ساتھ ساتھ سامنے کے دانت بھی ہل گئے اور منہ سے خون ابل کر ٹھوڑی سے بہتا ہوا زمین پر ٹپکنے لگا۔ اس منظر کو دیکھ کر گل وش اور کبیر کی ماں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ماں نے تو بے اختیار آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی کہ بیٹے کو اس بے دردی سے مارنے والے کا ہاتھ پکڑ سکے لیکن چوکنے کھڑے سپاہیوں میں سے ایک نے اسے اس زور کا دھکا دیا کہ وہ توازن کھو کر نیچے گر پڑی۔ گل وش خاوند کو بھول کر ساس کو سنبھالنے کے لیے لپکی۔

''ابھی صرف تیرا گھر ادھیڑا ہے۔ زبان نہیں کھولے گا تو گھر کے ساتھ ساتھ تیری کھال بھی ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔'' خونخوار آنکھوں والا مکے مارنا چھوڑ کر اب کبیر کے جبڑوں کو اپنی آہنی انگلیوں میں جکڑے اسے دھمکا رہا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم وہ لوگ کہاں ہیں۔'' مار کھا کر بھی کبیر انکار پر قائم تھا۔

''اور میں معلوم کیے بنا تیری جان نہیں چھوڑوں گا۔ جو مرا ہے وہ صرف انڈین آرمی کا سپاہی نہیں تھا، وہ میرا سگا بھائی تھا اور میں اپنے بھائی کے کھونیوں (خونیوں) کو نرک میں پہنچائے بنا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔'' اس بار اس نے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑا اور اس کے بٹ سے کبیر کو بے دردی سے پیٹنے لگا۔ ہر ضرب زوردار تھی اور مارنے والا غصے میں اتنا پاگل ہو رہا تھا کہ مارتے ہوئے یہ تک نہیں دیکھ رہا تھا کہ سامنے والے کو کس جگہ چوٹ لگ رہی ہے۔ چند منٹوں میں ہی کبیر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا اور اس کے حلق سے دردناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اس کی ہر بلند ہوتی چیخ کے ساتھ گل وش اور اس کی ساس کی چیخیں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔ وہ کبھی اس ظالم سے فریادیں کرنے لگتی تھیں اور کبھی اس ظلم پر بین۔ انہوں نے متعدد بار کبیر تک پہنچنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ظالم کے معاونین جو ویسے تو خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے، انہیں ان کی ایسی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دے رہے تھے اور ہر بار بے دردی سے پیچھے دھکیل دیتے تھے۔

''کوئی تو آؤ مدد کو۔ یہ ظالم میرے بچے کو مار ڈالیں گے۔'' بے بس ماں کی پکار آس پاس کے کئی لوگوں نے سنی تھی لیکن اپنے آپ میں شرمندہ اس پکار پر آنسو بہانے سے زیادہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔ بھارتی سپاہیوں نے شہد کی مکھیوں کی طرح کبیر کے گھر کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ایسے میں کسی کی ذرا سی مداخلت سے بات بہت زیادہ بگڑ جاتی۔ وہ سب عام سے لوگ تھے اور مسلح سپاہیوں سے لڑنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

''آخری بار پوچھ رہا ہوں، بتادے کہ اپنے سسرالیوں کو کہاں چھپایا ہے۔ تو اگر سمجھ رہا ہے کہ زبان بند رکھ کر انہیں بچالے گا تو یہ ہو نہیں سکتا۔ میرا نام مشرا ہے اور میں اپنے بھائی کے قاتلوں کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔'' مار کھا کھا کر کبیر ادھ موا ہو گیا تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور کبیر کی گردن پر پیر رکھ کر اپنے بھاری بوٹ سے اس کا نرخرہ دباتے ہوئے بولا۔ دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ کبیر کا سانس رکنے لگا اور اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں۔ یہ وہ نازک مقام تھا جہاں آکر اس کی ماں کی برداشت جواب دے گئی اور زور سے چیخی۔

''وہ باغ میں ہیں۔ باغ میں اوزار وغیرہ رکھنے کے لیے جو کمرا بنا ہوا ہے، اس کے نیچے ایک تہ خانہ بھی ہے۔ وہ لوگ اسی تہ خانے میں ہیں۔''

اس موقع پر گل وش نے اذیت سے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اسے ساس کے ہمت ہار جانے پر شکوہ نہیں تھا۔ ایک ماں اپنے ضبط کو جہاں تک آزما سکتی تھی، انہوں نے آزمایا تھا لیکن وہ کیا کرتی کہ اس کا وجود تو ترازو کے دو پلڑوں کے بیچ بٹا ہوا تھا۔ ایک پلڑے میں شوہر کی محبت تھی تو دوسرے میں چار چار خونی رشتے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی...... سب کچھ داؤ پر لگ گیا تھا۔

''دھنیواد مائی! تو نے اپنے بیٹے کی مشکل آسان کر دی۔'' اس نے پاؤں کا پورا وزن کبیر کے نرخرے پر ڈال دیا۔ وہ اگرچہ پٹ پٹ کر نڈھال ہو گیا تھا لیکن ایک جوان صحت مند جسم میں سے روح نکلنے کا عمل آسان نہیں ہوتا۔ اس کا پورا جسم بن پانی کی مچھلی کے مانند اس بری طرح تڑپنے اور پھڑکنے لگا کہ مشرا کے لیے اس کے نرخرے

پر پاؤں جمائے رکھنا مشکل ہوگیا۔ اس موقع پر اس کے حواری آگے بڑھے اور کبیر کی دونوں ٹانگیں مضبوطی سے جکڑ لیں۔ اب مشرا کا کام آسان ہوگیا تھا لیکن گل وش اور اس کی ساس کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''چھوڑ دے ظالم! چھوڑ دے میرے بچے کو۔ تجھ پر خدا کا قہر نازل ہو اور تیرے بھائی کی طرح تُو اور تیرا سارا خاندان بھی کتے کی موت مارا جائے۔'' وہ اسے بددعائیں اور گالیاں دیتی ہوئی جنونی انداز میں اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے جنون کے آگے بند باندھنا سپاہیوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

''گولی مار دو سالیوں کو۔ میرے پریوار کو شراپ دینے والوں کو اس زمین پر رہنے کا ادھیکار نہیں ہے۔'' مشرا نے حکم صادر کیا۔ کبیر کے جسم نے آخری جھٹکا لیا تو گل وش اور اس کی ساس بھی جسم میں پیوست ہونے والی گولیوں کے باعث جھٹکا کھا کر زمین پر گر چکی تھیں۔ کشمیر میں ہر روز برپا ہونے والے ظلم کی داستانوں میں ایک اور داستان کا اضافہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

''ہم جانتے ہیں کہ تم مسافر ہو اور تمہیں ہمارے پاس کچھ عرصے ہی مہمان رہنا ہے پھر بھی ہم تم سے اپنا دل لگا بیٹھے ہیں اور ہمیں سچ مچ یہی لگتا ہے کہ ہمارا عمار واپس لوٹ آیا ہے۔'' شفاف پانی کے جھرنے کے قریب بیٹھے آغا جان [illegible] اس سے بہت محبت اور اپنایت [illegible] مخاطب تھے۔

''زرینہ کہتی ہے تمہارا ہر نقش عمار جیسا ہے۔ اگر آج ہمارا عمار ہمارے پاس ہوتا تو بالکل تم جیسا ہی ہوتا۔''

''مجھے بھی آپ لوگوں سے بہت اپنایت محسوس ہوتی ہے۔'' اس نے آغا جان کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر نرمی سے دبائے۔

''کاش میں بھی آپ کا عمار بن کر ہمیشہ آپ کے پاس رہ سکتا لیکن میں تو ان کے پاس بھی نہ رہ سکا جن کے دل بھی ہر پل اسی طرح میرے لیے تڑپتے ہیں جس طرح آپ اور بی بی کے اپنے عمار کے لیے۔''

''لیکن ہمیں اس بات پر خوشی بھی ہے کہ ہم تم جیسے قابلِ فخر بیٹوں کے باپ ہیں۔'' آغا جان نے اس کے لہجے میں گھلی اداسی کو محسوس کر کے اسے گویا حوصلہ دیا۔

''عمار تو بے شک قابلِ فخر ہے کہ اس نے اپنی دھرتی کے لیے اپنی جان قربان کر ڈالی۔ آپ میرے لیے بھی دعا کیجیے گا کہ یہ زندگی اگر خرچ ہو تو عمار کی طرح کسی بلند مقصد کے حصول کے لیے ہی خرچ ہو۔'' اس نے اپنی دلی خواہش بیان کی۔

''اللہ تمہیں تمہارے نیک مقاصد میں کامیاب کرے اور ان ظالموں کو نیست و نابود کردے جو مظلوموں کی لاشوں پر اس دنیا میں اپنی جنت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔''

''آمین!'' اس نے آغا جان کی دعا پر بڑے دل سے کہا۔

وہ جبار علی عرف جارو کی تجویز پر کشمیر میں موجود تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کے ایک عزیز عمار سے حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے اور جو تھوڑا بہت فرق موجود ہے، اسے اس لیے آرام سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ عمار اپنے جان پہچان والوں کے لیے گزشتہ چھ برس سے گمشدہ ہے۔ چھ برسوں میں انسان یوں بھی اچھا خاصا تبدیل ہوجاتا ہے اور ایک بڑھتی ہوئی عمر کے نوجوان میں تو یہ تبدیلی اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے اس لیے اسے عمار کی حیثیت سے بہ آسانی قبول کرلیا جائے گا۔ جبار علی کی یہ بات درست ثابت ہوئی تھی اور واقعی اردگرد والوں نے ایک حیرت انگیز مسرت کے ساتھ اسے قبول کرلیا تھا۔

''مجھے جبار نے عمار کی شہادت کے کچھ عرصے بعد ہی اطلاع دے دی تھی لیکن میں زرینہ کو یہ خبر نہیں [illegible] سکا۔ وہ اس آس پر جیتی [illegible] ایک دن اس کا عمار واپس لوٹ آئے گا۔ مجھے لگتا ہے جس دن اس کی یہ آس ٹوٹ گئی، اس کی سانسوں کی ڈور بھی ٹوٹ جائے گی۔'' ان کی بے نور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔

''مجھے جبار علی نے عمار کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے اس کے جذبے نے بہت متاثر کیا۔ اس طرح اپنے پیار کرنے والے ماں باپ اور گھر کے آرام کو چھوڑ کر گمنامی کی زندگی اختیار کرلینا اور گمنامی میں رہ کر ہی آزادی کے لیے جان نچھاور کردینا معمولی قربانی نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں عمار کے لیے بے حد ستائش تھی۔

''یہ سب تو تم بھی کر رہے ہو۔'' آغا جان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

''میں تو اس طرف دھکیلا گیا ہوں۔ عمار کی طرح میں نے خود سے اپنے لیے اس راہ کا تعین کہاں کیا تھا۔''

''تم منتخب کیے گئے ہو معاذ احمد......! اس راہ کے مسافر کہیں بہت اوپر سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ مجھ جیسوں پر تمہاری تکریم فرض ہے۔'' آغا جان نے اس کے بازو پر دباؤ ڈال کر اسے یقین دہانی کروائی۔

"آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" وہ جھینپ سا گیا۔

"نہیں۔ میں تمہیں سراہ رہا ہوں اور تم پر رشک کر رہا ہوں۔" آغا جان برجستگی سے بولے۔ "کاش، میری معذوری میری راہ میں رکاوٹ نہ بنتی تو میں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہوتا۔" ایک حسرت سی تھی ان کے لہجے میں۔

"ساتھ تو آپ اب بھی دے رہے ہیں۔ عمار کی تربیت آپ کے اور بی بی جان کے ہاتھوں [illegible] ہوئی ہوتی تو بھلا اس [illegible] میں ایسا جذبہ پیدا ہوتا؟" اس کے لیے وہ بوڑھا اور نابینا شخص سچ مچ قابلِ ستائش تھا۔

"آپ میری مدد کر کے بھی تو کتنی جرأت اور کشادہ دلی کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ میں جس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں، اس کا آپ کی جدوجہد آزادی سے براہِ راست کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔"

"امتِ مسلمہ کی بھلائی سے تو ہے نا۔"

"جی، وہ تو ہے۔"

"بس تو پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ تم پاکستانی اور میں کشمیری۔ ہمارے دل تو ایک ہی ہیں نا اور ہم ایک ہی کلمے کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔" آغا جان سچ مچ بہت کشادہ دل کے مالک تھے۔

"میں نے بنجامن سے بات کی تھی۔ موجودہ حالات بے شک پریشان کن ہیں لیکن میرے لیے ان حالات کی وجہ سے ہی بنجامن سے بات کرنا مزید آسان ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ میں ان حالات میں عمار کو کشمیر میں رکھنا مناسب نہیں سمجھتا اس لیے بہتر ہے کہ تم اسے کہیں باہر بھجوا دو۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ اس کا زیادہ کاروبار مشرقِ وسطیٰ میں ہے تو تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔"

"یہ بہت اچھا کام کیا آپ نے۔ میں براہِ راست اسرائیل نہ بھی جا سکا اور کسی قریبی ملک میں بھی پہنچ گیا تو آگے کی راہ نکال لوں گا۔" وہ سن کر خوش ہو گیا۔

"تمہارا پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے نا؟"

"جی بالکل۔ ہمارے انڈیا میں اچھے کانٹیکٹس ہیں اس لیے اس طرح کے سارے کام آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ جارو، میرا مطلب ہے جبار علی نے جب عمار بننے کی تجویز دی تو اس تجویز کو قبول کرنے کی بڑی وجہ ہی یہ تھی کہ یہاں سے سارے انتظامات کرنا ہمارے لیے نسبتاً آسان تھا۔ پھر مسٹر جوناتھن کی مدد شامل ہونے سے مزید آسانی ہو گئی۔" وہ جھرنے کے پانی پر نظریں جمائے ان کے سوال کا جواب دینے لگا۔ مشکل حالات کے باوجود کشمیر کا بے مثال حسن بار بار اس کی نظروں کو باندھ لیتا تھا۔

"ہاں، مسٹر جوناتھن ہمارے لیے اللہ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ جبار علی نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے عمار کو بھی بہت سپورٹ کیا۔ عمار کی شہادت کے بعد وہی تھے جنہوں نے اتنی خاموشی سے اس کی تدفین [illegible] کسی کو کانوں کان [illegible] کی حقیقت کا پتا نہیں چل سکا۔" عمار کے ذکر پر ہر بار ان کی آنکھوں میں کرب کروٹیں لیتا تھا۔

"ایک غیر مسلم ہو کر مسلمانوں سے اتنی ہمدردی حیرت انگیز ہے۔" اس کی حیرت لبوں پر آگئی۔

"انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے لیکن جبار علی نے مجھے بتایا تھا کہ مسٹر جوناتھن عرصہ ہوا اسلام قبول کر چکے ہیں۔ شروع میں ڈر کر اظہار نہیں کیا پھر مصلحت آڑے آ گئی کیونکہ یہ تو طے ہے نا کہ جوناتھن کی حیثیت سے وہ شکوک و شبہات سے بالاتر ہو کر جتنا عمدہ کام کر سکتے ہیں، کسی مسلمان شناخت کے ساتھ نہیں کر سکتے۔"

"لیکن اس طرح ان کو اپنی نجی زندگی میں تو کافی مشکلات پیش آتی ہوں گی؟"

"زیادہ نہیں۔ ان کی بیوی ایک کشمیری مسلمان ہی ہے۔ درحقیقت انہیں اس لڑکی کی محبت نے ہی اسلام کی طرف راغب کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ خفیہ طور پر مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ اعلان کرنا اس لیے ضروری نہیں تھا کہ انڈیا ایک سیکولر ملک ہے اور وہاں ہندو مسلم شادی اتنا بڑا ایشو نہیں ہے۔ جبار علی کے مطابق ان کی بیوی ایسی باکمال عورت نکلی کہ اندر سے انہیں بدل کر رکھ دیا اور آج وہ ہم کشمیریوں کے سب سے بڑے ہمدرد ہیں۔" انہوں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

"اللہ کا اذن شامل ہو تو مشکلات اسی طرح آسان ہوتی ہیں۔" وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"بے شک۔" آغا جان نے اس کی تائید کی۔

"چاچا شیر خان اور ان کے خاندان کی کوئی خبر؟ مجھے ان کی فکر ہو رہی ہے کہ کہیں وہ لوگ انڈین آرمی کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔"

"اللہ ان کی مدد فرمائے۔ کاش مجھے بروقت اطلاع مل جاتی تو میں ان کو کسی مناسب جگہ بھجوا دیتا۔ حاجی شیر خان بے چارہ سیدھا سادہ آدمی ہے۔ ان حالات میں خاندان کو لے کر نہ جانے کہاں بھٹکتا پھر رہا ہوگا۔" وہ خود ان لوگوں کے لیے پریشان تھے۔

"آپ نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی

کوشش نہیں کی؟"

"میرا آج کل زیر نگرانی ہونا یقینی ہے اس لیے میں اپنے سارے رابطوں سے لاتعلق بنا ہوا ہوں اور کسی طرح کی معلومات حاصل نہیں کرسکتا۔" انہوں نے اپنی مجبوری بتائی۔ معاذ بھی اس بات کو سمجھتا تھا۔ بنجامن کی ضمانت اور گواہی اسے سلاخوں سے باہر تو لے آئی تھی لیکن وہ شکوک و شبہات کی زد میں تھا اور اس کی وجہ سے آغا گل بھی۔ اسے اس وقت مجبوریوں اور مصلحتوں میں جکڑے کشمیریوں کی بے بسی کا حقیقی ادراک ہوا۔

☆☆☆

اس تنگ و تاریک اور سیلن زدہ تہ خانے میں موجود ان چار نفوس کے لیے کھل کر سانس لینا بھی محال تھا۔ وہاں ایک گھٹن تھی جو طبیعت میں بیزاری پیدا کرتی تھی اور سیلن اور تاریکی کی وجہ سے قنوطیت میں تبدیل ہوجاتی تھی۔ تہ خانے میں بجلی کا کنکشن تھا لیکن کبیر نے انہیں بلب روشن کرنے سے منع کیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر کسی درز سے روشنی باہر چلی گئی تو کسی کو ان کی وہاں موجودگی کا شک ہوجائے گا۔ وہ محض زیرو کے بلب کی روشنی میں گزارہ کررہے تھے اور اتنی احتیاط سے چلتے پھرتے تھے کہ کوئی آہٹ پیدا نہ ہو۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اچھی میزبانی نہیں کرسکوں گا اور آپ کو یہاں تھوڑی تنگی ترشی میں گزارہ کرنا پڑے گا۔" کبیر نے انہیں یہاں ٹھہراتے ہوئے واضح الفاظ میں بتادیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اشیائے ضرورت کے ساتھ اس طرف آتا جاتا دیکھ کر کوئی کھوج میں پڑجائے اس لیے ہر ممکن احتیاط سے کام لے رہا تھا لیکن ممکنہ حد تک انہیں سہولیات بھی فراہم کی تھیں۔ بستر، ضرورت کے کچھ برتن، خشک میوہ جات اور پانی...... یہ وہ بنیادی ضرورت کی چیزیں تھیں جو اس نے کسی نہ کسی طرح انہیں فراہم کردی تھیں۔ موقع پاکر گل وش کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی ان تک پہنچادیتا تھا لیکن تین وقت کا تازہ کھانا کھانے کی عیاشی باقی نہیں رہی تھی۔

"اتنی چھوٹی سی جگہ پر رہتے رہتے میری ٹانگیں اکڑنے لگی ہیں۔ مجھے تھوڑی دیر باہر جاکر کھیلنے دیں نا۔ میں باہر جاکر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا ہوں اور روشنی میں چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس تاریکی میں رہ رہ کر تو مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے میں اندھا ہوچکا ہوں۔" کل ان کا چھوٹا بھائی بہرام ضد پر اڑ گیا تھا۔ ماں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھا بجھا کر ضد سے باز رکھا لیکن یہ سوال تو سب ہی کے ذہن میں تھا کہ آخر وہ کب تک اس جگہ پر یوں قیدیوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔ باہر اگر جان جانے کا خطرہ تھا تو یہاں بھی گھٹ گھٹ کر دم نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہو چلا تھا۔ کبیر کے سامنے اس مسئلے کو رکھا گیا تو وہ بولا۔

"آپ کی بات بالکل درست ہے۔ واقعی اس جگہ کسی کا زیادہ دن رہنا بہت مشکل ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ گھر پر آپ لوگ محفوظ نہیں رہیں گے اور میرے پاس اس کے سوا کوئی اور ٹھکانا موجود نہیں ہے۔" وہ چاروں ہی جانتے تھے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

"میں کوشش کرتا ہوں کہ میرا کسی حریت پسند تحریک کے دوست سے رابطہ ہوجائے۔ عام آدمی کی نسبت ان کے پاس پھر بھی تھوڑے بہت وسائل ہیں اور وہ آپ لوگوں کے لیے کسی محفوظ مقام کا انتظام کرسکتے ہیں۔" وہ انہیں ایک آس سی دلا کر چلا گیا تھا اور آج دوپہر میں بس ذرا کی ذرا کھانا پہنچانے ہی آیا تھا۔ اس کا پہنچایا ہوا کھانا ٹھنڈا ہی سہی، پر اتنا تھا کہ رات کو بھی شکم سیری کے کام آگیا تھا۔ صرف پری وش تھی جس نے روٹی نہیں کھائی تھی اور بھوک نہ ہونے کا بہانہ کرکے چند خشک خوبانیوں پر گزارہ کرلیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے حصے کی روٹی صبح بہرام کے کام آجائے۔ وہ ویسے ہی اس جبراً اختیار کی جانے والی قید سے بیزار تھا۔ ایسے میں بھوک کے عفریت کا شکار ہوجاتا تو ان کے لیے اسے بہلانا اور بھی مشکل ہوجاتا۔ دو بیٹیوں کے بعد خاصے وقفے سے پیدا ہونے والے بہرام کو یوں بھی ہتھیلی کے چھالے کی طرح پالا گیا تھا اس لیے وہ کچھ نازک مزاج بھی تھا۔

"میری ذرا سی جذباتیت نے میرے پورے خاندان کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔" پری وش ماں کے ساتھ بستر پر لیٹی اس وقت کے لیے پچھتا رہی تھی جب وہ جذبات میں اندھی ہوکر رات گئے عمار کے لیے کھانا لے کر آغا گل کے گھر کی طرف چل پڑی تھی۔ ایک تو غیر یقینی حالات سے پیدا ہونے والا ذہنی دباؤ تھا، دوسرے خالی پیٹ بھی پریشان کررہا تھا اس لیے نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی اور وہ بہت کچھ سوچتی جارہی تھی لیکن اس کیفیت میں بھی اسے اس بات کا خیال تھا کہ اس کی اندرونی بے چینی ظاہر نہ ہونے پائے۔ وہ ماں کی نیند خراب ہونے کے خیال سے آنکھیں موندے بالکل ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ یوں تو اس تہ خانے میں دن رات تقریباً برابر ہی تھے لیکن قدرت کے عطا

کردہ نظام اور خود اپنے برسوں کے معمول کے باعث وہ لوگ مقررہ اوقات میں سونا جاگنا اور کھانا پینا انجام دیتے رہتے تھے۔ اب بھی قدرت کی طرف سے جسم میں چلتی حیاتیاتی گھڑی نے طے شدہ معمول کے مطابق سب کو سونے کے لیے لٹادیا تھا اور اس تہ خانے میں موجود چاروں نفوس میں سے صرف وہی تھی جو اس پہر جاگ رہی تھی۔

اچانک ہی آہٹ ہوئی تو وہ چونک گئی اور پٹ سے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ کپڑوں کی ہلکی سی سرسراہٹ نے اسے بتایا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی ہے جو اس وقت جاگ رہا ہے۔

''کون؟''

سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اپنے ساتھ سوئی ماں کی گہری سانسیں تو وہ سن ہی رہی تھی اور باپ کا معلوم تھا کہ وہ اتنی گہری نیند سونے کے عادی تھے کہ اگر انہیں جگایا نہ جائے تو فجر سے پہلے درمیان میں کسی صورت نہیں اٹھتے تھے۔

''بہرام!'' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے اسے اندھیرے میں بھی بالآخر اٹھنے والے کا ہیولا دکھائی دے ہی گیا۔

''یہ اس وقت چپکے چپکے کہاں جارہا ہے؟'' بہرام بے حد احتیاط سے بالکل دبے قدموں حرکت کررہا تھا اس لیے وہ یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ کسی حاجت کے باعث اٹھا ہے۔ یوں بھی اس کا رخ تہ خانے کے ایک کونے میں بنے بیت الخلا کے بجائے اس جانب تھا جہاں تہ خانے سے اوپر جانے والی سیڑھیاں موجود تھیں۔

''اوہ میرے خدایا! اس کے دماغ سے باہر جاکر کھلی فضا میں سانس لینے کی بات نکلی نہیں ہے اور یہ اس وقت چپکے سے باہر جارہا ہے۔'' اسے معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی لیکن اس نے بہرام کو روکنا اور ٹوکنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ اپنی جگہ پڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ اتنی احتیاط سے کام لے رہا تھا کہ اگر وہ جاگ نہ رہی ہوتی تو اسے اس کے اس طرح جانے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ زینہ طے کرکے تہ خانے کا راستہ کھول کر باہر نکل گیا تو وہ خود بھی اسی کی طرح احتیاط سے بستر سے اٹھی اور اوڑھنی کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے زینہ چڑھ گئی۔ تہ خانہ اوزاروں والے کمرے میں کھل رہا تھا اور کمرے کا دروازہ بہرام کھلا چھوڑ گیا تھا۔ وہ بھی کھلے دروازے سے باہر چلی آئی۔ باہر آتے ہی ٹھنڈی اور تازہ ہوا کا جھونکا جسم سے ٹکرایا تو اسے بہت اچھا لگا اور بے اختیار ہی اس نے ایک گہری سانس لی۔

''یہ بہرام کہاں چلا گیا، اسے دیکھتی ہوں، ایسا نہ ہو کہ زیادہ آگے نکل جائے۔'' چھوٹے بھائی کے خیال نے اسے فکر میں مبتلا کیا تو سب بھول بھال کر اس کی تلاش میں قدم آگے بڑھائے۔ چڑھتا چاند تھا اس لیے رات کا وقت ہونے اور کوئی مصنوعی روشنی نہ جلنے کے باوجود اتنا گھپ اندھیرا نہیں ہورہا تھا کہ کچھ دکھائی نہ دے۔ اس کی نظروں نے جلد ہی بہرام کو جالیا۔ وہ باغ کے پھاٹک کی طرف جارہا تھا۔

'مجھے اسے روکنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باہر نکل کر کسی مشکل میں گھر جائے۔' وہ دل ہی دل میں سوچتی اس کے پیچھے لپکی۔ دائیں بائیں ایک خاص ترتیب میں لگے سیب کے پیڑوں نے حسرت سے اس دھرتی کی بیٹی کو دیکھا جس کی مٹی میں وہ تاثیر تھی کہ اس کا تقابل صرف جنت سے ہی کیا جاسکتا تھا۔ روئے زمین پر دوسرا کوئی خطہ بھلا کشمیر کی مثل کہاں تھا۔ اس دھرتی سے جنم لینے والا حسن بے مثال تھا تو نمو پانے والے ذائقے لاجواب۔

لاجواب ذائقے والے سیبوں کے وہ پیڑ اگر بول سکتے تو اپنی دھرتی کی بیٹی کو پکار کر یہاں سے کہیں دور بھاگ جانے کا مشورہ دیتے لیکن چونکہ وہ بول نہیں سکتے تھے تو ان کے نصیب میں بے بسی سے سب دیکھتے رہنا ہی لکھا تھا۔

''بہرام!'' اپنی جانب بڑھتے خطرے کی بُو سونگھے بغیر ہی پری وش نے دبی آواز میں بہرام کو پکارا لیکن اس کی پکار بہرام تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ ان گاڑیوں کے غراتے انجنوں کی آواز میں گم ہوگئی تھی جو ابھی وہاں پہنچی تھیں اور جن سے بھارتی سپاہی اچھل اچھل کر باہر کود رہے تھے۔

پری وش کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ بہرام بھی ان آوازوں کو سن چکا تھا اور ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گیا تھا۔

''بھاگو بہرام! بھاگو اور ان پیڑوں کے درمیان کہیں جاکر چھپ جاؤ۔'' وہ جو اب تک بہرام کو لاعلم رکھنے کی خاطر اس کے پیچھے بہت احتیاط سے آرہی تھی۔ پوری رفتار سے دوڑ کر اس تک پہنچی اور اضطراری لہجے میں اس سے کہا۔

''پہلے دیکھنے تو دیں آپا کہ کون ہے؟'' وہ مضطرب تھا لیکن پری وش جتنا نہیں۔

''دیکھنا کیا ہے میرے بھائی! میں ان بھیڑیوں کی بو کو یہاں سے بھی محسوس کرسکتی ہوں۔'' باہر سرچ لائٹیں روشن ہونا شروع ہوگئی تھیں اور کوئی دم نہیں جاتا تھا کہ وہ پھاٹک توڑ کر اندر گھس آتے۔

''آپ...... آپ بھی میرے ساتھ چلیں آپا!'' بہرام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچ لے جانے کی کوشش کی۔

''نہیں، تم جاؤ۔ میں جاکر اماں اور بابا کو خبر دیتی

ہوں۔" اس نے بہرام کو دائیں جانب دھکیلا اور خود جس راستے پر چل کر یہاں آئی تھی، اسی پر واپس دوڑ گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب ایک بڑی گاڑی نے لکڑی کے پھاٹک کو ٹکر ماری۔ کمزور سا پھاٹک پہلی ہی ٹکر میں اپنے قبضوں سے اکھڑ کر زمین بوس ہو گیا۔ گاڑی غراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اس کی طاقتور ہیڈ لائٹس کی روشنی نے فوراً ہی دوڑتی ہوئی پری وش کو جالیا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں چلیں اور اس کے دائیں بائیں سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔ گھبراہٹ میں اسے ٹھوکر لگی اور لڑکھڑا کر زمین پر گر گئی۔ گولیاں چلانے والے اس منظر کو دیکھ کر وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے لگے۔ وہ چڑیا کو دبوچنے سے پہلے اس کے پھڑپھڑانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"مر جانا ہے مگر ان کے ہاتھ نہیں آنا۔" نیچے گری پری وش کے سامنے بربریت کی بے شمار داستانیں تھیں اس لیے اسے فیصلہ کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ وہ گاڑی کے اپنے قریب پہنچ کر رکنے سے قبل ہی اٹھی اور ایک جانب دوڑ پڑی۔ فوراً ہی ایک بار پھر گولیاں برسیں اور اس کے آس پاس سے گزر گئیں۔ وہ جانتی تھی کہ بھارتی سپاہیوں کا نشانہ اتنا کچا نہیں کہ اسے نشانہ نہیں بنا سکیں۔ وہ صرف اسے ڈرا رہے تھے اور اس کے ڈر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ ایک آبرومند لڑکی کے لیے اس کی آبرو زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ بھی موت کے ڈر سے بے نیاز اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ یہ باغ اس کے بہنوئی کا تھا۔ وہ یہاں بے شمار بار آئی تھی اس لیے اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس وقت باغ کا کون سا گوشہ اسے پناہ دے سکتا ہے۔

"پکڑو سالی کو، بھاگنے نہ پائے۔" گاڑی رک چکی تھی اور اس میں سے بھارتی سپاہی اچھل اچھل کر باہر نکل رہے تھے۔ یہ مشرا تھا جو چلائی گئی گولیوں کو بے اثر جاتا دیکھ کر زور سے چلایا تھا۔ اس کے ساتھی اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی پری وش کے پیچھے دوڑ گئے۔

گولیوں کی آوازوں نے تہ خانے میں سوئے ہوئے حاجی شیر خان اور اس کی بیوی کو بھی نیند سے جگا دیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے تھے اور فوراً ہی انہیں اپنے بچوں کی غیر موجودگی کا ادراک ہو گیا تھا۔

"بہرام نہیں ہے، بہرام کی ماں!"

"پری بھی غائب ہے۔" ماں کی آواز اندیشوں سے لرز رہی تھی۔

"اس طرح چپ چاپ رات گئے وہ کہاں اور کیوں گئے؟" حاجی شیر خان کو اپنے سوال کا جواب تو نہیں ملا لیکن باہر چلتی گولیوں کی آواز نے ایک بار پھر دل کو لرزا دیا۔

"میرے بچے۔" ممتا تڑپ کر پکاری اور دنیا کے ہر خوف کو پس پشت ڈال کر ایک ماں کو اوپر کی طرف دوڑا دیا۔ حاجی شیر خان جس کا سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا، اب وہاں ٹھہر کر کیا کرتا۔ وہ بھی بیوی کے پیچھے ہی بھاگا۔ تہ خانے کا کھلا راستہ اور اس سے آگے کمرے کا چوپٹ کھلا دروازہ سب گواہی دے رہے تھے کہ اندر کے حبس اور اندھیرے سے گھبرائے ان کے بچے کھلی فضا کی خواہش میں باہر نکلے تھے اور......

اس اور سے آگے سوچنے کا انہیں حوصلہ نہیں تھا لیکن جو سوچا نہیں جا سکتا تھا وہ حقیقت کے روپ میں ان کے سامنے تھا۔ کھلے دروازے سے باہر تیز روشنی اور اس روشنی میں دکھائی دیتی ایک کے پیچھے ایک کھڑی فوجی گاڑیاں۔ ان دونوں کے دل اس منظر کو دیکھ کر بری طرح ڈوب گئے اور انہوں نے وہاں موجود بھارتی سپاہیوں کے ہجوم میں پری وش اور بہرام کو تلاشنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ہی وہاں موجود نہیں تھے۔ ایک طرف اطمینان ہوا تو دوسری طرف دماغ میں سوال بھی گونجنے لگے کہ آخر وہ دونوں کہاں ہیں؟

"ہینڈز اپ۔" یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان خونی بھیڑیوں کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہتے۔ ایک ساتھ کئی بندوقیں ان کے اوپر تن گئیں۔

"بزدل چوہے بل میں چھپ کر بیٹھے تھے۔ کیا سمجھ رہے تھے تم کہ بھارت ماتا کے سپوت کو مار کر خود بچ جاؤ گے۔" مشرا کا غصہ ان پر نکلنے لگا اور اس نے بلا تکلف حاجی شیر خان کو رائفل کے کئی بٹ دے مارے۔

"ہم نے کسی کو نہیں مارا ہے۔ اس خبیث کو اس کے کرموں کا بدلہ دینے کے لیے اللہ نے ہمارے لیے فرشتہ بھیجا تھا۔ ہم بے گناہ تو بس تم ظالموں کے ظلم سے بچنے کے لیے چھپتے پھر رہے تھے۔" اب کچھ نہیں رہا تھا جسے بچانے کی آس میں اپنی آواز کو گھونٹا جاتا۔ بھارتی درندوں کے نرغے میں آنے کے بعد رحم کی امید رکھنا خود کو دھوکا دینے کے برابر تھا اس لیے زبان پر پڑا قفل کھل گیا۔

"اس فرشتے کو بھی ہم ڈھونڈ نکالیں گے لیکن پہلے ان زبانوں کو تو بند کر دیں جو ہمارے خلاف بھونکتی رہتی ہیں۔" اس نے رائفل کی نال جارحانہ انداز میں پری وش کی ماں کے منہ میں گھسائی اور گولی چلا دی۔ گولی کا زاویہ کچھ ایسا بنا کہ وہ تالو کو پھاڑتی ہوئی کھوپڑی سے باہر نکل گئی اور نشانہ

بننے والی مظلوم عورت کو دوسری سانس لینا بھی نصیب نہ ہوا۔

''بزدلو! ایک عورت کو گولی مار کر کون سی بہادری کا ثبوت دیا ہے تم نے۔ ماں کا دودھ پیا ہے تو آؤ اور ہتھیار پھینک کر کسی مرد سے لڑو۔'' زندگی کی ساتھی کو یوں پل بھر میں اپنی نظروں کے سامنے دم توڑتے دیکھ کر شیر خان کا دماغ صدمے سے الٹ گیا اور وہ سب کچھ بھول بھال کر لڑنے مرنے پر اتر آیا۔ اس کے اس بے بس اظہار پر ان لوگوں نے زوردار قہقہہ لگایا پھر مشرا اس کے عین سامنے کھڑا ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''سنا ہے بجھنے سے پہلے چراغ خوب پھڑکتا ہے۔ تیرا بھی کچھ وہی حال ہے۔ چل پھڑکنا چھوڑ، ہم تجھے بھی وہیں پہنچا دیتے ہیں جہاں تیری پتنی اور باقی کا پریوار موجود ہے۔'' اس نے رائفل کی نال حاجی شیر خان کے سینے پر رکھ دی۔

''کیا مطلب؟ کیا کیا ہے تم نے میرے بچوں کے ساتھ؟'' شیر خان رونے والا ہو گیا۔

''ہم سے غداری کی سزا بھگتی ہے حرام زادوں نے۔ ہمارے مجرموں کو پناہ دی تھی نا تیری بیٹی، داماد نے۔ لے پھر ان کے لیے دھرتی پر کہیں کوئی پناہ نہیں رہی۔ مار آئے ہیں ان غداروں کو اور اب تمہاری باری ہے۔'' مشرا نے دیوانگی کے عالم میں اس کے چہرے پر رائفل کے کئی بٹ مارے۔ شیر خان کو اگرچہ دو سپاہیوں نے جکڑا ہوا تھا پھر بھی وہ بپھر گیا اور خود کو ایک جھٹکے سے چھڑاتے ہوئے مشرا کا گلا پکڑ لیا۔

''خون پی جاؤں گا میں تیرا۔ نسلوں سے تم ہمیں ڈس رہے ہو، اب تمہاری باری ہے۔'' دیوانگی میں وہ اس زور سے مشرا کا گلا گھونٹ رہا تھا کہ لمحوں میں اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے تھے اور حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ کئی سپاہیوں نے زور لگا کر اسے مشرا سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ جبر کی انتہا تھی کہ ایک سیدھا سادہ آدمی مقابلے پر اتر آیا تھا۔

''گولی مار دو اسے۔'' مشرا کی جان پر بنتے دیکھ کر حکم صادر کرنا پڑا۔ گولی شیر خان کی کھوپڑی میں اتری تو مشرا کے نرخرے پر جمے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو گیا۔

ادھر مشرا گلے پر دباؤ ہٹنے سے ایک بار پھر جی اٹھا اور کسی ہانپتے ہوئے کتے کی طرح منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ ذرا حالت سنبھلی تو شیر خان کے مردہ وجود کو ٹھوکر مار کر چیخا۔

''کہاں ہے اس کی لونڈیا؟ جلدی سے لے کر آؤ اسے۔ اس کی لاش پر لٹا کر اس کی لونڈیا کا بلات کار نہیں کیا تو

میرا نام بھی مشرا نہیں۔'' جس وقت وہ یہ الفاظ کہہ رہا تھا، پری وش کے پیچھے دوڑنے والے اس کے سپاہی پری کے سر پر پہنچ چکے تھے اور یوں لگتا تھا کہ اگلے ہی پل وہ ان کی گرفت میں ہوگی لیکن پھر پل میں ہی بازی پلٹ گئی۔ سپاہیوں کے ہاتھ اس کے جسم کو چھو پاتے، اس سے پہلے وہ باغ کی پرلی جانب اس کنوئیں کی منڈیر پر پیر جما چکی تھی جسے اپنی آخری پناہ گاہ تصور کر کے اس طرف دوڑی آئی تھی۔

''رک جا، میں کہتا ہوں اے لڑکی رک جا۔'' ایک سپاہی زور سے چلایا اور اضطراری طور پر اس پر رائفل تان لی لیکن پھر اسے خود ہی احساس ہوگیا کہ جو خود ہی مرنے کی ٹھانے بیٹھا ہو، اسے موت سے نہیں ڈرایا جاسکتا۔ رائفل نیچے جھک گئی اور پری وش نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کنوئیں میں چھلانگ لگادی۔

☆☆☆

''فکر مت کرو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' عالم شاہ نے مسلسل تسبیح گھماتی سجل کی نقاب سے جھانکتی فکرمند آنکھوں پر ایک نظر ڈالی اور اسے تسلی دی۔

''ان شاء اللہ!'' جواب میں وہ دل کی گہرائیوں سے بولی پھر اپنی پریشانی کی وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

''موبل چھوٹی ہے۔ اس پر کبھی کوئی ذمے داری نہیں رہی اس لیے مجھے فکر ہورہی ہے کہ وہ تنہا اس مشکل اور تکلیف دہ وقت سے کیسے گزر رہی ہوگی۔ اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ آپ، اماں یا بابا سائیں میں سے کوئی ایک تو اس کے پاس رک جاتا۔''

''حالات تمہارے سامنے ہیں۔ تم جس حالت میں تھیں، یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک بھی تم سے دور ہونا منظور کر لیتا۔''

''ہاں، لیکن موبل......''

''تم موبل کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہی ہو۔'' عالم نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ ''ادا معظم شاہ کی وفات سے لے کر اب تک بے شمار مشکلات آئی ہیں اور ہر مشکل وقت میں یہ موبل ہی تھی جس نے بہت حوصلے سے کام لیا ہے۔ اماں سائرن کو پرسکون رکھنا۔ انہیں سنبھالنا، حویلی کا نظم و نسق دیکھنا اور بابا سائیں کو تسلی اور حوصلہ دینا...... یہ ساری وہ ذمے داریاں تھیں جو موبل کی عمر سے بہت بڑی تھیں لیکن اس نے انہیں ایسے سنبھالا کہ کسی کو احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ کوئی بڑا یا مشکل کام انجام دے رہی ہے۔''

''لیکن اس وقت وہ مشکل اور تکلیف میں ہے تو ہم میں سے کوئی اسے سنبھالنے کے لیے اس کے قریب موجود نہیں ہے۔'' سجل کی سوئی اپنی جگہ اٹکی تھی۔

''جا رہے ہیں نا ہم اس کے پاس۔ ان شاء اللہ اس کے آپریٹ سے پہلے ہی اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔'' اس بار عالم نے بحث کرنے کے بجائے رسان سے جواب دیا۔

انہیں بہت اچانک ہی موبل کی بیماری کی خبر ملی تھی۔ اس کے پتے میں پتھری ہوگئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق ایسا کافی عرصے سے تھا لیکن موبل نے سب سے یہ بات چھپائی اور دواؤں کی مدد سے اپنی تکلیف کو دباتی رہی۔ شاید حویلی میں پھیلی ٹینشن کی وجہ سے اس نے ایسا کیا تھا۔ اسے خیال ہوگا کہ اتنی پریشانی میں ماں باپ کے لیے ایک اور پریشانی کیا بڑھائے لیکن اس کے اس طرز عمل کا نتیجہ اس طور سامنے آیا تھا کہ ڈاکٹرز نے فوری آپریشن کو ناگزیر قرار دے دیا تھا۔ اتنا بڑا کام ملازمین کے سہارے انجام نہیں پاسکتا تھا اس لیے اطلاع ان لوگوں تک پہنچا دی گئی تھی۔ اس اطلاع کو سن کر صداقت شاہ نے کہا تھا۔

''میں اور تمہاری اماں سائرن پاکستان واپس چلے جاتے ہیں۔ تم دونوں بہن بھائی، نیلی اور اعظم کے ساتھ یہیں رہو۔ سجل ٹھیک ہوجائے تو پھر وطن واپسی کا پروگرام بنالینا۔''

لیکن اس موقع پر سجل ضد پر اڑ گئی تھی اور بہن کے پاس واپس جانے کی رٹ لگائی تھی۔ ہمیشہ کی مفاہمت پسند سجل کا یہ انداز سب کے لیے نیا تھا لیکن پھر کوئی اس سے رک جانے پر زیادہ اصرار بھی نہیں کرسکا تھا۔ وہ بہت نازک وقت سے گزری تھی اور اب بھی معذوری کا بوجھ اٹھائے یقینی طور پر شدید ذہنی دباؤ سے گزر رہی تھی اس لیے اس کو کسی ایسی بات کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا جس سے اس کے ذہنی دباؤ میں اضافہ ہوجائے۔ مجبوراً ہی سہی، اس کی بات مان لی گئی تھی اور وہ سب وطن جانے والی فلائٹ میں سوار تھے۔

سجل کی حالت کے پیش نظر عالم شاہ بطور خاص اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کی اضطراری حالت کو دیکھ کر اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے اور نہ ہی اسے موبل کے سوا کچھ سجھائی دے رہا ہے۔

''کتنی دیر اور لگے گی؟'' وہ اڑ کر ہی بہن کے پاس جارہی تھی لیکن چاہتی تھی کہ کچھ ایسا ہوجائے کہ پلک جھپکنے میں اس تک پہنچ جائے۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا/باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے
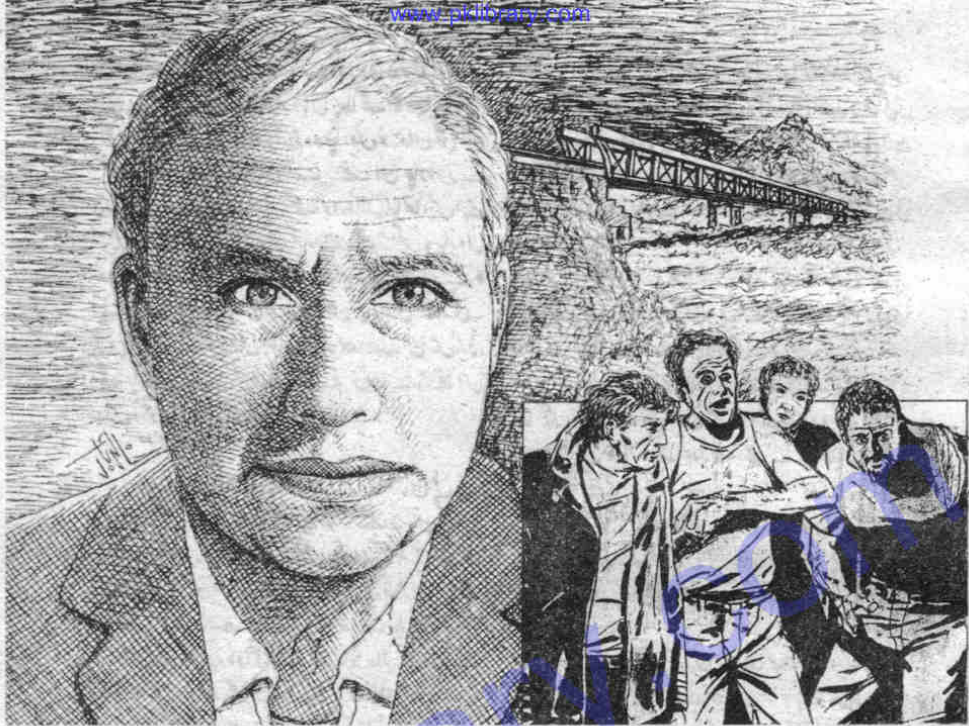
بات سنو

عتیق بخاری

اکثر بُرے حالات میں کم ہمتی اچھا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کردیتی ہے۔ وہ بھی فالج زدہ سوچ کے حامل لوگ... زندگی سے مایوس ہوکر موت کی طرف بڑھتے جارہے تھے... ایسے میں کسی کے مہربان ساتھ نے انہیں موت کے منہ سے کھینچ کر زندگی کی طرف لوٹایا تو احساس ہوا کہ زندگی اتنی حقیر شے نہیں کہ اتنی آسانی سے موت کے منہ میں دھکیل دی جائے۔

چند ٹھکرائے ہوئے بدقسمت لوگوں کی خوش امیدی کا قصہ

دن کے اجالے پر رات کی تاریکی چھانے کوتھی کہ ایک نوجوان اس پُل کے قریب آیا جو شور مچاتے، تیزی سے بہتے پانی کے اوپر بنا ہوا تھا۔ اس کے آنے کے بعد محض چند سیکنڈ کے وقفے سے اسی کی عمر کے تین اور نوجوان وہاں آپہنچے۔

وہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسرے سے لاتعلق کھڑے پانی کی اٹھتی لہروں کو دیکھ رہے تھے۔ ان چاروں کے چہروں پر اداسی، یاسیت، دکھ سب بیک وقت موجود تھے۔ ان چاروں کا ایک مقصد تھا...... خودکشی کرنا۔ یہ پُل تھا

ہی خودکشیوں کے لیے مشہور۔ آئے روز کوئی نہ کوئی بدنصیب اپنی پریشانیوں سے تنگ آ کر وہاں چھلانگ لگا دیتا۔ وہ پل کئی جانیں نگل چکا تھا اور آج وہ چاروں نوجوان بھی اسی منحوس نیت کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ ان چاروں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا، بس اپنی اپنی سوچوں میں گم پانی پر غور کر رہے تھے۔ اگر وہ چاروں خودکشی کرتے تو اس پل پر بیک وقت چار خودکشیاں کرنے کا ایک ریکارڈ بن جاتا لیکن قدرت کو ان کی زندگی منظور تھی۔ پل پر آنے کے محض بیس پچیس سیکنڈ بعد جب ان میں کوئی ایک یا شاید چاروں چھلانگ لگانے ہی والے تھے اس اداس و منحوس ماحول میں ایک آواز گونجی۔

''رکو!''

وہ چاروں چونک گئے اور اس تقریباً سنسان پل کے پاس ایک شخص کو دیکھا جو پچپن سے ساٹھ کے درمیان کی عمر کا تھا۔ اس اندھیرے میں اس کی شکل اتنی واضح نظر نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ ان چاروں سے قدرے فاصلے پر سڑک کنارے لگے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ نہ جانے اس کی آواز میں کیا تھا کہ وہ واقعی رک گئے اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو اور پھر اسے دیکھنے لگے۔ وہ شخص درخت کے نیچے سے نکل کر ان کے قریب آ گیا اور بغیر کوئی تمہید باندھے بولنے لگا۔

''تم یقیناً خودکشی کرنے آئے ہو۔ میرا خیال درست ہے نا؟'' ان چاروں نے اس کی اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں۔

''ارے، تم بھی خودکشی کرنے آئے تھے؟'' وہ شخص پھر بولنے لگا۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے، کرلو خودکشی۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ بس میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو پھر میں نے ایک ضروری کام کرنا ہے۔ تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ پلیز! میری ہیلپ کر دو پھر شوق سے مر جانا، پلیز......!''

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' ان میں سے ایک بولا۔ اس کی آواز مری مری سی تھی۔

''میں ایک رائٹر ہوں اور مختلف موضوعات پر لکھتا ہوں۔ تمہیں دیکھا تو ذہن میں خیال آیا کہ اگر یہ خودکشی کرنے لگے ہیں تو ان سے بات کر کے اس بارے میں بھی کچھ لکھوں۔'' وہ بڑی جلدی جلدی بول رہا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر کچھ دیر کی تو وہ چاروں سنے بغیر پانی میں کود جائیں گے۔

''کیوں ہمیں پریشان کر رہے ہو؟ جاؤ اور کہیں اور سے کہانی ڈھونڈو۔ ہم سے تمہیں کوئی کہانی نہیں ملے گی۔ ہاں، بس ایک چھوٹی سی خبر مل سکتی ہے...... کل کے اخبارات میں۔'' ایک نوجوان نے بڑے اداس لہجے میں کہا تو وہ شخص تیزی سے اس کے قریب گیا اور اس کا بازو پکڑ کر باقی تین کی جانب مڑا۔

''دیکھو، تم نے مرنا تو ہے ہی۔ جاتے جاتے مجھ پر احسان کر جاؤ۔ صرف تھوڑی دیر رک جاؤ...... بس تھوڑی سی دیر......!'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''بولو، کیا پوچھنا ہے لیکن ذرا جلدی۔ ان تینوں کا تو پتا نہیں لیکن مجھے اس پانی میں کودنا ہے، وہ بھی جلد از جلد۔'' جس کا بازو پکڑا ہوا تھا، اس نے کہا تو باقی تینوں بھی مان گئے۔

''آؤ میرے ساتھ، وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' وہ شخص یہ کہہ کر انہیں پل سے ذرا فاصلے پر لے گیا۔ درختوں کے نیچے بینچ رکھے ہوئے تھے۔ وہ پانچوں وہاں جا کر بیٹھ گئے۔

''بس، اب تم یہ کرو کہ اپنا اپنا نام بتا کر خودکشی کی وجہ بتاؤ۔ مجھے بس یہی جاننا ہے اور ہاں...... پہلے میں اپنا نام بتا دیتا ہوں...... الفریڈ گبر...... رائٹر ہوں، تنہا رہتا ہوں۔ میرا خیال ہے تمہارا اتنا جان لینا کافی ہے۔ اب تم شروع ہو جاؤ۔'' اچانک وہاں آ کر چار لوگوں کو خودکشی کرنے سے عارضی طور پر روک لینے والے نے اپنا تعارف کروایا۔ وہ چاروں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ الفریڈ منتظر نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''میرا نام جیمز ہے۔ گٹارسٹ ہوں۔ بہت اچھا گٹار بجا لیتا ہوں لیکن کسی کو میرے فن کی قدر ہی نہیں۔'' الجھے براؤن بالوں والے خوبرو لڑکے نے گویا اپنی بات مکمل کر دی لیکن الفریڈ نے اسے مزید بولنے کا کہا۔

''نہیں، اتنا کافی نہیں۔ تمہیں شروع سے لے کر آج اس پل پر آنے تک کے تمام حالات و واقعات بتانا ہوں گے۔''

''مجھے بچپن سے گٹار بجانے کا شوق تھا۔ میں پڑھائی پر کم اور اس کام پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ جوں جوں بڑا ہوتا گیا، فن میں نکھار آتا گیا لیکن ممی کو یہ پسند نہیں تھا۔ وہ بہت ڈانٹ ڈپٹ کرتیں۔ کئی بار میرا گٹار توڑ دیا۔ میں جیب خرچ جمع کر کے اور لے آتا۔ اس پر ممی نے میرا جیب خرچ بند کر دیا۔ وہ مجھے ٹیچر بنانا چاہتی تھیں لیکن پڑھانا تو دور کی بات، مجھے تو پڑھنے میں بھی دلچسپی نہ تھی۔

ممی نے مجھے بارہا ڈانٹا، مارا، ڈیڈی سے مار پڑوائی لیکن میں اپنے شوق میں سب سہتا گیا۔ اسی دوران مجھے اور میرے چند دوستوں کو ایک پارٹی میں گٹار بجانے کے لیے کہا گیا۔ وہاں میری بڑی پذیرائی ہوئی اور معاوضہ بھی ملا۔ بس اس بات سے میں اتنا نڈر ہوگیا کہ گھر اور ماں باپ کو چھوڑ دیا۔ میں نے سوچا کہ میں اب خود خوب کما سکتا ہوں۔ شہرت بھی مل جائے گی تو پھر کیوں گھر میں رہ کر ڈانٹ ڈپٹ سہوں اور اپنے شوق کی وجہ سے بار بار طعنے سنوں۔'' جیمز کچھ دیر کے لیے رک گیا۔ وہ کچھ کھو سا گیا تھا جیسے پرانے دن اس کے سامنے پھرنے لگے ہوں۔ سب نہایت خاموشی سے اسے سُن رہے تھے۔ ویسے بھی الفریڈ کے علاوہ باقی تین ایسی پوزیشن میں تھے ہی نہیں کہ کوئی ردعمل دے سکتے۔ وہ خالی خالی نظروں سے گویا سننے کی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔

''بولتے رہو۔'' الفریڈ نے نرمی سے بولتے ہوئے اس کی ہمت بندھائی۔ اسے لگا تھا کہ ماضی کے دنوں میں جا کر جیمز شاید دکھی ہوگیا ہے۔ جیمز ہلکا سا چونکا اور پھر بولنا شروع کیا۔

''میں واقعی آگے بڑھنے لگا، کئی فنکشن کیے۔ جو کماتا، اپنے گروپ کے ساتھ ہلا گلا کرتے ہوئے لٹا دیتا۔ میں بے فکر تھا کہ میرا فن مجھے ہمیشہ دولت دیتا رہے گا اور میں خوبصورت زندگی گزاروں گا۔ کچھ عرصہ تو ایسا ہی چلتا رہا پھر ایک روز ایک پارٹی میں ایک اور گٹارسٹ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس کی عزت دیکھ کر مجھے جلن سی ہوئی۔ میری اور اس کی تو تکار ہوگئی اور ایک دن نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ میں نے اس کے سر پر بوتل دے ماری۔ وہ زخمی ہوگیا۔ لوگوں نے اس کے ساتھ ہمدردی دکھائی اور مجھے نفرت کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے مخالف نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے شدید مالی نقصان پہنچایا۔ لوگ اس کے گرویدہ ہوگئے۔ اسے معصوم اور مجھے ظالم کہا گیا۔ ٹھنڈے دل سے سوچا تو معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ احساس تو ہوگیا لیکن اب دیر ہوچکی تھی۔ مختصر سے عروج کے بعد میرا عبرتناک زوال شروع ہوگیا۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، معروف ہوٹلز، ریسٹورنٹ کے ساتھ ساتھ غیر معروف جگہوں اور لوگوں سے کام مانگا لیکن اب انکار اور بھوک میری قسمت میں گویا لکھ دی گئی تھی۔ بڑے کروفر سے گھر چھوڑا تھا۔ واپس جاتے شرم آرہی تھی پھر بھی میں نے دو تین بار گھر رابطہ کیا لیکن ادھر سے سرد مہری کا اظہار کیا گیا۔ اب حال یہ ہے کہ تقریباً تین سال ہوگئے ہیں مجھے خوار ہوتے ہوئے۔ تھوڑا بہت کام ملتا ہے اور مہینوں کام کے لیے ترستا ہوں۔ کوئی اور کام کرنا چاہا تو اس میں مجھے کامیابی نہیں ملی۔ میں اب اپنی زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔ ایک طرف یہ دکھ ہے کہ میرا شوق بری طرح ذلیل ہوکر تقریباً مرچکا ہے اور دوسری طرف بھوک کا رونا اور ہاں، سب سے تکلیف دہ بات یہ کہ میں اپنے ممی ڈیڈی کے پیار اور توجہ کو ٹھکرا کر گھر چھوڑ کر اپنوں کو گنوا چکا ہوں۔''

''تم بھوکے ہو اس وقت؟'' الفریڈ نے اچانک اس کی بات کاٹ دی۔

''میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔'' جیمز آہستگی سے بولا۔ الفریڈ کو اس کی آواز میں بھوک کا درد اور نقاہت محسوس ہوئی۔

''اوہ، رکو...... میں ابھی آیا پھر تمہاری باقی بات سنتا ہوں۔'' الفریڈ کھڑا ہوکر بولا۔ محض چند قدم چل کر وہ رک گیا۔

''میں بس تین چار منٹ میں آرہا ہوں۔ یاد رکھنا تم نے...... یعنی تم چاروں نے مجھے اپنی اپنی کہانی سنانے کے بعد ہی خودکشی کرنی ہے۔'' الفریڈ گبز ان سے اس کے واپس آنے تک زندہ رہنے کی یقین دہانی چاہ رہا تھا۔

''یاد ہے ہمیں۔ بس تم ذرا جلدی کرو۔'' ایک زندگی و جذبات سے عاری آواز نے کہا۔

الفریڈ دس بارہ منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چند ڈبے تھے۔ ان میں برگرز، سینڈوچز اور جوسز تھے۔

''لو، یہ تم چاروں کے لیے ہے، کھالو...... جیمز! تم باقی کہانی اس کے بعد ہی سنانا۔'' الفریڈ نے ایک برگر لیتے ہوئے باقی سامان ان کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ چاروں انکار کریں گے اور پھر اسے ان کی منت سماجت کرکے کھلانا پڑے گا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان سب نے بڑی جلدی کھانے کی چیزوں کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ وہ جو چند منٹ پہلے زندگی ختم کرنے والے تھے، بڑی رغبت سے کھانا کھانے لگے۔ الفریڈ ان کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے محض ایک برگر ختم کرنے کے دوران وہ ساری چیزیں ختم کرچکے تھے۔

''لگتا ہے تم سب ہی نے صبح سے یا شاید کل سے کچھ نہیں کھایا۔'' الفریڈ بولا۔ جواب میں وہ کچھ نہیں بولے۔ الفریڈ نے غور کیا کہ جذبات و احساسات سے عاری چہروں پر تھوڑی تھوڑی سی زندگی کی رمق پیدا ہوگئی تھی۔

''جیمز! تم اپنی بات مکمل کرو۔'' الفریڈ گبز نے بینچ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''میں سب کچھ گنوا چکا ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔'' جیمز کی آواز بھرا گئی تھی۔

''تو اس لیے تم نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا؟'' الفریڈ نے سوال کیا۔

''ہاں...... تو کیا نہیں کرنا چاہیے تھا؟'' جیمز نے الٹا سوال کرڈالا۔

''یعنی تمہاری کہانی مکمل ہوگئی ہے۔ اب میں باقی تینوں سے کہانی سنوں گا یعنی ان تینوں کی خودکشی کرنے کے فیصلے کی وجہ جانوں گا۔ تو اب تم میں سے کون بولنے والا ہے؟'' الفریڈ نے جیمز کا سوال نظرانداز کر کے اپنی بات کردی۔

''تمہیں نہیں لگ رہا کہ تم اپنا اور ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو؟ کہیں تم یہ تو نہیں پلان بنائے بیٹھے ہو کہ ہمارا ارادہ بدل دو؟'' نیلی آنکھوں والا دبلا پتلا سا نوجوان الفریڈ سے مخاطب تھا۔

''میرا وقت ضائع ہرگز نہیں ہو رہا۔ بتایا تو ہے کہ میں رائٹر ہوں، مجھے کہانیاں مل رہی ہیں اور تم اپنا وقت ضائع کر کے بھی تھوڑی دیر بعد خودکشی کر سکتے ہو...... اور ہاں، مجھے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں کہ تم اپنے ارادے پر قائم رہو یا بدلو۔'' الفریڈ نے فوراً جواب دیا۔

''چلو، پھر میں اپنی بپتا تمہیں سنا دیتا ہوں۔'' نیلی آنکھوں والے نے گویا بے فکر ہو کر کہا۔ الفریڈ اس کی جانب متوجہ ہو کر دیکھنے لگا۔

''میرا نام مچل ہے۔ غریب گھرانے میں پیدا ہوا، باپ نشئی تھا۔ کچھ عرصہ مجھے، میری ماں اور میرے دو بھائیوں کو خوب پریشان کیا۔ مار پیٹ، گھر سے چیزیں چوری کرنا اس کا معمول تھا۔ جب ہمیں مارنے سے تھک گیا اور گھر کی چیزیں ختم ہوگئیں تو ایک روز ہمیں چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ ماں ایک ہوٹل میں کام کرتی تھی۔ بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا۔ میں نے ٹیکسی چلانا شروع کی۔ اسی دوران میری دوستی ایک میرے جیسی لڑکی سے ہوگئی۔ یہ دوستی تقریباً چار سال رہی لیکن تقریباً دو ماہ پہلے اسے کوئی اور امیر شخص مل گیا۔ اس نے مجھے یہ کہہ کر بریک اپ کرلیا کہ میں ایک غریب کے ساتھ شادی نہیں کرسکتی۔ میں نے اسے منانے کی بہت کوشش کی۔ اس کے نئے دوست اور میرے درمیان دو تین جھڑپیں بھی ہوئیں لیکن ظاہر ہے کوئی فائدہ نہ ہوا اور میری دوست نے مجھے ہی دھمکی دے ڈالی کہ اگر میں نے اپنا رویہ درست نہ کیا تو وہ پولیس کے پاس جا کر میرے خلاف شکایت درج کروا دے گی۔ باپ کے بھیانک رویے، غربت، دن رات کی پریشانیوں کے بعد اب اس واقعے نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے ٹیکسی چلانا چھوڑ دی اور گھر پر پڑا رہا۔ اس پر میری ماں کو غصہ آگیا۔ اس نے مجھے بے نقط سناتے ہوئے کہا کہ اگر اوقات نہیں تھی تو لڑکی سے دوستی کرنے کا جھنجھٹ پالا ہی کیوں؟ اب کیسے بوجھ بن کر رہ گئے ہو۔ اس لڑکی کے بعد میری ماں نے بھی مجھے اوقات دکھائی تو میں دلبرداشتہ ہو کر گھر سے نکل آیا۔ پچھلے تین دن سے گلیوں، بازاروں میں بھٹک رہا ہوں۔ فٹ پاتھ پر سو رہا ہوں۔ بس، خیال آیا کہ جس زندگی کی سگے ماں باپ، دوست، کسی کو ضرورت نہیں، اسے ختم کر دینا چاہیے۔'' شدتِ جذبات سے مچل کی آواز اونچی ہوگئی۔ وہ تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ الفریڈ جو آنکھیں بند کیے ہوئے تھا، آنکھیں کھول کر بولا۔

''تمہارا شکریہ مچل! تم نے مجھے خود پر بیتنے والی ساری بپتا سنائی۔''

مچل کچھ نہیں بولا۔ وہ اپنے آنسو صاف کر رہا تھا۔ الفریڈ نے اسے اپنے پاس پڑی پانی کی بوتل پکڑائی۔

''میرا خیال ہے اب تم شروع ہو جاؤ۔'' مچل کو پانی پکڑا کر الفریڈ اس شخص سے مخاطب ہوا جو سر جھکائے بیٹھا اپنی انگلیوں سے اپنی پیشانی سہلا بلکہ رگڑ رہا تھا۔ اس نے الفریڈ کی بات سنی ہی نہیں تھی حالانکہ اس سے قبل وہ مچل کو غور سے سن رہا تھا۔

''میں تم سے کہہ رہا ہوں۔'' الفریڈ نے اس کا گھٹنا پکڑ کر اسے ہلایا۔

''کیا...... مجھ سے کچھ کہا؟'' وہ چونکا۔

''ہاں، میں نے کہا اب تم اپنی کہانی سناؤ تاکہ مجھے پتا چلے کہ تم اس منحوس پل پر کیوں آئے ہو؟'' الفریڈ بولا۔

''میں کلارک ہوں۔ قسمت نے مجھے آسمان سے زمین پر دے مارا ہے۔'' ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اس نے اپنی بات شروع کی۔

''اچھا، تو بتاؤ نا پوری بات۔'' الفریڈ سیدھا ہو بیٹھا۔

''میرے باپ کا بہت بڑا بزنس تھا۔ میں سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا۔ ہمیشہ دولت کی ریل پیل دیکھی۔ میری شادی بھی مجھ جیسی امیر لڑکی سے ہوئی۔ تین سال قبل میرے ڈیڈی کا انتقال ہوگیا۔ سارا کام مجھ پر آپڑا۔ اب وسیع و عریض بزنس کو سنبھالنا میری ذمے داری تھی۔ میں نے

اپنی طرف سے پوری کوشش کی لیکن کیونکہ تجربہ نہیں تھا اس لیے آغاز میں ہی بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ میری بیوی اور ماں دونوں پہلے تو پریشان ہوئیں پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ناراض سی رہنے لگیں۔ ماں کو شکایت تھی کہ میں نے عیاشی کی اور باپ کے ساتھ کام کو نہ سمجھا اور اس کے نتیجے میں اب معاشی نقصان اٹھا رہا ہوں۔ بیوی کو شکوہ تھا کہ اب اس کی پُرتعیش زندگی، شاپنگ، مہنگی گاڑیوں کا شوق خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس نے یکدم رویّہ بدل لیا۔'' کلارک کے چہرے پر بیک وقت غصے اور دکھ کے تاثرات تھے۔ الفریڈ نے پانی کی بوتل اس کی جانب بڑھا دی۔ اس نے ایک ہی سانس میں پانی ختم کر دیا اور بینچ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اس کے چہرے پر تھکن ہی تھکن تھی۔ تھوڑی تاریکی، تھوڑی روشنی میں ایک درخت کی جانب دیکھتے ہوئے وہ کھوئے کھوئے انداز میں پھر بولنے لگا۔

''صبح میرا بیوی سے جھگڑا ہوتا اور شام کو ممی سے ڈانٹ پڑتی۔ میں روز روز کی اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے طریقے سوچنے لگا۔ ایک طرف بزنس کی گرتی بگڑتی صورتِ حال، دوسری جانب گھریلو جھگڑے۔ میں تقریباً ڈپریشن کا مریض بن گیا اور انہی دنوں میری بیوی نے بے وفائی اور طوطا چشمی کی انتہا کرتے ہوئے مجھ سے طلاق لے لی۔ اس نے رکھائی سے کہا کہ وہ کسی کنگال شخص اور ایسے بے وقوف کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی جس نے باپ کا اتنا بڑا کاروبار برباد کر کے رکھ دیا۔ میں طلاق کے صدمے سے ابھی نکلا نہ تھا کہ ایک اور جھٹکا مجھے میری ماں نے دیا۔ اس نے مجھے جائداد سے عاق کر دیا اور حکم جاری کیا کہ میں آفس میں قدم بھی نہ رکھوں۔ گھر میں ممی سے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ میرے شوہر کا کاروبار تباہ کرنے والا اسی سلوک کا مستحق ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ براہِ کرم تم میرے کام میں دخل مت دو۔ جو جیب خرچ چاہیے ہوگا، میں دے دیا کروں گی۔ میں نے ممی کو منانے اور سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ ممی نے بتایا کہ وہ ایک بہت سمجھ دار اور زیرک انسان کی خدمات لینے والی ہیں جو سارا بزنس سنبھالے گا اور ان کا کھویا ہوا وقار، مقام دوبارہ حاصل کرنے میں مدد دے گا۔''

''ایسا کون ہے جو میری جگہ لے گا اور میرے ڈیڈی کا کام مجھ سے چھین لے گا؟'' میں نے بڑے دکھ سے سوال کیا۔

''بس ہے کوئی...... تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔'' ممی نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال سنوارتے ہوئے کہا۔ مجھے ان کے لہجے میں کسی گڑبڑ کا شک ہوا اور پھر چند دنوں بعد وہ گڑبڑ سامنے آ گئی جب ایک شام ممی نے مجھے اطلاع دی۔

''ڈیئر! میں شادی کر رہی ہوں۔'' وہ کافی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا......؟ کس سے اور کیوں؟'' میں بھونچکا تھا۔

''مسٹر ڈگلس سے...... وہی جو اب میرے ساتھ کاروباری معاملات دیکھے گا۔ وہ بھی طلاق یافتہ ہے۔ کچھ رقم ہے اس کے پاس، وہ ہمارے بزنس کو کافی سہارا دے گی اور......'' وہ میری جانب پورا مڑ گئیں۔ ''اور کیوں کا جواب یہ ہے کہ مجھے میری لائف جس طرح میں چاہوں، گزارنے کا حق ہے۔'' ممی بہت اجنبیت سے بولیں۔

''میرا ایک دم عاق کر دیا جانا، ممی کی رکھائی اور بدلے بدلے انداز، سب سمجھ میں آ گیا۔ میں پیچ و تاب کھاتا ہوا گھر چھوڑ کر آ گیا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ گزشتہ مہینوں کے بُرے حالات کی ڈپریشن سے زیادہ ڈگلس کی ہماری زندگی میں مداخلت مجھے اس بات پر مجبور کر دے گی کہ میں اسے شوٹ کر دوں۔ اس واقعے کو اڑھائی ماہ ہو چکے ہیں۔ گھر سے لائی رقم ختم ہو چکی ہے اور اب لگتا ہے زندہ رہنے کے لیے کوئی وجہ نہیں بچی۔ اس لیے......!'' کلارک نے آخر میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تو اس لیے تم نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا؟'' الفریڈ نے کہا۔

''ہاں، میں مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنوں نے دھوکا دیا۔ مجھے میری بیوی، میری ماں نے مصیبت کے دنوں میں تنہا چھوڑا۔ میرے قریبی ساتھیوں نے میرے ساتھ فراڈ کیا...... کیا بچا ہے؟ کیا بچا ہے میرے لیے جس کی خاطر میں جیوں؟'' کلارک چیخ اٹھا۔ آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

''او کے...... او کے...... مر جانا...... بس اب ایک بندہ رہ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے فیصلے کی وجہ بتا دے تو فوراً یہاں سے چلا جاؤں پھر تم چاروں وہی کرنا جو کرنے آئے تھے۔'' الفریڈ نے نرمی سے کہا۔ وہ ان سے خودکشی کی بات یوں کر رہا تھا جیسے کوئی عام سی روٹین کی بات ہو اور وہ چاروں بھی اپنا کام درمیان میں روک کر اس سے باتیں کر رہے تھے کہ بات مکمل ہو تو وہ ادھورا کام مکمل کریں۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' آخری رہ جانے والے سے الفریڈ نے سوال کیا۔

''ایڈی!'' مختصر جواب دیا گیا۔

''تم بتاؤ کس نے تمہیں ستایا ہے؟'' الفریڈ نے پوچھا۔

"سب نے...... سب نے ستایا ہے۔" ایڈی جواب دے کر خاموش ہوگیا۔

"تم وہ وجہ تفصیل سے بتاؤ نا...... جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا۔" الفریڈ گیبر اسے یاد دلا رہا تھا کہ مکمل کہانی سنانے کی بات طے ہوئی ہے۔

"ان تینوں کے دکھ سن کر اندازہ ہوا ہے کہ ہمارے اردگرد کے لوگ کیسے رفتہ رفتہ اپنے رویّے اور باتوں سے ہمیں موت کی جانب دھکیلتے ہیں۔" اپنی بات کہنے کے بجائے ایڈی نے مچل، جیمز اور کلارک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ خلاف معمول تھا۔ الفریڈ چونک اٹھا کہ بجائے کھوئے کھوئے انداز سے اپنی خودکشی کے فیصلے کی وجہ بتانے کے اس نے باقی تین کہانیوں کا خصوصی نوٹس لیا ہے۔

"اس کا مطلب ہے تمہارے بھیانک فیصلے کے پیچھے بھی اردگرد کے لوگ ہی ہیں۔" الفریڈ نے اسے آگے بولنے کا کہا۔

"ہاں، ایسا ہی ہے۔ ان تینوں کی طرح مجھ پر بھی برا وقت آیا تو نہ صرف معاشی مسئلہ بنا، ساتھ ہی اپنوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا، وہاں فراڈ ہوگیا۔ جب تفتیش کی گئی تو اصل مجرم بچ نکلا کیونکہ اس کے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے جبکہ مجھ پر سارا الزام ڈال کر مجھے اور میرے دو اور دوستوں کو پھنسا دیا گیا۔ ہمارے گرد ایسا جال بنا گیا کہ جھوٹا کیس لوگوں کو سچا لگنے لگا۔ جو جمع پونجی تھی، عزت تھی، اس کیس کی نذر ہوگئی۔ جان تو جیسے تیسے چھوٹ گئی لیکن سوسائٹی میں بہت بدنامی ہوئی۔ مجھے لوگوں نے عجیب نظروں سے دیکھنا شروع کردیا۔ میں جس کلب کا ممبر تھا، انہوں نے میری ممبر شپ ختم کردی، یہ کہہ کر کہ تمہارے یہاں آنے سے کلب کی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔"

"تو تم نے انہیں بتایا نہیں کہ یہ جھوٹا کیس تھا؟" مچل نے اچانک اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔ الفریڈ پھر چونکا۔

"بتایا تھا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا اور یقین تو......!" ایڈی نے رک کر گہری سانس لی۔

"یقین تو میری فیملی بھی کرنے کو تیار نہ تھی۔ میرے وکیل باپ کو غصہ تھا کہ میں نے اس کا نام ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میری سوشل ورکر ماں نے مجھ سے ناراض رہنا شروع کردیا۔ میری لاکھ صفائیوں کے بعد بھی وہ یہ کہتے رہے کہ آخر انہوں نے تم پر اور تمہارے گروپ پر ہی کیوں الزام لگایا۔ کچھ تو ہوگا ہی۔ جاب، جمع پونجی، عزت، سب ختم ہوگئے۔ اردگرد والوں کی طنزیہ نگاہیں اور جملوں نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے گھر چھوڑا اور چند دن ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا جائے۔"

"یعنی تم نے بھی اپنوں کے رویّے سے تنگ آکر یہ فیصلہ کیا؟" جیمز اٹھ کر ایک اور خالی بینچ پر جاتے ہوئے بولا۔

"وہ میرے اپنے تھے ہی نہیں۔ وہ تب تک میرے تھے جب تک میں گاڑی اور ہینڈسم تنخواہ والا تھا۔ جونہی یہ چھنا، وہ مجھ سے دور ہوگئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تمہارے ممی ڈیڈی تم سے لاتعلق ہوگئے۔ جیسے کلارک کی بدقسمتی کو اس کا قصور ٹھہرا کر بیوی اور ماں نے الگ پھینک دیا اور جیسے مچل کی گرل فرینڈ نے امیر دوست کے ملتے ہی اس سے آنکھیں پھیر لیں۔" ایڈی دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

"یہ دراصل قسمت کا چکر ہے۔ جب خراب ہوتی ہے، کچھ بھی ٹھیک نہیں رہتا۔" مچل نے آہ بھری۔

"میں کہتا ہوں، لعنت ہے ان سب پر جنہوں نے ہمیں اس اسٹیج تک پہنچا دیا۔" کلارک نے غصے سے کہا۔

الفریڈ بڑے غور سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ان سب نے آپس میں بات کرنا شروع کردی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہوئی۔ الفریڈ نے پل کی سائڈز پر لگے درختوں کے پتوں کی جانب دیکھا اور ہلکا سا مسکرا دیا۔

"تم چاروں کا شکریہ...... تم نے میری بات مانی اور مجھے اپنی اپنی کہانی سنائی۔ اب میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔" الفریڈ بات کرتے ہوئے جیمز کی جانب دیکھ رہا تھا جو بینچ پر لیٹ کر ستاروں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔

"کون سی بات؟" کلارک نے سوال کیا۔

"بات کیا...... بس ایک درخواست ہے۔" الفریڈ تھوڑا سا ہچکچا کر بولا۔

"درخواست...... کیا مطلب؟" مچل نے پوچھا۔

"وہ...... تم اب بھی خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتے ہو......؟ میرا مطلب ہے کہ میرا کام تو ہوگیا...... کیا اب تم پانی میں کودنے والے ہو؟" الفریڈ تھوڑا رک رک کر بولا تو وہ چاروں یوں چونکے جیسے انہیں کافی دیر سے کچھ بھولا ہوا تھا اور اب کسی نے یاد دلوا دیا۔ چاروں نے ایک دوسرے کو اور الفریڈ نے ان چاروں کو بڑے غور سے دیکھا۔

"ہاں، میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔ میں ضرور خودکشی کروں گا۔" مچل نے حتمی لہجے میں کہا تو لیکن...... وہ اپنی جگہ پر جما بیٹھا تھا۔ اس نے ٹانگیں سمیٹ کر بینچ کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔

"اب اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔" جیمز

دھیرے سے بولا۔ وہ بدستور بینچ پر لیٹا آسمان کو تک رہا تھا۔

''ہم تو تمہارے روکنے پر رکے ہوئے تھے ورنہ اب تک تو......!'' کلارک بولا۔

''میرا خیال ہے اب اس دنیا کو چھوڑ ہی دیں۔'' ایڈی نے کہا۔ وہ دور لگے پول پر روشنیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ الفریڈ ہلکا سا ہنسا لیکن کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔

''اچھا تو اب میری درخواست سنو۔'' الفریڈ کا لہجہ بہت نرم اور ملتجیانہ تھا۔ وہ چاروں بولے بغیر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''دیکھو، تم چاروں جوان ہو۔ ابھی زندگی میں کچھ خاص نہیں دیکھا۔ میرے پاس تمہارے مسائل کا حل ہے۔ اگر تم اس سلسلے میں میری کچھ تجاویز سن لو تو مجھے یقین ہے کہ تم خودکشی کرنے سے رک جاؤ گے۔''

''تم ہمیں خودکشی کرنے سے روک رہے ہو؟'' ایڈی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، لیکن فی الحال تین دن کے لیے۔'' الفریڈ نے کلارک کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب، تین دن کے لیے؟'' کلارک نے چونک کر پوچھا۔

''دیکھو، تم صرف تین دن کے لیے خودکشی کرنے کو ملتوی کردو۔ اگر میں تمہارے مسائل کا حل دے کر تین دن میں تمہیں زندگی کی طرف مائل نہ کرسکا تو میں خود تمہیں اس مل پر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ ایک بار...... ذرا میری بات پر غور کرو۔'' الفریڈ ایک بینچ کی پشت پر ہاتھ جمائے کھڑا یوں بول رہا تھا جیسے لیکچر دے رہا ہو۔ وہ چاروں سوچ میں پڑ گئے۔ پل کے نیچے سے بہتے پانی کا شور بڑا واضح سنائی دے رہا تھا۔ الفریڈ بڑے تحمل سے ان کے جواب کا انتظار کررہا تھا۔

''میں تو جینا چاہتا تھا لیکن مجھے مجبور کیا گیا۔'' مچل بولنے لگا۔

''میں صرف تین دن...... صرف تین دن کے لیے رک رہا ہوں۔'' الفریڈ جلدی سے بولا۔

''ان تین دنوں میں ہم کہاں رہیں گے...... کہاں سے کھائیں گے؟'' جیمز نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ الفریڈ کھل کر مسکرا دیا۔

''میرے گھر رہ سکتے ہو۔ کھانا پینا سب فری...... تو کیا چلیں؟''

وہ چاروں ایک دوسرے کو چند لمحے دیکھتے رہے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہاں سے کچھ ہی دور میرا گھر ہے۔ ہم پیدل چل کر جاسکتے ہیں۔'' الفریڈ گبز نے چلتے ہوئے کہا۔ وہ چاروں بھی اس کے ساتھ چلنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد سڑک سے نیچے اترنے کے بعد وہ ایک بڑے سے پرانی طرز کے مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ الفریڈ نے گیٹ کھولا تو وہ سب اندر داخل ہوگئے۔

''کیا تم اکیلے رہتے ہو؟'' کلارک نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں، بالکل اکیلا۔'' الفریڈ ہلکا سا مسکرایا۔

''تمہاری فیملی کا کوئی فرد تمہارے ساتھ نہیں رہتا؟'' مچل نے پوچھا۔

''نہیں...... چلو آؤ، میں تمہیں تمہارا کمرا دکھادوں۔ رات کافی ہوگئی ہے، اب سونا چاہیے۔'' الفریڈ نے مختصر سا جواب دے کر بات بدل دی اور انہیں لے کر ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ گیا۔

''تم چاروں یہاں اکٹھے سوجاؤ، تم اس وقت ایسی ذہنی حالت میں ہو کہ ہوسکتا ہے اچانک پھر کسی پر فرسٹریشن کا اٹیک ہو اور وہ پھر کوئی غلط قدم اٹھانے کے بارے میں سوچے تو باقی تین اسے سنبھال سکتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تین دن سے پہلے کچھ ایسا ہو۔'' الفریڈ نے انہیں ایک کمرے میں ٹھہرانے کی وجہ بتائی۔

''مسٹر الفریڈ! ٹھیک کہا تم نے۔ واقعی یہ اچھا خیال ہے۔'' ایڈی نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم سب میرے ساتھ آؤ۔ تھوڑا سا سامان لانا ہوگا یعنی دوسرے کمروں سے یہاں بیڈ اور کمبل وغیرہ لانے ہوں گے۔ آؤ، میری مدد کرو۔'' الفریڈ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ مچل، کلارک اور جیمز اس کے پیچھے چل دیے۔

''میں تو اب لیٹ چکا ہوں، اٹھنے کی ہمت نہیں، تم جاؤ۔ بے فکر رہنا، میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھاؤں گا۔'' ایڈی نے بیڈ پر پھیلتے ہوئے ہنس کر کہا۔

الفریڈ نے غور کیا، مسلسل پھیکی مسکراہٹ والے چہرے پر جاندار مسکراہٹ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرے میں چار لوگوں کے سونے کا انتظام ہوگیا۔ الفریڈ نے انہیں لیٹنے کا کہا اور باہر نکل گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ کمبل وغیرہ اٹھائے کمرے میں واپس آگیا۔ کمرے کی ایک جانب جیمز اور مچل کے اور دوسری جانب کلارک اور ایڈی کے بستر تھے۔ درمیان میں خالی جگہ تھی۔ الفریڈ نے کمبل کارپٹ پر

رکھا اور بڑے آرام سے نیچے لیٹ گیا۔

''میں نے سوچا میں بھی یہیں سو جاؤں، یہ زیادہ بہتر ہو جائے گا۔ میری فکر مت کرنا، میں نیچے لیٹ کر سونے کا عادی ہوں۔ اس طرح مجھے زیادہ اچھی نیند آتی ہے۔'' ان کے کوئی سوال کرنے سے پہلے الفریڈ نے خود ہی ساری بات کردی پھر اچانک کچھ یاد آجانے پر اٹھ بیٹھا۔

''تم لوگ کچھ کھانا چاہتے ہو تو لے آؤں؟'' اس نے چاروں سے سوال کیا۔

''نہیں۔'' ان کی نیند میں ڈوبی آواز میں جواب ملا۔ الفریڈ مطمئن ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔

☆☆☆

''مسٹر الفریڈ! لگتا ہے بہت اچھی کُکنگ کر لیتے ہو۔'' الفریڈ کے کانوں سے مچل کی آواز ٹکرائی۔ وہ صبح جلدی اٹھ کر سب کا ناشتا تیار کرنے لگا تھا۔ وہ جلدی سے مچل کی جانب مڑا۔

''ارے اٹھ گئے تم...... باقی تینوں کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ جیسے ڈر ہو کہ ان دونوں کی عدم موجودگی میں وہ تینوں خودکشی کر لیں گے۔

''وہ بھی ادھر ہی آرہے ہیں۔ تمہارے ناشتے کی خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایڈی کہہ رہا تھا مسٹر الفریڈ سے کہو میرے لیے ڈبل ناشتا بنائے۔ یقیناً کمال کے کک ہو تم۔'' مچل فرائنگ پین اور پاس پڑی ڈش کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ الفریڈ مسکرا دیا۔

''چلو پھر پلیٹیں اور کپ نکال کر ٹیبل پر رکھو۔'' الفریڈ نے مچل سے کہا اور ایڈی، جیمز، کلارک کو بھی آواز دی۔ چند سیکنڈ میں وہ وہاں پہنچ گئے۔ الفریڈ نے مچل کی مدد سے ناشتا ٹیبل پر رکھا اور سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سب ناشتا کرنے لگے۔

''کافی بہت شاندار بنی ہے، گڈ!'' کلارک نے گھونٹ بھرتے ہی تعریف کی۔

''میں تمہیں بھی بنانا سکھا دوں گا، اب تم بنانا۔'' الفریڈ نے جیمز کی طرف دیکھتے ہوئے کلارک کو جواب دیا۔ جیمز مزید سلائس اٹھا کر ان پر مکھن لگا رہا تھا۔

''اچھا؟'' کلارک ہنسا۔

''ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اب تو میں نے ناشتا کیلئے بنالیا ہے لیکن ناشتے کے بعد سے لے کر تین دن ختم ہونے تک ہم پانچوں مل کر کام کریں گے اور خوب مصروف رہیں گے۔'' الفریڈ نے اپنی پلیٹ میں آملیٹ رکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک، ہم ایسا ہی کریں گے۔ چلیں، اب ناشتے کے بعد کے کام بانٹ لیں۔'' ایڈی خوش سا دکھائی دیا۔

''میں ذرا زیادہ مقدار میں ناشتا کر چکا ہوں۔ مجھے کام بھی ذرا زیادہ ہی دینا۔'' جیمز نے ہنس کر کہا۔ وہ اپنے کپ میں الفریڈ کے ہاتھوں کی بنی مزیدار کافی انڈیل رہا تھا۔

''چلیں جی ناشتا ہو گیا۔ اب سب اپنی ڈیوٹی سن لیں۔'' الفریڈ نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ چاروں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''مچل! تم ناشتے کے برتن دھوؤ گے، اس کے بعد ڈائننگ ٹیبل، چیئرز اور کچن کی اچھے طریقے سے ڈسٹنگ کرنی ہے اور کچن کا فرش اچھے سے صاف کر دینا اور...... کلارک! تم کچن کے سامنے موجود لاؤنج کی صفائی کرو گے اور لاؤنج میں موجود ہر چیز کی جھاڑ پونچھ اس طرح کرنا ہے کہ ہر چیز چمکنے لگے۔'' مچل اور کلارک نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''بہت اہم بات سنو۔'' الفریڈ نے ذرا آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاتھ کے ساتھ ذہن اور زبان کو بھی مصروف رکھنا ہے۔ مچل اور کلارک، تم دونوں کیونکہ ایک دوسرے کے قریب ہو گے اس لیے کام کے دوران تم دونوں مسلسل آپس میں گپ شپ بھی کرتے رہو گے اور تمہاری گفتگو کا موضوع ہوگا فٹ بال میچز اور فٹ بالرز۔'' الفریڈ نے دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھایا۔

''مسٹر الفریڈ! ہم سمجھ گئے۔ بالکل ویسا ہی ہوگا جیسے تم نے کہا ہے۔'' کلارک نے جلدی سے کہا۔ مچل نے اپنی آستینیں سمیٹنا شروع کر دیں۔ دونوں اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے کے لیے بے چین و پُرجوش لگ رہے تھے۔

''میں، جیمز اور ایڈی بیڈ روم، اسٹور روم، گیلری وغیرہ کی صفائی کریں گے۔ ہر جگہ مل کر کام کرتے ہوئے ہم شوبز اسٹارز اور ان کی گلیمرس لائف پر گفتگو کریں گے۔ بڑا گھر ہے، ہمارے ذمے کافی کام ہے۔ جیمز! تم ہماری نسبت زیادہ کام کر لینا، تمہاری یہی خواہش تھی نا؟'' تینوں کو کام بتاتے ہوئے الفریڈ نے جیمز سے سوال کیا۔

''بالکل...... بالکل، میں یہی چاہتا تھا۔ تو کیا اب شروع ہو جائیں؟'' جیمز نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کام شروع کرتے ہیں اور تم سب کے لیے ایک خوشخبری نما آفر ہے۔ تمہارے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ تم چاروں میرے ڈریسز استعمال کر سکتے ہو۔ میں تم چاروں

کی نسبت فربہ ہوں اس لیے میرے ڈریسز تم چاروں کے کام آسکتے ہیں۔ کسی کے کم ڈھیلے اور کسی کے زیادہ ڈھیلے...... لیکن گزارہ ہوجائے گا۔'' الفریڈ نے مسکرا کر کہا۔

اب وہ پانچوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ پہلے تو سب نے گفتگو کا آغاز ایسے کیا جیسے وہ کبھی کوئی ڈیوٹی ہو لیکن جلد ہی بات چیت میں شدت اور جوش آگیا۔ پسندیدہ فٹ بالر کی زندگی پر سیر حاصل بحث ہونے لگی، اپنے اپنے پسندیدہ اور ناپسندیدہ شوبز اسٹارز کی خوبیوں و خامیوں پر تبصرے ہونے لگے۔ گزشتہ رات کی یاد گویا محو ہو چکی تھی۔ تیزی سے ہاتھ اور زبان چل رہی تھی، کراس ٹاکنگ ہو رہی تھی، آوازوں سے بڑا سا گھر گونجنے لگا تھا۔

''ایڈی! تم میرے فیورٹ اداکار کو اوور ایکٹنگ کرنے والا کیوں کہہ رہے ہو؟ تم کیا جانو ایکٹنگ کیا ہے، نان سینس!'' کلارک لاؤنج کی ڈسٹنگ کرتے ہوئے چیخا۔

''تمہارا موضوع فٹ بال ہے، شوبز نہیں۔ تم مجھے سننے کے بجائے اپنے کام پر دھیان دو بیوقوف آدمی۔'' جواباً ایڈی چلایا۔

''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم جو چاہے بولتے رہو۔'' مچل کچن سے نکل آیا۔ اتفاق سے مچل اور کلارک ایک ہی اداکار کے فین تھے۔ ادھر جمبو اور ایڈی اپنی بات پر ڈٹ گئے۔ الفریڈ بھی ریفری بن رہا تھا، کبھی سائڈ پر کھڑا ہو کر ان کی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ لڑائی، نوک جھوک میں صفائی ہوگئی، برتن دھل گئے، ڈسٹنگ کے بعد ہر چیز چمکنے لگی اور وہ پانچوں خوب تھک گئے۔ شاور لینے کے بعد سب لاؤنج میں صوفے، قالین پر تقریباً گر گئے۔ کچھ نیند لینے اور تازہ دم ہونے کے بعد دوپہر کا کھانا مل کر بنایا اور کھایا گیا۔ ٹیبل پر ہی کچھ دیر گپ شپ کے بعد الفریڈ نے انہیں گھر کے پچھلے حصے میں چلنے کا کہا۔ وہاں پر چھوٹا سا کچن گارڈن بنایا گیا تھا لیکن اس وقت اس کی حالت یہ تھی جیسے کافی دنوں سے اس پر توجہ نہیں دی گئی ہو اور پانی نہیں دیا گیا ہو۔

''گارڈن تو اچھا ہے لیکن قریب المرگ لگ رہا ہے۔'' جمبو نے دیکھتے ہی تبصرہ کیا۔

''نو...... نو...... تین دن تک کوئی بھی موت، خودکشی جیسے الفاظ زبان پر نہیں لائے گا۔'' الفریڈ نے اونچی آواز میں بری طرح ٹوکا۔

''اوہ...... مجھے یاد نہیں رہا۔'' جمبو نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''مجھے اپنے پودوں کا خیال رکھنا، ان کے ساتھ وقت

گزارنا بہت پسند ہے لیکن چند دنوں سے میں اس پر دھیان نہیں دے پایا۔ چلو آؤ، شام کی چائے سے پہلے ہم پانچوں مل کر اسے اس کی سابقہ پوزیشن پر لانے کی کوشش کریں۔"

پانچوں کام میں لگ گئے۔ انہوں نے بڑی تیزی سے کام مکمل کرلیا۔ خشک گرے پتوں کی صفائی، پودوں کی تراش خراش، گارڈن کی صفائی چٹکیوں میں ہوگئی۔ اب پانی دیا جارہا تھا۔ پودے نکھرنے اور خوبصورت لگنے لگے۔ تھوڑی سی سبزی لگی ہوئی تھی۔ دو ٹوکروں میں وہ بھی اتار کر رکھ لی گئی۔ اس دوران بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔

"تمہیں سبزی لگانا پسند ہے؟"

"ہاں، لیکن میں پھول زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

"میرے گھر میں بھی بہت سے گملے تھے، بڑے اور چھوٹے سائز کے۔ کچھ میں سبزیاں تھیں، کچھ میں پھول۔"

"پودوں کی بڑھوتری کے لیے گلے سڑے پتوں کی کھاد بہت مفید ہوتی ہے۔"

"کچن گارڈن اچھی مصروفیت ہے اور فائدہ مند بھی۔"

"وقت پر پانی لگانا اور پودوں کی کاٹ چھانٹ کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

"ارے، پانی لگتے ہی پودوں میں جان پڑگئی۔"

الفریڈ بول بھی رہا تھا اور سب کی باتوں، لہجے، تاثرات کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد پچھلی رات کی طرح الفریڈ نیچے بستر بچھائے ہوئے تھا اور وہ چاروں بیڈ پر تھے۔ سارا دن کام خود کرنے کے باوجود وہ پانچوں تازہ دم اور پُرسکون نظر آرہے تھے۔ الفریڈ اچانک اٹھا اور بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ تھوڑی دیر میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گٹار تھا۔

"جیمز! یہ لو گٹار اور اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔ یہ میرا گٹار ہے، کافی عرصے سے یونہی پڑا تھا۔ چلو آج یہ کام آجائے گا۔" بغیر کوئی تمہید باندھے الفریڈ نے بولتے ہوئے جیمز کو گٹار تھمادیا۔ چند سیکنڈ بعد کمرے میں سر بکھرنے لگے۔ آج رات انہیں تھکن سے نہیں بلکہ سکون سے گہری نیند آئی تھی۔

☆☆☆

تین دن گزر گئے۔ ان تین دنوں میں الفریڈ گبز، جیمز، مچل، کلارک، ایڈی نے بہت سی گپ شپ کی۔ اس دوران ایک دوسرے کی پرسنل لائف کے تاریک پہلوؤں کو اگنور کرکے پسند و ناپسند پر بات ہوئی۔ فیورٹ اسٹارز، پسندیدہ لباس، خوشبو، پودوں، پھول، فیورٹ ڈشز پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ نت نئی ترکیبوں سے کھانے پکائے گئے۔ الفریڈ نے سب کو کافی بنانا سکھائی جو کوئی بھی نہ سیکھ سکا۔ سب یوں وقت گزار رہے تھے جیسے پکنک پر آئے ہوئے ہوں۔ کوئی سنجیدہ بات یا دکھی موضوع نہیں چھیڑا گیا نہ کوئی اپنوں کی بے وفائی یا معاشی مسئلے کا ذکر ہوا۔ بس پہلے دن کلارک نے رات کا کھانا کھاتے ہوئے الفریڈ سے کہا تھا۔

"تین دن تک ہماری مہمان نوازی سے یقیناً تمہارے بجٹ پر اثر پڑے گا۔ کیا تم رائٹنگ سے اتنا کمالیتے ہو کہ اکیلے اتنا خرچہ کرتے پھرو؟"

"میری خاندانی زمین ہے۔ اس سے کافی آمدنی ہوجاتی ہے۔ تم بے فکر رہو، یہ سب میں اپنے لیے کررہا ہوں۔" کہہ کر الفریڈ نے موضوع بدل دیا تھا۔

تیسرا دن تھا، یعنی اس مختصر سے عرصے کا آخری دن جس کے لیے الفریڈ نے انہیں خودکشی سے رکے رہنے کا کہا تھا۔ حسب معمول لنچ کیا جارہا تھا کہ الفریڈ نے چمچ پلیٹ میں رکھ کر سب کی طرف دیکھا اور بولنے لگا۔

"بہت اچھے دن گزر رہے ہیں تمہارے ساتھ۔ جیمز کا گٹار بجا کر سنانا بہت دلچسپ رہا، مل کر صفائی کرنا، کھانا پکانا، نوک جھوک، ایک ہی بیڈروم میں باتیں کرتے ہوئے سونا، اکٹھے بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا بہت شاندار رہا ہے لیکن......" الفریڈ یکدم چپ ہوگیا۔

"لیکن کیا مسٹر الفریڈ؟" کلارک نے چونک کر سوال کیا۔ باقی بھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"لیکن اب یہ ختم ہونے والا ہے۔" الفریڈ کے لہجے میں اداسی تھی۔

"ختم...... کیا مطلب؟" مچل نے جو اس کے قریب بیٹھا تھا، اس کا شانہ ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے تم چاروں کو صرف تین دن کے لیے خودکشی کرنے سے یہ کہہ کر روکا تھا کہ اگر اس عرصے میں تمہارے مسائل کا حل دے کر تمہیں زندگی کی طرف راغب نہ کرسکا تو خود تمہیں اسی پل پر چھوڑ آؤں گا جہاں سے میں تمہیں لایا تھا...... تم چاروں نے آج جبکہ تیسرا دن چند گھنٹوں بعد ختم ہونے والا ہے، ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے پتا چلے کہ تمہیں زندگی کی طرف رغبت ہوئی یا نہیں اور ویسے بھی میں نے تمہیں مسائل کے حل بتائے ہی نہیں، بس کھانا پینا، گپ شپ کرتے رہے ہیں تو...... ظاہر ہے آج رات میں تمہیں وعدے کے مطابق اس منحوس پل کے پاس چھوڑ آؤں گا اور

پھر......سب......ختم۔'' الفریڈ حد درجہ افسردگی سے بہ مشکل بولا۔ اس نے اپنا سر جھکا رکھا تھا اور پلیٹ میں چمچ اِدھر سے اُدھر ہلا رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے خاموشی چھا گئی اور پھر...... خاموشی کو ایک زندگی سے بھرپور آواز نے توڑا۔

''میں جینا چاہتا ہوں۔''

الفریڈ نے تیزی سے سر اٹھایا۔ ''یہ جملہ کس...... نے کہا؟'' بہت حیران ہو کر اس نے سوال کیا۔

''میں نے۔'' چاروں بیک وقت بولے۔

''تم......تم چاروں......اب خودکشی نہیں کر رہے...... یہی کہہ رہے ہو نا تم؟'' الفریڈ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

''ہاں مسٹر الفریڈ! ہمیں ہمارے مسائل کا حل مل گیا ہے اور اب ہم جینا چاہتے ہیں۔'' ایڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے؟'' الفریڈ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

''تمہارے گھر میں تمہارے ساتھ رہتے ہوئے، قہقہے لگاتے، لڑتے جھگڑتے اندازہ ہوا کہ فضول سے مسئلوں کو دل و دماغ پر لینا ہی نہیں چاہیے، یعنی......مل گیا نا مسائل کا حل۔'' کلارک نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ بات کی۔

''میرا ذہن تو اب نئی باتیں سوچنے لگا ہے۔ لعنت ہو ان پرانے رشتوں پر جنہوں نے ہم سے زندگی چھیننا چاہی۔'' مچل کے چہرے پر زندگی مسکرا رہی تھی۔

''میں تو سوچ رہا ہوں کوئی چھوٹی موٹی جاب ڈھونڈ لوں۔ کسی ریسٹورنٹ میں برتن دھونے یا ویٹر بننے کا کام مل ہی جائے گا۔ بس اب یہ نہیں سوچنا کہ میرا خواب کیا تھا اور یہ ٹوٹ کیوں گیا۔'' گٹارسٹ جیمز کے چہرے پر بے فکری تھی۔

''مجھے نئے دوست، نئے رشتے مل گئے ہیں۔ مجھے تو اب ان کے ساتھ مل کر جینا ہے۔'' ایڈی نے دائیں سے الفریڈ اور بائیں ہاتھ سے مچل کا ہاتھ تھام لیا۔

''ویری گڈ! تمہارے بدلے ارادے نے مجھے بہت خوشی دی ہے۔'' الفریڈ نے دوبارہ لنچ اسٹارٹ کر لیا۔ باقی بھی اپنی پلیٹوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''مسٹر الفریڈ! ہمیں زندگی کی جانب دوبارہ لانے میں بلاشبہ تمہارا ہاتھ ہے۔ ہمارے ارادے بدل دینے کا سارا کریڈٹ صرف اور صرف تمہیں جاتا ہے۔'' کلارک نے کھل کر خراج تحسین پیش کیا۔

''تھینکس مسٹر الفریڈ! ہمیں رہائش، کھانا اور لباس مہیا کرنے کے لیے۔'' جیمز ممنون نظر آ رہا تھا۔

''اور......ہمیں آپس میں خوب بولنے کا موقع دے کر ہنسنے اور کتھارسس نکال دینے پر مجبور کرنے کا شکریہ۔'' مچل جذباتی انداز میں بولا۔

''مہلک تنہائی میں دوستوں کا گروپ بنا کر خوشی دینے کا احسان ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ شکریہ الفریڈ......! شکریہ۔'' ایڈی کی آنکھوں میں نمی تھی۔ لنچ کے بعد سب گپ شپ کے لیے گارڈن میں آ گئے۔

''تم یہاں جب تک چاہو، رہ سکتے ہو...... بلکہ ہمیشہ رہ سکتے ہو...... اب سوچنا یہ ہے کہ تم کیا کام یا کیا جاب کر سکتے ہو۔'' الفریڈ نے کہا۔

''واقعی ہمیں زندگی کے دھارے میں شامل ہونے اور مسٹر الفریڈ کے گھر رہائش رکھنے کے عوض رینٹ دینے کے لیے کوئی نہ کوئی کام کرنا ہو گا۔'' جیمز جلدی سے بولا۔

''رینٹ......؟ ارے نہیں، وہ تو......'' الفریڈ نے بولنا چاہا لیکن مچل نے بات کاٹ دی۔

''ہاں، اب ہم طریقے سے رہیں گے۔ گزشتہ تین دن کی بات اور تھی لیکن اب سب فری نہیں ہو گا۔ ہم آج ہی سے کام اسٹارٹ کریں گے۔''

''یہاں ایک بہت بڑا ریسٹورنٹ ہے۔ وہاں کام کرنے والوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ میں بات کروں؟'' الفریڈ نے چاروں کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

''کیوں نہیں، ہم ضرور کریں گے یہ کام۔ ہم اپنی لائف زیرو سے اسٹارٹ کریں گے۔'' بہت بڑا بزنس کھو دینے والا کلارک بڑے عزم سے بولا۔ باقی تینوں نے اس کی تائید کی۔

''مسٹر الفریڈ! آپ کمال کے آدمی ہیں۔ کیسے بغیر میڈیسن کے ہمارا علاج کر دیا۔ آپ کسی ماہر نفسیات سے کم نہیں۔ بڑے اچھے انداز سے ہمیں ڈپریشن سے نکال لیا۔'' جیمز نے کہا۔ وہ سبزیوں کے پودوں پر آنے والے نئے پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ الفریڈ بے اختیار مسکرا دیا اور بولا۔

''ہر انسان ماہر نفسیات ہوتا ہے، بس اپنی اس صلاحیت کو سامنے لانے، بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی ساری ضروریات، کیفیات اور دکھوں وجذبات کو مدنظر رکھ کر دوسرے انسان کے ذرا بھی قریب ہو جائے تو وہ اس کے لیے ایک ڈاکٹر، سائیکاٹرسٹ بن سکتا ہے۔ کوئی پریشان نظر آ رہا ہے تو کوشش کرو کہ وہ مسئلہ

بتائیے...... ضرور کسی کی بات سنو...... مسئلہ سناؤ گے، سنو گے تو مسئلے کا حل بھی نکل آئے گا۔'' الفریڈ نے تفصیل سے بڑا اہم لیکچر دے ڈالا۔

''ایک بات کہوں؟ حقیقت میں تم بھی خودکشی نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لیے تو فوراً مجھ سے باتیں کرنے لگے، آپ بیتی سنانے لگے ورنہ پانی میں چھلانگ تو سیکنڈ میں لگائی جاسکتی ہے۔ دراصل تمہیں کوئی روکنے، ٹوکنے والا، باتوں میں لگانے والا نہیں تھا۔ جونہی ملا تم رک گئے۔'' اس نے کہا تو چاروں سر ہلانے لگے۔

''مسٹر الفریڈ! اب ہمیں اپنی ذات میں کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی، نہ ہی کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم زندگی کا ہی خاتمہ کر ڈالیں۔'' مچل نے مسکرا کر کہا۔

''اوہ، خوب یاد دلایا۔ آج سے تم چاروں بس اسی بات پر فوکس کرو گے کہ واقعی تم میں کوئی کمی نہیں۔ مچل کو گرل فرینڈ نے نہیں بلکہ اس نے گرل فرینڈ کو چھوڑا ہے کیونکہ وہ بے وفائی کر رہی تھی۔''

''جیمز بہت اچھا گٹار بجا سکتا ہے۔ وہ بیسٹ گٹارسٹ ہے۔ اس کے فن کی قدر ہم کریں گے۔ کلارک اچھا بزنس کر سکتا ہے۔ یہ بیوقوف ہے نہ نااہل، بس بدقسمتی سے کاروبار تباہ ہوا۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ ایڈی پر جو الزام لگے، وہ جھوٹے تھے اور الزام لگانے والے اصلی مجرم تھے۔ یہ بے قصور اور معصوم ہے۔ اس طرح تمہارا مورال مزید بڑھے گا، او کے؟'' الفریڈ نے ایک اور خوبصورت بات سمجھائی۔

''او کے باس!'' ایڈی ہنسا، باقی اس کا ساتھ دینے لگے۔

''ایک اہم سوال مسٹر الفریڈ! تمہیں ہمیں بچانے کا خیال کیوں آیا کہ تم نے دور سے آکر، کوئی بھی رشتہ نہ ہوتے ہوئے ہمارے ساتھ اتنا اچھا سلوک کر ڈالا؟'' اچانک جیمز نے پوچھا۔ الفریڈ مسکرایا، اس کی مسکراہٹ پھیکی سی تھی۔

''میں وہاں اپنے ایک ضروری کام کے سلسلے میں گیا تھا۔ اچانک تم چاروں پر نظر پڑ گئی۔ یقیناً ایسا ہونا تقدیر میں لکھا ہوا تھا کہ میرے دل میں بس یونہی خیال آیا کہ اپنا کام کرنے سے پہلے تم سے بات کروں۔'' یہ کہہ کر الفریڈ رک گیا۔ چاروں اس کی جانب دیکھ رہے تھے کہ وہ جلدی سے دوبارہ بات شروع کرے۔

''ایک بات بتاؤں پہلے......؟ وہ میں...... رائٹر نہیں ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔'' الفریڈ نے رک رک کر کہا۔ وہ چاروں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''جھوٹ کیوں بولا؟'' مچل نے سوال کیا۔

''بتایا نا کہ بس یونہی تم سے بات کرنے کو دل کیا تو رائٹر ہونے کا بہانہ گھڑ کے تمہیں کہانیاں سنانے کا کہا۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ بات سن کر تمہیں تمہارا کام کرنے دوں گا اور خود اپنا کام کر لوں گا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ تمہاری باتیں سن کر ایک دم میرا جی چاہنے لگا کہ تمہیں جینا چاہیے۔ پھر تم بھی ایک دوسرے کو ردعمل دینے لگے، جذباتی ہونے لگے تو میں نے سوچا کہ اگر ان میں زندگی کی رمق باقی ہے ہی تو اپنے کام کو نظرانداز کروں اور زندگیاں بچاؤں۔''

''مسٹر الفریڈ! تو تم اب اپنا ضروری کام کر لو۔ اب تو تم ہماری طرف سے بےفکر ہو۔'' ایڈی نے تیزی سے کہا۔

''نہیں...... بس وہ اسی دن ہو سکتا تھا...... نہیں ہوا تو بس اب نہیں ہو سکتا۔'' الفریڈ دھیرے سے بولا۔

''ایسا کون سا کام تھا جو اب نہیں ہو سکتا؟'' مچل نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں واقعی، ایسا کیا کام تھا؟ کیا کرنے گئے تھے تم وہاں مسٹر الفریڈ؟'' کلارک بھی حیران تھا۔

''خودکشی...... خودکشی کرنے گیا تھا۔'' الفریڈ گبر نے دھماکا خیز انکشاف کیا تو چاروں کے منہ محاورتاً نہیں، حقیقتاً کھل گئے۔ چند لمحے خاموشی کے گزر گئے۔ وہ چاروں کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی الفریڈ کو دیکھ رہے تھے۔

''خودکشی......؟ یعنی تم بھی......؟'' جیمز کے گلے میں الفاظ پھنسے ہوئے تھے۔

''میرے دوستو! یہ سچ ہے کہ میں اس روز خودکشی ہی کرنے گیا تھا۔'' الفریڈ نے دھیرے سے کہا۔ سب الفریڈ کو خاموشی سے تکنے لگے۔

''میں نے تم چاروں کی کہانی سنی تھی کہ بتاؤ کیا وجہ ہے جو تم اپنے آپ کو ختم کر لینا چاہتے ہو...... میرا خیال ہے اب یہ کام کرنے کی میری باری ہے۔'' الفریڈ دکھی انداز میں ہلکا سا ہنس کر بولا۔ وہ چاروں صرف سر ہلا پائے۔

''میری بیوی جین گبر کو مرے ہوئے آج دو ہفتے ہو گئے ہیں۔'' الفریڈ نے افسوسناک خبر سنائی اور جو کہ ان چاروں کے لیے بہت بڑا انکشاف تھی۔

''دو ہفتے...... یعنی صرف دو ہفتے ہوئے ہیں تمہیں صدمہ جھیلے ہوئے۔'' جیمز کی آواز میں لرزش تھی۔ کلارک نے بےاختیار الفریڈ کا ہاتھ تھام لیا جو ہلکا ہلکا کانپ رہا تھا۔

''میرا تعلق امیر فیملی سے تھا۔ میں نے اپنی مرضی کرتے ہوئے غریب لڑکی جین سے شادی کر لی۔ اس بات

پر مشتعل ہو کر میرے باپ نے مجھے جائداد جو کئی ایکڑ اراضی اور فارمز پر مشتمل تھی، سے عاق کر دیا۔ میں نے اور جینی نے مختلف جگہوں پر کام کر کے گزر اوقات شروع کی۔ بڑی تنگی میں دن گزرنے لگے۔ کئی برس بیت گئے، ہمارے ہاں اولاد بھی نہ ہوئی۔ میں اور جینی اس کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔ تین سال قبل میرے والد کا انتقال ہوا تو میرے بھائیوں نے مجھے آخری رسومات میں شامل ہونے کے لیے اطلاع دی۔ وہیں پر مجھے بتایا گیا کہ میرے والد نے مرنے سے پہلے شاید مجھ پر ترس کھا کر چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا میرے نام کر دیا تھا جو میرے بھائیوں کو ملنے والے حصے سے کئی گنا کم تھا لیکن میں پھر بھی خوش تھا کہ دو افراد کے گزارے کے لیے مناسب انتظام ہو گیا ہے۔ تین سال پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ دو ہفتے قبل میں اور جینی مارکیٹ سے آ رہے تھے کہ ایک کار اچانک بے قابو ہو کر جینی سے ٹکرائی اور وہ ہوا میں اچھلتے ہوئے بڑے زور سے گری۔ اس کا سر زمین سے بری طرح ٹکرایا۔ وہ لمحوں میں میری آنکھوں کے سامنے مر گئی اور میں...... میں کچھ بھی نہ کر پایا۔ مجھے گاڑی یا گاڑی کے ڈرائیور سے کچھ نہیں لینا دینا تھا...... یہ...... محض ایک حادثہ تھا جو میری لائف برباد کر گیا۔ جینی نے کچھ ہی عرصہ تو سکون سے جیا تھا کہ...... کہ موت نے...... اسے مجھ سے جدا کر دیا۔ میں پاگل سا ہو گیا اور سوچا کہ جینی کے بغیر جی کر کیا کرنا۔ یہی سوچ کر اس روز پُل پر پہنچا۔ تمہیں دیکھا تو پتا نہیں کیوں تم سے بات کرنے کو دل کیا۔ آگے کی کہانی تم جانتے ہو...... تمہاری باتیں سن کر میرا ابھی دل جینے کو کرنے لگا پھر تم نے میرے گھر آ کر رونق لگا دی۔ میرا گھر پہلے کی طرح صاف کر دیا، میرا گارڈن پہلے جیسا ہو گیا اور تنہائی دور ہونے سے غم بٹنے سا لگا۔ اب مجھے کافی سکون ہے۔ مجھے بھی تم لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تمہاری وجہ سے میں زندگی کی جانب واپس آیا ہوں۔“ الفریڈ آنسو صاف کر رہا تھا۔

”بہت بڑا غم ہے تمہارا مسٹر الفریڈ! مجھے بہت افسوس ہے۔“ ایڈی نے الفریڈ کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”اور آفرین ہے تم پر کہ اس بڑے صدمے کے باوجود تم نے خود کو سنبھال کر ہمیں زندہ رہنے پر مائل کر دیا۔“ مچل نے آنکھوں کی نمی کو رگڑتے ہوئے کہا۔

”دراصل تم لوگوں سے باتیں کر کے کئی حقیقتیں مجھ پر کھلیں۔ وہ یہ کہ ہم پانچوں تنہائی، اپنوں کی بے وفائی، غربت، بیروزگاری، رشتوں کے دور ہو جانے جیسی پرابلم کا شکار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ انکشاف ہوا کہ بے شمار انسان ایسے ہیں جو غربت زدہ زندگی گزار رہے ہیں، کئی لوگوں کی بیویاں ان سے طلاق لے چکی ہیں، لوگوں پر جھوٹے کیسز بھی بنتے ہیں۔ اکثر لوگوں کی صلاحیتوں کا لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔ بہت سے بدنصیب ایسے ہیں جن کے شوہر یا بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ کاروبار بھی بہت سوں کے تباہ ہوئے ہیں۔ بھیانک تنہائی کئی لوگوں کا مقدر ہے۔ چند کو چھوڑ کر یہ مسئلے تو ساری دنیا کو ہیں تو کیا ساری دنیا خودکشی کر لے؟ نہیں، دکھوں کو برداشت کرنا اور منفی باتوں کو اگنور کر کے لائف کو آگے بڑھانا ہوگا۔“ الفریڈ گبز نے بات مکمل کر لی تھی۔

☆☆☆

اگلا دن بہت مصروف گزرا۔ جمز اور کلارک کو ریسٹورنٹ میں کام مل گیا۔ مچل گاڑیوں کا تھوڑا بہت کام جانتا تھا۔ اس نے ورکشاپ پر جاب کر لی اور ایڈی نے کوئی کام ملنے تک الفریڈ کے گھر کی صفائی اپنے ذمے لے لی۔ الفریڈ نے کہا تھا کہ وہ اسے اس کام کا معاوضہ دے گا۔ ایڈی نے معاوضے کے طور پر رہائش اور کھانے کا مطالبہ کیا۔

رات کا وقت تھا، سب کھانا کھا کر مشترکہ بیڈروم میں آ چکے تھے۔

”اب تم اپنے کمرے سیٹ کر لو۔ اب ہم الگ سو سکتے ہیں۔“ الفریڈ نے گویا اجازت دی۔ ویسے بھی وہ رینٹ دینے پر بضد تھے تو انہیں الگ الگ کمرا تو دینا ہی تھا۔

”او کے...... او کے...... کر لیں گے جب جی چاہے گا۔ فی الحال جیسا چل رہا ہے، چلنے دو۔“ کلارک نے بے فکری سے بیڈ پر پھیلتے ہوئے کہا۔

”مسٹر الفریڈ! آج کا دن بہت مصروف، بھرپور اور زندگی سے بھرا ہوا تھا۔ ہماری بات سن کر تم نے ہمیں علاج کر کے بچا لیا۔“ ایڈی نے جمز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو حسب معمول گٹار بجانے کے لیے اٹھا رہا تھا۔

”اور تم نے مجھے بچا لیا...... تم بات سنانے اور میں سننے کی وجہ سے مرنے سے بچ گیا۔“ الفریڈ ہنسا۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔

جمز گٹار بجا رہا تھا۔ سب مسکراتے چہروں کے ساتھ نئی زندگی کو ویلکم کہہ رہے تھے۔

⌘⌘⌘

خاطر داری

ملک صفدر حیات

چند متکبر لوگ بھول جاتے ہیں کہ چودھریوں کے اصول اور ملکی قوانین میں کوئی یکسانیت اور برابری نہیں ہوتی... لیکن انصاف کے ٹھیکیدار اپنی عینک سے معاملے کی سنگینی یا رنگینی کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں... جبکہ قوانین اور اصولوں پر عادتوں کے نہیں بلکہ حقیقتوں کے تقاضے پورے کرنا پڑتے ہیں... اس چودھری کو بھی یہی زعم تھا کہ اس کا اٹھایا ہوا ہر قدم انتہائی درست ہے... مگر صفدر حیات نے اس کی غلط سمت کی نشاندہی کرتے ہوئے خوب اچھے سے بتادیا کہ درست سمت کون سی ہے...

تھانے کی حدود میں مجرموں کی خاطر داری کا

عبرت اثر ماجرا

دولت کدہ دیکھتے ہی دیکھتے ماتم کدہ بن گیا تھا۔ پچھلے دو ماہ میں موضع فرید پور کے وسنیکوں کے لیے یہ دوسرا بڑا جھٹکا تھا جس نے ان کے دل ودماغ کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ سب سے زیادہ غمگین اور جگر فگار اُچی حویلی میں رہنے والے لوگ یعنی چودھری حفیظ اللہ اور اس کے خاندان کے دیگر افراد تھے کیونکہ صرف دو ماہ کے وقفے سے یہ ہوش وخرد کے پرخچے اڑا دینے والا دوسرا بم بھی اسی حویلی پر گرا تھا۔

اُچی (اونچی) حویلی کے اندر اگر کہرام مچا ہوا تھا تو باہر پورے فرید پور کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ سننے والوں نے اس خبر کو اپنی سماعت کا دھوکا سمجھا اور دیکھنے والے اس خونچکاں اور دلخراش حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے مگر وہی بات کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا اور لوح محفوظ پر مرقوم الفاظ کو ٹالا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے تبدیل کرنا ممکن ہے۔ دو ماہ قبل چودھرائن وزیر بیگم چل بسی تھی اور اب اُچی حویلی کی بہو عروج کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ میں اس وقت جائے وقوعہ پر موجود تھا۔

ان دنوں میری تعیناتی ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک تھانے میں تھی۔ فرید پور نامی وہ گاؤں میرے تھانے کے شمال مشرق میں صرف ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا لیکن میں نے ابھی جس سانحے کا ذکر کیا ہے، وہ فرید پور سے باہر ایک کچے راستے پر وقوع پذیر ہوا تھا۔ مذکورہ کچا راستہ موضع فرید پور اور موضع شیر گڑھ کو آپس میں ملاتا تھا۔ یہ لگ بھگ تین میل کی دوری تھی اور قتل کی یہ واردات کم وبیش اس کے وسط میں ہوئی تھی۔ مجھے جیسے ہی اس واقعے کی اطلاع ملی، میں کانسٹیبل محمد ہاشم کے ہمراہ موقعِ واردات پر پہنچ گیا تھا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ فروری کا مہینا اپنا نصف سفر طے کر چکا تھا لیکن ابھی تک فضا میں ٹھنڈک کا راج تھا۔ موسم پوری طرح کھلا نہیں تھا۔ بہرحال، میں وقوعہ کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔

وہ تہرے قتل کی ایک لرزہ خیز واردات تھی۔ چودھری حفیظ اللہ کی بہو عروج، عروج کے بڑے بھائی مشتاق اور کوچوان اللہ دتا کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ ابتدائی معلومات کے مطابق مشتاق اپنی بہن عروج کو لینے شیر گڑھ سے فرید پور آیا تھا۔ ایک رات اُچی حویلی میں گزارنے کے بعد اگلی صبح یعنی آج لگ بھگ دس بجے وہ عروج کے ساتھ ایک تانگے میں بیٹھ کر اپنے گھر واقع شیر گڑھ کی جانب روانہ ہوا تھا۔ اُچی حویلی والے یہی سمجھ

رہے تھے کہ وہ لوگ بخیریت اپنی منزل پر پہنچ گئے ہوں گے لیکن اس وقت ان کا اطمینان غارت ہو گیا جب کھیتوں میں کام کرنے والے کرامت علی نامی ایک مزدور نے آ کر اس سنگین واردات کی اطلاع دی۔ کرامت علی فرید پور ہی کا رہنے والا تھا اسی لیے وہ حویلی کے عالیشان تانگے اور ان تین لاشوں کو بہ آسانی پہچان گیا تھا۔

عروج، مشتاق اور اللہ دتا کی لاشیں کسمپرسی کی حالت میں کچے راستے کے کنارے پر پڑی تھیں۔ ان کے ابدان لہولہو ہو رہے تھے۔ انہیں کسی تیز دھار برچھے یا تیغے سے قتل کیا گیا تھا۔ ان آلاتِ غارت گری کو ایسی سفاکی سے استعمال کیا گیا تھا کہ وہ تینوں بدنصیب اپنا دفاع نہیں کر سکے تھے اور حملہ آوروں نے درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے ساتھ ہی برچھوں اور نیزوں کی انیوں سے ان کے جسموں کو گود ڈالا تھا۔ میں نے ''حملہ آوروں'' کے الفاظ اس لیے استعمال کیے کہ مقتولین کی لاشوں کی ناقابلِ بیان حالت کو دیکھ کر مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس رونگٹے کھڑے کر دینے والی واردات کے ذمے دار ایک سے زیادہ افراد تھے۔

جس تانگے پر سوار ہو کر وہ تینوں اُچی حویلی سے روانہ ہوئے تھے، وہ لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر کھیتوں کے بیچ ''کھڑا'' تھا۔ گھوڑا ابھی تک تانگے میں جتا ہوا تھا۔ میں نے مقتولین کی لاشوں کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد مذکورہ تانگے کا بغور جائزہ لیا۔ تانگے کی اگلی اور پچھلی دونوں سیٹیں خون آلود تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ عروج، مشتاق اور اللہ دتا کو تانگے پر ہی قتل کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی لاشوں کو کچے راستے کے کنارے پھینک کر تانگے کو کھیتوں کے اندر پہنچا دیا گیا تھا۔ شقی القلب قاتلوں کی یہ حکمتِ عملی فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اگر وہ بدبخت تانگے کو وقوعہ پر بھی کھڑا رہنے دیتے تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑنا تھا۔

میں نے موقع کی کارروائی مکمل کی تو سورج مغربی افق پر جھک چکا تھا۔ میرے حکم پر ایک تانگے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ چودھری حفیظ اللہ اور اس کا بیٹا چودھری سمیع اللہ بھی وہاں موجود تھے۔ مقتولہ عروج، سمیع اللہ کی بیوی تھی۔ جب میں مذکورہ تینوں لاشوں کو تانگے پر رکھوا کر کانسٹیبل محمد ہاشم کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوانے لگا تو چودھری حفیظ اللہ نے مجھ سے کہا۔

''ملک صاحب! کیا یہ سب ضروری ہے؟''

''بہت ضروری چودھری صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ قانونی کارروائی کا حصہ ہے۔''

''مگر اسپتال میں تو مُردوں کی چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔'' چھوٹے چودھری سمیع اللہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابھی چار ماہ پہلے ہی تو عروج سے میری شادی ہوئی تھی۔''

وہاں پر تین انسانوں کی لاشیں رکھی ہوئی تھیں جنہیں بے رحمی سے فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لیکن چھوٹے چودھری کو صرف اپنی بیوی کی لاش کے پوسٹ مارٹم کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس سے کوئی سخت بات کرتا۔

''سمیع اللہ! مجھے تمہارے دکھ اور اس عظیم تر نقصان کا احساس ہے۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''جس طرح جائے واردات کی کارروائی ضروری ہے، بالکل ویسے ہی ان لاشوں کا پوسٹ مارٹم بھی قانون کا تقاضا ہے اور میں اپنے اس فرض سے مجبور ہوں کیونکہ یہ تین انسانوں کی طبعی موت کا معاملہ نہیں بلکہ ایک لرزہ خیز واردات کا قصہ ہے۔ کسی شیطان صفت شخص نے بلکہ اشخاص نے آپ کی بیوی، سالے اور کوچوان کو بہیمانہ انداز میں موت کے منہ میں دھکیلا ہے لہٰذا پوسٹ مارٹم تو بہرصورت ہوگا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بڑے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''چودھری صاحب! کیا آپ نے شیر گڑھ والوں کو اس سانحے کی خبر کر دی ہے؟''

''جی ہاں تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے پژمردہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے اپنے دو بندوں کو گھوڑوں پر ادھر بھیجا ہے۔ اب تک وہ لوگ شیر گڑھ پہنچ گئے ہوں گے۔ چودھری یعقوب احمد کے تو صرف دو ہی بچے تھے۔ عروج اور مشتاق۔'' بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔ ''یہ سوچ کر ہی میرا کلیجا کانپ جاتا ہے کہ شیر گڑھ کی بڑی حویلی میں اس خبر سے جو قیامت ٹوٹے گی، وہ یعقوب احمد اور اس کی بیوی ممتاز کا کیا حشر نشر کرے گی۔ وہ بے چارے تو ایک پل میں بے اولاد ہو گئے ہیں۔''

''چودھری صاحب!'' میں نے حفیظ اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت اُچی حویلی میں آپ کی موجودگی زیادہ ضروری ہے۔ آپ دونوں باپ بیٹا گھر جائیں۔ میں یہاں کے معاملات کو نمٹانے کے بعد آپ کے پاس آتا ہوں پھر اس سانحے پر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔''

میری بات چودھری حفیظ اللہ کی سمجھ میں آگئی۔ سمیع اللہ نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے میری بات کی توثیق کردی۔

''اباجی! تھانیدار صاحب نے بالکل صحیح کہا ہے۔ آپ کی طبیعت بھی آج کل نرم گرم ہی چل رہی ہے۔آپ کو حویلی جاکر آرام کرنا چاہیے۔میں ہوں نایہاں پر۔''

چودھری حفیظ اللہ اپنے نمک خواروں کی معیت میں اُچی حویلی کی جانب روانہ ہوگیا تو میں اپنے کام میں لگ گیا۔سب سے پہلے میں نے کانسٹیبل ہاشم کو لاشوں کے ساتھ سرکاری اسپتال جانے کا حکم دیا پھر وہاں موجود افراد سے پوچھ تاچھ کرنے سے پہلے میں نے چھوٹے چودھری سمیع اللہ سے استفسار کیا۔

''چودھری صاحب! آپ کی شادی کو صرف چار ماہ ہوئے ہیں۔اگر عروج کو شیر گڑھ جانا ہی تھا تو آپ کو اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔آپ نے اپنی بیوی کو اکیلے کیوں بھیج دیا؟''

''عروج اکیلی نہیں، اپنے بڑے بھائی مشتاق کے ساتھ گئی تھی تھانیدار صاحب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''مشتاق کل ہی یہاں آیا تھا۔اس نے بتایا کہ عروج کے باپ یعنی میرے سسر چودھری یعقوب کو اپنی بیٹی کی بہت یاد آرہی ہے اس لیے ہفتہ دس دن کے لیے عروج کو شیر گڑھ بھیج دیا جائے۔آگے ویسے بھی الیکشن کا سیزن شروع ہونے والا ہے۔چودھری یعقوب صاحب سیاست کے پرانے کھلاڑی ہیں اور انتخابات میں نہ صرف حصہ لینا بلکہ جیتنا ان کی عادت ہے اور اس عادت کو وہ اپنا مان کہتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو تھما پھر ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔

''مشتاق اپنی اکلوتی بہن عروج کو لینے ہی آیا تھا۔میں گزشتہ روز سے بیمار ہوں۔رات بھر تیز بخار رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی دست کا معاملہ بھی ہے۔میں تو ان لوگوں کے ساتھ شیر گڑھ جانا چاہتا تھا لیکن اباجی نے سختی سے منع کردیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں لہٰذا مجھے گھر میں آرام کرنا چاہیے۔مجھے کیا پتا تھا کہ ہم پر اتنی بڑی قیامت ٹوٹنے والی ہے۔''

بات کے اختتام پر اس کی آواز بھیگ گئی۔میں نے تسلی دینے والے انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چودھری صاحب! ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔آپ کی زندگی باقی تھی اس لیے قدرت نے آپ کی طبیعت خراب کردی اور آپ ان کے ساتھ نہ جاسکے۔مالک کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے جسے سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو صاف کرتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔''اب تو مجھے ساری زندگی اسی دکھ اور پچھتاوے کے ساتھ جینا ہوگا۔''

''حوصلے سے کام لیں چودھری صاحب!'' میں نے تشفی بھرے لہجے میں کہا پھر دوسرے لوگوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

جائے وقوعہ کے نزدیک لگ بھگ دو درجن مرد وزن جمع تھے۔میں نے ان میں سے آٹھ دس افراد سے پوچھ تاچھ کی مگر کوئی بھی ایسی بات سامنے نہیں آئی جس کے ذریعے میں اس خونیں واردات کے ذمے داروں تک رسائی حاصل کرسکوں حتیٰ کہ اُچی حویلی والوں کو اس خونچکاں واقعے سے آگاہ کرنے والا کرامت علی بھی تین انسانوں کے قاتلوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

''تم نے کتنے بجے ان لاشوں کو کچے راستے کے کنارے پر پڑے دیکھا تھا؟'' میں نے کرامت علی کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔

کرامت علی کھیتوں میں کام کرنے والا ایک مزدور پیشہ شخص تھا۔اس کی عمر چالیس کے آس پاس رہی ہوگی۔وہ درمیانے قد اور سانولی رنگت کا مالک ایک دبلا پتلا انسان تھا۔

''میں نے سب سے پہلے تانگے اور گھوڑے کو دیکھا تھا تھانیدار صاحب اور مجھے اس پر خاصی حیرت بھی ہوئی تھی کہ کسی نے اس تانگے کو کھیتوں کے بیچ لاکر کیوں کھڑا کردیا ہے۔'' کرامت علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔''میں اس وقت کھیتوں کی دوسری طرف کچے راستے کے قریب پہنچا تو میں نے تین انسانوں کو مردہ حالت میں پڑے پایا۔میں نے انہیں اور تانگے کو فوراً پہچان لیا۔اس کے بعد میں بھاگتے ہوئے اُچی حویلی پہنچا اور چھوٹے چودھری صاحب کو اس بارے میں سب کچھ بتادیا۔اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو چودھری صاحب سے پوچھ لیں۔'' بات کے اختتام پر اس نے چودھری سمیع اللہ کی طرف دیکھا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کرامت علی!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔''مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔تم اچھی طرح اپنے ذہن پر زور دے کر مجھے بتاؤ کہ جب تم اس طرف آرہے تھے تو تم نے یہاں کوئی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھی تھی؟''

''کیا دیکھی تھی؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

"میرا مطلب ہے......" میں نے آسان الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے دو یا دو سے زیادہ لوگوں کو یہاں دیکھا تھا؟ ان کی کسی حرکت کو نوٹ کیا تھا؟ یہ جو تین لوگ اپنی جان سے گئے ہیں، میں ان کی موت کے ذمے داروں کی بات کر رہا ہوں۔"

"نہیں سرکار! میں نے کسی کو انہیں قتل کرتے نہیں دیکھا۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں تو کافی دور سے چلتا ہوا اس طرف آ رہا تھا اور جب میں یہاں پہنچا تو میں نے تانگے اور ان تین لاشوں کو دیکھا تھا۔ چھوٹے چودھری صاحب کی بیوی، ان کے سالے اور کوچوان کو کس نے قتل کیا ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ چاہیں تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم نے جو بتایا، میں نے اس پر یقین کر لیا ہے۔"

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کرنے کے بعد ایک طرف نکل گیا۔

اب جائے واردات پر میرا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔ سورج غروب ہونے میں چند ہی منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے چودھری حفیظ اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ یہاں کا معاملہ نمٹانے کے بعد میں اس کے پاس آؤں گا۔ سو ایفائے عہد کی خاطر میں چودھری سمیع اللہ کی ہمراہی میں اُچی حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

"اُچی حویلی" کی وجۂ تسمیہ اس کی بلندی تھی۔ چودھری حفیظ اللہ کے آباؤاجداد نے مذکورہ حویلی کو عام گاؤں کی زمین سے کم وبیش سات فٹ اونچا تعمیر کرایا تھا اس لیے اسے اُچی حویلی کہا جاتا تھا۔ اس حکمت عملی کا سبب یقیناً خود کو گاؤں کے دیگر باسیوں سے ممتاز، برتر اور اعلیٰ وارفع ظاہر و ثابت کرنا تھا۔

چودھری حفیظ اللہ کی کُل چار اولادیں تھیں۔ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ سب سے بڑی بیٹی نائلہ کی عمر پینتیس سال تھی۔ اس سے چھوٹی بیٹی ثمینہ اکتیس سال کی تھی۔ اس کے بعد ثوبیہ کا نمبر تھا جس کی عمر ستائیس سال تھی۔ ان تینوں بہنوں سے چھوٹا سمیع اللہ تھا جو لگ بھگ پچیس سال کا تھا۔ چودھری حفیظ اللہ کی تمام اولادیں شادی شدہ تھیں۔ تینوں بیٹیاں اپنے گھروں میں خوش وخرم اور شاندار زندگی گزار رہی تھیں۔ زندگی تو سمیع اللہ کی بھی خوش وخرم اور شاندار گزر رہی تھی لیکن اس اندوہناک واقعے نے اُچی حویلی کے اندر اور باہر موجود ہر شخص کو اندوہ گیں کر دیا تھا اور سب سے زیادہ بُری حالت چھوٹے چودھری سمیع اللہ کی تھی۔ اس نے اپنی نوبیاہتا بیوی کو کھویا تھا اور وہ بھی دل پاش اور جگر خراش حالات میں۔

جب میں اُچی حویلی کی دس سیڑھیاں چڑھ کر اس عالیشان عمارت کے اندر پہنچا تو اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے ایک کشادہ سجے سجائے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ اُچی حویلی کا ڈرائنگ روم تھا جہاں پر کم از کم پچاس افراد کے بیٹھنے کے لیے آرام دہ صوفے اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن کے سامنے منقش چوبی میزیں بھی موجود تھیں۔ چھوٹا چودھری مجھے اس شاہانہ بیٹھک میں چھوڑ کر حویلی کے اندرونی حصے میں غائب ہو گیا تھا۔ چند منٹ کے بعد چودھری حفیظ اللہ میرے پاس آ گیا۔ رسمی علیک سلیک جائے واردات پر ہو چکی تھی لہٰذا میں فوراً مقصد کی بات پر آ گیا۔

"چودھری صاحب!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ کی عمر اور تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ میں نے موقعِ واردات پر جو مناظر دیکھے ہیں، ان سے میرے ذہن میں تو ایک ہی خیال آ رہا ہے اور وہ یہ کہ ہم اس سانحے کو کسی بھی قیمت پر راہزنی اور لوٹ مار کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عروج، مشتاق اور کوچوان اللہ دتا کو تہِ تیغ کرنے والے درندہ صفت حملہ آوروں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے تہرے قتل کی یہ واردات انجام دی ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے ملک صاحب!" وہ ایک بوجھل اور افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "ان تینوں لاشوں کی حالت کو دیکھ کر میں بھی پورے وثوق سے یہی کہوں گا کہ یہ خونچکاں واقعہ ایک انتقامی کارروائی ہے۔"

"آپ نے میرا کام بڑی حد تک آسان کر دیا ہے چودھری صاحب!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔ "میرا تھانیدارانہ ذہن بھی اسی زاویے پر سوچ رہا ہے۔ انتقامی کارروائی کا سیدھا سیدھا مطلب ہے...... دشمنی نکالنا۔" میں لمحے بھر کے لیے تھما پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کر دی۔

"اب آپ مجھے اپنے دشمنوں کے بارے میں کھل کر بتائیں گے تاکہ میں اس بہیمانہ واردات کے ذمے داروں کو گرفتار کر سکوں۔ اس امر میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی کہ کوچوان اللہ دتا کا اس معاملے سے کچھ

لینا دینا نہیں تھا۔ وہ بے چارہ تو کسی اور کی بھینٹ چڑھ گیا۔''

''میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے گمبھیر انداز میں بولا۔ ''مجھے شک ہے کہ اللہ دتا نے حملہ آوروں کو پہچان لیا تھا۔ اسے محض اس لیے بلی چڑھا دیا گیا کہ اگر وہ زندہ رہ گیا تو قاتلوں کا راز فاش کردے گا۔ باقی جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو......'' وہ لحہ بھر کے لیے رکا پھر پُرسوچ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں اپنے کسی ایسے دشمن کو نہیں جانتا جو اتنی دیدہ دلیری سے میرے علاقے میں گھس کر ایسی جرأت کا مظاہرہ کرسکے۔ اس حوالے سے میرا ذہن کسی اور طرف جا رہا ہے۔''

''کس طرف چودھری صاحب؟'' میں نے ترنت استفسار کیا۔

''دیکھیں، ہم دونوں اس بات پر تو متفق ہیں کہ کوچوان بے قصور مارا گیا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''باقی بچے وہ دونوں بھائی بہن، میرا مطلب ہے...... عروج اور مشتاق۔ یہ ٹھیک ہے کہ عروج میری بہو تھی لیکن اس سے پہلے وہ مشتاق کی بہن بھی تھی اور ان دونوں کا باپ یعنی چودھری یعقوب احمد ایک دشمن دار شخص ہے۔ الیکشن زیادہ دور نہیں ہیں ملک صاحب! عین ممکن ہے یہ سازش چودھری یعقوب کے کسی سیاسی حریف نے بنی ہو۔ اس نے ایک ہی جھٹکے میں یعقوب احمد کو بے اولاد کردیا اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے دونوں بچوں کی موت کا الزام موضع فرید پور پر آئے۔''

''آپ کی بات میں وزن ہے چودھری صاحب!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اس حوالے سے سوچا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے چودھری یعقوب احمد سے تفصیلاً بات کرنا ہوگی۔ کیا آپ کی اس سے کوئی قریبی رشتے داری ہے؟''

''نہیں ملک صاحب! آپ اسے قریبی رشتے داری تو نہیں کہہ سکتے البتہ ہم سب ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔'' اس نے رسان بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''باقی چودھری یعقوب سے آپ کی تفصیلی ملاقات اسی حویلی میں متوقع ہے اور وہ بھی آج ہی۔'' اس نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے لحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے سہ پہر میں جن دو بندوں کو شیر گڑھ بھیجا تھا، انہوں نے یقیناً چودھری یعقوب کو اس سانحے کی اطلاع دے دی ہوگی۔ اس کے بعد یعقوب احمد کا اونچی حویلی کی طرف رخ کرنا لازم ہے۔ وہ کسی بھی وقت یہاں آسکتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

ہمارے درمیان اہم اور سنجیدہ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ چودھری سمیع اللہ کی نگرانی میں دو ملازم صورت افراد سامانِ خورونوش سے لدی ہوئی ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوئے اور انہوں نے اللہ کی درجن بھر نعمتوں کو میرے سامنے رکھی میز پر سجادیا پھر وہ چپ چاپ واپس چلے گئے اور سمیع اللہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''ملک صاحب! بسم اللہ کریں۔'' چودھری حفیظ اللہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''چودھری صاحب! آپ کی حویلی پر قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یہ تکلف نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں ہرگز کچھ بھی نہیں کھا پاؤں گا۔''

''ملک صاحب! آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پُرخلوص لہجے میں بولا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کی خاطر تواضع کو بھول جاؤں۔''

''میں آپ کی محبت اور مہمان نوازی کی دل سے قدر کرتا ہوں چودھری صاحب!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''لیکن میں معذرت خواہ ہوں کہ اس موقع پر کھانے پینے کی کوئی شے میرے حلق سے نہیں اتر سکے گی۔ پھر کبھی میں آپ کی حویلی میں حاضر ہوں گا اور خوب سیر ہوکر کھاؤں گا۔ امید ہے آپ میری مجبوری کو سمجھ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اصرار نہیں کروں گا۔'' چودھری حفیظ اللہ نے کہا۔ ''لیکن یہ سب کچھ یہیں رکھا رہے گا۔ اگر آپ کی طبیعت مائل ہوجائے تو حسبِ خواہش کچھ بھی لے سکتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔''

چودھری حفیظ اللہ کی اپنایت اور خلوص بھرے رویّے کے پیشِ نظر میں نے بھی ضد بحث سے احتراز کرتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے چودھری صاحب! جو آپ کی مرضی۔''

اس کے بعد ہم تینوں چودھری یعقوب احمد کی سیاست اور اس کے دشمنوں کے حوالے سے گفتگو کرنے لگے۔ اس بات چیت میں مجھے پتا چلا کہ عروج کا باپ ایک دبنگ سیاست دان تھا۔ آج تک کوئی دوسرا امیدوار اس کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہیں کرسکا تھا۔ اس علاقے

میں میری تعیناتی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے یعقوب احمد اور اس کی سیاست کے حوالے سے بہت سی باتیں میرے لیے نئی اور پُراز دلچسپی تھیں۔

کسی بھی انسان کی مسلسل کامیابی جہاں اس کی شہرت، مقبولیت اور عزت کا باعث بنتی ہے، وہیں پر اس کے حاسدین کی تعداد میں بھی اضافہ کرتی ہے اور اگر کوئی حاسد طاقتور بھی ہو تو وہ دشمنی سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عروج، مشتاق اور اللہ دتا کی موت کا ذمے دار چودھری یعقوب احمد ہی کا کوئی بدخواہ یا سیاسی حریف ہو۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ گزشتہ دو ماہ میں اُچی حویلی میں بسنے والے چودھری خاندان کو یہ دوسرا دھچکا سہنا پڑا تھا۔ دو ماہ پہلے چودھری سمیع اللہ کی ماں دارالفانی سے دارالبقا روانہ ہوئی تھی۔ وزیر بیگم کے چہلم کو چند روز ہی گزرے تھے کہ آج یہ دوسرا سانحہ رونما ہوگیا تھا۔ چودھری حفیظ اللہ اور اس کے فرزند واحد چودھری سمیع اللہ کے دکھ کو سمجھنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی نہیں، بس احساس کے زندہ ہونے کی ضرورت تھی۔ متاثرین کے لیے یہ ایک قیامتِ صغریٰ، ایک صدمۂ جانکاہ تھا۔

ہمارے درمیان افسردہ اور دل گرفتہ ماحول میں گفتگو کا عمل جاری ہی تھا کہ ایک ملازم نے وہاں آکر چودھری حفیظ اللہ کو اطلاع دی۔

"چودھری صاحب! نصیر اور منظور واپس آگئے ہیں اور وہ فوراً آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ انہیں بھیجو اندر۔" چودھری سمیع اللہ نے سپاٹ آواز میں کہا۔

ملازم کے جانے کے بعد چودھری حفیظ اللہ نے مجھے بتایا۔ "ملک صاحب! نصیر اور منظور وہی دو بندے ہیں جنہیں میں نے شیر گڑھ دوڑایا تھا۔"

"اوہ اچھا۔" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "اس ملازم کی بات سے تو یہی لگتا ہے کہ عروج اور مشتاق کا باپ چودھری یعقوب احمد نہیں آیا۔"

"سوہنا رب خیر کرے۔" چودھری حفیظ اللہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ "میرے دماغ میں بُرے بُرے خیال آرہے ہیں ملک صاحب!"

"اللہ کرم کرے گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

ایک منٹ کے بعد نصیر اور منظور، چودھری حفیظ اللہ کے روبرو دست بستہ کھڑے تھے۔ چودھری کے استفسار پر انہوں نے شیر گڑھ کا جو احوال بیان کیا وہ اس حویلی کے غم میں عظیم اضافے کا موجب تھا۔ اس سنسنی خیز بیان کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

جب نصیر اور منظور نے شیر گڑھ کی بڑی حویلی میں پہنچ کر چودھری یعقوب احمد کو فرید پور والے اندوہناک سانحے کے بارے میں بتایا تو حویلی میں موجود ہر شخص کے ہوش اڑ گئے۔ مشتاق شادی شدہ تھا اور اس کی تین سال کی ایک بیٹی تھی جس کا نام عابدہ تھا۔ عابدہ کا شعور ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے باپ کی المناک موت کی اذیت ناک شدت کو صحیح معنوں میں محسوس کرسکے لیکن مشتاق کی بیوی عالیہ اس دلدوز خبر کو سنتے ہی زاروقطار رونے لگی تھی۔ چودھری یعقوب احمد اور اس کی بیوی چودھرائن ممتاز بی بی کے دل و دماغ میں گویا بارودی دھماکے ہورہے تھے۔ چند لمحات اسی افراتفری اور بے سروسامانی میں گزر گئے۔ چودھری یعقوب کی سمجھ بوجھ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اچانک اپنے دونوں بچوں کو کھو بیٹھے گا۔ جب وہ کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو اس نے فی الفور فرید پور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ نصیر اور منظور کے ساتھ ہی اس طرف آنا چاہتا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایک ملازم کو بھیج کر اپنے چھوٹے بھائی اسحاق احمد کو بلالیا۔ اسحاق احمد شیر گڑھ ہی میں رہتا تھا۔ اس کی رہائش گاہ "چھوٹی حویلی" کہلاتی تھی۔ وہ شیر گڑھ سے نکلنے سے پہلے چودھری اسحاق احمد کو فرید پور والے سانحے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا مگر تیرہ فروری کا دن ان لوگوں کے لیے ایسا منحوس ثابت ہوا کہ ایک کے بعد ایک بری خبر ان پر ایسے وارد ہورہی تھی کہ وہ اپنے ہوش و حواس کو بجا اور سلامت رکھنے میں کلی طور پر ناکام ہوچکے تھے۔ چودھری اسحاق احمد اپنے بڑے بھائی کے بلاوے پر چھوٹی حویلی سے بڑی حویلی تو پہنچا مگر ایک دلخراش اور لرزہ خیز خبر کے ساتھ۔ چودھری اسحاق کے اکلوتے بیٹے چھبیس سالہ سلیم احمد کو کسی نے سفاکانہ انداز میں قتل کرکے اس کی لاش کو کھیتوں میں پھینک دیا تھا۔

"یہ تم لوگ کیا بکواس کررہے ہو؟" چودھری حفیظ اللہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔ "سلیم تو بہت اچھا لڑکا ہے۔ اسے کوئی کیوں مارے گا؟"

"چودھری صاحب! ہم نے شیر گڑھ میں جو سنا اور جو دیکھا، وہی آپ کو بتارہے ہیں۔" نصیر نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔ "یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ چودھری اسحاق احمد کے اکلوتے بیٹے سلیم کو کسی ظالم شخص نے بے دردی سے گلا کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

"اسی لیے چودھری یعقوب صاحب ہمارے ساتھ یہاں آنے کے بجائے تھانے گئے ہیں۔" منظور نے معتدل انداز میں بتایا۔ "انہوں نے ہم سے یہی کہا ہے کہ وہ تھانے میں سلیم کے قتل کی رپورٹ درج کرانے کے بعد یہاں آئیں گے۔"

"یہ کیا ہوگیا ملک صاحب!" چودھری حفیظ اللہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے دل گیر لہجے میں کراہ اٹھا۔ "ان دونوں بھائیوں کی تو دنیا ہی اجڑ گئی۔ ایک ہی دن میں وہ اولاد جیسی نعمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ انسان اگر بے اولاد ہو تو کسی نہ کسی طرح صبر آ ہی جاتا ہے۔ وہ دونوں بھائی تو اپنی جوان اولاد کو کھو کر بڑھاپے میں بے اولاد ہو گئے ہیں۔ یہ صدمہ انہیں جینے دے گا اور نہ ہی مرنے۔"

چودھری حفیظ اللہ کی آہ و بکا اور گریہ و زاری کے دوران میں ہی چودھری سمیع اللہ کے خاموش اشارے پر نصیر اور منظور چپ چاپ وہاں سے کھسک لیے تھے اور میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ملک صاحب! آپ کیوں اچانک کھڑے ہو گئے؟" چودھری حفیظ اللہ نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے اس وقت یہاں نہیں، تھانے میں ہونا چاہیے چودھری صاحب!" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "آپ نے مجھے جس کام کے لیے بلایا تھا، وہ مکمل ہو چکا۔ اب تھانے میں دوسرے فریادیوں کو قانونی مدد کی ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ چودھری یعقوب کو تھانے میں بیٹھ کر میرا انتظار کرنا پڑے۔ امید ہے آپ میری پیشہ ورانہ مجبوری کو سمجھ گئے ہوں گے۔"

"آپ نے بجا فرمایا ملک صاحب!" چودھری سمیع اللہ نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "مشتاق کی طرح میں سلیم کو بھی اپنا بڑا بھائی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے ان دونوں کی عبرت ناک موت کا حد درجہ دکھ ہے۔ یہ ساری اموات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی لگ رہی ہیں اور ان خونریز واقعات میں اول آخر نقصان ہوا ہے شیر گڑھ کے چودھریوں کا۔" پھر وہ بھی میری دیکھا دیکھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔

"ملک صاحب! ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں تاکہ چاچا یعقوب کو ایسا محسوس نہ ہو کہ مصیبت کی اس گھڑی میں وہ تن تنہا کھڑا ہے۔"

"بیٹا جی! میں تمہارے اس جذبے کو سلام کرتا ہوں۔" بڑے چودھری نے چھوٹے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا۔ "لیکن نقصان صرف شیر گڑھ والوں ہی کا نہیں، ہمارا بھی ہوا ہے۔ عروج کی دردناک موت کے ساتھ ہی تمہارا گھر بھی تو اجڑا ہے۔ کیا یہ ہمارے لیے قیامت کی گھڑی نہیں ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ملک صاحب! مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ آپ میری حویلی میں تشریف لائے اور بغیر کچھ کھائے پیے رخصت ہو گئے۔ کاش، میں جی جان سے آپ کی خاطر داری کر پاتا۔"

"مل بیٹھنے اور خاطر داری کے ہزاروں مواقع آئیں گے چودھری صاحب!" میں نے اس سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ آرام کریں۔ میں کل کسی وقت آپ سے ملاقات کرنے آؤں گا۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں چودھری سمیع اللہ کے ساتھ ایک تانگے پر سوار ہوا اور مذکورہ تانگا میرے تھانے کی جانب بڑھنے لگا۔

☆☆☆

وہ رات کے آٹھ بجے کا عمل تھا۔ میں اس وقت کانسٹیبل واحد حسین کے ساتھ موضع شیر گڑھ کے آخری کنارے پر واقع ٹبلی والے کھوہ سے چند قدم آگے کھیتوں کے بیچ موجود تھا۔ فضا میں خنکی نہیں بلکہ باقاعدہ ٹھنڈک کا راج تھا۔ فروری کا مہینا آدھا گزر چکا تھا لیکن موسم سرما کی رخصت کے امکانات ابھی ظاہر ہونا شروع نہیں ہوئے تھے۔

ہمارے چاروں طرف تاریکی نے بسیرا کر رکھا تھا مگر میں اور دیگر لوگ کھیتوں کے جس حصے میں تھے، وہ اچھا خاصا روشن تھا۔ لگ بھگ دو درجن لالٹینوں سے خارج ہونے والی روشنی نے ہمارے مخصوص ماحول کو مناسب انداز میں اُجال دیا تھا اور میں اس زرد اجالے میں سلیم احمد کی گردن کٹی لاش کو واضح طور پر دیکھ پا رہا تھا۔ سلیم کی عمر چھبیس سال بتائی جا رہی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک گبرو جوان تھا۔ "تھا" اس لیے کہ اب اس کے لیے حال کا صیغہ استعمال کرنا تکنیکی اعتبار سے درست نہیں تھا۔ وہ ماضیِ قریب کا حصہ بن کر قصۂ پارینہ کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ کسی سنگدل شخص نے گلا کاٹ کر اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کا لباس خصوصاً لباس کا بالائی حصہ اس کے اپنے ہی خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ کٹی ہوئی گردن سے خارج ہونے والے لہو نے اس کے لباس کو پوری طرح بھگو دیا تھا۔ وہ ایک انسانی قتل کی لرزہ خیز واردات تھی۔ شہ رگ بری طرح کٹ جانے کے بعد

گردن کا متاثرہ مقام ورم کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ سلیم کی لاش کا منظر بلاشبہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔

میں نے اکڑوں بیٹھ کر لالٹینوں کی روشنی میں مذکورہ لاش کا تفصیلی معائنہ کیا تھا اور اس کوشش میں کام کی ایک بات میرے ہاتھ لگ گئی تھی اور وہ یہ کہ سلیم کو کسی اور جگہ موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد یہاں لا کر پھینک دیا گیا تھا کیونکہ اس وقت جس مقام پر اس کی لاش پڑی تھی وہاں زمین پر مجھے خون کا نام ونشان دکھائی نہیں دیا تھا اور اس کا لباس اس امر کا گواہ تھا کہ اس کی کٹی ہوئی گردن میں سے کس قدر خون نکلا تھا۔

جب میں افراتفری کے عالم میں چودھری سمیع اللہ کے ساتھ تھانے پہنچا تھا تو وہاں چودھری یعقوب احمد دو افراد کے ساتھ پہلے سے موجود تھا۔ ہمارے درمیان نہایت ہی مختصر سنجیدہ بات چیت ہوئی تھی اور ہم سب فی الفور جائے وقوعہ کی سمت چل پڑے تھے۔ اس شبینہ سفر کے دوران میں میرے، سمیع اللہ اور یعقوب احمد کے بیچ آج کے دن کی نحوست اور سنگینی کے حوالے سے کھل کر گفتگو ہوئی تھی۔ بہرکیف، میں نے واحد حسین کی مدد سے جائے وقوعہ کی ضروری کارروائی مکمل کر لی تو چودھری یعقوب احمد نے مجھ سے کہا۔

''ملک صاحب! آپ میرے ساتھ بڑی حویلی چلیں۔ باقی کی باتیں وہیں بیٹھ کر کریں گے۔''

''ضرور۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک آخری کام نمٹانے کے بعد۔''

''کون سا آخری کام؟'' اس نے پوچھا۔

''سلیم کی لاش کو فوری طور پر سرکاری اسپتال بھجوانا ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو شکر کریں کہ موسم ٹھنڈا ہے ورنہ ابھی تک اس لاش میں سے بدبو کے بھبکے اٹھنا شروع ہو چکے ہوتے۔''

سلیم کا باپ چودھری اسحاق احمد بھی موقع پر موجود تھا۔ دونوں بھائیوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ میری بات اچھے سے ان کے بھیجوں میں بیٹھ گئی تھی۔ انہوں نے کوئی سوال کیا اور نہ ہی اعتراض۔ میں نے سلیم کی لاش کو تانگے میں رکھوانے کے بعد کانسٹیبل واحد حسین کی ذمے داری میں ضلعی اسپتال روانہ کر دیا۔ واحد حسین کے علاوہ میں نے دو اور بندوں کو بھی تانگے پر سوار کرا دیا تھا تاکہ کانسٹیبل کو تنہائی کا احساس نہ ہو۔ وہ رات کا وقت تھا اور ایک گردن کٹی لاش کے ہمراہ کانسٹیبل کا اکیلے سفر کرنا مجھے ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ یہ اہتمام میں نے اپنی اسی سوچ کے پیش نظر کیا تھا۔ ان تمام قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد میں اور سمیع اللہ، چودھری برادران کے ہمراہ شیر گڑھ کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے۔

گاؤں کے کم وبیش وسط میں دو عالیشان حویلیاں پہلو بہ پہلو بنی ہوئی تھیں جن میں سے ایک سائز کے اعتبار سے دوسری سے بڑی تھی اور وہ ''بڑی حویلی'' کہلاتی تھی جبکہ دوسری کو لوگ ''چھوٹی حویلی'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان دونوں حویلیوں میں یعقوب احمد اور اسحاق احمد رہتے تھے۔ میں اس وقت بڑے چودھری کی رہائش گاہ یعنی بڑی حویلی میں موجود تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے علاوہ چودھری یعقوب کا داماد بھی وہاں حاضر تھا۔ میں نے مناسب، موزوں اور ہمدردی بھرے الفاظ میں پہلے تو ان تینوں کو ان واقعات کے حوالے سے تسلی دلاسا دیا پھر صورت حال کی سنگینی کی طرف آ گیا۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کو دیکھنے کے بعد کہا۔

''ایک بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ دونوں لرزہ خیز وارداتیں کسی انتقامی کارروائی کا نتیجہ ہیں اور ان کے پیچھے کسی ایک ہی شخص کا ہاتھ ہے اور وہ شخص طاقت واختیار میں اگر آپ لوگوں کے ہم پلہ نہیں تو آپ سے کم بھی نہیں ہے کیونکہ راہزن اور لٹیرے ایسی منظم کارروائی نہیں کر سکتے۔ مقتولین کی جانوں کے سوا کچھ بھی نہیں گیا۔ اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ قاتلوں کو صرف سلیم، مشتاق اور عروج کو ہی موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے بھیجا گیا تھا تاکہ آپ دونوں بھائیوں کی پوری اولاد کا صفایا ہو جائے اور شیر گڑھ کی دونوں حویلیاں اپنے مستقبل کے وارثوں سے محروم ہو جائیں اور آپ کے دشمن کی یہ ناپاک چال بدقسمتی سے کامیاب رہی ہے۔ اس وقت آپ دونوں بھائی اپنی اولادوں کو ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''اگر میرا اندازہ غلط ہے تو آپ لوگ میری تصحیح کر دیں لیکن اگر آپ میرے خیال سے اتفاق کرتے ہیں تو پھر آپ مجھے اپنے تمام دشمنوں کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کریں تاکہ میں جلد از جلد ان تین انسانوں کی اموات کے حقیقی ذمے داروں تک رسائی حاصل کر کے انہیں قرار واقعی سزا دلوا سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔''

''ملک صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ اسحاق احمد سے کسی کی براہ راست کوئی دشمنی نہیں۔'' چودھری یعقوب نے غم سے بوجھل آواز میں جواب دیا۔ ''البتہ میرے کئی ایک سیاسی دشمن ضرور ہیں۔ میں اللہ کے فضل سے ہمیشہ انتخابات

میں کامیابی حاصل کرتا رہا ہوں اور ظاہر ہے یہ بات بہت سے لوگوں کو اچھی نہیں لگتی۔ اس وقت بھی الیکشن کی روایتی سرگرمیاں شروع ہو چکی ہیں اور اس بار میرے مقابلے میں پنڈ گوندلاں والا کا ایک زمیندار احمد نواز گوندل الیکشن لڑ رہا ہے۔ میرے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ میں دعوے سے کہہ سکوں کہ قتل و غارت گری کی ان وارداتوں کا ذمے دار احمد نواز گوندل ہی ہے لیکن ظاہر ہے ان حالات میں میرا دھیان سب سے پہلے اسی کی طرف جائے گا نا۔''

''میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا چودھری صاحب!'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اپنی تفتیش کے آغاز کے لیے ایک نام مل گیا ہے۔ میں آپ کے سیاسی حریف احمد نواز گوندل کو اپنے طریقے سے چیک کرلوں گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور اہم بات آپ لوگوں کے علم میں ہو تو مجھے ضرور بتائیں تاکہ مجھے اپنے کام میں مدد مل سکے۔''

چودھری اسحاق احمد نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کرنسی نوٹ کا ایک ٹکڑا برآمد کیا اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ہوسکتا ہے آپ اس نوٹ کے ذریعے ان سفاک قاتلوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجائیں۔''

میں نے کرنسی نوٹ کے اس ٹکڑے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا معائنہ کیا۔ وہ سو روپے مالیت کے نوٹ کا آدھا حصہ تھا یعنی نوٹ کو درمیان سے کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا جن میں سے ایک حصہ اس وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے مذکورہ سو روپے کے نوٹ کے ذیل میں ''کاٹ'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ کٹے اور پھٹے ہوئے نوٹ کی حالت میں نمایاں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق میری عقابی نگاہ سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ نوٹ کے ''مقام علیحدگی'' پر کسی تیز دھار قینچی یا چھری کے آثار واضح طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔ اگر اس نوٹ کو پھاڑ کر دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہوتا تو اس کی سطح اتنی ہموار اور ''شارپ'' نہ ہوتی۔

''آپ کو سو روپے والے نوٹ کا یہ ٹکڑا کہاں سے ملا ہے چودھری صاحب؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں چودھری اسحاق سے استفسار کیا۔

''یہ مجھے نہیں، فیکا حیلی کو ملا ہے ملک صاحب!'' چھوٹے چودھری نے مجھے بتایا۔ ''یہ وہی بندہ ہے جس نے حویلی آکر ہمیں اس سانحے کی اطلاع دی تھی۔ سو روپے کا یہ آدھا نوٹ سلیم کی لاش کے قریب ہی ایک پتھر کے نیچے اس طرح دبا کر رکھا گیا تھا کہ دیکھنے والے کی نظر اسی پر پڑے۔''

''یہ کارستانی یقیناً اسی قاتل کی ہے جس نے آپ کے بیٹے سلیم کو فنا کے گھاٹ اتارا ہے۔'' میں نے نوٹ کے اس ٹکڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''یہ ایک طرح سے اس کا کوئی خفیہ پیغام ہے۔ میں بہت جلد اس پیغام کو سمجھ جاؤں گا۔'' میں لمحے بھر کے لیے تھما پھر مذکورہ نوٹ کے ٹکڑے کو اپنی جیب میں رکھنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''اندھیرے کے باعث میں جائے وقوعہ اور اس کے گردونواح کا تسلی بخش جائزہ نہیں لے سکا۔ آپ لوگوں سے میری استدعا ہے کہ اس طرف لوگوں کے جانے پر پابندی عائد کردیں۔ میں کل صبح اپنے بندوں کو یہاں بھیجوں گا۔ وہ گھوم پھر کر اچھی طرح موقع واردات کو کھنگالیں گے۔ عین ممکن ہے کہ اس نوٹ کے ٹکڑے کے علاوہ بھی کوئی اہم سراغ ہاتھ لگ جائے۔''

''ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے ملک صاحب!'' بڑے چودھری نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا آپ کو فرید پور والے وقوعہ سے بھی سو روپے والے نوٹ کا کوئی ٹکڑا ملا ہے۔ میرا مطلب ہے اس ٹکڑے کا دوسرا حصہ؟''

''نہیں چودھری صاحب!'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''فرید پور والے وقوعہ کی کارروائی کے وقت تو دن کی روشنی موجود تھی لیکن اس کچے راستے کے آس پاس یا کھیتوں کے اندر ہمیں ایسی کوئی شے نہیں ملی البتہ ان دونوں خونیں وارداتوں میں کئی ایک چیزوں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔''

''مثلاً کون سی چیزیں؟'' چھوٹے چودھری نے سوال اٹھایا۔

''فرید پور والی واردات میں عروج، مشتاق اور کوچوان اللہ دتا کو تانگے پر ہی موت کے گھاٹ اتارا گیا لیکن ان کی لاشوں کو کچے راستے کے کنارے پھینک کر تانگے کو کھیتوں کے اندر پہنچا دیا گیا۔'' میں نے نپے تلے الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''سلیم احمد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے یعنی اسے کسی اور جگہ قتل کرنے کے بعد اس کی گردن کٹی لاش کو ٹھلی والے کھوہ کے نزدیک پھینک دیا گیا۔ کل میرے اسٹاف کے لوگ اس مقام کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے جہاں سلیم کی جان لی گئی ہے...... ان شاء اللہ!'' میں نے لحاتی توقف کرکے ان تینوں چودھریوں کے چہروں پر منڈلاتے غم و اندوہ کے بادلوں کا جائزہ لیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''فرید پور اور شیر گڑھ کے سانحات کا کوئی عینی شاہد ہے اور نہ ہی کسی نے وقوعات کے آس پاس کسی قسم کی کوئی

مشکوک سرگرمی ٹوٹ کی۔ فرید پور والی لاشیں ایک کھیت مزدور کرامت علی نے دریافت کیں اور سیدھا اپنی حویلی پہنچ کر اس سانحے کی اطلاع دی۔ کرامت علی ہی کی طرح کا کردار شیر گڑھ میں فیکا تیلی نے ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان دونوں لرزہ خیز وارداتوں میں تیز دھار برچھوں، بھالوں، خنجروں اور نیزوں وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے لیکن حملہ آور اتنے تجربہ کار اور پیشہ ور قاتل تھے کہ کہیں بھی کسی آلۂ قتل کو چھوڑ کر نہیں گئے۔ یہ میں لمحۂ موجود تک کی تفتیش کی بات کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کل دن کی روشنی میں شیر گڑھ والے وقوعہ سے کوئی آلۂ قتل پولیس کے ہاتھ لگ جائے اور سب سے اہم نکتہ......!" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک طویل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے پُرذوق الفاظ میں کہا۔

"ان دونوں وارداتوں میں ایک ہی خاندان کو ٹارگٹ کر کے اس کی آئندہ نسل کا خاتمہ کر دیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قاتلوں کا تعلق آپ ہی کے دشمنوں سے ہے۔"

میں اپنی کہہ کر خاموش ہوا تو چودھری برادران گہری اور پُرتفکیر سوچ میں ڈوب گئے۔ چودھری سمیع اللہ کے چہرے پر بھی ہر جگہ تشویش اور دکھ کی ہی حکمرانی تھی۔ چند لمحات کی گمبھیر خاموشی کے بعد چودھری یعقوب احمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب! میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ہمارا جو نقصان ہو چکا، اس کی تلافی یا مداوا تو کسی بھی قیمت پر ممکن نہیں ہے لیکن آپ کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اس واقعے کے ذمے داروں کو انصاف کے کٹہرے میں لا کر انہیں عبرتناک سزائیں دلوا سکیں۔ ان کی ہلکی سے ہلکی سزا بھی بھیانک موت کی صورت ہونا چاہیے تاکہ ہمارے سینوں میں بھڑکی ہوئی آگ کی تپش میں کسی قدر کمی واقع ہو۔"

"یہ میرا آپ لوگوں سے وعدہ ہے کہ مجرم بہت جلد میرے تھانے کی حوالات میں بند ہوں گے۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "وہ سفاک درندے کسی بھی حال میں عبرتناک سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔"

ان لوگوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں انہیں انصاف کی قوی امید دلا کر وہاں سے واپس آ گیا۔ جب میں تھانے پہنچا تو ٹھنڈی ٹھار رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

تھانے کا عملہ میری راہ دیکھ رہا تھا۔ کانسٹیبل محمد ہاشم تو تھانے کے باہر ہی مل گیا۔ مجھے تانگے سے اترتا دیکھ کر وہ فوراً میرے نزدیک آ گیا۔ جب میں چودھری یعقوب کے ساتھ موضع شیر گڑھ کے لیے روانہ ہو رہا تھا تب تک ہاشم سرکاری اسپتال سے واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاشم! کیا تمہارے جثے میں بہت زیادہ گرمی بھر گئی ہے جو اس سردی میں تھانے کے سامنے چہل قدمی کر رہے ہو؟"

"ایسا نہیں ہے ملک صاحب!" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے سوال کیا۔ "تو پھر کیسی بات ہے؟"

"مجھے آپ کو کچھ دکھانا اور کچھ بتانا ہے۔" وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ "اور......آپ سے معافی بھی مانگنا ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے تھانے کے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے ایسا کیا کر دیا ہے جس کے لیے معافی مانگنے کی ضرورت پیش آ گئی؟"

"مجھ سے ایک بھول ہو گئی ہے ملک صاحب!" وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں دراصل لالچ میں آ گیا تھا اس لیے میں نے آپ سے کچھ چھپا لیا تھا۔"

"بجھارتیں کیوں ڈال رہے ہو ہاشم!" میں نے اسے گھورا۔ "جو بھی کہنا ہے، سیدھے اور صاف الفاظ میں کہہ ڈالو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے سچی اور کھری بات پسند ہے؟"

"میں آپ کی اس عادت سے واقف ہوں ملک صاحب اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ میری خطا کو معاف کر دیں گے۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "جب آپ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھیں گے تو دوسرے لوگ آپ کو گھیر لیں گے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ یہیں پر میری بات سن لیں۔"

ہاشم کے متذبذب اصرار میں کچھ ایسا موجود تھا کہ میں نے اس کی بات مان لی اور معتدل انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، میں سن رہا ہوں۔ تم بولنا شروع کرو۔"

"آج سہ پہر میں جب میں فرید پور والے وقوعہ کا جائزہ لے رہا تھا تو مجھے تانگے کے اندر سے سو روپے والے نوٹ کا آدھا حصہ ملا تھا۔" اس نے نہایت ہی سادگی سے بتانا شروع کیا تو میرے دماغ کو گیارہ ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا۔ "میں نے اس خیال سے وہ آدھا نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا کہ کل میں کسی وقت ادھر جاؤں گا اور اس نوٹ کے دوسرے حصے کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ جانتے ہیں یہ رقم میری دو ماہ کی تنخواہ کے برابر ہے اسی لیے میرے دل میں لالچ آ گیا تھا لیکن جب میں تین لاشوں کے ساتھ جائے واردات سے اسپتال کی طرف جا رہا تھا تو میرے ضمیر نے ملامت کی کہ میں نے یہ بات آپ سے کیوں چھپالی۔

بہرحال جب میں ان لاشوں کو اسپتال پہنچا کر واپس تھانے آیا تو آپ شیر گڑھ کے لیے نکل چکے تھے۔ تب سے میں ادھر ادھر ٹہل کر آپ کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔''

محمد ہاشم کو خبر نہیں تھی کہ اس نے اپنی معافی کی ''درخواست'' میں مجھے کتنی بڑی خوشخبری سنادی تھی۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔

''نوٹ کا وہ ٹکڑا اس وقت کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے جناب!'' وہ اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی اس آدھے نوٹ کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔''

آئندہ پندرہ سیکنڈ میں سو روپے والے نوٹ کا وہ آدھا حصہ میرے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ جو آدھا نوٹ چودھری اسحاق نے بڑی حویلی میں مجھے دیا تھا، اس کا نمبر میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ میں نے ہاشم کے دیے ہوئے آدھے نوٹ پر نگاہ ڈالی تو اس امر کی تصدیق ہوگئی، یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی نوٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے اس ٹکڑے کو بھی اپنی جیب کے اندر اس سے بچھڑے ہوئے ٹکڑے کے پاس پہنچانے کے بعد ہاشم کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''میں تمہارے اس لالچ کو ایک بشری کمزوری جان کر تمہیں دل سے معاف کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے ضمیر کی آواز پر دھیان دیا اور مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ یہ عمل تمہیں ایک اچھا انسان ثابت کرتا ہے۔''

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے اضطراری آواز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''ملک صاحب! کیا آپ نے واقعی مجھے معاف کر دیا ہے؟''

''ہاں، بالکل۔'' میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تمہیں چند ایک باتوں کا خیال رکھنا ہے۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے فدویانہ انداز میں بولا۔ ''آپ حکم کریں ملک صاحب!''

''تم پچھلے دس منٹ سے مجھے گھیرے کھڑے ہو۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تھانے میں موجود عملے کے دوسرے افراد کے ذہنوں میں یقیناً کھلبلی مچی ہوگی کہ آخر ہمارے درمیان کون سے راز و نیاز چل رہے ہیں۔ اپنے دماغ میں بٹھالو کہ وہ راز و نیاز کچھ اس طرح ہیں......!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''آج فرید پور والے وقوعہ سے تمہیں سو روپے والے نوٹ کا آدھا حصہ ملا تھا جسے تم نے اپنی جیب میں رکھ لیا پھر میں نے تمہیں لاشوں کے ساتھ اسپتال روانہ کر دیا اور تم مجھے اس آدھے نوٹ کے بارے میں بتانا بھول گئے۔ اس وقت تم نے بے حد معذرت کے ساتھ وہی آدھا نوٹ میرے حوالے کیا ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''یہ سب تو صد فیصد سچائی پر مبنی ہے ملک صاحب!'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''بس، آپ نے میرے لالچ اور ضمیر کی ملامت کو اس کہانی سے نکال دیا ہے۔''

''تم بھی اپنے من میں سے لالچ کے جذبے کو نکال باہر کرو ہاشم!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس طرح ضمیر کو ملامت کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی اور تمہارا دل و دماغ ہر وقت امن و آشتی کا گہوارہ بنا رہے گا۔''

وہ ممنونیت بھری آواز میں بولا۔ ''ملک صاحب! میں آپ کی اس سیکھ کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''شاباش۔'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''اب تم جا کر میرے لیے گرما گرم کھانے کا بندوبست کرو۔ مجھے بہت زور کی بھوک محسوس ہو رہی ہے اور ہاں......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''میرے کوارٹر کے اندر ایلومینیم کے ایک ڈبے میں گاجر کا باداموں والا حلوا رکھا ہوا ہے، ذرا اسے بھی گرم کر لینا۔ اس وقت مجھے اضافی توانائی کی ضرورت ہے اور یہ حلوا اس مقصد کے لیے رسائن کا درجہ رکھتا ہے۔''

''میں چند منٹ کے اندر آپ کے حکم کی تعمیل کر دوں گا ملک صاحب!'' وہ توانا لہجے میں بولا۔

اس کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا اور حوالدار نبی بخش اور اے ایس آئی قادر علی کو بھی وہیں بلالیا۔ فرید پور سے واپسی پر میری ان سے تفصیلی بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ دونوں میرے بعد اس تھانے میں سینئر تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں دونوں وقوعہ جات کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد سو روپے والے کرنسی نوٹ کے دونوں حصوں کو ان کے سامنے رکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں سوال کیا۔

''آپ لوگ قاتلوں کی اس ''پالیسی'' کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''ایک بات تو طے ہے ملک صاحب!'' حوالدار نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ مجرم بہت مالدار ہیں اسی لیے سو روپے والے نوٹ کو بے دردی سے پھاڑ کر اِدھر اُدھر پھینک دیتے ہیں ورنہ ان چونچلوں کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔''

''میرا دھیان چند سال پہلے والے ایک واقعے کی طرف جارہا ہے۔'' اے ایس آئی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان دنوں میں خانیوال کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ اس علاقے میں ایک خطرناک کرائے کا قاتل یوسف عرف یوسی ہوا کرتا تھا۔ وہ بھاری معاوضے پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا کرتا تھا اور جائے وقوعہ پر کرنسی نوٹ کا ایک حصہ چھوڑ جاتا تھا۔ اس کی یہ ادا کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ حتیٰ کہ پولیس والے بھی اس سے اس قدر نالاں تھے کہ اس کے حرام موت مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے کیونکہ ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ ان کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ وہ کڑے سے کڑے پہرے میں بھی اپنے مطلوبہ بندے کا شکار کر کے غائب ہوجاتا تھا پھر ایک روز وہ بالکل ہی غائب ہوگیا۔ وہ کہاں چلا گیا؟ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جان سکا۔ رفتہ رفتہ پولیس والے اور دوسرے لوگ کانے یوسی کو بھول گئے۔ یہی سوچ لیا گیا کہ وہ کسی اندھی قبر میں جا سویا ہے۔''

''تم نے ابھی یوسی (یوسف) کے نام کے ساتھ لفظ ''کانا'' بھی استعمال کیا ہے۔'' اے ایس آئی کے خاموش ہونے پر میں نے سوال اٹھایا۔ ''کیا اس سفاک اور بے رحم قاتل کی ایک آنکھ میں کوئی خرابی تھی؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کی ایک آنکھ بے نور تھی اسی لیے اسے ''کانا یوسی'' بھی کہا جاتا تھا۔''

''کیا کبھی تمہارا اس سے سامنا ہوا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''میرا مطلب ہے تم نے اسے روبرو دیکھا تھا؟''

''نہیں ملک صاحب!'' اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''میں نے صرف اس کے بارے میں سنا ہی تھا۔ اسے دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔''

''اور تم یہ سمجھتے ہو کہ وہی کانا یوسی اب ہمارے علاقے میں سرگرم عمل ہوگیا ہے؟'' حوالدار نے اے ایس آئی کی طرف دیکھتے ہوئے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور ان دونوں وارداتوں میں اسی کا ہاتھ ہے؟''

''میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' وہ حوالدار کی چوٹ پر برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ملک صاحب کے سنائے ہوئے آدھے نوٹوں والے واقعے کے حوالے سے یوسی کا ذکر کیا ہے۔ مجھے نہیں امید کہ وہ اب زندہ بھی ہو۔ ورنہ اتنے عرصے تک وہ چپ بیٹھنے والا نہیں تھا۔''

میں اے ایس آئی اور حوالدار کی باہمی چپقلش اور مسابقت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ خود کو دوسرے سے برتر ثابت کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں میں سے بڑے بڑے کیڑے نکال کر تو تکار پر اتر آتے تھے۔ قبل اس کے کہ ان کے بیچ کوئی نیا محاذ کھل جاتا، میں نے کہا۔

''تم لوگ آپس میں الجھنے کے بجائے میری بات دھیان سے سنو۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ تم دونوں نے کل کون کون سا کام انجام دینا ہے۔''

وہ میری طرف متوجہ ہوگئے۔

''قادر علی!'' میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کل صبح کسی کانسٹیبل کو ساتھ لے کر شیر گڑھ والے وقوعہ پر جاؤ گے اور وہاں سے کوئی اہم سراغ تلاش کرنے کی کوشش کرو گے۔ تمہاری خصوصی کھوج آلۂ قتل کے حوالے سے ہوگی۔''

''سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے فرمانبرداری سے بولا۔ ''میں آپ کی امید پر پورا اتروں گا...... ان شاء اللہ!''

''اور تم......!'' میں نے روئے سخن حوالدار کی جانب موڑتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''کل کا پورا دن تم نے یہاں موجود رہ کر تھانیداری کرنا ہے...... مکمل چوکسی اور ذمے داری کے ساتھ۔''

''جو آپ کا حکم ملک صاحب!'' وہ ہشاش بشاش لہجے میں بولا اور پوچھا۔ ''کیا آپ کل کہیں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''ہاں، بالکل۔'' میں نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ ''میں آپ لوگوں کو اس کیس کے تمام پہلوؤں سے مکمل طور پر آگاہ کر چکا ہوں۔ میں کل صبح ''پنڈ گوندلاں والا'' جا رہا ہوں، چودھری یعقوب احمد کے سیاسی حریف احمد نواز گوندل کا ''انٹرویو'' کرنے۔ سردست ہمارے شک کے دائرے میں اس بندے کے سوا اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کانسٹیبل محمد ہاشم نے کمرے میں داخل ہو کر اطلاع دی۔ ''ملک صاحب! میں نے آپ کے کوارٹر میں گرما گرم کھانا لگا دیا ہے۔''

''تم لوگ آرام کرو کیونکہ کل کا دن بہت لمبا ہونے والا ہے۔'' میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''پیٹ ناں پیاں روٹیاں، تے سبے گلاں کھوٹیاں!''

☆☆☆

شیر گڑھ، فرید پور، جمال نگر اور منظور کوٹ کی طرح پنڈ گوندلاں والا بھی میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ یہ گاؤں

شیر گڑھ سے مشرق میں لگ بھگ آٹھ میل کے فاصلے پر واقع تھا جبکہ میرے تھانے سے اس کی سمت انتہائی شمال مغرب اور دوری کم و بیش دس میل تھی۔ میں کانسٹیبل جاوید کی معیت میں جب پنڈ گوندلاں والا پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی اور میرا مطلوبہ بندہ احمد نواز گوندل کہیں جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

اس نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور مجھے عزت و احترام کے ساتھ اپنی حویلی کے اندر لے گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''گوندل صاحب! کہاں جانے کی تیاری ہے؟''

''ملک صاحب! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انتخابی مہم کا آغاز ہو چکا ہے۔'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اسی سلسلے میں آج کل کہیں نہ کہیں جانا لگا ہی رہتا ہے۔ ویسے اس وقت میرا موضع شیر گڑھ جانے کا ارادہ تھا۔ مجھے پتا چلا ہے وہاں کے دو چودھری برادران کے ساتھ کوئی افسوسناک واقعہ پیش آ گیا ہے۔ میں ان دونوں کے بچوں کی المناک اموات کی تعزیت کے لیے وہاں جا رہا تھا۔''

اس نے دانستہ یا نادانستہ چودھری یعقوب اور اس کے چھوٹے بھائی چودھری اسحاق کا نام نہیں لیا تھا۔ میں سردست کوئی اندازہ قائم نہ کر سکا کہ یہ ایک اتفاقی عمل تھا یا اس میں احمد نواز گوندل کی بدنیتی چھپی ہوئی تھی۔

''گوندل صاحب! ان چودھری برادران میں سے ایک اس الیکشن میں آپ کا سیاسی حریف بھی ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں چودھری یعقوب احمد کی بات کر رہا ہوں جناب جس کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ وہ کبھی الیکشن ہارا نہیں ہے۔''

''ملک صاحب! ہار جیت تو مقدر کا کھیل ہے۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''کسی انسان کا نصیب کس وقت چمک اٹھے یا کب دغا دے جائے، اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کوئی فارمولا نہیں کہ ایک شخص ہر میدان میں زندگی بھر فتح ہی حاصل کرتا رہے گا اور کسی بندے کے بارے میں دعوے سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے مقدر میں ازلی ابدی شکست ہی لکھوا کر اس دنیا میں آیا ہے۔ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں سرکار اور اللہ تو ان لوگوں کا بھی ہے جو اس کی ذات پر یقین نہیں رکھتے۔''

احمد نواز گوندل فربہ اندام ہونے کے باوجود بھی پُرتاثر اور دبنگ شخصیت کا مالک تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ وہ گفتگو مطلب، معقول اور پُرمغز گفتگو کے فن سے آشنا تھا۔ یہ اس سے میری پہلی ملاقات تھی اور اس کی بات چیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔

''آپ نے درست فرمایا گوندل صاحب!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اللہ سبھی کا ہے اور سبھی اس کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں۔ وہ اس بنا پر فیصلے نہیں کرتا کہ کون اسے کتنا مانتا ہے اور کون اس کے وجود سے انکاری ہے۔ یہ دنیا بقدر کوشش ہے۔ جو شخص جتنی کوشش کرتا ہے، اسے اس کی محنت کا اتنا پھل ضرور ملتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کی بھی محنت کو رائگاں نہیں جانے دیتا۔ ناانصافی اس کی شان کے خلاف ہے۔ بے شک وہ عزت اور ذلت کا مالک ہے۔''

''بس، سرکار! میں بھی محنت اور کوشش ہی تو کر رہا ہوں۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''باقی جو مالک کی مرضی۔ نتیجہ تو اسی کے ہاتھ میں ہے نا ملک صاحب!''

''بے شک۔'' میں نے دو ٹوک انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''گوندل صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے ''اس وقت میرا موضع شیر گڑھ جانے کا ارادہ تھا'' اور ''میں چودھری برادران کے بچوں کی المناک اموات کی تعزیت کے لیے وہاں جا رہا تھا'' جیسے جملے ادا کیے تھے۔ ماضی کا صیغہ ''تھا'' تو یہ بتاتا ہے کہ اب آپ نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا ہے۔''

''آپ پولیس والے ہیں نا اس لیے آپ الفاظ کو اس طرح گرفت میں لیتے ہیں جیسے کسی خطرناک مجرم کی گردن ناپ لی ہو۔'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ ''خیر، میں نے ابھی تک شیر گڑھ جانے کا ارادہ نہیں بدلا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ پہلی بار میری حویلی پر تشریف لائے ہیں اس لیے آپ کو پروٹوکول دینا بھی تو ضروری ہے نا۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ آپ یہاں ان دونوں خونریز واقعات کی تفتیش کرنے آئے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے آپ کی سماعت میں میرے خلاف بہت زہر انڈیلا ہوگا۔''

''ایسی بات نہیں ہے گوندل صاحب!'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''چودھری یعقوب احمد اور اس کے چھوٹے بھائی چودھری اسحاق احمد نے اپنے کسی دشمن کی نشاندہی کی ہے اور نہ ہی کسی شخص پر الزام لگایا ہے۔ میں روٹین کی پوچھ تاچھ کے لیے ہر اس جگہ جاؤں گا جہاں سے کوئی ایسا سراغ ہاتھ لگنے کی امید ہو جو مجھے چار افراد کے قاتلوں تک پہنچا دے۔ یقیناً آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کے پاس بھی اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔''

''ہوں......!'' اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تو آپ نے یہ طے کرلیا ہے کہ شیر گڑھ اور فرید پور میں پیش آنے والے دونوں افسوسناک واقعات کا ذمے دار کوئی ایک ہی شخص یا ایک ہی گروہ ہے اسی لیے آپ نے ''چار افراد کے قاتلوں'' کی بات کی ہے؟''

اسی دوران میں گوندل صاحب کے ملازمین نے ہمارے سامنے انواع و اقسام کا سامانِ خورونوش چن دیا تھا۔ گفتگو کے بیچوں بیچ ان اشیائے نعم سے بھی خاطر خواہ انصاف کیا جارہا تھا۔

''یہ میں نہیں، حالات و واقعات اور شواہد نے طے کیا ہے گوندل صاحب کہ ان دونوں وارداتوں کے پیچھے کسی ایک ہی پارٹی کا ہاتھ ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں مفروضوں پر اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کا قائل نہیں ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے ملک... صاحب!'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''آپ کن حالات و واقعات اور شواہد کی بات کررہے ہیں؟ کیا میں ان کے بارے میں جان سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں گوندل صاحب!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں آپ کے تعاون سے اس کیس کو حل کرنے کی نیت لے کر پنڈ گوندلاں والا آیا ہوں۔ آپ سے کچھ چھپانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!''

''یہ آپ کا بڑا پن اور میری عزت افزائی ہے ملک صاحب!'' وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ بتائیں، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے آلاتِ قتل و غارت گری، قاتلوں کی سفاکی و بے رحمی کے بارے میں بتانے کے بعد سو روپے والے کرنسی نوٹ کے دونوں حصوں کو اس کے سامنے رکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔

''ان میں سے ایک ٹکڑا فرید پور والے وقوعہ پر اور دوسرا ٹکڑا شیر گڑھ کے موقع واردات سے ملا ہے گوندل صاحب!''

کرنسی نوٹ کے دو ٹکڑوں پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ تو کانے یوسی کی واردات کا انداز ہے ملک صاحب!''

''کیا آپ یوسف عرف یوسی نامی اس قاتل کو جانتے ہیں؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''صرف نام کی حد تک۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''برسوں پہلے میں نے اس کا نام سنا تھا۔ خانیوال اور اس کے گردونواح میں اس کی بڑی دھوم تھی۔ وہ بھاری معاوضہ لے کر لوگوں کو قتل کیا کرتا تھا لیکن وہ تو کئی سال پہلے مرکھپ چکا۔ اب اگر اسی کے انداز میں نوٹ کا آدھا حصہ جائے وقوعہ پر چھوڑ کر قتل و غارت گری شروع کردی گئی ہے تو میں ان خونچکاں واقعات کے ذمے دار یا ذمے داران کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!''

احمد نواز گوندل کے چہرے کے تاثرات اور لب و لہجے میں موجود اعتماد کو دیکھتے ہوئے میرا پیشہ ورانہ تجربہ یہ بتاتا تھا کہ قتل کی حالیہ دو وارداتوں میں اس کا کوئی ہاتھ ہے اور نہ ہی وہ اس حوالے سے کسی قسم کی معلومات رکھتا ہے۔

''ٹھیک ہوگیا گوندل صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن آپ اس سلسلے میں میری راہنمائی فرماسکتے ہیں۔ شیر گڑھ کے چودھریوں سے ہزار اختلافات اور سیاسی رنجشوں کے باوجود میری طرح آپ کی بھی یہی خواہش ہوگی کہ چار افراد کی اذیت ناک اموات کے ذمے داروں کو کڑی سے کڑی سزا ملے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

''بالکل نہیں جناب! آپ سولہ آنے درست فرمارہے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ کوئی معمولی واقعات نہیں ہیں۔ میں آپ کی آسانی کے لیے چند اشارے دے سکتا ہوں۔ اگر آپ نے تھانیدارانہ سراغ رساں دماغ کا استعمال کیا تو بہ سہولت کسی کارآمد نتیجے تک پہنچ جائیں گے، اتنا مجھے یقین ہے۔''

''میں ہمہ تن گوش ہوں گوندل صاحب!'' میں نے کہا۔

''یہ بات پورا شیر گڑھ جانتا ہے کہ چودھری اسحاق کا اکلوتا بیٹا سلیم ایک عیاش طبع جوان تھا اسی لیے چودھری یعقوب نے اپنی بیٹی عروج کا رشتہ اسے نہیں دیا تھا اور اس کی شادی فرید پور کے چودھری خاندان میں کردی تھی۔''

احمد نواز گوندل نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے متحمل انداز میں بتایا۔ ''یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ چودھری یعقوب کا بیٹا مشتاق اپنے کزن سلیم کا گہرا دوست تھا۔ ان کے درمیان کوئی بھی راز، راز نہیں تھا کیونکہ بہت ساری بدفعلیوں میں وہ دونوں ایک ساتھ ہوا کرتے تھے۔ یہی مشتاق اپنی اکلوتی بہن عروج سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ عروج جو فرید پور کے چودھری سمیع اللہ کی بیوی تھی۔ ان کی شادی صرف چار ماہ ہی چل سکی۔''

یہاں تک بتانے کے بعد وہ یکلخت خاموش ہوگیا۔ چند لمحات کے بعد میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''تو اس سے کیا سمجھ میں آتا ہے؟''
''سمجھ میں تو اس وقت آئے گا جب آپ میری بات پر غور فرمائیں گے ملک صاحب!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اگر آپ نے ان چار کرداروں پر توجہ دی تو بہت جلد اس کیس کے معمے کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''
''مگر آپ نے جن چار کرداروں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے تین سلیم احمد، مشتاق احمد اور عروج سمیع اللہ تو لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''لیکن چوتھا کردار ابھی بقیدِ حیات ہے ملک صاحب!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اور اس کا نام، قتل ہونے والے ایک کردار کے ساتھ نتھی بھی ہے جیسا کہ آپ نے ابھی میرے سامنے ''عروج سمیع اللہ'' کا نام لیا ہے۔''
''آپ کے ان ذومعنی اور سنسنی خیز اشاروں سے میری سمجھ میں یہی آیا ہے کہ......'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر میں اپنی تفتیش فرید پور کی اُچی حویلی تک محدود کردوں تو کامیابی کے امکانات روشن ہیں؟''
''میں ایسا سمجھتا ہوں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے ملک صاحب!'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''ویسے میں ہر حال میں آپ کی سرخروئی کے لیے دعاگو ہوں۔''
''آپ کے اس خلوص اور اپنائیت کے لیے میں تہِ دل سے مشکور ہوں گوندل صاحب!'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''ان شاء اللہ بہت جلد ملاقات ہوگی۔''
''ان شاء اللہ!'' وہ توانا لہجے میں بولا۔ ''اگر مجھے شیر گڑھ کی طرف نہیں جانا ہوتا تو میں آپ کو شام تک ضرور یہاں روک لیتا۔''
''بہت شکریہ گوندل صاحب!'' میں نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا اور حویلی سے نکل آیا۔
احمد نواز گوندل نے اشاروں، کنایوں میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ واپسی کے سفر کے دوران میں، میں اس کی معنی خیز باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے مسلسل خاموش اور کسی گمبھیرتا میں ڈوبا دیکھ کر کانسٹیبل جاوید نے کہا۔
''ملک صاحب! میں نے جیسا سوچا تھا، اس کے بالکل الٹ ہوا ہے۔''
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''جاوید! تم نے ایسا کیا سوچ لیا تھا؟''
''میرا خیال تھا کہ آپ گوندل صاحب کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آئیں گے۔'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن آپ نے تو اس سے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھ گچھ کی ہے۔''
''میری ایک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو جاوید!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''قانون ہر چھوٹے بڑے، طاقتور اور کمزور، اعلیٰ و ادنیٰ کے ساتھ مساوات کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے کہ قانون کی نظر میں تمام انسانوں کے حقوق اور فرائض مساوی ہیں اور اسی قانون کا تقاضا ہے کہ بغیر ٹھوس ثبوت کے محض شک کی بنیاد پر کسی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ باقی جہاں تک گوندل صاحب سے میرے دوستانہ رویّے کی بات ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''اسی دوستانہ رویّے اور اپنائیت بھرے انداز کی بدولت میں نے اس کی زبان سے بڑی کارآمد باتیں اگلوائی ہیں جو آگے چل کر میرے بہت کام آئیں گی۔''
''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہر پولیس والا آپ کے انداز میں نہیں سوچتا۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ہم بے بس، لاچار اور کمزور لوگوں کو بغیر کسی سمن یا وارنٹ کے ہی محض شک کی بنیاد پر گرفتار کر کے نہ صرف حوالات میں بند کر دیتے ہیں بلکہ ان کی زبان کھلوانے کے لیے سو سو تفتیشی ''جتن'' بھی کرتے ہیں۔''
''چند عاقبت نااندیش اہلکاروں کے اس غیر ذمے دارانہ فعل کے باعث پورے ڈیپارٹمنٹ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ کالی بھیڑیں تو ہر محکمے میں پائی جاتی ہیں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''بہرکیف، تم نے پولیس کے جس عمومی رویّے کا ذکر کیا ہے، وہ میرے نزدیک بہت افسوسناک اور قابلِ مذمت ہے۔''
وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کے ساتھ کام کر کے بہت کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے۔''
میں نے کانسٹیبل جاوید کی بات پر دھیان نہیں دیا اور دوبارہ احمد نواز گوندل کی باتوں پر غور کرنے لگا۔

☆☆☆

پندرہ فروری کا آغاز بڑے سنسنی خیز انداز میں ہوا تھا۔ پچھلی رات جب میں پنڈ گوندلاں والا سے واپس آیا تو میرا ذہن خاصا الجھا ہوا تھا۔ احمد نواز گوندل کی مبہم مہمل اور گول مول باتوں کے اندر کئی ایک سربستہ راز چھپے ہوئے تھے۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ جو بھی کہا تھا، میں نے اسے ہلکا نہیں لیا تھا اور رات سوتے وقت بھی اس کے

اشارے اور کنایے میری سوچ کے اندر گردش کرتے رہے تھے اور صبح جب مقتولین کی پوسٹ مارٹم شدہ لاشیں اسپتال سے تھانے پہنچیں تو ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

میں نے فرید پور اور شیر گڑھ اپنے بندوں کو بھیج کر دونوں متاثرہ خاندانوں کو تھانے بلا لیا تھا۔ مذکورہ لاشیں تھانے کے صحن میں ڈھکی رکھی تھیں اور چودھری صاحبان میرے کمرے میں موجود ایک نئی بحث چھیڑے بیٹھے تھے۔ چودھری یعقوب احمد نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! سلیم، اسحاق کا بیٹا ہے اور مشتاق و عروج دونوں میری اولادیں ہیں لہٰذا ان تینوں کی لاشیں ہم دونوں بھائی اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ ان کی تدفین شیر گڑھ کے قبرستان میں ہو گی۔''

چودھری اسحاق نے بڑے بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''بھائی جان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب! آپ یہ تینوں لاشیں ہمارے حوالے کر دیں تو بہت مہربانی ہو گی جناب کی۔''

''ہم نے کب کہا کہ عروج آپ کی بیٹی نہیں ہے یعقوب چاچا!'' چودھری سمیع اللہ نے اپنے سسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ آپ کی بیٹی ہونے کے علاوہ میری منکوحہ بھی تھی۔ عروج کی لاش تو فرید پور کے قبرستان ہی میں دفن ہو گی۔ آپ سلیم اور مشتاق کی لاشوں کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ ہم عروج اور اللہ دتا کی لاشیں اٹھا لیتے ہیں۔''

سمیع اللہ کی تجویز معقول اور وزن دار تھی لیکن چودھری یعقوب احمد نے برہمی بھرے لہجے میں کہا۔

''برخوردار! میں نے عروج کو پورے تیئس سال تک اپنے جگر کا حصہ بنا کر پالا تھا اور تمہاری شادی کو صرف چار ماہ ہوئے ہیں۔ تم میری بیٹی کی لاش کے دعوے دار نہ ہی بنو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ ہم ہر قیمت پر اس کی لاش کو شیر گڑھ لے کر ہی جائیں گے۔''

''میرا دعویٰ غلط یا جھوٹا نہیں ہے چاچا جان!'' سمیع اللہ نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''وہ ہر صورت میں میری بیوی تھی اور یہ حق مجھے قانون اور شریعت نے دیا ہے۔ اس کی لاش کا واحد وارث صرف اور صرف میں ہی ہوں۔''

''میں اور بھائی جان تو اپنی اولادوں سے یکسر محروم ہو چکے ہیں۔'' چودھری اسحاق نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چنانچہ ہمیں کسی اچھے بُرے نتیجے کی قطعاً کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر تم اپنی ضد پر اڑے رہے تو تیسرا خونریز واقعہ اس تھانے کے گرد و نواح میں بھی رونما ہو سکتا ہے۔''

چودھری اسحاق احمد نے تھانے میں بیٹھ کر میرے سامنے چودھری سمیع اللہ کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔ یہ سیدھی سیدھی میرے معاملات میں دخل اندازی تھی۔ قبل اس کے کہ میں اپنے اختیارات کا استعمال کر کے چودھری اسحاق کے دماغ کے کیڑے جھاڑتا، چودھری حفیظ اللہ نے پہلی بار اس تلخ و ترش بلکہ فساد برپا گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔

''سمیع اللہ! بڑوں کے ساتھ زبان نہیں لڑاتے۔ تمہارے چاچا چودھری یعقوب احمد بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ عروج کی لاش پر انہی کا حق بنتا ہے۔'' پھر وہ براہِ راست اپنے سمدھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''چودھری صاحب! آپ دونوں بھائیوں نے اپنی جوان اولاد کو کھویا ہے۔ میں آپ لوگوں کے دکھ درد کو سمجھ اور محسوس کر سکتا ہوں۔ آپ سمیع اللہ کی جذباتی باتوں کا بُرا نہ منائیں اور عروج کی لاش کو اپنے ساتھ شیر گڑھ لے جائیں۔ ہمیں جب بھی عروج بیٹی کی یاد آئے گی، ہم شیر گڑھ جا کر اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کر لیا کریں گے۔ اسی بہانے آپ لوگوں سے بھی ملاقات ہو جایا کرے گی۔''

چودھری حفیظ اللہ نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک متوقع اور سر پر منڈلاتی ہوئی خونریز جنگ کو شروع ہونے سے پہلے ہی روک لیا تھا۔ اس دانش مندی اور بردباری پر میں اسے ستائشی نظر سے دیکھنے لگا۔ علاوہ ازیں چودھری سمیع اللہ کی فرمانبرداری بھی لائقِ تحسین تھی۔ اس نے اپنے باپ کے فیصلے کے سامنے ایک لفظ نہیں کہا اور خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ اگرچہ اپنے اندر غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن اس نے کسی جھنجلاہٹ یا خفگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

آئندہ ایک گھنٹے کے اندر دونوں پارٹیاں اپنے اپنے حصے کی لاشیں اٹھا کر تھانے سے رخصت ہو گئیں تو میں نے اے ایس آئی قادر علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر مجھے سلام کیا اور میرے اشارے پر کرسی سنبھال لی۔

''قادر علی! وہ لوگ تو اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھا کر چلے گئے ہیں لیکن ہمارا اصل کام تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے فرید پور والے وقوعہ سے کچھ خاص ملا اور نہ ہی تم نے شیر گڑھ والے وقوعہ کے حوالے سے کوئی خوشخبری سنائی ہے۔ متاثرین تو اپنی اولادوں کو دفنانے کے بعد ان کی مغفرت اور اگلی زندگی

کی آسانی کے لیے دعاؤں اور قرآن خوانی وغیرہ میں معروف ہوجائیں گے لیکن ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھ نہیں سکتے۔ ہمارے پیشہ ورانہ فرائض کا تقاضا تو یہی ہے کہ ہمیں ان افسوسناک واقعات کے ذمے داروں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دلوانا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنے کام کا آغاز کہاں سے کریں؟ سرِدست ہمارے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"میں آپ کی بات کو سمجھ سکتا ہوں ملک صاحب!" میرے خاموش ہونے پر اے ایس آئی نے معتدل انداز میں کہا۔"میں سمجھتا ہوں ہم بالکل بھی خالی ہاتھ نہیں ہیں۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

"دونوں وقوعہ جات سے ہمیں سو روپے والے کرنسی نوٹ کے جو دو حصے ملے ہیں، ہم ان کی مدد سے تفتیش کا آغاز کرسکتے ہیں۔" وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔

"وہ ایک بُھلاوے کے سوا کچھ نہیں ہے قادر علی!" میں نے کہا۔"کسی نے ہماری تفتیش کو غلط رخ پر ڈالنے کے لیے وہ چال چلی ہے اور وہ "کسی" یقیناً ان واقعات کا ذمے دار ہی ہے۔ اس موضوع پر احمد نواز گوندل سے میری کھل کر بات ہوچکی ہے۔ وہ بھی یوسی کانا کو جانتا ہے اور اس کے مطابق مذکورہ خطرناک قاتل برسوں پہلے اس دنیا سے رخصت ہوچکا ہے۔ اس کے انداز کی ہوبہو نقل کرنے والا، چار افراد کی بہیمانہ اموات کا ذمے دار گروہ بہت ہی شاطر اور عیار ہے۔ اس نے ہمیں ایک بند گلی میں لا کھڑا کردیا ہے لیکن میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنا ابھی باقی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے اندر سے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور نکلے گا جو ہماری تفتیش کے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔"

"ان شاء اللہ ملک صاحب!" وہ پُروثوق انداز میں بولا۔

پھر ہمارے درمیان انہی خونچکاں واقعات اور چودھری برادری کے رویّوں کے حوالے سے بات ہونے لگی۔ جب قادر علی کو چودھری حفیظ اللہ کے فیصلے کا علم ہوا تو اس نے کہا۔

"ملک صاحب! یہ بندہ بہت گہرا لگتا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کے مطالبے کی حمایت نہ کر کے شیر گڑھ کے چودھریوں کا دل جیت لیا ہے ورنہ آپ نے گرماگرمی کی جو صورتِ حال بتائی ہے، اس میں خون خرابا تو لازمی تھا۔"

"میں اپنے سامنے تو انہیں کسی بھی قیمت پر اس کھلی قانون شکنی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔"اگر چودھری یعقوب احمد اور اس کا برادر خورد ایسی کسی حماقت کا ارتکاب کرتا تو میں مطلق بھول جاتا کہ انہوں نے اولاد کے حوالے سے کتنا بڑا صدمہ اٹھایا ہے۔ میں انہیں پکڑ کر حوالات میں بند کردیتا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ ویسے یہ ماننا پڑے گا کہ چودھری سمیع اللہ نے انتہائی جائز اور حق کی بات کی تھی۔ عروج کی لاش اسے ملنا چاہیے تھی۔ اس لاش کا حقیقی وارث وہی تھا۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب!" اے ایس آئی تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن شکر گڑھ والے چودھری برادران، مقتولہ عروج کی لاش اس کے سسر چودھری حفیظ اللہ کے ایما اور اجازت سے لے کر گئے ہیں۔ اگر وہ کوئی زورزبردستی کرتے تو وہی آپ والی بات...... ہم بھی انہیں بتادیتے کہ تھانے کی طاقت کیا ہوتی ہے۔ ہم یہاں پر قانون نافذ کرنے کے لیے بیٹھے ہیں۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے یا اس کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ کسی رورعایت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے اے ایس آئی کے خیالات اور عزائم پر صاد کیا اور ان واقعات کے دیگر پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

اسی سہ پہر جب میں عصر کی نماز سے فارغ ہوا تو سرکاری اسپتال سے پوسٹ مارٹم کی رپورٹس آگئیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح تھی۔

شیر گڑھ والے وقوعہ کے مطابق، مقتول سلیم احمد کی موت تیرہ فروری کی سہ پہر تین سے چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اسے کسی تیز دھار آلے کی مدد سے گلا کاٹ کر فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ میں اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس نے شراب کی بھاری مقدار اپنے معدے میں اتار رکھی تھی۔ گویا احمد نواز گوندل کی مقتول کے بارے میں رائے غلط نہیں تھی۔ مرحوم بہت ساری عاداتِ بد کا حامل تھا۔

فرید پور والے وقوعہ سے ملنے والی تینوں لاشوں کے وقتِ موت میں بمشکل پانچ سے دس منٹ کی کمی بیشی تھی۔ مجموعی طور پر عروج، مشتاق اور اللہ دتا نے تیرہ فروری کی صبح دس سے بارہ بجے کے درمیان اس دنیا کو خیرباد کہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹس کے ساتھ ہی ان کے لیبارٹری ٹیسٹ وغیرہ کے تجزیے بھی موجود تھے۔ مشتاق اور اللہ دتا کی ٹیسٹ رپورٹس میں تو مجھے کچھ خاص نظر نہ آیا لیکن عروج کی

لیبارٹری رپورٹ دیکھ کر میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور میں بقول کسے، چکرا کر رہ گیا۔ مذکورہ رپورٹ میں میرے ہوش اڑانے والی صرف ایک لائن تھی...... عروج تین ماہ کی حاملہ تھی۔

گزشتہ تین روز میں چودھری سمیع اللہ سے میری کئی بار بات ہوئی تھی لیکن اس نے ایک مرتبہ بھی عروج کے پیٹ سے ہونے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ان دونوں کی شادی کو صرف چار ماہ ہوئے تھے اور لیبارٹری ٹیسٹ کے مطابق عروج پچھلے تین ماہ سے ایک زندگی کو اپنے رحم میں لیے گھوم پھر رہی تھی۔ یہ اتنی بڑی خوشخبری تھی کہ اسے سب سے پہلے اس بچے کے باپ کو آگاہ کرنا چاہیے تھا۔

اگر عروج نے اپنے حاملہ ہونے کے بارے میں سمیع اللہ کو بتا رکھا تھا اور سمیع اللہ یا حفیظ اللہ نے مجھ سے ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا تو اس میں خرابی یا پریشانی والی کوئی بات نہیں تھی لیکن اگر وہ دونوں باپ بیٹا اُچی حویلی کے اگلے وارث کی آمد سے بے خبر تھے تو اس کا ایک ہی مطلب نکلتا تھا اور وہ یہ کہ...... عروج نے دانستہ اس خبر کو ان سے چھپایا تھا۔ اگر عروج نے دانستہ ایسا کیا تھا تو اس کی پراسرار دروغ گوئی کی وجوہ تک رسائی حاصل کرنا مجھ پر واجب ہو گیا تھا اور اس مقصد کے لیے میرا اُچی حویلی جانا ضروری تھا۔

چودھری حفیظ اللہ اور چودھری سمیع اللہ تو رہ گئے ایک طرف، مجھے تو شیر گڑھ کے چودھریوں خصوصاً چودھری یعقوب احمد کے رویّے پر شدید حیرت ہو رہی تھی۔ جب بھی کوئی عورت امید سے ہو جاتی ہے تو وہ یہ خوشخبری سب سے پہلے دو افراد کو سناتی ہے۔ نمبر ایک، اپنے شوہر اور اس کے بچے کے باپ کو۔ نمبر دو، اپنی ماں کو۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ عروج کی ماں ممتاز بی بی کو اپنی بیٹی کے حاملہ ہونے کی خبر ہو اور اس نے اپنے کدخدا کو نہ بتایا ہو۔ کدبانو اور کدخدا تو ایک گاڑی کے دو پہیے اور ایک دوسرے کے رازدار ہوتے ہیں۔

☆☆☆

سولہ فروری کی صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اے ایس آئی قادر علی کو اپنے ساتھ لیا اور ہم دونوں تھانے سے اُچی حویلی کی جانب روانہ ہو گئے۔ آج سردی قدرے کم اور موسم کھلا ہوا خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ قادر علی کو اپنے ہمراہ لے کر جانے کا میرا ایک خاص مقصد تھا۔ اسے مجھ سے اکثر یہ شکایت رہتی تھی کہ میں اسے کانسٹیبلز وغیرہ کے ساتھ تو مختلف قسم کی محکمہ جاتی کارروائیوں کے لیے اِدھر اُدھر بھیجتا رہتا ہوں لیکن کسی مشن میں بھی میں نے اسے اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ سو، اس کا دیرینہ شکوہ دور کرنے اور اس کی دلی خواہش کو پورا کرنے کی نیت سے میں نے اسے اپنے ساتھ اُچی حویلی لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''قادر علی!'' میں نے راستے میں اس سے پوچھا۔ ''اب تو تم خوش ہو نا؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے جناب کہ جونیئر اہلکاروں کے ساتھ کام کر کے کچھ نیا سیکھنے کو نہیں ملتا اور اس تھانے میں مجھ سے سینئر صرف آپ ہی ہیں۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔''

''ہاں، بالکل۔ میں سمجھ گیا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اب اس فلسفے کا دوسرا پہلو بھی دیکھو قادر علی! تم اتنا تو جانتے ہی ہو کہ ہر چیز کے کم از کم دو رخ یا دو زاویے لازمی ہوتے ہیں۔ میں نے کم از کم کی بات کی ہے اور زیادہ سے زیادہ کا تعین کرنے کے لیے اس معاملے کی نوعیت کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔''

''ملک صاحب! آپ کہہ تو بالکل ٹھیک رہے ہیں۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کی نوازش ہو گی اگر یہ وضاحت بھی کر دیں کہ ہماری حالیہ گفتگو سے اس معاملے کا کیا تعلق ہے؟''

''تم نے کہا کہ خود سے جونیئرز کے ساتھ کام کر کے کچھ نیا سیکھنے کو نہیں ملتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے، سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تو ''سیکھنے'' کے عمل کا دوسرا پہلو ہے ''سکھانے'' کا عمل اور یہ دونوں عمل ایک دوسرے کے لیے واجب و موجب ہیں۔ اگر تمہاری یہ تمنا ہے کہ اپنے سینئرز کے ساتھ کام کر کے تم اپنے علم اور تجربے میں اضافہ کرو تو تم سے جونیئرز کو بھی اپنے دل و دماغ میں یہ چاہت رکھنے کا حق ہے کہ وہ تم سے یعنی خود سے سینئر اہلکار کی معیت میں کام کر کے کچھ نیا اور کچھ بڑا سیکھ سکیں۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔

''اگر پولیس ڈیپارٹمنٹ میں سے ''سیکھنے سکھانے'' کا سلسلہ ختم ہو جائے تو پھر کانسٹیبل بھرتی ہونے والا ایک نوجوان اپنی زندگی کے بہترین چالیس، پینتالیس سال محکمے کو دینے کے بعد بھی ''کانسٹیبل'' ہی ریٹائر ہوگا۔ اب تم خود ہی اندازہ لگا لو کہ اس صورت حال میں کوئی کانسٹیبل ''اے ایس آئی قادر علی'' یا ''تھانہ انچارج ملک صفدر حیات'' کیسے بن سکتا تھا؟''

''آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی ہے ملک

صاحب!'' وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا ہے۔''

''غلطی کا احساس ہو جانا اس خطا کا اخلاقی اور روحانی کفارہ ہوتا ہے قادر علی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہاری بات سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔''

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

ہم اُچی حویلی کے نزدیک پہنچے تو میں نے قادر علی سے کہا۔ ''میں ان چودھری باپ بیٹے سے ایک انتہائی حساس اور اہم موضوع پر چند سوالات کرنے آیا ہوں۔ یہ پوچھ تاچھ میں ان سے الگ الگ کروں گا اور دونوں سیشن میں تم میرے ساتھ موجود رہو گے۔ اپنی آنکھوں، کانوں اور دماغ کی کھڑکیاں و دروازے کھلے رکھ کر۔ میری اس تفتیش سے تمہیں بہت کچھ نیا اور نتیجہ آور سیکھنے کو ملے گا۔''

''بہت شکریہ ملک صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کی ہدایات پر پوری طرح عمل کروں گا۔ ایسے مواقع روز روز تھوڑی ملتے ہیں جناب!''

ہم فرید پور میں داخل ہو کر اُچی حویلی کی جانب بڑھنے لگے تو مجھے چھوٹا چودھری سمیع اللہ ایک گھوڑے پر سوار اپنی ہی طرف آتا نظر آیا۔ اس نے بھی مجھے تانگے میں بیٹھا دیکھ لیا تھا چنانچہ وہ ہمارے تانگے کے نزدیک آکر رک گیا۔

''السلام علیکم ملک صاحب!'' اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے مجھے سلام کیا اور پوچھا۔ ''مجھے امید ہے آپ خیریت ہی سے آئے ہوں گے۔ اُچی حویلی اب اور کوئی صدمہ برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تھانیدار صاحب!''

''فکر والی کوئی بات نہیں چودھری صاحب!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''بس، میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا آپ لوگوں سے بھی سلام دعا کرلوں۔'' پھر میں نے ذرا دیر کو رکنے کے بعد سوال کیا۔ ''ویسے آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں چودھری صاحب؟''

''میں ساتھ والے پنڈ میں ایک چھوٹے سے کام کے لیے جا رہا ہوں جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''تین سے چار گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ آپ حویلی میں تشریف رکھیں۔ میں واپس آکر آپ سے بات کرتا ہوں۔''

''چودھری صاحب! جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، میں ایک ضروری کام سے کہیں جا رہا ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میں اتنی دیر تک حویلی میں رک نہیں سکوں گا۔ آپ اگر مجھے صرف دس منٹ دے دیں تو میں آپ کی مرحوم بیوی عروج کے حوالے سے ایک اہم بات کی تصدیق یا تردید کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ ایک لمحے کی قلیل مدت تک متذبذب رہنے کے بعد وہ جلدی سے بولا۔ ''جی، کیوں نہیں...... ضرور۔''

میں ان دونوں باپ بیٹے سے الگ الگ ''میٹنگ'' کرنے کا سوچ کر ادھر آیا تھا اسی لیے میں نے چودھری سمیع اللہ سے یہ غلط کہا تھا کہ میں کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ تو ایک آئیڈیل سچویشن تھی کہ وہ مجھے حویلی کے باہر اکیلا ہی مل گیا تھا۔ میں نے اسے موقع غنیمت جانتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''تو پھر آجائیں ادھر تانگے میں۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ میں نے تانگے کے کوچوان کو اشارہ کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو جائے۔ اس اللہ کے بندے نے فوراً سے پیشتر میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

میں اس وقت تانگے کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ اے ایس آئی قادر علی عقبی نشست پر موجود تھا۔ چودھری سمیع اللہ نے پچھلی نشست کا رخ کیا تو میں نے اپنے پہلو والی خالی جگہ کو تھپتھپاتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

''یہاں چودھری صاحب......!''

وہ میرے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے انجانے خدشات اور تفکرات کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ میں نے تشفی بھرے انداز میں کہا۔

''چودھری صاحب! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل میں گزشتہ روز مقتولین کی پوسٹ مارٹم رپورٹس میرے پاس آگئی تھیں۔ آپ کی بیوی کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ میں ایک اہم چیز کا انکشاف ہوا ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کو ایسی کون سی اہم شے مل گئی ہے تھانیدار صاحب؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔

''عروج کی رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ......'' میں نے چودھری سمیع اللہ کی زبان سے سچ اگلوانے کی غرض سے دانستہ مذکورہ رپورٹ کو ''ایڈٹ'' کرتے ہوئے بتایا۔ ''کہ وہ موت کے وقت امید سے تھی۔ کیا آپ اس بات سے واقف تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے معتدل لہجے میں جواب دیا۔

''عروج نے اس سانحے سے دو تین دن پہلے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

اس کے جواب نے میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی

بجادی تاہم اس کے باوجود بھی میں نے اپنی تسلی اور اطمینان کے لیے تصدیق کو ضروری جانا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

''دو تین دن پہلے یا دو تین ماہ پہلے؟''

''میں نے دو تین دن کہا ہے ملک صاحب!'' وہ متفکر انداز میں بولا۔ ''کیا کوئی گڑبڑ ہے؟'' اس نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

میں تو دال میں کچھ کالا ہونے کی توقع کررہا تھا مگر چودھری سمیع اللہ کا واضح جواب تو چیخ چلا کر اس تلخ حقیقت کا اعلان کررہا تھا کہ بدقسمتی سے یہاں تو پوری دال ہی کالی تھی۔

''کوئی گڑبڑ نہیں ہے چودھری صاحب!'' میں نے اپنے چہرے کے تاثرات کو قابو میں رکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''کیونکہ آپ کی بیوی کے حاملہ ہونے والی بات مجھے اس رپورٹ سے پہلے معلوم نہیں تھی اس لیے میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کے لیے یہ صدمہ کتنا جاں گسل ہے۔ آپ کی ہمت اور حوصلے کو سلام ہے کہ ایسے حالات میں بھی زندہ ہیں۔''

میں نے موقع محل کی مناسبت سے جو بات بنادی تھی، وہ تیر بہ ہدف مؤثر ثابت ہوئی۔ کسی قسم کے شک میں مبتلا ہوئے بغیر وہ اذیت آمیز لہجے میں بولا۔

''قبر کا حال تو مُردہ ہی جانتا ہے ملک صاحب! بس کسی زندہ لاش کی طرح چل پھر رہا ہوں۔ شاید اسی کا نام زندگی ہے ملک صاحب!''

''اللہ آپ کو صبر اور برداشت عطا فرمائے چودھری صاحب!'' میں نے اپنے ''کام'' کو غیر محسوس انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے یقیناً بڑے چودھری صاحب کو بھی عروج والی خوشخبری کے بارے میں بتایا ہوگا اور اب عروج کی موت کے بعد تو وہ آپ سے بھی زیادہ آزردہ اور دل شکستہ ہوچکے ہوں گے۔''

''جب میں نے اباجی کو یہ بتایا کہ میں باپ بننے والا ہوں تو وہ دادا بننے کی خوشی میں اتنے زیادہ پُرجوش ہوگئے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں انہیں اس سے پہلے کبھی اس قدر مسرور اور شاداں نہیں دیکھا تھا۔ نانا تو وہ کئی بار بن چکے ہیں مگر اپنی نسل کے آگے بڑھنے کی مسرت اور خوشی کچھ الگ ہی ہوتی ہے لیکن عروج کی موت کے ساتھ ہی سب ختم ہوگیا ملک صاحب!'' وہ حد درجہ افسردہ ہوگیا۔

''میں آپ کے غم اور صدمے کی شدت کو محسوس کرسکتا ہوں چودھری صاحب!'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا پھر اپنے ''کام'' کے آخری حصے کو بھی انجام دے ڈالا۔ ''آپ نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ مرحومہ عروج نے اپنی موت سے دو تین دن پہلے ہی آپ کو باپ بننے کی خوشخبری دی تھی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شیر گڑھ والے چودھری برادران عروج کے امید سے ہونے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے؟''

''جی بالکل۔'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔ ''اگر عروج تیرہ تاریخ کو صحیح سلامت شیر گڑھ پہنچ جاتی تو پھر یہ خبر وہاں بھی پہنچ جاتی مگر قدرت سے لڑنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے ملک صاحب! ویسے میرا ارادہ تھا کہ کم ازکم چاچا یعقوب احمد کو اس حوالے سے آگاہ کردوں مگر اباجی نے مجھے منع کردیا تھا اور آپ نے اس روز تھانے میں ان دونوں بھائیوں کا رویہ تو دیکھ ہی لیا تھا۔ ان کے انداز میں اپنوں والی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ عروج کی موت کے ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے ایسا غیریت کا برتاؤ کیا جیسے عروج سے میرا کوئی رشتہ ناتا کبھی رہا ہی نہیں تھا۔''

بات کے اختتام پر اس کے لہجے میں کڑواہٹ عود کر آئی تھی۔ میں نے اپنا کام مکمل کرچکنے کے بعد ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''ہاں، میں نے ان دونوں بھائیوں کے تکبر، ضد اور نامعقولیت کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بہرکیف......!'' میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کیا چودھری صاحب! ایسے بدلحاظ اور گھمنڈی لوگوں سے دور رہنا ہی دانشمندی ہے۔ آپ اب اپنے کام سے جائیں۔ میں بھی بڑے چودھری صاحب کو سلام کرکے آگے نکل جاؤں گا۔''

''کیا چار افراد کے قاتلوں کے بارے میں کچھ پتا چلا ملک صاحب؟'' اس نے سرسری انداز میں استفسار کیا۔

''تفتیش جاری ہے چودھری صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''اسی سلسلے میں مصروفِ عمل ہوں۔ وہ درندے جو کوئی بھی ہیں، میں انہیں گرفتار کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔''

اس نے تہِ دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور تانگے سے اتر کر اپنے گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی کوچوان واپس تانگے میں آگیا اور ہمارا رخ اپّی حویلی کی سمت ہوگیا۔

میں نے عروج کی پوسٹ مارٹم اور لیبارٹری ٹیسٹ کی

رپورٹس کو چار بار پڑھا تھا اور وہ بھی نہایت ہی باریک بینی سے اور مجھے مذکورہ رپورٹس کی صحت پر ذرا سا بھی شبہ نہیں تھا کیونکہ میڈیکولیگل آفیسر اور کیمیکل ایگزامنر کی فیصلہ کن آرا کے علاوہ رپورٹس کے مندرجات بھی اس امر کی تصدیق کرتے تھے کہ اپنی موت کے وقت عروج تین ماہ کے پیٹ سے تھی۔ چودھری سمیع اللہ سے اس کی شادی چار ماہ قبل یعنی گزشتہ سال اکتوبر میں ہوئی تھی۔ اس مدت کو ذہن میں رکھ کر حساب لگائیں تو منطقی نتیجے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ سیدھی سی بات ہے، عروج کے رحم میں تخم ریزی کا عمل پچھلے سال نومبر کی کسی تاریخ کو پورا ہو چکا تھا۔ اگر وہ بیج چودھری سمیع اللہ کا تھا تو پھر عروج نے تین ماہ کے بعد اسے یہ خوشخبری کیوں دی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس تاخیری غلط بیانی کے پیچھے عروج کی کون سی چال یا مصلحت پوشیدہ تھی، اس سوال کا جواب دینے کے لیے وہ اب زندہ نہیں تھی۔

اس راز سے صرف عروج ہی واقف تھی کہ اس کی کوکھ میں سانس لیتی زندگی کا ماخذ چودھری سمیع اللہ تھا یا پھر کوئی اور۔ چودھری سمیع اللہ تو اسے ایک ننھی میوہ جان کر اس کی آبیاری کرتا رہا تھا جبکہ عروج کی رپورٹ اسے قلمی ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

چودھری حفیظ اللہ کے ملازمین نے عزت و احترام کے ساتھ ہمیں حویلی کی بیٹھک میں پہنچا دیا۔ چند ہی منٹ میں چودھری خود بھی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ صاحب سلامت کے بعد اس نے اپنے ایک ملازم کو پاس بلا کر کچھ ہدایات دینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''چودھری صاحب! کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں صرف دس منٹ آپ کے پاس رک کر آگے بڑھ جاؤں گا۔ بس آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی اس لیے یہاں آ گیا۔''

آج وہ تین دن پہلے والے حفیظ اللہ سے بالکل مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ تیرہ فروری کی سہ پہر جب جائے وقوعہ پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ سرتاپا غم و اندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا مگر اس وقت وہ ایک دم بے فکر اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ ''ملک صاحب! یہ کیا بات ہوئی؟'' اس نے شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس روز بھی آپ کچھ کھائے پیے بغیر یہاں سے چلے گئے تھے۔ آج میں جی بھر کر آپ کی خاطر داری کروں گا۔''

''چودھری صاحب! میں آپ کی خاطر داری کی خواہش کو بہت جلد پورا کر دوں گا۔'' میں نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔ ''فی الحال صرف ایک گلاس پانی سے کام چل جائے گا۔ ہم کافی ٹائٹ ناشتا کر کے تھانے سے نکلے ہیں اور آج کام بھی بہت زیادہ ہیں لہٰذا دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے ہر صورت جانا ہوگا۔ امید ہے آپ میری پیشہ ورانہ مجبوریوں کا احساس کریں گے۔''

میں نے اپنا مقدمہ اتنی سنجیدگی اور دوٹوک انداز میں پیش کیا تھا کہ اس نے مزید کوئی ضد بحث نہیں کی۔ اس نے اپنے ملازم کو چائے، بسکٹ اور پانی لانے کا حکم دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''آج کس طرف چڑھائی کا ارادہ ہے ملک صاحب اور آپ مجھ سے ایسی کون سی اہم بات کرنے آئے ہیں؟''

''جیسا کہ میں نے بتایا، میرا آج کا دن بہت مصروف گزرنے والا ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''دیگر کاموں کے علاوہ ایک چکر پنڈ گوندلاں والا کا بھی لگانا ہے۔ وہاں کے چودھری احمد نواز گوندل سے ملاقات ضروری ہے۔ وہ بندہ چودھری یعقوب احمد کا سیاسی حریف بھی ہے۔ عین ممکن ہے اس سے ملنا اس کیس کو حل کرنے میں معاون ثابت ہو۔ باقی جہاں تک آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو......'' ڈرامائی انداز میں توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سمیع اللہ سے ہونے والی حالیہ بات چیت کے برعکس ایک نئے اور مختلف انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان دونوں خونریز وارداتوں کے حوالے سے میرے ہاتھ ایک ثبوت لگا ہے۔ ہوسکتا ہے اس ثبوت کو دیکھ کر آپ کے ذہن میں کچھ آ جائے اور آپ میری مدد کر سکیں۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بے حد محتاط لہجے میں پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ کے ہاتھ ایسا کیا لگ گیا ہے؟''

میں نے اپنی جیب میں سے سو روپے والے کرنسی نوٹ کے دونوں ٹکڑوں کو نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''ان میں سے ایک ٹکڑا فرید پور والے جائے وقوعہ سے اور دوسرا ٹکڑا شیر گڑھ والے موقعِ واردات سے ملا ہے۔''

''یہ تو سیدھا سیدھا کانا یوسی کا طریقۂ واردات ہے ملک صاحب!'' نوٹ کے ٹکڑوں پر نگاہ پڑتے ہی وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''مگر میں نے سنا ہے یوسی کانا تو برسوں پہلے مر کھپ چکا ہے۔'' میں نے چودھری حفیظ اللہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پھر یہ سب اس سے کیسے منسوب کر سکتے ہیں؟''

"کچھ لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ کئی سال پہلے کانا یوسی مارا جاچکا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ وہ خانیوال کو چھوڑ کر شیخوپورہ آبسا تھا اور اب تک متحرک ہے۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اگر خانیوال اور شیخوپورہ کی بحث کو ایک طرف رکھ دیں اور کانا یوسی کے زندہ یا مردہ ہونے کا بھی ذکر نہ کریں تو اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسی کے انداز میں کوئی اور مجرم ذہن بندہ یہ کام کر رہا ہو یا پھر مجرموں کے کسی گروہ نے اس کے طریقۂ کار کو اپنا لیا ہو۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

اس نے سوال کی گیند میری کورٹ میں پھینک دی تھی۔ سو، میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کی بات میں وزن ہے چودھری صاحب۔ دیکھتے ہیں، آگے چل کر اس مسئلے کے اندر سے کیا نکلتا ہے۔"

اس دوران میں چائے، بسکٹس وغیرہ آچکے تھے۔ میں چودھری کو اِدھر اُدھر گھمانے کے بعد مطلب کی بات پر آگیا۔ وہ بات جس کو کہنے کے لیے میں نے یہ گراؤنڈ بنایا تھا۔

"چودھری صاحب!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کے رنج و غم میں برابر کا شریک ہوں اور مجھے سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ عروج چودھری سمیع اللہ کو کبھی اولاد کا تحفہ نہیں دے سکتی تھی۔ خیر، اب تو وہ اس دنیا ہی سے رخصت ہوگئی ہے۔"

"یہ آپ نے کیسی بات کردی ملک صاحب؟" چونکے بغیر اس نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ عروج بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں تھی؟"

"اس کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ سے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس کی کرید تشویش میں بدل گئی۔

"کل مقتولین کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ وغیرہ مجھے موصول ہوگئی ہیں چودھری صاحب!" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے بتایا۔ "عروج کی رپورٹ کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ بانجھ تھی۔"

میں نے چودھری حفیظ اللہ سے دانستہ دروغ گوئی کی تھی تاکہ چودھری سمیع اللہ کی فراہم کردہ معلومات کی تصدیق یا تردید ہوسکے۔ یہ سب اس لیے بھی ضروری تھا کہ عروج کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ چودھری سمیع اللہ کے چند منٹ پہلے والے بیان سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ عروج کا سسر کس سُر، تال اور راگ میں جواب دیتا ہے۔

"ملک صاحب! آپ سیانے بیانے انسان ہیں۔" اس نے میرے کام کو سہل کرتے ہوئے بڑے اعتماد اور سنجیدگی سے کہا۔ "سوہنے رب کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر آگے چل کر عروج کا بانجھ پن ظاہر ہوتا تو مجھے مجبوراً سمیع اللہ کی دوسری شادی کرانا پڑتی کیونکہ اولاد تو ہر انسان کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ آکسیجن۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔"

میں نے اور اے ایس آئی نے بیک زبان کہا۔ "آمین!"

چودھری حفیظ اللہ کے جواب سے دو باتیں سامنے آئی تھیں۔ نمبر ایک، چودھری سمیع اللہ نے اپنے باپ کو عروج کے حاملہ ہونے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا یعنی چھوٹے چودھری نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔ نمبر دو، چودھری حفیظ اللہ نے دانستہ عروج کے "پُرامید" ہونے کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے چودھری حفیظ اللہ پر یہی ظاہر کیا جیسے میں اس کے بیان پر یقین کرچکا ہوں کہ وہ اپنی بہو کے حاملہ ہونے سے واقف نہیں تھا۔ میں اس کھیل کو جس انداز میں آگے بڑھانے کا ارادہ رکھتا تھا، اس کے بنیادی تقاضے کی رو سے بڑے چودھری کو فی الوقت خوش فہمی میں رکھنا بہت ضروری تھا۔

میں نے چودھری حفیظ اللہ کو الوداعی سلام کیا اور اے ایس آئی قادر علی کے ساتھ اُس حویلی سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

کوئی بھی انسان جب جھوٹ کا سہارا لیتا ہے تو اس کی دروغ گوئی کے پیچھے عموماً چار وجوہ میں سے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ وجوہات ہوسکتی ہیں۔ نمبر ایک، وہ کوئی بڑا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ نمبر دو، وہ کسی بڑے نقصان سے بچنا چاہتا ہے۔ نمبر تین، وہ کسی خطرناک مصیبت کو ٹالنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ نمبر چار، وہ کسی دوسرے کو مشکل میں ڈالنے کا متمنی ہوتا ہے۔

یہ بات روزِ روشن کے مانند میرے دماغ کی آنکھوں کے سامنے کھل چکی تھی کہ اس کیس کو حل کرنے کے لیے مجھے تین افراد کے جھوٹوں کی حقیقت کو جاننا تھا۔ مذکورہ تین افراد میں سے ایک عروج تو زمین اوڑھ کر سو چکی تھی۔ اب اس سے کسی نوعیت کا رابطہ ممکن نہیں تھا۔ باقی بچے چودھری سمیع اللہ اور اس کا باپ چودھری حفیظ اللہ...... اور ان دونوں کی زبانوں کے قفل کھلوانے کے لیے میں نے جو انوکھی چال

چلی تھی، وہ نہایت ہی مؤثر ثابت ہوئی۔ اگلی صبح چھوٹا چودھری سمیع اللہ اپنے باپ کے ساتھ تھانے پہنچ گیا تھا۔

میں اس کی توقع بھی کر رہا تھا لہٰذا میں نے ان کی متوقع آمد کے حوالے سے اپنے حوالدار کو خصوصی ''ہدایات'' دے رکھی تھیں۔ وہ مجھے سلام کر کے میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چھوٹے چودھری کے چہرے پر خفگی کے آثار دکھائی دے رہے تھے جبکہ بڑا چودھری الجھا ہوا نظر آتا تھا۔

''چودھری صاحب!'' میں نے سمیع اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے کھیل کا ''ڈراپ سین'' شروع کر دیا۔ ''آپ کا موڈ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''ملک صاحب! سمیع اللہ کو آپ سے چند شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں۔'' چودھری حفیظ اللہ، بیٹے کی لب کشائی سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''میرا تو تھانے آنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ بس یہی زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے آیا ہے۔''

''چودھری صاحب! پولیس ڈیپارٹمنٹ نے مجھے یہاں لوگوں کی فریادیں اور شکایتیں سننے کے لیے ہی بٹھا رکھا ہے۔'' میں نے بڑے چودھری کی بات کے جواب میں سرسری انداز میں کہا پھر چھوٹے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''بتائیں چودھری صاحب! آپ کو مجھ سے کیا شکوہ اور کیا شکایت ہے؟ میں آپ کی تشفی کرنے کا ذمے دار ہوں۔''

''صرف دو باتیں میرا دماغ خراب کر رہی ہیں ملک صاحب!'' سمیع اللہ نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے مجھ سے سو روپے والے کرنسی نوٹ کے دو ٹکڑوں کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا اور ابا جی کو پوری کہانی سنا ڈالی۔ یہ تو ہے میری پہلی شکایت۔ آپ اس کا جواب دیں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا پھر میں دوسری بات بتاتا ہوں۔''

''کہانی تو وہی ہے جو تم نے اپنے ابا جی سے سنی ہے۔'' میں نے مذکورہ کرنسی نوٹ کے دونوں ٹکڑے اس کے سامنے رکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''آپ کے ابا جی کا کہنا یہ ہے کہ ان دونوں خونیں وارداتوں کے پیچھے یوسی کانا یا اسی کی طرز پر کام کرنے والے کسی جرائم پیشہ گروہ کا ہاتھ ہے۔ مجھے بتاؤ، آپ اس بارے میں کیا سوچتے ہو؟''

''میں کانا یوسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''اس لیے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔''

''ٹھیک ہو گیا۔ اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ... یوسی کانا کے موضوع پر آپ سے بات کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا چنانچہ میں نے اس کا ذکر ضروری نہیں جانا۔ اب آپ مجھے دوسری شکایت کے بارے میں بتائیں۔''

''آپ نے عروج کی رپورٹ کے حوالے سے بھی ہم دونوں کو دو الگ کہانیاں سنائی ہیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ابا جی کو آپ نے بتایا ہے کہ عروج بانجھ تھی اور مجھ سے کہا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ یہ تضاد کیوں جناب؟''

''یاد کریں...... یہ بات تو عروج نے اپنی موت سے دو تین دن پہلے آپ کو بتائی تھی کہ وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو عروج کی رپورٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس رپورٹ کے مطابق وہ حاملہ تھی۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا کہ اس کے پیٹ میں آپ کا بچہ ہے۔''

''ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مگر الفاظ کے ہیر پھیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر عروج امید سے تھی تو ظاہر ہے اس کی کوکھ میں میرا ہی بچہ تھا۔''

''الفاظ کے ہیر پھیر سے جو فرق پڑتا ہے، اسے سن کر تمہارا دماغ پھٹ جائے گا چودھری جی!'' میں نے ''آپ جناب'' کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

''آپ کا مطلب کیا ہے؟'' وہ اکھڑے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا۔

''مطلب یہ کہ اگر عروج کے بطن میں تمہارا بچہ پروان چڑھ رہا ہوتا تو وہ اپنی موت سے تین ماہ پہلے تمہیں باپ بننے کی خوشخبری سنا چکی ہوتی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم اور لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹس سے پتا چلتا ہے کہ موت کے وقت عروج تین ماہ کی حاملہ تھی۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر بڑے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''آپ نے تو انگریز کے زمانے میں مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ انگلش بہ آسانی لکھ، پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔'' بات کے اختتام پر میں نے مذکورہ رپورٹس اپنی میز کی دراز میں سے نکال کر اس کی جانب بڑھا دیں۔

چودھری حفیظ اللہ نے بغور ان رپورٹس کا مطالعہ کیا پھر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے مضمحل انداز میں بولا۔

''سمیع اللہ! ملک صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''آپ نے ہم دونوں باپ بیٹے سے جھوٹ کیوں

بولا تھا ملک صاحب؟'' چھوٹے چودھری نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ''آپ نے مجھ سے تین ماہ کے حمل والی بات چھپائی اور اباجی کو بتایا کہ عروج بانجھ تھی...... آخر کیوں؟''

''حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اور تم دونوں کے منہ سے سچ اگلوانے کے لیے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس امر میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ دونوں میں سے کوئی ایک ان خونریز واقعات کے راز سے واقف ہے اور...... یہ بھی ممکن ہے آپ دونوں ہی اس معاملے کے رازداں ہوں لیکن اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ یہ بھید اب سربستہ نہیں رہا۔ آپ قانون سے تعاون کرتے ہوئے مجھے سب کچھ سچ سچ بتادیں گے تو ہم سب کے لیے آسانی ہوجائے گی۔''

''ملک صاحب!'' سمیع اللہ نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر آپ کو یقین دلانے کے لیے تیار ہوں کہ میں اس معاملے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''تمہارے قسم کھانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا سمیع اللہ!'' میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے اور وہ بھی ابھی کے ابھی۔''

''ملک صاحب! میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' چودھری حفیظ اللہ نے گمبھیر انداز میں کہا پھر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سمیع اللہ! تم تھوڑی دیر کے لیے باہر جاؤ۔''

سمیع اللہ الجھن زدہ انداز میں اٹھا اور چپ چاپ میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ملک صاحب!'' چودھری حفیظ اللہ آگے کو جھک کر گمبھیر انداز میں گویا ہوا۔ ''ہم عزت دار اور غیرت مند لوگ ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ پرایا خون اپنی حویلی کا اگلا وارث قرار پائے لہٰذا مجھے جو ٹھیک لگا، وہ میں نے کیا...... بلکہ میں نے کروایا۔ اس معاملے میں سمیع اللہ کا کچھ لینا دینا نہیں ہے اسی لیے میں نے اس کے سامنے بات نہیں کی۔ آپ سمجھ دار انسان ہیں۔ اس بکھیڑے کو ہم دونوں مل کر سمیٹ سکتے ہیں۔ میں آپ کی ہر شرط اور ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہوں۔ بس آپ حکم کریں۔''

میں ایک گہری اور آسودہ سانس لے کر رہ گیا۔ ڈھکے چھپے نہیں بلکہ واضح الفاظ میں بڑے چودھری نے چار افراد کو قتل کروانے کا اقبال کرلیا تھا مگر میرے لیے کچھ اور جاننا بھی ضروری تھا۔

''چودھری صاحب! میں کن شرائط اور کون کون سے قواعد وضوابط پر اس بکھیڑے کو سمیٹنا چاہوں گا، اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو عروج کی اس سنگین غلطی کا کب پتا چلا تھا؟''

''لگ بھگ دو ماہ پہلے۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''چودھرائن وزیر بیگم کے انتقال پر دوسرے لوگوں کے علاوہ شیر گڑھ والے دونوں چودھری بھائی اور ان کے بچے بھی یہاں آئے ہوئے تھے اور میں نے اتفاقاً عروج اور چودھری اسحاق کے بیٹے سلیم کو تنہائی میں باتیں کرتے سن لیا تھا۔ سلیم کسی بات کے لیے عروج سے ضد کررہا تھا اور جواب میں عروج نے جو کہا، ان الفاظ نے میرے دماغ کو پھاڑ ڈالا تھا۔ وہ منت ریز لہجے میں اس سے کہہ رہی تھی...... ''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو سلیم! اب میں تمہارے لیے پرائی ہوچکی ہوں۔ تم میری جی جمائی زندگی کو برباد کرنے کی کوشش مت کرو۔ یہی کیا کم ہے کہ تمہاری محبت کی یادگار میرے پیٹ میں پل رہی ہے۔''

اتنا کہہ کر چودھری خاموش ہوگیا۔ اس کے کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ عروج کی لیبارٹری ٹیسٹ رپورٹ اس کے اقبالِ جرم کی تصدیق کرتی تھی۔

''چودھری صاحب! آپ کو میری خاطر داری کرنے کی بڑی تمنا تھی مگر افسوس کہ قدرت نے آپ کو اس کا موقع نہیں دیا۔ ہاں، البتہ یہ سنہری موقع خوش قسمتی سے میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس بات کا یقین کرلیں کہ میں آپ کی جم کر ایسی ''خاطر داری'' کروں گا جو آپ مدتوں یاد رکھیں گے۔''

بات کے اختتام پر میں نے بہ آوازِ بلند اپنے حوالدار کو پکارا۔ ''نبی بخش! میں نے تمہیں جو خصوصی ہدایات دی تھیں، ان پر عمل کرنے کا وقت آگیا ہے۔ فوراً یہاں آجاؤ۔''

میرے خطرناک تیور دیکھ کر چودھری حفیظ اللہ کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ اس نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔ ''ملک صاحب! کوئی تو راستہ ہوگا؟''

''راستہ تو ہر حال میں ہوتا ہے چودھری صاحب!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر اس وقت آپ کے سامنے جو واحد راستہ ہے، وہ میرے تھانے کی حوالات سے عدالت اور عدالت سے سیدھا جیل کی طرف جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ کی قسمت۔''

وہ وحشت اور دہشت بھرے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے جو راستہ بتایا تھا، وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

(تحریر: حُسام بٹ)

اٹلی کے شہر کیپوا میں انسانوں کی ایک بڑی منڈی لگتی تھی جہاں انسانی غلام خریدے اور بیچے جاتے تھے۔ آج اس منڈی میں اسپارک بھی موجود تھا جسے کل رات ہی بحری قزاق اٹھا کر یہاں بیچنے کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ پریشان حال اسپارک نے بہت مشکل سے اپنی گردن اٹھائی کیونکہ اس کا مضبوط کسرتی جسم زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا۔ اسپارک نے دیکھا دور دور تک انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر سا نظر آرہا تھا۔ ہر رنگ و نسل کا انسان جو جانے کہاں کہاں سے پکڑ کر اس منڈی میں بیچنے کے لیے لایا گیا تھا۔ اس کی متلاشی نگاہیں بھٹک رہی تھیں جنہیں پامیلا کی تلاش تھی۔ اسپارک کی بیوی پامیلا بھی اس بحری جہاز میں سفر کر رہی تھی جس پر کل رات بحری قزاقوں نے حملہ کر کے تمام مسافروں کو یرغمال بنالیا تھا پھر انہیں زنجیروں میں جکڑ کر اس انسانی منڈی میں بیچنے کے لیے لایا گیا تھا۔

"یہ تو بہت جاندار اور طاقت ور دکھائی دے رہا ہے۔"

اپنے قریب سے ابھرتی آواز سن کر اسپارک چونک گیا۔ کوئی اجنبی مرد بہت اشتیاق سے اس کے زنجیروں میں بندھے جسم کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول کر چیک کر رہا تھا جو اسے بے حد ناگوار محسوس ہوا لیکن افسوس وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر عام حالات میں اسپارک اس وقت اپنے علاقے ٹریس میں موجود ہوتا تو کسی شخص میں اتنی جرأت نہ تھی جو اس کے جسم کو ایک انگلی سے بھی چھو کر دیکھنے کی ہمت کرتا۔ ٹریس کے لوگ اسپارک کی طاقت سے خوف زدہ رہتے تھے۔ وہ اپنے علاقے کا ایک نامور اور جنگجو شخص تھا۔ اس کی بیوی پامیلا کو ٹریس میں ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ ٹریس کے لوگ پامیلا کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے۔ اس کے پاس ہر وقت دعا کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ لوگوں کا ماننا تھا پامیلا کی دعا میں بہت

زندگی کے انتظار میں موت کی سولی پر لٹکے لوگوں کا حیرت انگیز قدم

سونے کے پنجرے میں رہنے سے انسان خود کو خوش قسمت نہیں سمجھ سکتا کیونکہ قید تو بہرحال قید ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا بھی یہی حال تھا جو ایک ان دیکھے حصار میں قید تھے اور... ان کے خون سے ہولی کھیلنے والے شاید بھول گئے تھے کہ ایک دن موت کو بھی موت ہے

آزادی

نفیسہ سعید

تاثیر ہے۔ وہ مختلف بیماریوں کا علاج اپنے دم سے کرتی تھی۔ اکثر گھروں سے آسیب نکالنے کے لیے بھی پامیلا کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ یہی وجہ تھی جو ٹریس کے لوگ پامیلا سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان دونوں میاں بیوی کا شمار ٹریس کی معزز ترین شخصیات میں ہوتا تھا۔ دو دن پہلے پامیلا کو اپنے کسی روحانی کام سے روم جانا تھا جس کی وجہ سے وہ دونوں اپنا سفر بحری جہاز کے ذریعے طے کر رہے تھے جب اچانک اس جہاز پر قزاقوں نے حملہ کر کے اندر موجود تمام افراد کو یرغمال بنا لیا۔ اب اسپارک نہ جانتا تھا کہ پامیلا کہاں تھی؟ اس کا سودا طے پا گیا تھا۔ رقم کی لین دین کے بعد اسے مالک کے حوالے کر دیا گیا۔ اس وقت جب اسے بڑے سے ٹرک میں بٹھایا جا رہا تھا تب اس نے پامیلا کو دیکھا جو اس ٹرک میں پہلے سے سوار تھی جس میں غلام بھرے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک کا چہرہ خوف زدہ تھا سوائے پامیلا کے جس کے چہرے پر کندہ لفظ نفرت واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بالکل بھی خوف زدہ نہ تھی۔ ٹرک کے تمام مسافروں کے درمیان وہ جدا دکھائی دے رہی تھی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

☆☆☆

ارینا کا میدان سج چکا تھا جہاں شوقین افراد کا جم غفیر کھیل کے شروع ہونے کا منتظر تھا۔ سامنے ہی بڑا سا اسٹیج سجا ہوا تھا جس کی کرسیوں پر کیپوا کے معززین بیٹھے تھے جن کے پیچھے ان کے غلام ہاتھ باندھے کھڑے اپنے اپنے ماسٹر کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ اسٹیج کے نیچے چند لوگ بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ انہیں سزا دینے کے لیے یہاں لایا گیا تھا۔ یہ لوگ یا تو چھوٹے موٹے چور تھے جو کسی بھی واردات کے دوران پکڑے گئے یا وہ غلام تھے جو اپنے ماسٹر کو دھوکا دے کر فرار ہونے کی کوشش میں گرفتار ہوئے۔ اب کیپوا کے قانون کے مطابق انہیں سزا دینے کے لیے ارینا لایا گیا تھا۔ جہاں ہر مجرم کا مقابلہ ایک غلام سے تھا جس کی ہار جیت کا فیصلہ کسی ایک کی موت پر ختم ہونا تھا۔ یہ خونی کھیل کیپوا کے لوگوں کا پسندیدہ ترین تھا جس کا انتظار شدت سے کیا جاتا۔ لوگ ٹکٹ خرید کر یہ خونی کھیل دیکھنے آتے۔ جتنا یہ کھیل کیپوا کے لوگوں کو پسند تھا، اتنا ہی اسپارک کے لیے قابل نفرت تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں کسی کی یوں جان لینا کبھی اچھا نہ لگا تھا لیکن وہ مجبور تھا، اس کا ماسٹر اس کھیل کا شیدائی تھا جس میں وہ لاکھوں روپیہ کماتا جس کی خاطر وہ کسرتی بدن رکھنے والے غلام خریدنے میں اپنا پیسا پانی کی طرح بہاتا۔ کھیل شروع ہو گیا تھا۔ میدان نقارے کی آواز سے گونج اٹھا۔ اسپارک کے مدمقابل ایک سوکھی سڑی کالی سی لڑکی تھی جو پچھلے ماہ اپنے ماسٹر کے ظلم و ستم سے بچنے کی خاطر اس کے گھر سے فرار ہونے کی کوشش میں پکڑی گئی تھی اور قسمت نے اسے موت کے اس کھیل کا حصہ بنا دیا۔ پہلی نظر میں وہ اسپارک کو بہت آسان ہدف محسوس ہوئی لیکن کھیل شروع ہوتے ہی اسے اپنے خیال کی خود نفی کرنا پڑی۔ لڑکی کا کھیل دیکھ کر وہ جلد ہی اس بات کا قائل ہو گیا کہ جینے کی خواہش ایک معمولی شے کو بھی طاقت بخش دیتی ہے۔ غلام لڑکی اس کا بھرپور مقابلہ کر رہی تھی، اسپارک کے بس میں ہوتا تو اسے زندگی بخش دیتا لیکن جانتا تھا اس صورت میں موت اسپارک کا مقدر بن جاتی اور ابھی وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ موت اور زندگی کا یہ کھیل اپنے عروج پر تھا۔ سارا میدان دیکھنے والوں کے پرجوش نعروں سے گونج اٹھا جو دونوں فریقین کے لیے ٹانک کا کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کا کھیل دیکھ کر پیٹریانک کا جوش بھی بڑھتا جا رہا تھا، وہ ہر حال میں اسپارک کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کے کھیل کے ذریعے مزید پیسا کما سکے پھر ایک دم میدان میں ہونے والا شور تھم گیا جس کا مطلب تھا کوئی ایک کھلاڑی یہ جنگ ہار چکا ہے جو یقیناً اسپارک نہ تھا۔

☆☆☆

اسپارک دیگر مرد غلاموں کے ہمراہ ڈیرے پر رہتا تھا جو اس کے ماسٹر پیٹریانک کے گھر کے ساتھ ہی واقع تھا جس کا ایک دروازہ اندر کی جانب کھلتا تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ لوہے کے مضبوط دروازے کی دوسری جانب ایک بڑا سا تالا ہر وقت لگا رہتا تاکہ ڈیرے سے کوئی غلام حویلی میں داخل نہ ہو سکے۔ تمام غلام عورتیں ماسٹر کے گھر میں رہتی تھیں جس کا بڑا سا بیرونی گیٹ بھی ہر وقت بند رہتا۔ یہی وجہ تھی جو اسپارک اب تک پامیلا سے نہ مل پایا تھا۔ وہ اس سے مل کر یہاں سے فرار کا لائحہ عمل تیار کرنا چاہتا تھا جو ابھی تک ممکن نہ ہوا تھا کہ وہ خونی حادثہ ہو گیا جس کے نقش اسپارک کے دل پر دائمی اثرات چھوڑ گئے۔ وہ ایک طوفانی رات تھی ڈیرے پر موجود چند غلام ماسٹر کی حویلی کی چھت پر صفائی کا کام کر رہے تھے جن میں اسپارک بھی شامل تھا جب اچانک ہی حویلی میں ایک غیر مانوس شور سنائی دیا جو آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ اب ان کا فرض تھا نیچے جا کر دیکھیں شاید ماسٹر کی فیملی کسی مشکل کا شکار نہ ہو۔ یہ ہی سوچ کر اسپارک نے اپنے قریب رکھی لکڑی کی تلوار اٹھا لی۔ ان کا اصل اسلحہ حویلی کے اندر ماسٹر کے قبضے میں ہوتا تھا جو انہیں بہ وقت ضرورت فراہم کیا جاتا ورنہ وہ اپنی پریکٹس لکڑی کی تلواروں سے کرتے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا جب اسپارک دو غلام لڑکوں کے ہمراہ حویلی کے بڑے سے ہال میں داخل ہوا۔ سامنے ہی پامیلا موجود تھی جس کا

چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسپارک نے دیکھا اس کے سامنے فرش پر ایک غلام لڑکی خون میں لت پت پڑی ہے جس کے قریب ماسٹر کا سترہ سالہ بیٹا بڑا سا چمڑے کا ہنٹر لیے کھڑا تھا جس پر لگا لڑکی کے بدن کا خون دور سے چمک رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر اسپارک خوف زدہ ہو گیا، ایک ہی سیکنڈ میں وہ سارا معاملہ سمجھ گیا۔ اس وقت پامیلا اس لڑکی پر ہونے والے ظلم کو روکنے کے لیے باہر نکلی تھی جو اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ وہ پامیلا کو روکنا چاہتا تھا مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ پامیلا نے ماسٹر کے بیٹے راڈرک کے ہاتھ سے ہنٹر چھین لینا چاہا۔ وہ غصے میں چلا رہی تھی اور احتجاج کر رہی تھی، اس ظلم کے خلاف جو اس غلام لڑکی پر کیا گیا۔ اس کا یہ ردعمل بغاوت کے زمرے میں آتا تھا۔ حویلی کے قانون کے مطابق پامیلا باغی ہو چکی تھی جس کی سزا صرف موت تھی۔ اسپارک اسے روکنا چاہتا تھا جب چشم زدن میں وہ واقعہ رونما ہو گیا۔ ماسٹر کا خاص غلام کتھرڈن ایک بڑا سا ڈنڈا لیے ہال میں نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر اسپارک خوف زدہ ہو گیا جب اسے بازو سے پکڑ کر بیرونی دروازے کی جانب دھکیل دیا گیا۔ اسپارک نے پلٹ کر دیکھا کتھرڈن ڈنڈا لے کر پامیلا کے سر پر جا پہنچا تھا اور ایک ہی سیکنڈ میں بنا سوچے سمجھے اس نے پامیلا کے سر پر ڈنڈا مار دیا۔ وہ لہرا کر نیچے گری اس وقت تک اسپارک کو دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا تھا، اس بھیانک رات وہ پامیلا کی کوئی مدد نہ کر سکا تھا۔ اس گزرتی رات کے ہر لمحے میں اسپارک نے صرف ایک بات سوچی کاش اس کی تلوار اصلی ہوتی۔ وہ ایک ایسی کالی اور اندھیری رات تھی جس کی صبح اسپارک کی زندگی میں کبھی نہ آئی۔

☆☆☆

ماسٹر کے بڑے بیٹے کی شادی قریب آ رہی تھی جس کے لیے حویلی میں تزئین و آرائش کا کام جاری تھا۔ ڈیرے کا ہر غلام حویلی میں اپنا کام سر انجام دے رہا تھا۔ اسپارک کو حویلی کا بیرونی حصہ رنگ کرنے کے لیے دیا گیا تھا جب اس نے رنگ کرتے ہوئے اپنے دل میں حساب لگایا، آٹھ ماہ، چھبیس دن اور دس گھنٹے ہو گئے تھے اسے پامیلا سے بچھڑے ہوئے۔ وہ ہر اس لمحے اور گھڑی کا انتقام لینا چاہتا تھا جو اس نے پامیلا کے بغیر گزاری۔ اپنے اس انتقام کے لیے اسپارک کو غلاموں پر مشتمل ایک ٹیم درکار تھی جسے تشکیل دینے کے منصوبے پر اس نے کام شروع کر دیا تھا۔ وہ جب بھی ماسٹر اور اس کے بیٹے راڈرک کو دیکھتا اس کا زخم ہرا ہو جاتا۔ اس کے دل میں موجود انتقام کی آگ تیز ہو جاتی جسے فینی نے مزید ہوا دی، جو حویلی میں موجود ایک غلام لڑکی تھی جسے اس وقت روم سے اٹھا کر کیپوا کی منڈی میں پہنچایا گیا جب وہ اپنے خاندان کے ساتھ تفریح کے لیے روم آئی تھی۔ اس سے ایک پُرآسائش زندگی چھین کر اسے غلام بنا دیا گیا، اس کے ماں باپ اور دونوں بہنوں کا پیار بھی چھن گیا اور اسے اس بلند و بالا دیوار والی حویلی کے اندر قید کر دیا گیا جہاں وہ اپنی مرضی سے سانس بھی نہ لے سکتی تھی۔ وہ آزادی چاہتی تھی جس کی کوئی بھی بھاری قیمت ادا کرنے کو تیار تھی، یہی وجہ تھی فینی نے ڈیرے پر موجود ایک غلام لڑکے کو سل سے تعلق جوڑ رکھا تھا جو اسپارک کی نظر میں آ گیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا فینی، ماسٹر کے علاوہ راڈرک سے بھی شدید نفرت کرتی ہے اس لیے اسے فینی حویلی کے اندر اپنی بہترین مددگار لگی۔ اسپارک جانتا تھا یہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں اگر ان میں سے کوئی ایک بھی پکڑا جاتا تو اس کی قسمت میں سوائے موت کے کچھ نہ تھا۔ یہاں کے قانون کے مطابق فرار ہونے والا غلام اگر ارینا میں موت کا مقابلہ جیت بھی لیتا تو بھی اپنے ماسٹر کے ہاتھوں مارا جاتا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی اذیت ناک موت نہ چاہتا تھا۔ ویسے بھی اسپارک کا مقصد محض فرار نہ تھا، وہ پامیلا کے خون کا ایسا بدلہ لینا چاہتا تھا جو صدیوں تک یاد رکھا جا سکے۔ اپنے انتقام کے ذریعے وہ اگلی دنیا میں پامیلا کو سکون دینا چاہتا تھا اور یہ سب کرنے کے لیے فرار ہونے سے قبل ان سب کو ایک بار حویلی میں داخل ہونا تھا جو صرف فینی کی مدد سے ممکن ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ماسٹر کی ملازمۂ خاص شیرک کی پسندیدہ تھی اور شیرک جانتی تھی حویلی کے داخلی راستے کی چابیاں کہاں رکھی ہیں۔

☆☆☆

آج صبح ہی تیز آندھی آئی تھی جس کے ساتھ گرد و غبار کا طوفان حویلی اور ڈیرے میں داخل ہو کر ایک تباہی مچاتا گزر گیا تھا جس کے بعد چاروں طرف ریت ہی ریت دکھائی دے رہی تھی جس کی صفائی کا کام جاری تھا۔ کچھ لڑکے حویلی کے باہر کا بڑا سا میدان صاف کر رہے تھے جبکہ کچھ اسپارک جیسے جنگجو اس وقت ڈیرے کے میدان میں اپنی تلوار بازی کی مشق میں مصروف تھے۔ جب اسپارک نے اپنی تلوار ہاتھ سے رکھ کر پریکٹس کرتے غلاموں پر ایک نظر ڈالی جو اس وقت بیس کے قریب تھے جن میں سے دس ایسے تھے جو یہاں سے نکلنے کے لیے اسپارک کی ہر بات ماننے کو تیار تھے۔ باقی دس سے اس نے ابھی بات ہی نہ کی تھی، اسے انتظار تھا آج رات کا جب تمام غلام واپس آئیں تو ڈیرے پر ایک میٹنگ رکھی جائے جس میں سب لوگ شریک ہوں۔ وہ یہاں سے فرار کے لیے ہر غلام کو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتا تھا تاکہ پیچھے رہ جانے والے ماسٹر کے عتاب کا شکار نہ ہوں۔ اسے

ماسٹر اور اس کے گارڈز سے مقابلے کے لیے غلاموں کی پوری فوج چاہیے تھی جس کا لائحہ عمل وہ مرتب کر چکا تھا مگر اصل مسئلہ اب بھی وہیں تھا۔ حویلی کے اندر داخل ہونے کے لیے درمیانی دروازہ کھلا ہونا ضروری تھا جبکہ فینی ابھی تک اس دروازے کی چابی حاصل نہ کر سکی تھی۔ حویلی کے مین گیٹ سے اندر داخل ہونا ناممکن تھا۔ وہاں سیکیورٹی کے سخت ترین انتظامات تھے۔ داخلی گیٹ پر تلواروں سے لیس جنگجو غلاموں کی پوری فوج ہر وقت موجود رہتی۔ ایسے میں حویلی کے اندر داخل ہونے کا واحد راستہ حویلی کا درمیانی دروازہ تھا جو ڈیرے کی جانب کھلتا تھا اور جسے اندر سے صرف فینی کھول سکتی تھی۔ اسپارک، فینی کی طرف سے گرین سگنل کا منتظر تھا جس کے بعد وہ سب اس حویلی میں داخل ہو جاتے۔ وہ حساب لگا چکا تھا اس کے ساتھ حویلی میں داخل ہونے والے غلاموں کی تعداد پچاس سے زائد تھی۔ فینی نے بھی کچھ خواتین غلاموں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ لوہے کی اصلی اور تیز و تند تلواریں کس کمرے میں ہیں۔ وہ وہاں تک رسائی کا راستہ بھی معلوم کر چکی تھی۔ اب صرف اور صرف انتظار تھا اس مناسب وقت کا جب فینی کے دیے گئے سگنل کے بعد وہ اپنی کارروائی کا آغاز کر سکتے۔

☆☆☆

آدھی رات کا وقت تھا جب اسپارک کے حساس کانوں نے ایک نسوانی چیخ کی آواز سنی۔ وقفے وقفے سے سنائی دینے والی چیخ کی آواز حویلی کے درمیانی دروازے سے اس طرف آ رہی تھی جس کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا حویلی میں آج پھر راڈرک کے زیر عتاب کوئی ملازمہ آ گئی تھی کیونکہ راڈرک ہمیشہ آدھی رات کو شراب کے نشے میں دھت ہو کر خواتین ملازماؤں پر تشدد کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ یہ آواز سن کر اسپارک اٹھ بیٹھا، اس کے ساتھ ہی وہاں موجود دیگر غلام بھی جاگ گئے۔ رات کے اس لمحے ان نسوانی چیخوں کی آواز نے اس کے ذہن میں پامیلا کی یاد کو ایک بار پھر تازہ کر دیا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل کر حویلی کی بلند و بالا دیواروں پر ایک نظر ڈالی۔ کوئی ایسا طریقہ نہ تھا جو ان دیواروں کے ذریعے وہ حویلی کے دوسری جانب کود جاتا۔ وہ مایوس ہو کر پھر اس کمرے میں داخل ہوا جہاں موجود درمیانی دروازہ اس کی واحد امید تھا جس کے ذریعے وہ حویلی میں داخل ہو کر وہاں ہونے والے ظلم کو روک سکتا تھا۔ اس کے ساتھ مزید دس غلام بھی اس کمرے میں موجود تھے۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی چیخیں تھم گئی تھیں، شاید ایک اور غلام ملازمہ ان ظالموں کے ہاتھوں اپنی زندگی کی بازی ہار گئی تھی اور یہ سب اس کے لیے بھی کچھ نہ کر سکے تھے۔ مایوسی میں گھرا اسپارک دروازے کے مزید قریب ہوا جب اس کے کانوں نے ہلکی سی کوئی آواز سنی۔ کسی نے دروازے پر لگے تالے میں چابی گھمائی تھی۔ اسپارک دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اپنی جگہ پر رک گیا۔ اگلے دو سیکنڈ میں دروازے کی زنجیر گرائے جانے کی آواز واضح طور پر سنائی دی اور فینی نے دروازہ کھول کر ذرا سی گردن باہر نکال کر اس کی جانب دیکھا۔ یہ گرین سگنل تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے واپس لوٹ گئی تھی۔ اسپارک کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اپنے ساتھ موجود غلاموں کو لے کر وہ حویلی میں داخل ہو گیا اور درمیانی دروازہ کھلا چھوڑ دیا تا کہ مزید غلام بھی اس کے پیچھے حویلی میں آ جائیں۔ وہ سب فینی کی قیادت میں اس کمرے تک پہنچ گئے جہاں اسلحہ رکھا تھا۔ پوری حویلی رات کے سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ملازمہ کی خون میں لت پت لاش لاؤنج میں پڑی دور سے دکھائی دے رہی تھی جسے دن نکلتے ہی اٹھا کر قریبی جنگل میں پھینک دیا جاتا جہاں وہ جنگلی جانوروں کی خوراک بن جاتی۔ اسپارک کو یہ سوچ کر جھرجھری سی آ گئی۔ پامیلا جیسی روحانی پیشوا کی لاش بھی یوں ہی جنگلی جانوروں کی نذر کر دی گئی تھی۔ اسے اپنی مذہبی رسومات بھی نصیب نہ ہوئی تھیں، اس کی لاش لاوارث سمجھ کر پھینک دی گئی۔ اس احساس کے ساتھ ہی اسپارک کے سارے بدن میں غصے کی لہر ابھری، وہ اپنے ہاتھ میں تیز دھار والی تلوار لیے پیٹریانک کے کمرے میں داخل ہو گیا جو اس کا پہلا مجرم تھا، جس کی قوتِ خرید کے سبب وہ دونوں میاں بیوی اس بلند و بالا حویلی میں موجود تھے اور یہ وہ رات تھی جب حویلی میں ماسٹر اور اس کا کوئی رشتے دار باقی نہ بچا سوائے ان غلاموں کے جو حویلی میں دندناتے پھر رہے تھے جنہیں خریدنے کے لیے پیٹریانک لاکھوں روپیہ صرف کرتا تھا۔ آج وہی اس کی موت بن گئے اور اس کے خاندان کا نام و نشان ہی مٹا دیا۔ سچ ہے نفرت انتقام کی سیڑھی پر رکھا جانے والا پہلا قدم ہے۔ دن کا سورج نکلنے سے پہلے حویلی غلاموں سے خالی ہو گئی۔ جب علاقے کا چیف اس حویلی میں پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ غلاموں نے پیٹریانک اور اس کے خاندان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا جو اپنے ماسٹر کے وفادار تھے۔ ساری حویلی خون سے رنگین تھی اور ہر طرف انسانی لاشوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا حیرت کی بات یہ تھی کہ فرار ہونے والوں نے حویلی سے کوئی قیمتی چیز نہ اٹھائی تھی۔ شاید انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک سب سے قیمتی شے ان کی اپنی جان تھی جسے بچا کر وہ اس حویلی اور ڈیرے سے نکل گئے۔

⌘⌘⌘

دو چھوٹے شہروں کو آپس میں ملانے والی پچیس کلومیٹر لمبی یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار سڑک جس کے سینے پر چھوٹی بڑی موٹریں اور بسیں ڈولتی ڈگمگاتی گزرتی تھیں، اپنی شکستہ حالی کے باوجود ہزاروں افراد کے روزگار کی ضامن تھی۔ ہر روز بیسیوں لوگ اس کے ذریعے ملازمتوں پر جاتے تھے، کارخانوں اور دفاتر جاتے تھے، سامان نقل و حمل کرتے تھے۔ دونوں شہروں کے وسط میں اس سڑک کے کنارے پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ ان پہاڑیوں سے محض چالیس کلومیٹر دور بارڈر تھا۔ یہ بات سرکاری ایجنسیوں اور پولیس سے لے کر ان دو سرحدی شہروں کے عام باشندوں تک کو معلوم تھی کہ یہ پہاڑیاں بارڈر پار سے ہونے والی اسمگلنگ کا گڑھ ہیں۔ چار یا چھ ماہ بعد کبھی کبھی قانون نافذ کرنے والے

لمبی چھلانگ لگانے والے چند کھلاڑیوں کا اناڑی انداز

خطائیں کرکے مذاق میں اڑا دینے سے سزائیں معاف نہیں ہو جاتیں... یہ حقیقت جب ان بے وقوفوں پر کھلی تو گیدڑ کے مانند شہر کی جانب بھاگ جانے کا خیال انہیں کچھ لمحات کے لیے تو مسحور کر گیا لیکن خطاؤں کی سنگینی نے ان کے چودہ طبق روشن کر ڈالے کیونکہ ... مجرمانہ کارروائیوں میں نہ کوئی سجن ہوتا ہے نہ دشمن... بس ایک ایسی اجنبیت ہوتی ہے کہ کسی بھی آنکھ میں اپنا عکس نظر نہیں آتا۔

بھائی بند

علی امجد

اداروں کو ہوش آتا تھا اور وہ یہاں پر کریک ڈاؤن شروع کر دیتے تھے۔ اس کریک ڈاؤن کو بھی خفیہ نہیں رکھا گیا بلکہ یہ خبر اخبارات میں بڑے فخر کے ساتھ چھپوائی جاتی تھی کہ کریک ڈاؤن فلاں تاریخ سے شروع ہو رہا ہے اور فلاں تاریخ تک جاری رہے گا تاکہ اسمگلر دوست ہوشیار ہو جائیں۔ ہم بھی انہی میں سے تھے۔

شہر کے بچے بچے کی زبان پر یہ بات تھی کہ پولیس اسمگلروں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنا حصہ لے کر اسمگلنگ کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ باوجود یہ کہ اس اسمگلنگ کے فیض و برکات مقامی لوگوں کو براہ راست حاصل ہوتے تھے مگر پھر بھی لوگ اسمگل شدہ سامان خریدتے تھے اور اسے پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ جہاں تک بات ہے قانون اور اسمگلروں کی ملی بھگت اور ان کے باہمی تعاون کی تو اس کی صداقت کے بارے میں حتمی فیصلہ صادر کرنا مشکل ہے کیونکہ اپنے دو سالہ کیریئر میں ہمیں بھی پولیس والے بھائیوں کو ان کا ''حق'' نہیں دینا پڑا تھا۔

''وہ بھی کیا دن تھے یار پومی! وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے نا؟''

میں نے گردن موڑ کر اکمل کو دیکھا جو ایک نسبتاً سیدھی چٹان پر یوں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا جیسے شہنشاہ اکبر دربار جما کر بیٹھا ہو مگر اداس تھا۔

اس نے پھر کہا۔ ''پومی! تجھے یاد ہے، اس منحوس بزنس میں پڑ کر ہم نے کیا کھویا ہے؟'' مجھے چپ پا کر اس نے مزید اداس ہو کر کہا۔ ''ہم نے بچپن کھو دیا...... بچپن کے یار کھو دیے۔ کیا دن تھے جب ہم سارا دن محلے میں آوارہ گردیاں کرتے تھے۔ شاہ، باسم، ٹومی، چڑیا، حامد گینڈا، اچھو شاکا، عامر وغیرہ...... یہ سب لوگ ہمارے ساتھ ہوتے تھے مگر وہ وقت گزر گیا...... یار! بڑے ظلم کی بات ہے۔ وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے، یوں کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ زندگی وہ ریت ہے کہ جو لمحہ لمحہ مٹھی سے سرکتی جا رہی ہے۔''

میں نے بھنا کر کہا۔ ''فلاسفر کی اولاد! کیا خاک تیزی سے گزرتا ہے وقت۔ ایک ایک پل صدیوں پر پھیلا ہوا لگ رہا ہے۔ ہمیں کتنی دیر ہو گئی ہے۔ ان لوگوں نے ابھی تک سامان نہیں پہنچایا۔ پتا نہیں کہاں مر گئے ہیں۔''

وہ میری اس بات کا اثر لیے بغیر بولا۔ ''پومی یار! تُو نے مجھے خوامخواہ اس دھندے میں گھسیٹ لیا۔ میں گزرے ہوئے وقت کو بہت مس کرتا ہوں۔ بھلا اب وہ وقت کیسے واپس آسکتا ہے۔''

''چھوٹے آدمی! تیری سوچ کب بڑی ہوگی؟'' میں نے جل کر کہا۔ ''تو ہر چوتھے روز گزرے وقت کو یاد کر کے اداس ہو جاتا ہے۔ بیوقوف آدمی! تجھے میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ میں نے تجھے اپنے کاروبار میں فی سبیل اللہ شامل کر لیا ورنہ تو اب بھی خالی جیب، بیروزگار محلے کے نکھے یاروں کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہا ہوتا۔ تیرے دن کا آغاز باپ کی لعنت ملامت سے ہوتا اور رات کو ٹھیک ٹھاک گالیوں سے عزت افزائی کروا کر تو سکھ کی گہری نیند سوتا۔ نہ تیری جیب میں نوٹ ہوتے، نہ گھر میں تیری قدر ہوتی۔''

''اب کون سی ہوتی ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''ماں روتی پیٹتی رہتی ہے کہ تجھے پیدا کیا تھا کہ تُو محنت کر کے حلال کما کر کھائے گا۔ تو اپنے ایک خبیث دوست کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر اسمگلر بن گیا ہے۔''

میں نے اپنے کردار پر حملہ ہوتے دیکھا تو پینترا بدل کر کہا۔ ''اکمل، میرے دوست! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ہم محلے کے تمام دوستوں سے زیادہ کما رہے ہیں۔ تُو نے دیکھا ہی ہوگا، جب سے ہم نے کام شروع کیا ہے، گھر والوں کے رویے میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ میرا اباپ دن میں دو مرتبہ بلاناغہ دیسی اور ولایتی ملی جلی اسپیشل گالیوں سے میری عزت افزائی کرتا تھا کہ میں گدھے جتنا بڑا ہو گیا ہوں اور اپنا مستقبل بنانے کے بجائے لوفر دوستوں کے ساتھ قیمتی وقت برباد کر رہا ہوں۔ اب ہر مہینے بڑے نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں پکڑاتا ہوں تو ظاہر نہیں ہونے دیتا مگر اندر سے بہت خوش ہوتا ہے۔ نہ اب گالیاں دیتا ہے، نہ جوتوں سے مرمت کرتا ہے۔''

''تیرا باپ ٹھہرا لالچی آدمی۔'' اکمل نے عادت سے مجبور ہو کر بغض نکالا کیونکہ وہ بھی کئی مرتبہ میرے باپ کی گالیوں کے ذخیرے سے ٹھیک ٹھاک مستفیض ہو چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اور اپنے باپ کو بھی بھول نہ جایا کر...... سارا محلہ جانتا ہے کہ چاچے افضل نے زندگی میں نہ تو کوئی نماز چھوڑی ہے، نہ کوئی خوبصورت عورت۔ جو بھی اس کے کریانے اسٹور پر آئی، متاع عزت و ناموس کی فروخت کے لیے بولی لگوا کر گئی......''

''بکواس ہے یہ سب۔ ابا دکان کی ساری آمدن اماں کے ہاتھ پر لا کر رکھتا ہے۔ پتا نہیں لوگوں نے کیوں یہ بات مشہور کر رکھی ہے۔''

''بیٹا! دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں پر آگ ہوتی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ فضول باتیں چھوڑ، مجھے تو ٹینشن ہو رہی ہے کہ ابھی تک سامان نہیں پہنچا ہے۔ کہیں ان لوگوں

کے ساتھ راستے میں گڑبڑ نہ ہوگئی ہو۔“

اسی دوران یکلخت روڈ کی طرف سے ایک ٹرک پہاڑیوں کی طرف مڑا۔ میں تو پہلے ہی نیچی جگہ پر ایک چٹان کی جڑ میں بیٹھا ہوا تھا جبکہ اکمل نسبتاً اونچی چٹان پر بیٹھا تھا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سیدھی اس پر پڑی تو وہ پھرتی سے چٹان پر سے پھسل کر نیچے اندھیرے میں آگیا۔

”یہ کون ذلیل کا تخم آگیا؟“

”اپنے ہی بھائی بند ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بڑے ہی بے خوف معلوم ہوتے ہیں۔ لائٹس بند ہی نہیں کیں۔“

”اسی طرح ایک دن پولیس آئے گی اور ہم دونوں پکڑے جائیں گے۔“ اکمل نے ہمیشہ کی طرح امکان کا اظہار کیا۔

”بیٹا تو مر سکتا ہے، پر بزدلی کی باتیں چھوڑنا تیرے بس کی بات نہیں، منحوس آدمی! پیسا کمانے کے لیے دل سے خوف نکالنا پڑتا ہے۔ ڈھائی سال سے تیری بکواس سن رہا ہوں...... پکڑے جائیں گے...... پکڑے جائیں گے...... پکڑے جانا ہوتا تو اب تک آزاد گھوم رہے ہوتے؟“ میں نے غصہ ہو کر کہا۔

”اگر ہم لوگ یہ کام نہ کرتے تو اب ہماری کیا اوقات ہوتی؟ نہ تیری روزی سے شادی ہو پاتی، نہ محلے کی سب سے خوبصورت لڑکی صومی میرے گن گاتی۔“

اس نے اعتراف کرلیا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے پومی! روزی کا قصائی باپ کبھی اس کا ہاتھ مجھے نہ دیتا اگر میرے پاس روپیہ نہ ہوتا لیکن تجھے یاد ہے نا وہ وعدہ جو ہم نے ڈھائی سال پہلے کیا تھا؟“

”ہاں ہاں۔ فکر نہ کر۔ جیسے ہی ہمارے پاس مناسب پیسا اکٹھا ہو جائے گا، ہم اسمگلنگ چھوڑ کر کوئی مناسب کاروبار کرلیں گے۔“ میں نے کہا۔ اسی دوران میں میرے پاس موجود مخصوص ٹرانسمیٹر نے شور مچانا شروع کردیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سامان پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں مستعدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

یہ شاید پریشانی سے آگے کا مرحلہ تھا۔ رات غارت ہوگئی تھی۔ نیند کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ صبح اٹھا تو موڈ خراب...... اماں سے بدتمیزی کی، ابا سے اکڑ کر بات کی اور صلے میں گالیوں کی ایک بوچھاڑ حسب معمول وصول کی پھر سارا دن کمرے میں پڑا اکڑھتا رہا۔ ابھی دن کے دو بجے تھے اور میں اکمل سے ملنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا گھر عقبی گلی میں غربی نکڑ پر تھا۔ اس کے گھر جانے کے لیے مجھے خاصا طویل چکر کاٹ کر جانا پڑتا تھا۔

راستے میں وحید عرف استاد سائیکل سے ملاقات ہوئی جو عین جوانی میں سر سے گنجا ہوگیا تھا۔ میری دستک کے جواب میں اکمل باہر گلی میں ہی آگیا۔ ہم اس کے گھر کے قریب چائے اسٹال میں آبیٹھے۔ وہ چائے آرڈر کرنے کے بعد میرا بغور جائزہ لے کر بولا۔ ”لگتا ہے تو رات بھر نہیں سویا؟“

”تیرا کیا خیال ہے...... اتنا نقصان سہنے کے بعد سکھ کی گہری نیند سوتا؟“

”پومی! یہ تو قسمت کی بات ہے یار!“ وہ سستی سے جماہی لے کر بولا۔

میں نے جل کر کہا۔ ”تو، تو خوب گہری نیند سویا ہوگا؟“

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”شادی شدہ ہوں بھائی۔ جب محبوبہ بیوی کے روپ میں پہلو میں ہو تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بندے کو کانوں پر بھی گہری نیند نہ آئے۔ دیکھ پومی! میں تو کہتا ہوں تو بھی اب شادی کرلے۔ اس سے پہلے کہ استاد سائیکل کی طرح تیرے سر میں سے بھی گھٹنا برآمد ہو جائے۔ اب عمر بہت ہوگئی ہے تیری، دیر نہ کر۔“

میں نے بتایا۔ ”ابھی ملا تھا منحوس شادی ہال کے سامنے، چہرے پر ازلی نحوست لیے ہوئے۔ سر ہوگیا، کہتا تھا خوب رو گڑا چھاپ رہے ہو اسمگلنگ سے۔ میں نے کہا بدبخت! تجھے کس بدبخت نے کہہ دیا کہ ہم اسمگلنگ کررہے ہیں۔“

”بھائی عشق، مشک اور اسمگلنگ چھپائے نہیں چھپتے۔ آہستہ آہستہ ہماری شہرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم یہ کام جتنی بھی احتیاط سے کریں، محلے کے زیادہ تر لوگوں کو پتا چل چکا ہے کہ ہم اسمگلر بن چکے ہیں۔ خیر، اس بیکار موضوع کو بھاڑ میں ڈال۔“ اس نے چائے کا پہلا سپ لیا پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ”یہ بتا، صومی کیا کہتی ہے؟“

”وہ کیا کہہ سکتی ہے ماسوائے کوئی بزنس کرنے پر زور دینے کے۔“ میں نے کہا۔ ”شادی کے لیے بھی اس نے شرط رکھی ہوئی ہے۔ تم تو جانتے ہو۔ یہ بھی جانتے ہو کہ وہ کس قدر ضدی ہے۔ ٹس سے مس نہیں ہوگی۔“

”بیٹا! وہ تجھے دوالیا کر کے چھوڑے گی۔ لوٹ کے کھا رہی ہے وہ تجھے...... اس طرح تو بزنس نہیں ہوسکتا نا...... نہ پیسا جمع ہوگا، نہ کاروبار شروع ہونے کی نوبت آئے گی۔“

میں نے موضوع لپیٹ کر کہا۔ ”تو چھوڑ صومی کو...... ابھی میں تفتیش کرنے آیا ہوں۔“

”تفتیش؟“

”ہاں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”کس سے تفتیش؟“

"تجھ سے۔" میرا انداز دوٹوک تھا۔ "کیونکہ میں سامان کو لوڈ کروائے بغیر چلا گیا تھا۔ صومی کو مارکیٹ میں لڑکوں نے چھیڑا تھا۔ میں ہنگامی حالات کے پیشِ نظر چلا گیا تھا۔ سامان لوڈ کروایا تو نے...... جب ہمارا سامان والا کیری ڈبا پہاڑیوں سے نکلا تو... تو نے مجھے بتایا تھا لیکن ٹھیک بیس منٹ بعد تو نے بتایا کہ اڈا احمد نگر کے پاس ڈاکوؤں نے تجھے روک لیا اور تجھے گن پوائنٹ پر بے بس کر کے سارا سامان لے گئے۔"

"ہاں، تو اس میں تجھے کیا شک ہے؟"

"مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی کہ ڈاکوؤں میں روشن دادا کا گرگا ٹوڈر بھی تھا۔"

"تو ٹوڈر، ڈاکوؤں میں شامل نہیں ہو سکتا؟" وہ بُرا مان کر بولا۔ "تجھے نہیں معلوم کہ وہ روشن دادا کا سب سے بدنام کارندہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "روشن دادا کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تین ماہ تک اس کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ میں نے جیب کترنا اسی کی سرپرستی میں سیکھی تھی۔ وہ بہت بااصول بندہ ہے۔ اپنے ایریے کے لوگوں کو وہ تنگ نہیں کرتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کا گرگا ٹوڈر تجھے پہچان کر بھی لوٹ مار سے باز نہ آئے جبکہ تو کہتا ہے کہ اس نے تجھے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔"

اکمل منہ پھلا کر بولا۔ "تو سیدھا سیدھا مجھ پر شک کر رہا ہے پومی! شرم کر۔"

"لاکھوں کا نقصان ہوا ہے اکمل! یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اتنا نقصان ہم کیسے سہہ سکتے ہیں۔ کون ہمیں ادھار پر سامان دے گا اب؟" میں نے کہا۔ "ہمیں ہر پہلو کو مدِنظر رکھنا ہوگا تاکہ کسی نتیجے پر پہنچا جا سکے۔"

اکمل بولا۔ "نتیجہ نکل بھی آتا ہے تو کیا ہو جائے گا؟ کیا روشن دادا سے وہ مال بازیاب کروالیں گے ہم؟"

میں نے گہری سانس لی۔ "یہی تو پریشانی کی بات ہے۔ روشن دادا ہمارے ایریے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر چڑیا پر نہیں مار سکتی لیکن سچ پوچھو تو ابھی تک مجھے یقین نہیں آرہا۔ یہ تمہاری آنکھوں کا دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ٹوڈر ہی تھا؟"

"سو فیصد۔" وہ وثوق سے بولا۔

میں نے کچھ سوچا پھر کہا۔ "میں روشن دادا کے پاس جاؤں گا۔"

"روشن دادا کے پاس؟" وہ متعجب ہو کر بولا۔

"اسے یہ کہنے کہ روشن دادا! تیرے کارندے ٹوڈر نے ہمارا سامان لوٹا ہے، ہمارا سامان لوٹا دو؟"

"اور تیرا خیال ہے کہ وہ غنڈا موالی تیری بات غور اور تحمل سے سنے گا اور پھر کہے گا کہ اوکے، ہو گیا بادشاہو...... آپ کا حکم سر آنکھوں پر...... ابھی آپ کا سامان لوٹائے دیتے ہیں۔"

میں نے جھلا کر کہا۔ "احمق آدمی! وہ ایسا کیوں کہے گا؟ لٹیرے بہت بااصول ہوتے ہیں۔ تشدد سہہ لیتے ہیں، جیل کی ہوا کھا لیتے ہیں مگر کبھی لوٹا ہوا مال واپس نہیں کرتے۔"

"یہ بتا کہ روشن دادا کے پاس جانے کا کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے کہا۔ "ظاہر ہے وہ آسانی سے لوٹا ہوا مال لوٹانے پر رضامند نہیں ہوگا۔ میں اسے جذباتی طور پر ڈھب پر لانے کی کوشش کروں گا۔ کہوں گا کہ تم تو اپنے ایریے میں واردات نہ کرنے کے حوالے سے مشہور ہو۔ مقامی لوگ تمہاری عزت کرتے ہیں...... تمہارے انہی بے مثال اصولوں کی وجہ سے۔ تمہارے آدمی نے ہمارا سامان لوٹا ہے تو اب تم پر اخلاقی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ اپنے بے مثال اصول کی پاسداری کرتے ہوئے مالِ مسروقہ کی واپسی یقینی بناؤ۔"

"اور وہ واقعی شرافت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے مالِ مسروقہ کی واپسی یقینی بنا دے گا؟"

"اے منحوس شخص! تُو کیوں اس بات پر تل گیا ہے کہ وہ سامان واپس نہیں لینا۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ اسمگلنگ کی دنیا میں ہماری موجودگی کی واحد ضمانت وہ سامان ہی ہے ورنہ ہمارا دھندا ختم۔"

"بات تو، تو ٹھیک کہہ رہا ہے پومی!" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "تو جو کرنا چاہتا ہے کر لے۔ بندے کو آخر تک کوشش کرتے رہنا چاہیے لیکن مجھے کوئی زیادہ امید نہیں ہے۔"

☆☆☆

میں نے چائے کا آخری سپ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چائے کا ذائقہ اتنا ہی تلخ تھا، جتنی اس وقت میری زندگی تلخ ہو چکی تھی۔ میں نے چور نظروں سے کاؤنٹر پر بیٹھے ماسٹر غنی کو دیکھا جو منہ میں پان کا بھرکس نکالتے ہوئے اپنے ہوٹل کے ہال میں میلی کچیلی کرسیوں پر بیٹھے اکا دکا افراد کو نوٹس کر رہا تھا پھر خاموشی سے دروازے کی سمت لپکا تو کمینے ماسٹر غنی کی پاٹ دار اور پھٹے اسپیکر جیسی خوفناک آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ "پومی جی! ارے پومی جی!"

"کیا ہوا غنی؟" میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

وہ کوئی شرم لحاظ کیے بنا بولا۔ "لگتا ہے پومی جی کا ہاتھ ذرا تنگ ہے آج کل۔ کیوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

وہ بے شرم انسان کسی کا بھرم رکھنے کا روادار نہیں تھا۔ کئی بار اس کی انہی حرکتوں کے باعث اس سے جھڑپ ہو چکی تھی۔

اس سے پیشتر کہ وہ اپنے گلے میں نصب قدرتی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے مجھے مزید خجالت سے دوچار کرتا، میں نے عزت بچانے کے لیے اس کے قریب آکر کہا۔ ”کھاتے میں لکھ لے یار!“

”او کے ہوگیا پومی جی!“ وہ دانت نکال کر گویا ہوا۔ ”کاروبار کیسا چل رہا ہے؟ لگتا ہے بیٹھ گیا ہے ورنہ تم چائے پی کر یوں چپ چاپ کھسکنے کی کوشش نہ کرتے...... بنا بل ادا کیے۔“

اس کی آواز اب بھی خاصی بلند تھی۔ وہ رجسٹر کھینچ کے چائے کھاتے میں لکھنے لگا تو میں نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ اب چلتا ہوا کاروبار بیٹھ گیا تھا تو میں ذلیل ہو رہا تھا۔ زیرو بجٹ کی پالیسی دو ہی دن میں مجھے اس مقام پر لے آئی تھی کہ مجھے ماسٹر غنی کے گھٹیا ہوٹل سے ادھار چائے پینا پڑی تھی۔

مجھے اکمل منحوس پر غصہ تھا۔ اسی کی موجودگی میں سامان لٹا تھا لیکن وہ بے چارہ بھی کیا کرتا۔ اکمل کی کم ہمتی اور ازلی سستی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ نہ تو کسی مسئلے کا حل نکال سکتا تھا، نہ کوئی قابل عمل مشورہ دے سکتا تھا۔ میری پریشانی کی وجہ ابا تھا جو زندگی کا پیمانہ روپے کو سمجھتا تھا۔ جونہی میں بیروزگاری کے قعر میں گروں گا، ابا جھٹ سے اپنی پرانی جون میں آجائے گا۔

اکثر دوست ایام بیروزگاری کاٹنے اور طویل عرصے تک چھوٹی موٹی نوکری کے حصول کے لیے جوتیاں چٹخانے کے بعد مایوس ہوکر اپنے باپ کی دکانوں پر بیٹھ چکے تھے یا اپنے آبائی اور خاندانی پیشے کو 'مرتا کیا نہ کرتا' کے مصداق قبول کر چکے تھے اور بغاوت پر اکسانے والے اونچے اونچے خوابوں سے توبہ کر چکے تھے۔ مجھے یہ سہولت بھی میسر نہ تھی۔ ابا میونسپل کمیٹی سے سینئر ہیڈ کلرک ریٹائرڈ ہوا تھا۔ گویا میں اپنے آبائی یا خاندانی پیشے سے منسلک ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ابا کی قلیل پنشن اگرچہ ایک خاندان کو پالنے کے لیے ناکافی تھی لیکن یہاں خاندان بڑا ہی کتنا تھا؟ تین لوگ تھے ہم...... ابا، اماں اور یہ خاکسار......

اسمگلنگ کا سامان پہنچانے والے کاروباری اصولوں کو لے کر بڑے بے رحم تھے۔ پہلے پیسا وصول کرتے، بعد میں سامان ہینڈ اوور کرتے تھے۔ ادھار کا رواج نہیں تھا۔

قہوہ نما چائے کی کڑواہٹ ابھی تک گلے میں گھلی ہوئی تھی۔ میں بے دلی سے پُرہجوم روڈ پر چلتے چلتے اکمل کے فلیٹ تک چلا گیا۔ بیل بجانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ روزی بلیک ٹائٹس میں ملبوس فلیٹ کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ اس نے اپنے قد سے بڑے جاگرز پہن رکھے تھے۔

”ہائے روزی!“ میں نے اس کے قریب جاکر مسکرا کر کہا۔

”ہائے۔“ اس نے چیونگم چباتے چباتے کہا۔ ”ہیرو، کدھر؟“

”تمہارا ہیرو کدھر ہے؟“ میں نے اکمل کے بارے میں پوچھا۔

”میرا کون سا ہیرو؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔

میں نے کہا۔ ”تمہارے مجازی خدا کی طرف اشارہ ہے میرا۔“

”وہ مجازی خدا پتا نہیں کہاں غائب ہے صبح سے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”یا تمہارے ساتھ ہوتا ہے، یا گھر میں پڑا رہتا ہے۔ تیسرا کوئی کام نہیں ہے اسے۔“

”کچھ تو شرم کرو روزی! آخر وہ شوہر ہے تمہارا۔ زیادہ نہ سہی، تھوڑی بہت عزت تو بنتی ہے اس کی۔“

وہ تنک کر بولی۔ ”تجھے کیوں مرچیں لگ رہی ہیں۔ تو اپنی گھر والی سے کروالینا اپنی عزت۔ مجھ سے نہیں ہوتی۔“

”خیر، مجھے اندر آنے دو۔ میں اکمل کا انتظار کروں گا۔ بہت ضروری کام ہے اس سے۔“

اس نے ناک سکیڑی۔ ”اب کون سا کام رہ گیا ہے؟ دھندا تو چوپٹ ہوگیا۔“

”ہائیں...... اکمل منحوس نے تجھے بھی بتادی یہ بات؟“

”تو کیا نہ بتاتا۔ میں اس کی بیوی ہوں۔“

”دیکھ لے روزی! تیرے بدبخت خصم نے تباہی پھیر دی ہے۔ اب تجھے پتا چلے گا، جب اکمل کے پاس روپیہ نہیں ہوگا تو تجھے پتا چلے گا کہ پومی کس بلا کا نام ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”میں اتنی مطلب پرست اور بے وفا نہیں ہوں۔ برا وقت بھی کاٹ لوں گی لیکن تیری وہ صوفی تجھے شادی سے پہلے ہی تین طلاقیں دے دے گی۔“

”وہ ایسی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وفا اس کے خمیر میں شامل ہے۔“

”خوش فہمی ایک خاص حد تک خوش فہمی رہتی ہے۔ ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو بیوقوفی بن جاتی ہے۔“ اسی دوران میں اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو وہ کال ریسیو کر کے ”ہیلو فریحہ“ کہتی ہوئی فلیٹ کے دروازے میں غائب ہوگئی۔ میں فلیٹ کے بند دروازے کو دیکھتا رہا پھر واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے شدید حیرت نے آدبوچا۔ میں نے کچھ دور سے دیکھا، ابا نے ہاتھ میں پائپ پکڑا ہوا تھا۔ اس کے پاس کھڑی مہان شخصیت کوئی اور نہیں تھی

بلکہ وہ وہی شخصیت تھی جس کے گھر سے میں ابھی ٹھیک ٹھاک بے عزتی کروا کے آرہا تھا۔

''تو یہاں کھڑا ہے، میں ابھی تیرے گھر سے ہو کر آرہا ہوں۔'' میں نے قریب جا کر اکمل سے کہا۔

''حامد کا رکشا الٹ گیا تھا، سبزی منڈی کے پاس۔ وہ رکشے میں سبزیاں لے کر آرہا تھا۔ میں اس کی مدد کرنے چلا گیا تھا۔'' اکمل نے بتایا۔ ''بیچارے کو بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔''

''اپنی بیوی کو تو بتا کر جاتا۔ بڑے خونخوار تیوروں کے ساتھ وہ تیرا انتظار کر رہی تھی۔''

اور پھر ہم دونوں وہاں سے کھسک کر مین روڈ پر چڑیا کے کھوکے پر جا پہنچے۔ چڑیا ہمارا بچپن کا یار تھا۔ ہمیں دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ''ارے اکمل اور پومی! کتنے دنوں بعد اپنی شکلیں دکھا رہے ہو۔ کس حوالات میں بند رہے ہو؟''

چڑیا کو ہم سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا تھا۔ یوں تو وہ یاروں کا یار تھا لیکن یہ بات ہمیں بچپن سے ہی بہ خوبی معلوم تھی کہ چڑیا کسی کے کام آنے کو اپنی توہین سمجھتا تھا۔

میں نے پھر بھی چڑیا کو مخاطب کیا۔ ''چڑیا! تجھ سے ایک کام پڑ گیا ہے۔''

''مجھ سے؟'' چڑیا ہمیشہ کی طرح بدک گیا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''دیکھ پومی! تو یار ہے اپنا۔ میں یاروں کا یار ہوں مگر ہاتھ بہت تنگ جا رہا ہے آج کل۔ حالات تیرے سامنے ہیں۔''

''چڑیا کے بچے! ہو گیا تیرا رونا دھونا اسٹارٹ؟'' میں نے برا مان کر کہا۔ ''تو سمجھ رہا ہے کہ ہم تجھ سے ادھار مانگنے آئے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''تو کیا نہیں مانگنے آئے ہو؟''

''ہرگز نہیں۔''

اس کی جان میں جان آئی۔ ''تو پھر کیا کام ہے مجھ سے؟ حکم کرو، یاروں کے لیے تو چڑیا کی جان بھی حاضر ہے۔''

میں نے اس کے بے مثال خلوص پر کہا۔ ''بے شک، بے شک۔ خیر، کام تجھ سے یہ ہے کہ روشن دادا کا دستِ راست حنیف کسی زمانے میں تیرا بڑا دوست رہا ہے، اسے اپروچ کرنا ہے۔''

چڑیا کے چہرے پر سنجیدگی کی پرچھائیاں لرزیں۔ ''خیریت؟''

جواباً میں نے اسے تمام قصۂ غم کہہ سنایا تو وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ''پومی! اس میں خطرہ بہت ہے۔ روشن دادا بہت ظالم آدمی ہے۔''

''یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ......'' میں ایک راز کو کھولتے کھولتے رہ گیا۔ ''یار! اسی لیے تو تیرے پاس آئے ہیں۔ تو حنیف سے بات کر کہ وہ ہمیں روشن دادا سے ملوا دے۔''

چڑیا نے کہا۔ ''حنیف سے میرے تعلقات بہت پہلے ختم ہو چکے ہیں۔''

''بہت کمینہ پایا گیا ہے تو۔'' اکمل نے اسے گھورا۔ ''تو جیتے جی کسی کے کام نہیں آئے گا۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں اکمل!'' چڑیا منمنایا۔

میں نے بیچ میں حصہ ڈالا۔ ''بے شک تو سچ کہہ رہا ہے لیکن حنیف کے ساتھ تیری خدانخواستہ دشمنی تو نہیں ہے نا۔ تو بات کرے گا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔''

''اچھا۔'' وہ نیم رضامندی سے بولا۔ ''میں بات کر کے دیکھوں گا۔''

☆☆☆

ٹوڈر کی آنکھوں کی لالی خاصی خوفناک تھی۔ اس نے روشن دادا کے سامنے بہ مشکل غصہ قابو کرتے ہوئے مجھے آنکھیں دکھائیں۔ ''تیرے جیسے چوہوں کو ٹوڈر پاؤں کے نیچے مسل دیتا ہے۔ مجھ پر الزام تراشی کی سزا جانتا ہے؟''

میں نے اسے نظرانداز کر کے مسہری پر سستی سے لیٹے روشن دادا کو مخاطب کیا۔ ''روشن دادا! بھلا آپ کے سامنے غلط بیانی کرنے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟ میرے دوست نے خود ٹوڈر کو ان ڈاکوؤں کے ساتھ دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے اکمل اور کیری ڈبے کے ڈرائیور کو اسلحے کی نوک پر یرغمال بنایا اور سامان لوٹ کر لے گئے۔ روشن دادا! ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ کا تو یہ اصول دور دور تک مشہور ہے کہ روشن دادا اپنے علاقے کے لوگوں کو تنگ نہیں کرتا۔ میں آپ کا محلے دار بھی ہوں اور بہت عرصہ پہلے آپ کے ماتحت کام بھی کر چکا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے انصاف دیں۔''

روشن دادا نے ٹوڈر سے کہا۔ ''ٹوڈر! دیکھ لے، تو جانتا ہے نا کوئی چیز زیادہ دیر تک روشن دادا سے چھپی نہیں رہتی۔''

''میں خدا، رسول کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایسی کوئی واردات نہیں کی۔'' ٹوڈر نے کہا۔ ''اور پھر میں آپ کے سامنے جھوٹ بولوں گا؟''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے روشن دادا! اکمل نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ تین اور لوگ بھی تھے۔''

روشن دادا نے کہا۔ ''تیرا دوست اکمل تیرے ساتھ

کیوں نہیں آیا؟ اصل بندہ تو وہی ہے نا جس نے ٹوڈر کو دیکھا تھا۔"

میں نے بتایا۔ "اکمل بہت بزدل ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ روشن دادا ناحق کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے لیکن اس کے دل میں آپ کو لے کر بہت خوف بیٹھا ہوا تھا اور پھر کل شام سے وہ شہر میں بھی نہیں ہے۔ اس کی ساس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ وہ شام کو ہی اپنی بیوی کے ساتھ نکل گیا تھا۔"

روشن دادا نے کچھ دیر تک کسی "ذہین منصف" کے مانند مراقبہ کیا۔ میری دھڑکنیں اتھل پتھل ہوتی رہیں۔

"دیکھ بھئی، روشن دادا کی ایک ساکھ ہے۔ روشن دادا یونہی جلدی میں غلط فیصلے نہیں کرتا۔ تیرے دوست کا یہاں پر موجود ہونا ضروری ہے۔ اصل مقدمہ تو ٹوڈر کا اور اس کا ہے...... پھر ہی میں فیصلہ کروں گا۔"

میں نے خوشامدی انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے روشن دادا! جو آپ کا حکم۔ جیسے ہی اکمل اپنے سسرال سے لوٹے گا، میں اسے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ دروازے کھلے ہیں۔ جب چاہو آجانا۔" روشن دادا نے ایک "عوامی جج" کے سے جاہ و جلال کے ساتھ کہا۔

میں ٹوڈر کی غصیلی نظروں سے بچتا بچاتا روشن دادا کی حویلی سے باہر نکل آیا اور ماتھے پر رینگ آنے والا پسینا پونچھ کر روڈ پر نکل گیا۔ ابھی میں چند گز ہی چلا تھا کہ اچانک دو آدمی میرے دائیں بائیں نمودار ہوئے۔ ایک کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ انہوں نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑا اور کھینچ کر بجلی کی سی سرعت سے ایک تنگ سی ذیلی گلی میں لے گئے۔

"چھوڑو مجھے۔" میں نے زور لگایا۔

"بکواس بند کرو۔" ایک نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ تنگ سی گلی جو رہائشی مکانات پر مشتمل تھی، بالکل ویران پڑی تھی۔ وہ دونوں مجھے پُرہجوم روڈ پر سے جس دیدہ دلیری کے ساتھ گھسیٹ کر اس گلی میں لائے تھے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ وہ سکہ بند غنڈے تھے۔

گلی کا اختتام ایک بڑے خالی پلاٹ پر ہوا۔ پلاٹ میں ایک جگہ گھنی جھاڑیوں کا جھنڈ تھا۔ وہ مجھے جھنڈ کی طرف دھکیلنے لگے تو مجھے ان کا منصوبہ سمجھ میں آ گیا۔ "ٹوڈر! دیکھ تو اچھا نہیں کر رہا۔"

ٹوڈر نے مجھے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "چپ۔"

"میں عزت کے معاملے میں بڑا حساس ہوں ٹوڈر۔"

میں نے بظاہر دھمکی اور اندرونِ خانہ دہائی دی لیکن انہوں نے میری دہائی کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور مجھے جھاڑیوں کے جھنڈ تلے جا پھینکا اور خوب ٹھکائی لگائی اور چلے گئے۔

میں نے انہیں فرار ہوتے دیکھا تو چیخ کر کہا۔ "ٹوڈر! سؤر کے بچے! میں روشن دادا کو بتاؤں گا۔"

ٹوڈر لمحہ بھر کے لیے مڑا۔ "تو نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا...... اس کی تجھے سزا مل گئی ہے۔ اب اگر تو نے روشن دادا کو میری شکایت لگائی تو سوچ لینا میں تیرا کیا حشر کروں گا۔ ٹوڈر نام ہے میرا۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ کا روڑا اٹھا کر مجھے دے مارا۔

اتنے میں ایک کمزور سا آدمی موٹے عدسوں والا نظر کا چشمہ درست کرتا ہوا اپنے گھر کے دروازے سے باہر نکل آیا۔

"کیوں میاں! وہ تمہاری پھینٹی لگا رہے تھے؟"

"نہیں جی...... میری کہاں پھینٹی لگا رہے تھے۔" میں نے جل کر کہا اور کھڑا ہونے کی کوشش کی۔

وہ از راہِ ہمدردی بولا۔ "میں کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔"

"بہت اچھا کر رہے تھے جناب!" میں کھڑا ہو گیا۔

"بہت بیدردی سے پیٹ رہے تھے وہ۔"

"نہیں، نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ انہوں نے بہت شفقت اور محبت سے پیٹا ہے مجھے۔" میں نے کہا اور پھر وہاں سے جانے کے لیے گلی میں داخل ہو گیا۔

اب مجھے اکمل کی طرف جانا تھا۔ مجھے اس پر رہ رہ کر غصہ بھی آرہا تھا کہ میں نے اسے بہت کہا تھا کہ میرے ساتھ چلو لیکن اس کی ازلی بزدلی آڑے آ گئی تھی۔ روشن دادا جیسے بدمعاش کے سامنے جانے سے اس کی روح فنا ہوتی تھی۔

مجھے اچنبھا ہوا کہ اکمل کا فلیٹ بند پڑا تھا۔ نہ جانے کمبخت کہاں مر گیا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کل آجاؤں گا، جب تک اس کی واپسی بھی ہو جائے گی لیکن پھر میرے اندر کے اضطراب نے مجھے سمجھایا کہ معاملہ سامان کا ہے۔ کل اس کو لے کر ہر صورت میں روشن دادا کے سامنے جانا ہوگا تاکہ وہ ٹوڈر کے سامنے جا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرے لہٰذا میں اس کے والد کی دکان پر چلا گیا۔

"السلام علیکم چاچا!"

"وعلیکم السلام!" چاچا افضل نے مجھے سر تا پا دیکھا۔ "خیریت تو ہے؟"

"اکمل تو ادھر نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "یہ تو نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے...... کہیں سے لڑ کر آرہا ہے کیا؟"

"نہیں تو۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ "ادھر آ ذرا......اور اپنا حلیہ دیکھ۔"

میں دیوار کے ساتھ نصب قدِ آدم آئینے کے سامنے آیا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ دیر قبل ہونے والی خاطر تواضع کی نشانیاں لباس اور چہرے پر پڑنے والے نیل کی صورت میں واضح تھیں۔

چاچا کو اپنے لختِ جگر کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ "اکمل کہاں ہے......وہ ٹھیک تو ہے؟"

"اسی کی تلاش میں تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"کیوں......اپنے فلیٹ پر نہیں ہے؟"

"نہیں۔" میں یہ کہہ کر مایوسی کے ساتھ دکان سے باہر نکل آیا تو چاچے افضل نے اپنی بھاری آواز میں پکارا۔

"لڑکے! بات تو سن۔ کدھر جاتا ہے۔ کچھ بتا تو سہی۔ کس کے ساتھ تیری لڑائی ہوئی ہے؟"

لیکن میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات میرے کانوں تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

اگرچہ میں اپنا حلیہ ٹھیک کر کے گھر گیا تھا لیکن میں اپنا حلیہ جتنا بھی بہتر بنا لیتا، آنکھ کے نیچے پڑا ہوا بڑا سا نیل چھپ نہیں سکتا تھا۔

اماں نے رو دھو کر دل کا غبار نکالا۔ ابا نے گالیوں کا ایک بے مثال ذخیرہ خرچ کر کے اپنے پدرانہ جذبات کا اظہار کیا اور درشتی سے کہا۔ "کمبخت! مار کھا کے آگیا۔ بزرگوں کی عزت خاک میں ملا دی......ستیاناس ہو تیرا۔"

میں نے جذباتی ہو کر کہا۔ "میں آپ کا خون ہوں ابا! یوں بزدلی سے مار کھا کر کیسے آسکتا ہوں۔ میں نے دشمن کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ جتنی چوٹیں میں نے اس کو لگائی ہیں، میری چوٹیں تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ وہ پڑا ہوگا کسی اسپتال میں۔"

"وہ تھا کون؟" اماں نے آخرکار پوچھ لیا۔

"ایک پرانا جاننے والا تھا۔" میں نے بتایا۔

ابا نے پوچھا۔ "لڑائی کی وجہ کیا بنی؟"

"کمینے نے گالی دی تھی آپ کو۔" میں نے کہانی میں رنگ بھرتے ہوئے کہا۔

ابا زندگی میں پہلی مرتبہ مجھ سے خوش ہوا اور میری پیٹھ تھپک کر بولا۔ "شاباش! مجھے تم پر فخر ہے۔ اگر کوئی میرے سامنے تمہارے دادا مرحوم و مغفور کو گالی دیتا تو میں بھی اس کا یہی حشر کرتا۔"

اماں نے کہا۔ "اچھا بیٹا! ابھی مرنے مارنے کی باتیں چھوڑ۔ تیرا وہ دوست آیا تھا......اکمل!"

"اکمل......کب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"دو ڈھائی بجے......یا اس سے پہلے۔ ٹائم کا مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"ایک لفافہ دے گیا ہے۔ کہتا تھا، تجھے دے دوں۔"

"کدھر ہے وہ لفافہ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"تیرے کمرے میں رکھا ہے، بیڈ کے سرہانے۔"

میں لپک کر اپنے کمرے میں گیا۔ تکیے کے اوپر ایک سربمہر لفافہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جلدی سے چاک کیا تو اس میں سے ایک کاغذ برآمد ہوا جس پر چند سطریں اکمل کی رائٹنگ میں لکھی ہوئی تھیں۔

"پیارے دوست پوپی!

سب سے پہلے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں کہ میری وجہ سے تمہیں یہ پریشانی اٹھانا پڑی ہے۔ میں اور روزی شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ روزی میرے کام سے مطمئن نہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں کوئی ڈھنگ کا کام کروں۔ تم تو جانتے ہو میں روزی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ لہٰذا روزی کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے تمہارے ساتھ دھوکا کر رہا ہوں۔ جو سامان ہم نے وصول کیا تھا، وہ ٹوڈر اور اس کے ساتھیوں نے نہیں لوٹا تھا بلکہ میں نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک ڈیلر کو بیچ کر رقم وصول کر لی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ روشن دادا نے تمہارا کیا حشر کیا ہوگا لیکن تمہاری واپسی تک میں روزی کو لے کر نکل چکا ہوں گا۔ سامان کی رقم کے علاوہ بھی روزی نے کافی سارے پیسے بچت کر کے بچا لیے تھے جو اب مجھے کوئی شریفانہ بزنس شروع کرنے میں مدد دیں گے حالانکہ تم بھی سمجھتے تھے کہ روزی مجھے لوٹ کر کھا رہی ہے......روزی کو لگتا تھا کہ تم کوئی مناسب کاروبار کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو جبھی ہمیں ایسا سوچنا پڑا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ پڑھ کر تم بلبلا رہے ہو گے لیکن اپنے دوست کی مجبوری کو سمجھو یار! تم جتنے خبیث ہو، مجھے یقین ہے کہ جلد ہی کوئی نیا شیطانی دھندا شروع کر دو گے۔ بہرحال اب یہ باتیں فضول ہیں۔ مجھے دل سے معاف کر دینا اور یہ رقم وصول کرنے میرے ابا کے پاس نہ پہنچ جانا ورنہ بھگتو گے۔

تمہارا دوست......اکمل!"

⌘⌘⌘

گمشدہ

صائمہ دانش

اعتبار ایک ایسے خطرناک احساس کا نام ہے جو قائم رہے تو انسان دنیا فتح کرلیتا ہے اور اگر ٹوٹ جائے تو خواب اور ذات دونوں ہی ٹوٹ جاتے ہیں... اس کا رشتہ بھی دل کے نازک تاروں سے جڑا تھا مگر بے اعتباری کی ایک چوٹ سے ایسا طوفان آیا کہ محبت کے سارے نقش مٹ کر رہ گئے۔

بالآخر اولیویا نے فیصلہ کیا کہ اسے نیل کے گھر کی صفائی خود کرنی پڑے گی۔ یہ اچھا تھا اس لحاظ سے کہ وہ اس گھر سے ان تمام پرانی یادوں کو نکال باہر کرتی جو نیل کو تکلیف دیتی تھیں۔

اس کے بھانجے نیل کی بیوی کیرن کو غائب ہوئے لگ بھگ سال پورا ہونے کو تھا۔ اس کی کار ایک سڑک کنارے ملی تھی جس کی ہیڈ لائٹس اور دروازے کھلے ہوئے تھے مگر کیرن غائب تھی۔

گیارہ مہینے بغیر کسی اچھی یا بُری خبر کے انتظار کرتے ہوئے گزر گئے۔ گیارہ ماہ بعد پولیس کو اس کا پرس شہر سے دو میل دور ایک جنگل کے کنارے بہتی ایک ندی کے پاس سے ملا تھا۔ نیل کی فیملی یہ ماننے پر مجبور ہو ہی گئی کہ شاید کیرن مر چکی ہے۔ اسی لیے انہوں نے چرچ میں ایک چھوٹی سی تقریب منعقد کی۔

اولیویا کا خیال تھا اس طرح نیل اپنی بیوی کے غیاب سے سمجھوتا کرلے گا۔ شاید چند دن سوگ منا کر اپنی زندگی پھر سے بھرپور انداز میں جینا شروع کردے۔

کیرن کے لیے منعقد کی گئی اس دعائیہ تقریب میں جب نیل کو کیرن کے لیے کچھ الفاظ کہنے کے لیے بلایا گیا تو چند لمحے وہ کیرن کے چہرے کی بڑی تصویر کو گھورتا رہا۔

پانچ پریشان کن منٹوں کے بعد آخرکار وہ لرزتی آواز میں بولا۔ ''مجھے یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔''

کیرن کے جانے کے بعد نیل صوفے پر سو رہا تھا، اس بستر سے بچنے کے لیے جو کبھی وہ اور کیرن شیئر کرتے تھے۔

تہ خانے میں نہاتا تھا تاکہ کیرن کے شیمپو کی خوشبو اس کے نتھنوں تک نہ پہنچ پائے۔ الماری میں اس کے کپڑوں کو سب سے پیچھے دھکیل دیا تھا کہ کہیں غلطی سے بھی اس پر نظر نہ پڑ جائے۔

نیل کا یہ رویّہ نارمل نہیں تھا۔ سب دیکھ رہے تھے، وہ کیرن کی یادوں سے خوفزدہ بھی تھا مگر اس سے آزاد بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اب جبکہ سب کیرن کو مُردہ مان چکے تھے، نیل کو اپنی زندگی میں آگے بڑھنا چاہیے تھا مگر وہ سال گزرنے کے بعد بھی وہیں کا... وہیں کھڑا تھا اور اسی لیے اولیویا نے فیصلہ کیا۔

بس بہت ہوا۔

اب وقت آگیا ہے کہ نیل کو کیرن نام کے آسیب سے چھٹکارا دلایا جائے۔

اس دن نیل کے آفس کے لیے نکلنے کے بعد اولیویا اس کے گھر پہنچی تھی۔ اس کے پاس اضافی چابی تھی اس لیے اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔

کچھ دن پہلے جب ساری فیملی ایک ساتھ بیٹھی تھی، نیل نے بے لچک انداز میں کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتا کوئی گھر میں کسی بھی طرح کا ردوبدل کرے یا کیرن کی چیزوں کو چھیڑے۔

مگر اولیویا نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہ ایک غمزدہ شوہر کا بیان تھا اور وہ جانتی تھی کہ غم میں ڈوبے لوگوں کو کھینچ کر باہر نکالنا پڑتا ہے۔

آج رات جب وہ گھر پہنچے گا تو اسے راحت اور آزادی کا احساس ہوگا۔ اسے اس بات کا یقین تھا۔

اولیویا ہمیشہ سے ایک اچھی خالہ رہی تھی۔ نیل اس کے سامنے پل کر جوان ہوا تھا اور وہ اسے اتنی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ شاید نیل بھی خود کو اتنا نہ سمجھتا ہو۔

اولیویا کو احساس تھا کہ نیل ایسا کیوں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اوپر منڈلاتے شکوک وشبہات، سرگوشیوں اور نظروں سے خوفزدہ تھا۔ اسے لگتا تھا اگر وہ کیرن کو بھول کر اپنی زندگی میں آگے بڑھے گا تو لوگ اسے غلط سمجھیں گے مگر اب اسے لوگوں کی پروا چھوڑنا ہوگی۔ اسے آگے بڑھنا ہوگا۔

نیل کے جانے کے دس منٹ بعد اولیویا اندر تھی۔ چپٹے گتے کے ڈبوں اور ردی کی ٹوکریوں سے لیس۔

گھر میں پُرہول خاموشی طاری تھی۔ کیرن کی موجودگی میں ایسا نہیں تھا۔

''تم جہاں بھی ہو اس دنیا میں یا دوسری دنیا میں، امید کرتی ہوں آرام سے ہوگی۔'' اولیویا نے بہ آوازِ بلند کہا اور پھر اپنے کام پر لگ گئی۔

پہلا باکس کیرن کے رومانوی ناولوں سے بھر گیا تھا۔

باتھ روم آسان تھا۔ پہلے کا تمام سامان اس نے کچرے کے ڈبے میں ڈالا۔ اس کی جگہ نیا خوشبودار صابن، نیا شیمپو اور ایک نئی شیونگ کٹ رکھ دی۔ شاور کے پھول دار پردے پر دھول جم چکی تھی۔ اولیویا نے اسے بھی کھینچ کر نیچے اتارا۔ بھلا ایک دھول بھرے شاور کرٹن کے اترنے سے نیل کے جذبات کیونکر مجروح ہو سکتے تھے؟

کچھ دیر خود سے الجھنے کے بعد اولیویا نے کمرے میں لگی کیرن کی تصویر چھوڑ دی لیکن ہال وے میں شادی کی تصویر اتار دی۔ ابھی اسے نیل کی نظروں سے دور کردینا ہی بہتر تھا۔ شاید ایک دن نیل اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے تیار ہو جائے۔

بیڈ روم میں بڑا کام تھا۔ اولیویا نے چار بڑے ڈبوں کو جوتوں اور کپڑوں سے بھر دیا۔ اسے خدشہ تھا اتنا سامان شاید ہی اس کی گاڑی میں آپائے۔ اسے متعدد دورے کرنے پڑیں گے۔

کیرن کے کچھ ملبوسات اتنے خوبصورت تھے کہ ایک پل کے لیے اولیویا کی ان پر نیت خراب ہونے لگی۔ خاص طور سے یہ نیلے رنگ کا ریشمی ڈریسنگ گاؤن۔ اس کا دل چاہا وہ اسے اپنے لیے الگ کر لے۔ تاہم پھر اسے خیال آیا کہ اگر نیل نے اسے کسی دن اولیویا کے گھر دیکھ لیا تو پہچان جائے گا اور غصے میں ہوگا یا اس سے بھی بدتر، سوگوار ہو جائے گا۔ اسی لیے ارادہ بدلتے ہوئے اس نے اسے دوسرے کپڑوں کے ساتھ عطیہ کرنے کے لیے ڈال دیا۔

اس کے پاس بستر کے لیے نئی سفید چادریں تھیں۔ اس نے پرانی چادروں کو کچرے کے تھیلے میں ڈالا۔ وہ انہیں چیتھڑوں میں کاٹ کے اپنے کسی کام میں لاسکتی تھی۔

بیڈروم میں ماسٹر بیڈ پر چادر کے نیچے ایک گدے کا پیڈ تھا۔ اولیویا نے اس گدے کو قدرے مشکل سے کھینچنے کی کوشش کی۔ اسے دھونا تو سب سے زیادہ ضروری تھا تاکہ گمشدہ کیرن کی خوشبو سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکے۔

اس نے کہیں پڑھا تھا۔ ”خوشبو سب سے بڑی میموری ٹرگر ہے۔“

پیڈ کے نیچے کے گدے پر ایک سرخ لفافہ تھا۔

اولیویا کھلے ہوئے گدے پر بیٹھ گئی۔ اس نے لفافہ اٹھایا اور کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔

اس لفافے کے اندر ایک کارڈ تھا۔ اولیویا کے اس کارڈ کو کھولنے کے پیچھے کوئی تجسس نہیں تھا۔ یہ بس ایک بے اختیاری حرکت تھی۔

کارڈ کے کھولتے ہی گلاب کی سوکھی پنکھڑیاں اس کی گود میں بکھر گئیں۔ کارڈ کے اندر ایک ہاتھ سے لکھا ہوا خط تھا جس میں کیرن کو مخاطب کیا گیا تھا۔

اولیویا کی نظریں تیزی سے ان سطروں پر پھسلنے لگیں۔

محبت کے وعدے، کھلے ڈلے جذبات کا اظہار، جسمانی خواہشات کے حوالے۔

اور اس کے نیچے لکھا تھا۔ ”تمہارا بین!“

اولیویا بین نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی تھی۔ یہ ایک اشارہ تھا۔ یہ ایک اشارہ ہونا چاہیے۔ اسے فوری طور پر اس کی اطلاع دینی چاہیے۔

اس نے اپنا پرس اس پرائیویٹ ڈیٹیکٹیو کے بزنس کارڈ کی تلاش میں ٹٹولا جو کیرن کی تلاش پر مامور تھا۔ جس کے بارے میں اولیویا کا خیال تھا کہ وہ ایک ناکام ڈیٹیکٹیو ہے لیکن شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ اس کے پاس شروع کرنے کے لیے زیادہ کچھ تھا نہیں، سوائے کیرن کی ایک تصویر کے...... اور اب اولیویا کے ہاتھ یہ ایک سراغ لگا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ کیرن کی خفیہ زندگی کا ایک ٹکڑا پکڑے ہوئے تھی۔

کیا اس بارے میں معلوم کرنا اب اس کے بھانجے کو تکلیف دینے کے علاوہ کوئی اور مقصد پورا کرسکتا ہے؟ نیل کو تکلیف دینا ناقابلِ تصور تھا۔

اب کوئی چیز کیرن کو واپس نہیں لاسکتی لیکن اگر اس نے کیرن کا راز ظاہر کر دیا تو نیل کو ایک اور دھچکا لگے گا۔ ایک اور چوٹ، کیرن کی بیوفائی کی۔

اس نے پرس سے ہاتھ واپس نکالا اور اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اب وہ اس خط کا کیا کرے؟ کیا اسے اپنے ساتھ لے جائے یا ضائع کر دے؟ یہ تو طے تھا کہ وہ اسے یہاں نہیں چھوڑنے والی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ فیصلہ کر پاتی، اس نے سامنے والے دروازے کی آواز سنی۔

ایک سیکنڈ بعد اس نے نیل کی آواز سنی۔ وہ اس کا نام پکار کر پوچھ رہا تھا کہ اس نے اس کی کار دیکھی اور وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟

اولیویا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ خود ہی اس کی تلاش میں بیڈروم تک آیا۔ اولیویا اس سرخ لفافے کو سینے سے لگائے کھڑی تھی۔ نیل نے لفافے کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف۔

اس کے چہرے کے تاثرات اتنے ناقابلِ فہم تھے کہ اولیویا کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی اجنبی کو دیکھ رہی ہو۔

وہ نہیں جانتی تھی کیوں...... مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی جب اس نے نیل کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔

”مجھے افسوس ہے، آنٹی اولیویا!“ اس کی آواز سپاٹ تھی اور اس کا چہرہ بھی۔ ”میرا خیال تھا کہ میں نے ان سب کو کیرن کے ساتھ ہی دفن کر دیا ہے۔“

نیل کے ہاتھ اس کی گردن کی سمت بڑھے۔

اولیویا کی آنکھیں پھیلیں اور اس کی چیخ اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعر و سخن

❊ ناہید یوسف...... اسلام آباد

ظلمت چہار سو ہے میں دیکھوں جہاں تلک
حالت مرے وطن کی بڑی سوگوار ہے

❊ عاصم خان...... کراچی

جب کبھی لوٹ کے پردیس سے گھر جائے گا
دیکھ کر خالی در و بام وہ ڈر جائے گا
عمر ساری ہی گنوا دی تھی کمانے میں اب
خالی دیواروں کو تکتے ہوئے مر جائے گا

❊ شاہین تبسم...... کراچی

درد لفظوں میں کہاں دل کا بیاں ہوتا ہے
درد دل کا تو نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے

❊ شکیل احمد...... ملتان

چار سو زندگی میں میلے ہیں
لوگ کیوں بھیڑ میں اکیلے ہیں

❊ صابرہ رحمان...... گھوٹکی

ملے گی ہر خوشی ماں کی خدمت سے
ماں کی خدمت بھی سمجھو عبادت ہے

❊ روبینہ کوثر...... لکھر منڈی

مجھے تلاش تو کر اپنے دل کی دنیا میں
نظر اٹھا میں تری وسعتِ نظر میں ہوں

❊ محمد رفیق...... سیالکوٹ

ان کی آمد کا تصور روح پرور ہے مگر
دیکھیے کب ٹوٹتا ہے یہ طلسمِ انتظار

❊ خادم حسین...... مری

پلکوں پہ رک گیا ہے سمندر خمار کا
کتنا عجب نشہ ہے ترے انتظار کا

❊ طاہر خان...... کراچی

ادھوری چاہتوں کی قبر ہے دل میں
چلے آؤ کبھی تو فاتحہ پڑھنے!

❊ محمد نواز...... جیکب آباد

عرق آلود جبیں، نیچی نظر، لب خاموش
بے وفائی پہ کہیں آپ پشیماں تو نہیں

❊ اویس کمال...... حیدر آباد

جو میرے ہر درد کی دوا ہے
فقط وہ میری ماں کی دعا ہے

❊ نبیلہ جنید...... سرگودھا

دو گام ساتھ چل کے ہمیں چھوڑنا نہیں
ہم جیسے پھر ملیں گے نہیں اس جہان میں
جس طرح سے رفیق مرا مجھ سے بچھڑا ہے
کل ہم شمار ہوں گے کبھی رفتگان میں

❊ رفعت شہناز...... گوجرانوالہ

آنکھوں میں ممکنات کی پرچھائیاں لیے
میں ساحلِ حیات پہ حیراں کھڑی رہی

❊ صابر شاہ...... تلہ گنگ

تمہاری دید کا مقصد رہا ہے جن نگاہوں کا
وہ چشمِ منتظر پتھرا گئیں کیا تم نہ آؤ گے

❁ ہما ابرار......سیالکوٹ
ہوں گی باتیں اقرار ہونے تو دے
نگاہوں کو دیدار ہونے تو دے
سمجھ جائے گا دل جہاں کا چلن
تو غفلت سے بیدار ہونے تو دے

❁ ماہین علی......کوٹ ادو
میری قسمت کہ آپ آئے ہیں
دیکھ کر پھول مسکرائے ہیں
تھے بہت قیمتی وہ آنسو جو
آپ کی یاد میں بہائے ہیں

❁ شاہینہ پروین......کراچی
جس راستے پہ دل کے جدا تجھ سے ہم ہوئے
اس راستے کو تکتے ہیں تیری نظر سے ہم

❁ ایم سعید......جہانیاں
ہجر کی شب وہ نیلی آنکھیں اور بھی نیلی تھیں
جیسے اس نے اپنے سر سے بوجھ اتارا تھا

❁ حسان مغل......راولپنڈی
ہر بار تیری ہنستی نگاہوں نے جھک کر
اک بھید چھپایا تو کئی راز بکھیرے

❁ سلمان علی......کراچی
دل نے اگر چھپا بھی لیا داغِ آرزو
آنکھوں سے تو یہ راز چھپایا نہ جائے گا

❁ نازنین اشرف......کراچی
صورت تری جو دیکھی تو قربان ہوگئے
قدرت کے اس کرشمے پہ حیران ہوگئے
دشمن تھے کل تلک جو ، انہیں آج دوستو
چاہت ہوئی ہے ہم سے ، پشیمان ہوگئے

❁ رضیہ عزیز......کراچی
ایک ہلکا سا تبسم ، ایک گہرا سا خمار
ہائے وہ آنکھیں کہ تارے دیکھتے ہوں کوئی خواب

❁ رضوانہ تکمیر......ساہیوال
نظر کو حالِ دل کا ترجماں کہنا ہی پڑتا ہے
خموشی کو بھی اک طرزِ بیاں کہنا ہی پڑتا ہے

❁ رمضان خان......میانوالی
تو نے اس کی آنکھوں کو غور سے پڑھا قاصد
کچھ تو کہہ رہا ہوگا ، اس نظر کا سناٹا

❁ ساجدہ مریم......ڈیرہ غازی خان
نہ کوئی وعدہ ، نہ کوئی یقین نہ کوئی امید
خبر نہیں مجھے کیوں تیرا انتظار ہے آج

❁ شائستہ پرویز......ملتان
ہم ان کو سوچ میں گم دیکھ کر واپس پلٹ آئے
وہ اپنے دھیان میں بیٹھے ہوئے اچھے لگے ہم کو

❁ جمیل اختر......مردان
آنکھ میں چمکے نہیں تھے قربتوں کے ماہتاب
فرقتوں کے جھلملاتے عکس پلکوں پر رہے

❁ بریرہ ناظر......کراچی
وہ دوستی کی آڑ میں یوں وار کرگئے
انسانیت کی سب ہی حدیں پار کرگئے
قدرت نے غم دیے تھے کئی طرح کے ہمیں
جو باقی تھے ستم وہ سبھی یار کرگئے

❁ راجا اصغر......جہلم
اس زلف کا کیا کہنا جو دوش پہ لہرائے
سمٹے تو بنے ناگن بکھرے تو گھٹا چھائے

❁ محمد فیاض شاہد......مانسہرہ
اچھا کیا سمیٹ لیے گیسوئے دراز
ورنہ تمام رات دکھائی نہ دیتا چاند

❁ ثمینہ اشرف......گلگت
تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

❁ شاہدہ نسرین......ہارون آباد
ڈر ہے ترے حسین تصور کا خوں نہ ہو
میں نقشِ ناتمام ہوں سوچا نہ کر مجھے

❁ نور حسین......پشاور
راز کہہ دیتے ہیں نازک سے اشارے اکثر
کتنی خاموش محبت کی زباں ہوتی ہے

❁ سیدا ابرار......بنوں
تری نیم کش نگاہیں ، ترا زیرِ لب تبسم
یوں ہی اک ادائے مستی یونہی اک فریب سادہ

❁ رب نواز......گوجرانوالہ
تمہارے حسن سے رہتی ہے ہم کنار نظر
تمہاری یاد سے دل ہمکلام رہتا ہے

❁ فاخرہ عروج......لاہور
یہ کیا طلسم ہے کہ سنایا گیا مجھے
سازِ شکستِ دل ، تیری آوازِ پا کے ساتھ

❁ یاسمین چنا......سیالکوٹ
کبھی کبھی سفرِ زندگی سے تھک کر ہم
ترے خیال کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں

❊ محمد ایوب......کراچی
لب پہ لاتے نہیں مطلب کی کوئی بات کبھی
اور سپنوں میں امنگوں کو جواں رکھتے ہیں
❊ تنویر گل......مظفر گڑھ
رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ
❊ دلدار بھٹی......لاہور
ساجن کو جب جان نہ پاؤں اس سے کیا منواؤں
خود ہی اپنے جی ہی جی میں تڑپوں اور میں رو لوں
❊ ثمیرا بلوچ......سکھر
دل ہنس کر ہر دکھ سہہ لے گا، ہے شرط تمہارا ساتھ ملے
تم دشت بنو یا شہر بنو یا پاؤں کا چھالا بن جاؤ
❊ مسکان ایاز......روہڑی
اہلِ غرض کی اس دنیا میں شام سے پہلے پنچھی کا
چونچ میں دانا داب کے لانا اچھا لگتا ہے
❊ عابد علی......میرپور خاص
ساون کی ہیں پھواریں، جیون پہ اب تمہارے
پیاسا مرا شجر ہے، کیا ساتھ تم چلو گے
❊ کاشف خان......مری
گو کام تو کٹھن ہے، گزریں تو اس گلی سے
جو ہم پہ چاہے بیتے، دل کو تو آزمائیں
❊ محمد حسنین......بہاولنگر
حسابِ عداوت بھی ہوتا رہے گا
محبت نے جینے کی مہلت اگر دی
میں پھر خاک کو خاک پر چھوڑ آئی
رضائے الٰہی کی تکمیل کردی
❊ ذکیہ احمد......چکوال
خوابوں کی راہگزر میں، جذبوں کے امتحاں میں
ہم جی رہے ہیں لوگو! اک شہرِ بد گماں میں
❊ سکینہ شاہ......اوکاڑہ
طوفانی موسم میں رہائی اُن کو مت دینا صیاد
پر والے پنچھی بھی اس میں بے پر بنتے جاتے ہیں

❊ رانا زاہد خان......شانگلہ
بے نام اداسی میں دیکھے ہیں کئی چہرے
ہر چہرہ حقیقت میں پُر درد کہانی ہے
❊ شاہانہ فیض......رحیم یار خان
ہر اک چہرہ پڑھتے جائیں، ہر اک دامن چاک کریں
ہر اک جوہر ڈھونڈ کے لائیں، خود کو نہ پہچانے لوگ
❊ جواد احمد......کراچی
یہ حیرت ہے کہ تم جیتے، مگر ہو پھر بھی افسردہ
تمہارا وار ادھورا تھا کہ میری مات ادھوری ہے
❊ آصف خان......پشاور
ہے ابر کیوں تنا ہوا کہ بستیاں تو بہہ چکیں
کہ گر چکی ہیں بجلیاں، یہ ہجرتوں کا دور ہے
❊ شاہد نسیم......بدین
پھول گگن اور تارے مٹی سب کا وہ دھن وان
شکر کرے ہے ذرہ ذرہ ناشکرا انسان
❊ فردوس آفریدی......پشاور
بارود برستا ہو جہاں روز زمیں پر
اس دیس میں پھولوں کے زمانے نہیں آتے
❊ مہوش علی......کراچی
یہ میری عقل کا دھوکا ہے یا اس کی ہے یہ دانائی
میں بیٹھ گئی اک منزل پر، وہ منزل منزل ہرجائی
❊ کریم شاہ......قصور
سنو اے دلربا ساتھی مجھے اک کام کرنا ہے
سفر یہ زندگانی کا تمہارے نام کرنا ہے
❊ فرحان لیاقت......ڈی جی خان
نازاں ہے کس عیاری پر او جابر انسان
پورب پچھم فتح کیے نہ فتح کیے اذہان
❊ کبیر احمد......سوات
وہ کیا جانیں کہ ایک خدا کی پوجا میں کیا ملتا ہے
در در سجدے کرتے ہیں جو دولت کی جھنکاروں کو

یہ ویانا کی ایک ٹھنڈی صبح تھی۔ رابرٹ اسٹائن سرد ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے کاغذی تھیلے کو سینے سے لگائے ہوئے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا چھوٹا سا فلیٹ ایک پرانی کئی منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ اس نے کافی تیار کی اور ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔

ایک زمانہ تھا جب اس کے حالات اچھے تھے تو وہ مختلف ملکوں کے ایجنٹوں کو ایک جیسی معلومات فراہم کر کے اچھے پیسے کما لیتا تھا لیکن اب امریکی اسے صرف 80 ڈالرز ماہانہ دیتے تھے۔ اس کی بیوی ایک بار میں ویٹریس تھی۔ اس طرح زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔

اسے امید تھی کہ اس کا موجودہ پروجیکٹ امریکیوں سے اچھے پیسے دلوا دے گا۔ اس کو امریکن ایمبیسی کی ایک سیکریٹری کے ذریعے کوڈنگ مشین کے چپ کارڈ کی کاپی حاصل کرنا تھی۔ ویلسا کو اس نے کئی ہفتے کی محنت کے بعد اس کام کے لیے تیار کرلیا تھا۔ ویلسا نے کل دوپہر ایک پارک میں ملنا تھا۔ اگر وہ کاپی مل گئی تو وہ امریکیوں سے اچھے دام حاصل کر سکے گا۔

انتشار چاہے گھر کی سلطنت میں ہو یا ملکی سطح پر... اس انتشار کا سبب ہمیشہ کوئی ایسا شخص ہوتا ہے جو آپ کے انتہائی قریب ہو... اس ملک میں بھی مسلسل ہونے والے حادثات و واقعات نے حکومتی مشینری کو ہلا کر رکھ دیا تھا... ایسے میں اس کی جاسوسی نے وہ کارنامہ انجام دیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا۔

اپنے ہی وطن کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والوں کا عبرت اثر انجام

گھر کا بھیدی

افتخار حسین جعفری

جب وہ ناشتے کے بعد کافی پی رہا تھا تو دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ اس کی بیوی نے تو شام کو واپس آنا ہوتا ہے۔ اس نے دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

''کون ہے؟''

جواب میں آواز آئی۔ ''پوسٹ مین...... ایک ضروری خط دینا ہے۔''

رابرٹ نے خفیہ سوراخ سے باہر جھانکا تو وہ پوسٹ مین ہی تھا جس نے مخصوص نیلے رنگ کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو پوسٹ مین نے ایک فارم دستخط کرنے کے لیے دیا۔

جب فارم واپس کیا گیا تو پوسٹ مین نے اپنے چمڑے کے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا پستول نکالا اور رابرٹ پر دو گولیاں فائر کر دیں۔ رابرٹ زمین پر گر پڑا اور تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

لیری گیٹس نیویارک سے کینیڈا جا رہا تھا۔ منزل کے آخری حصے میں اس نے ایک ہیلی کاپٹر کرائے پر لیا جو اس وقت شمالی کینیڈا کے علاقے میں ایک دریائی فشنگ کیمپ کی طرف جا رہا تھا۔ پائلٹ نے نیچے کی جانب اشارہ کیا۔

''یہی کیمپ ''بلیک ویل'' ہے۔'' پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کو ایک صاف جگہ پر اتارا۔

لیری نے نیچے اتر کر ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو اسے جیپ نظر آ گئی جو اسے منزل پر لے جاتی۔ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد لیری کو درختوں کے جھنڈ کے پار ایک کاٹیج نظر آیا لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

سیڑھیوں سے نیچے دریا کے کنارے اسے ایک شخص نظر آیا جو ایک چھوٹی بوٹ کی صفائی کر رہا تھا۔ لیری نے وہاں پہنچ کر پوچھا۔

''ولیم ڈینز کہاں ہے؟''

جواب ملا۔ ''ڈینی دریا میں اوپر کی فشنگ کے لیے گیا ہوا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔''

لیری بوٹ میں سوار ہو گیا۔ دریا میں ایک میل کے سفر کے بعد کنارے پر لیری نے ایک شخص کو کھڑے دیکھا جو مچھلی کی راڈ سے شکار کھیل رہا تھا۔ لیری بھی کنارے پر اتر گیا اور قریب پہنچ کر آواز دی۔

''ڈینی! مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔''

''مجھے تمہاری کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے۔'' ڈینی نے کہا۔

''میں جانتا ہوں تم محبِ وطن ہو۔ امریکا کی خاطر میری بات سن لو۔'' لیری نے کہا۔

''میں اپنے ملک کی خاطر جان بھی دے سکتا ہوں لیکن مجھے اب ایجنسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' ڈینی نے کہا۔

''پلیز! ایجنسی ملک کا حصہ ہے اور ملکی سلامتی کے لیے میری بات پر غور کرو۔ میں ڈپٹی ڈائریکٹر ڈکسن ہیڈلے کا ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔ چند مہینے سے دنیا کے مختلف حصوں میں ہمارے جاسوسی کے پروجیکٹ ناکام ہو رہے ہیں۔ ہمارے ایجنٹ ناکارہ کیے جا رہے ہیں۔ روس کے جاسوسی ادارے K.G.B کو ہمارے ارادوں کا پہلے سے پتا چل جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری اپنی ایجنسی کے اندر کوئی زرخرید ایجنٹ گھسا بیٹھا ہے۔ تمہیں اس گھر کے بھیدی کو تلاش کرنا ہے۔'' لیری نے کہا۔

''میں تو سات سال پہلے ایجنسی چھوڑ چکا ہوں اور اب سکون سے ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔'' ڈینی نے کہا۔

''زیادہ نہیں، صرف چھ مہینے کے لیے واپس آجاؤ۔ ہم کسی اور پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ تم جو چاہو گے، وہ معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔ اگر تم انکار کرو گے تو ہم اس دریا کے پانی میں زہر ملا دیں گے اور تمہارا فشنگ کیمپ برباد ہو جائے گا۔ کوئی سیاح یہاں آنا پسند نہیں کرے گا۔'' لیری نے کہا۔

ڈینی نے تین روز تک پوری صورتِ حال پر غور کیا۔ وہ فشنگ کیمپ کا سارا انتظام اپنے نائب کے سپرد کر کے نیویارک جانے کے لیے تیار ہو گیا لیکن روانگی سے پہلے اس نے ایک ضروری کام یہ کیا کہ اپنی بارہ سالہ بیٹی کیری کو جو اس کے پاس چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی تھی، اس کی ماں کے پاس کیلی فورنیا بھیج دیا۔ کلیرنس اس کی دوسری بیوی تھی جس سے علیحدگی ہو چکی تھی۔

واشنگٹن انٹرنیشنل ائرپورٹ سے باہر آ کر ڈینی نے ایک کار کرائے پر لی اور دو گھنٹے کے سفر کے بعد ایجنسی کے ہیڈکوارٹر لینگلے پہنچ گیا۔ مختلف سیکیورٹی بیریئرز سے گزر کر وہ چھٹی منزل پر پہنچا جہاں ڈپٹی ڈائریکٹر آپریشنز (DDO) کا آفس تھا۔ ڈکسن ہیڈلے نے اٹھ کر ڈینی کا استقبال کیا۔

''ہمیں بہت خوشی ہے کہ تم نے عارضی طور پر یہاں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔'' ہیڈلے نے اس سے کہا۔

ہیڈلے نے ان آپریشنز کی تفصیلات بتائیں جو ٹوکیو، میڈرڈ، ویانا میں ناکام ہو گئے تھے۔ ہر اس شہر میں کسی ریٹائرڈ ایجنسی ایجنٹ کی موجودگی کے شواہد بھی ملے۔ گفتگو کے دوران ہیڈلے نے بتایا۔ ''پانچ سال پہلے ایک تفصیلی تفتیش کے بعد تقریباً ڈھائی سو سینئر ایجنٹس کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا

تھا۔ ایسا لگتا ہے ان لوگوں نے اپنا کوئی گروپ بنالیا ہے جو ہمارے آپریشنز کو برباد کررہا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ایجنسی کے اندر سے کوئی شخص اس گروپ کو معلومات فراہم کررہا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اس گھر کے بھیدی کو تلاش کر کے ہمیں اس کا نام بتاؤ۔ باقی کام ہم کرلیں گے۔ گروپ کو کون لیڈ کررہا ہے، اس بارے میں بھی معلومات درکار ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کچھ عرصے کے لیے واپس آنے کو تیار ہوں لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔ مجھے فری ہینڈ چاہیے کہ میں جہاں چاہوں اور جس کے بارے میں تفتیش کروں، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ تنخواہ میں وہی لوں گا جو ایک سینئر آفیسر کو ملتی ہے لیکن ان باتوں کی یقین دہانی میں ڈائریکٹر سی آئی اے بروکس جارڈن کے آفس میں اس کی زبانی سننا چاہتا ہوں۔" ڈینی نے کہا۔

اگلے ہفتے کے دوران ڈینی نے ورجینیا میں لینگلے سے کچھ فاصلے پر ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ ٹیلی فون بھی لگ گیا اور ایجنسی سے آنے جانے کے لیے کار بھی فراہم کردی گئی۔ ڈینی نے فشنگ کیمپ میں فون کر کے اپنا پتا اور فون نمبر نائب کو نوٹ کرادیا تاکہ ایمرجنسی کی صورت میں رابطہ کیا جاسکے۔

چند روز بعد وہ اپنے ایک پرانے ساتھی سام گرین سے ملنے اس کے فلیٹ پر گیا۔ سام جاسوس سیٹلائٹس کے شعبے میں کام کرتا تھا۔ گفتگو کے دوران ان سابق ایجنٹس کا ذکر بھی آیا جن کو ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ ان میں مختلف شعبوں کے ڈھائی سو آفیسرز شامل تھے۔ یقیناً بہت سے ایجنسی سے ناراض بھی ہوں گے۔ موجودہ ڈائریکٹر اس وقت ڈپٹی ڈائریکٹر تھا۔ ڈینی نے کہا کہ اب بھی کچھ سینئر لوگ ایجنسی میں موجود ہیں۔ ان میں سے ہی کوئی ایک یہاں کی اندرونی معلومات اس گروپ کو فراہم کررہا ہے۔

"آج رات میں ایک پارٹی میں جارہا ہوں۔ تم بھی ساتھ چلو۔ شاید کوئی کام کی باتیں پتا چل جائیں۔ یہ پارٹی روزلین کے گھر ہے اور وہاں زیادہ تر ایجنسی کے لوگ ہی موجود ہوں گے۔" سام گرین نے ڈینی سے کہا۔

سام کی کار میں دونوں روزلین کے گھر پہنچ گئے۔ پارٹی میں ہجوم تھا۔ سب لوگ لطف اٹھارہے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈینی کی نظر ایک خوبصورت خاتون پر پڑی جو ڈانس فلور پر ایک شخص کے ساتھ ڈانس کررہی تھی۔ ڈینی اس خاتون کے سیاہ بالوں اور سبزی مائل آنکھوں سے متاثر نظر آتا تھا۔ اس نے سام سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"اس کا نام جولی نکولس ہے۔ اس کے ساتھ جو شخص ہے، وہ ترک ولکاکس ہے جو ایجنسی کے روسی ڈویژن میں کام کرتا ہے۔" سام نے بتایا۔

ڈینی اپنا جام لے کر بالکونی میں آگیا۔ کچھ دیر بعد اس کو کسی نے پیچھے سے مخاطب کیا۔ "کیا تم تارے گن رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں گزرتی عمر کے سال گن رہا ہوں۔" ڈینی نے مڑ کر جواب دیا۔

یہ وہی خوب صورت خاتون تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کیا اور اندر ہال میں ڈانس فلور پر چلے گئے۔ گفتگو کے دوران ڈینی کو معلوم ہوا کہ یہ خاتون ایجنسی کے اسپیشل آپریشنز کے شعبے میں کام کرتی ہے۔ دونوں نے فون نمبرز کا تبادلہ بھی کیا۔

دوسرے روز ڈینی گیارہ بجے کے قریب ملاقات کے لیے ہیڈلے کے آفس پہنچ گیا۔ "مجھے ان لوگوں کے بارے میں معلومات چاہئیں جن کو بڑی تعداد میں ایک ساتھ ایجنسی سے نکالا گیا تھا۔" اس نے کہا۔

"ان میں سے اکثر لوگ مالی بدعنوانیوں میں ملوث تھے اور خفیہ معلومات ان لوگوں کو فروخت کررہے تھے جہاں سے زیادہ رقم ملنے کی امید تھی۔" ہیڈلے نے کہا۔

"مجھے ان آفیسرز کی مکمل فہرست چاہیے۔ مزید یہ کہ اس واقعے کے بعد ڈائریکٹر نے استعفا دے دیا اور اس کی جگہ جارڈن ڈائریکٹر بنادیا گیا۔" ڈینی نے کہا۔ "مجھے نک روزی کی فائل بھی چاہیے تاکہ میں ویانا آپریشن کے مقام سے اپنے کام کا آغاز کروں۔" ڈینی نے مزید کہا۔

ڈینی اور جولی کی ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ جولی نے بتایا کہ وہ وزارت خارجہ کے ایک افسر کی بیٹی ہے جو ملازمت کے دوران دنیا کے مختلف ممالک کی ایمبیسیز میں تعینات رہا۔ اس طرح جولی نے دنیا کی کئی زبانوں پر عبور حاصل کرلیا جن میں روسی، چینی اور مشرقی یورپ کے کئی ممالک کی زبانیں شامل تھیں۔ اسی طرح ڈینی نے اپنی فیملی کے بارے میں بتایا کہ اس کا تعلق ایک آئرش فیملی سے ہے۔ اس کی والدہ حیات ہیں۔

صبح جب وہ گہری نیند میں تھا، فون کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ دوسری طرف اس کا نائب کینیڈا سے بات کررہا تھا۔ اس نے بتایا۔ "تمہاری سابقہ بیوی بہت پریشان ہے۔ اسے فوراً فون کرلو۔"

ڈینی کو کیری کا خیال آیا کہ شاید وہ بیمار ہے۔ اس نے کلیرنس کو فون کیا۔ "کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟"

"کیری کل اسکول گئی تھی اور گھر واپس نہیں آئی ہے۔ میں نے اس کی دوستوں کے گھر بھی فون کر کے معلومات

حاصل کیں لیکن کہیں سے کچھ پتا نہیں چلا۔ میں نے پولیس میں بھی رپورٹ درج کروادی ہے۔ وہاں سے چند لوگ آئے تھے اور رسمی کارروائی کر کے چلے گئے۔ انہوں نے کہا کہ اڑتالیس گھنٹے انتظار کریں، پھر دیکھیں گے۔ ڈینی! اب تم ہی کچھ کرو۔“ اس نے بتایا۔

”فکر نہ کرو۔ میں اگلی فلائٹ سے کیلی فورنیا پہنچ رہا ہوں۔“ ڈینی نے جواب دیا۔

سفر کے دوران ڈینی سوچتا رہا کہ اس کی بیٹی کو کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ ابھی تک کسی نے تاوان کے لیے بھی فون نہیں کیا تھا۔ شاید اس کے لیے وارننگ ہو کہ وہ جو کام کر رہا ہے، اسے روک دے اور مزید تفتیش نہیں کرے۔

آفس پہنچ کر ڈینی سیدھا ہیڈلے کے آفس میں گیا اور اس کو یہ صورت حال بتائی۔

”مجھے صحیح اندازہ نہیں ہو رہا کہ میری بیٹی کے اغوا کے پیچھے کون لوگ ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں۔ روسی کے جی بی، برخاست شدہ ایجنسی کے ایجنٹ یا ایجنسی میں سے کوئی خاص شخصیت اس جرم کی ذمے دار ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

ہیڈلے نے یقین دلایا کہ ایجنسی کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے۔ ”لیکن کوئی تو ہے جو یہ چاہتا ہے کہ جو کام تم کر رہے ہو، اس کو روک دو۔“ اس نے کہا۔

”جوابی کارروائی کے طور پر میں یہی کر سکتا ہوں کہ اس کام کو جاری رکھوں تا کہ میری بیٹی کی جان محفوظ رہے۔“ ڈینی نے کہا۔

ڈینی اسی شام کیلی فورنیا پہنچ گیا۔ اس نے کلیرنس کو تسلی دی کہ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ کیری کی جان کو نقصان نہ پہنچے۔ اس نے پولیس کے افسران سے بھی ملاقات کی۔ اس کو بتایا گیا کہ کیری کی سائیکل ایک نہر کے کنارے سے ملی ہے۔ مزید تفتیش جاری ہے۔

ڈینی دو روز کے بعد واپس نیویارک آ گیا۔ جولی سے ملاقات کے دوران اس کو بھی صورت حال سے آگاہ کیا۔ جولی نے بھی یہ بات کہی کہ شاید تمہاری بیٹی کے اغوا کا تعلق اس کام سے ہے جو تم ایجنسی کے لیے کر رہے ہو۔ کوئی گروپ یہ چاہتا ہے کہ یہ کام بند کر دیا جائے۔ میری دعا ہے کہ تمہاری بیٹی جلد بہ خیریت مل جائے۔

ڈینی نے ویانا پہنچ کر آپریشن ”اسکائی لارک“ کے کیس آفیسر سے ملاقات طے کی۔ اسی سلسلے میں وہ اس وقت کلاک میوزیم میں موجود تھا۔

”کے جی بی نے ہر ایمبیسی میں اپنے جاسوسی آلات لگائے ہوئے ہیں اس لیے میں نے ملاقات کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا۔ تم کل ایمبیسی میں آ کر اس کیس فائل کا مطالعہ کر سکتے ہو۔“ ٹیلر نے بتایا۔

ڈینی نے اگلے روز وہ فائل تفصیل سے دیکھی۔ کچھ معلومات نوٹ کیں۔ جس ایجنٹ کو گولیاں ماری گئی تھیں، وہ اب وہیل چیئر استعمال کرتا تھا۔ ڈینی اس کا ایڈریس نوٹ کر کے دوسرے دن صبح اس کے گھر پہنچ گیا۔

اس کی بیوی نے دروازہ کھولا اور بتایا کہ اس کا شوہر بیمار ہے۔ اسے زیادہ پریشان نہ کیا جائے۔

رابرٹ اسٹائن ایک ادھیڑ عمر کا بوڑھا شخص تھا جو کھڑکی کے پاس وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔

”یقیناً کوئی اہم بات ہوگی جو تم نے واشنگٹن سے ویانا کا سفر کیا ہے۔“ اس نے ڈینی سے کہا۔

”میں تم سے ذاتی طور پر مل کر تفصیل جاننا چاہتا ہوں کہ یہ آپریشن کیسے ناکام ہوا۔“ ڈینی نے کہا۔

”انہوں نے مجھے گولیاں مار کر زندگی بھر کے لیے معذور کر دیا اور تم پوچھ رہے ہو کہ کیا ہوا۔ میں وہ کمپیوٹر چپ تقریباً حاصل کرنے والا تھا۔ ایک رات پہلے مجھے دونوں ٹانگوں میں گولیاں ماردی گئیں۔“ اس نے بتایا۔

”ہاں، میں نے پوری فائل پڑھی ہے۔ مجھے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ چیک سفارت خانے کی وہ سیکریٹری ایروفلوٹ کی فلائٹ سے ماسکو روانہ کر دی گئی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ جس گن سے گولیاں چلیں، کیا اس پر سائلنسر لگا ہوا تھا؟“ ڈینی نے پوچھا۔

”نہیں، وہ ایک عام ہینڈ گن تھی لیکن فائر کی کوئی آواز میں نے نہیں سنی۔ یقیناً یہ عجیب بات تھی۔ شاید اس میں کوئی مخصوص گولیاں استعمال کی گئی تھیں۔“ اس نے کہا۔

ڈینی نے سوچا کہ جائے وقوعہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ وہ چیک ایمبیسی کے سامنے سے بھی گزرا اور اس کے بعد وہ ٹیکنیکل میوزیم میں ٹکٹ لے کر داخل ہو گیا۔ اس دوران بھی وہ اس کیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ میوزیم کی سیر کے دوران کوئی نئی بات ذہن میں نہیں آئی۔

وہ واپسی کے لیے نیچے آنے لگا۔ اچانک ایک موٹی سی عورت اس کو دھکا دیتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ جتنی دیر میں ڈینی سنبھلا، وہ عورت زینے سے مڑ کر غائب ہو چکی تھی۔

اسے اندازہ ہوا کہ اس کی جیب میں کوئی مڑا ہوا کاغذ ڈالا گیا ہے۔ وہ جلدی سے باہر آیا تا کہ اس عورت کو پکڑ سکے۔ کچھ دور وہ موٹی عورت بھاگتی نظر آئی۔ اس دوران اس نے وگ اور

اسکرٹ اتار کر پھینک دیا۔ اب ایک موٹا سا آدمی سوٹ پہنے ایک سیاہ کار میں داخل ہو رہا تھا جو فوراً ہی روانہ ہوگئی۔ ڈینی صرف کار کی نمبر پلیٹ کے آخری تین عدد ہی دیکھ سکا۔

ڈینی نے جیب سے کاغذ نکالا۔ ہینڈ رائٹنگ دیکھ کر اسے شاک لگا۔ کیری نے لکھا تھا۔ ''ڈیڈی پلیز! یہ لوگ جو کہہ رہے ہیں وہ کریں۔'' نیچے کیری کا نام تھا۔ آخری لائن کسی اور ہاتھ کی لکھائی میں تھی۔ ''اگر تم اپنی بیٹی کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس تحقیقات سے باز آجاؤ ورنہ نتائج کے ذمے دار تم خود ہوگے۔''

ڈینی نے واشنگٹن پہنچ کر ہیڈلے کو فون کیا۔ ''آج ہفتہ ہے لیکن میں تم سے گھر پر ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ ٹیکسی میں اس کے گھر پہنچ گیا۔

''میرے پاس بھی تمہارے لیے کچھ خبریں ہیں۔'' ہیڈلے نے کہا۔ ''ویانا سے میرے پاس ایشفورڈ کی خفیہ ایجنسی کا فون آیا تھا کہ آسٹرین پولیس نے وہ کار تلاش کرلی ہے جس کے آخری تین ہندسے تم نے دیے تھے۔ یہ کار ایک شخص اوٹو ہانس کی ہے۔ یہ شخص کے جی بی کا ایک معمولی مہرہ ہے اور رقم کی خاطر چھوٹے موٹے کام کرتا ہے۔''

''یہ بات تو طے ہوگئی کہ میری بیٹی کے اغوا کے پیچھے روسیوں کا ہاتھ ہے تاکہ مجھ پر دباؤ ڈالا جاسکے لیکن میں جواباً ان کو دباؤ میں رکھنا چاہتا ہوں اور جو کام میں کررہا ہوں، اس میں لگا رہوں۔'' ڈینی نے کہا۔ ''میں ویانا میں اسٹائن سے ملا تھا۔ اس پر جس گن سے فائر کیے گئے تھے، اس میں سائلنسر نہیں لگا ہوا تھا لیکن فائر کی آواز پھر بھی نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہے واردات میں خصوصی گولیاں استعمال کی گئی تھیں اور یہ بھی آپ جانتے ہیں ایسی گولیاں سی آئی اے نے ایک خفیہ پروجیکٹ کے تحت تیار کی تھیں۔ یہ یقیناً اس گروپ کے کسی ممبر کا کام ہے جس کے لوگوں کو ایجنسی ملازمت سے فارغ کردیا گیا تھا۔ یقیناً اس کے پاس یہ گولیاں موجود تھیں۔ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ بھیدی ایجنٹ کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ ویانا میں کیا آپریشن پلان کیا گیا ہے۔ گروپ کے لوگوں نے اس بات کو آخر تک خفیہ رکھا اور آسٹرینز کو عین وقت پر بتایا جس کے نتیجے میں رابرٹ کو گولیاں ماری گئیں اور چیک ایجنسی کی اس سیکریٹری کو دوسرے ہی دن ماسکو روانہ کردیا گیا۔ ایک اور مقصد یہ تھا کہ ایجنسی کو بدنام کیا جائے اور پریس کے ذریعے یہ باتیں امریکی صدر تک بھی پہنچ جائیں۔'' ڈینی نے مزید کہا۔

پیر کی صبح آفس میں ڈینی نے اس لسٹ کا مطالعہ کیا جس میں ملازمت سے نکالے جانے والے ایجنٹس کے نام تھے۔ اس نے ایک نام منتخب کیا اور اس سے ملاقات کے لیے روانہ ہوگیا۔ سلر کمنس ایک بار میں شغل کرتے ہوئے ملا۔

''میں کچھ کنٹریکٹ حاصل کرنا چاہتا ہوں جس سے اچھی آمدنی ہوجائے۔ کیا گروپ میری مدد کرے گا؟ میں کس طرح ان سے رابطہ کروں؟'' ڈینی نے کہا۔

''اگر وہ چاہیں تو خود رابطہ کرتے ہیں۔ اگر چاہو تو لومونٹ سے بات کرکے دیکھو۔'' کمنس نے کہا۔

لومونٹ سے ڈینی کی ملاقات اس کے فارم ہاؤس پر ہوئی۔ ''گروپ نے مجھے بھی چند سال پہلے کنٹریکٹ کی آفر کی تھی لیکن میں نے انکار کردیا۔'' اس نے بتایا۔

''پلیز! مجھے کوئی راستہ بتاؤ۔ میری مالی حالت اچھی نہیں ہے۔'' ڈینی نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم ٹالبوٹ سے ملاقات کرکے دیکھو۔'' لومونٹ نے کہا۔ ''وہ جارج ٹاؤن میں رہتا ہے۔ یہ گروپ کی اسکریننگ کمیٹی کا ممبر ہے۔''

''لیکن ان کا لیڈر کون ہے؟'' ڈینی نے پوچھا۔

''اصل طاقت ویلنگٹن لائٹر کے پاس ہے۔'' لومونٹ نے کہا۔

''یہ کہاں رہتا ہے، مجھے تو معلوم نہیں۔'' ڈینی بولا۔

''شاید بنگی بریسویل کچھ بتا سکے لیکن میرا نام درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ پرامن زندگی گزار رہا ہوں۔''

جارج ٹاؤن میں ڈینی کی بنگی سے ملاقات کوئی نتیجہ خیز نہیں رہی۔ لائٹر کی رہائش کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں چل سکا۔

ہیڈلے کے آفس میں یہ ساری باتیں زیر بحث آئیں۔

''لائٹر کو تلاش کرنے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' ڈینی نے کہا۔ ''ایجنسی کے آپریشنز میں ہونے والی خرابیاں، بھیدی ایجنٹ کی شناخت اور میری بیٹی کے اغوا کے معاملات کے حل کے لیے میرا لائٹر تک پہنچنا ضروری ہے۔''

''اس سلسلے میں تمہیں دفتر خزانہ سے معلومات کرنا ہوں گی کہ اس کے ریٹائرمنٹ چیک ہر مہینے کہاں کیش ہوئے ہیں۔'' ہیڈلے نے کہا۔

ایک طویل طریقہ کار کے بعد ڈینی کو کامیابی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ لائٹر کے پنشن چیک کی ادائیگی زیورخ، سوئٹزرلینڈ کے بینک میں کی جاتی ہے۔

ڈینی نے فوراً سوئٹزرلینڈ جانے کا پروگرام بنالیا۔ زیورخ پہنچ کر اس نے فیلکس ٹوبلر سے ملنے کے لیے دریائے لمات کے کنارے ایک پھولوں کی دکان کو تلاش کیا اور وہاں پہنچ گیا۔ ٹوبلر سے اس کی ملاقات پندرہ سال پہلے ایرک ہوفمین

نے کروائی تھی جو ڈینی کے کالج کا دوست تھا۔ ٹوبلر، ڈینی کو لے کر ایک اندرونی آفس میں آگیا اور اس نے پوچھا کہ اب بتاؤ تمہارے زیورخ کے سفر کا مقصد کیا ہے۔

”مجھے ایک امریکی باشندے کی تلاش ہے جو چند سال پہلے یہاں آیا ہے۔ یہ ایک امیر شخص ہے جس نے گھر بھی مہنگے علاقے میں لیا ہوگا۔ اس کا نام ویلنگٹن لائٹر ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

”میں اس طرح کے صرف ایک شخص کو جانتا ہوں لیکن اس کا نام کریمر ہے۔ اکثر اس کے گھر میں بڑی پارٹیاں ہوتی ہیں اور پھول میری ہی دکان سے منگوائے جاتے ہیں۔“ ٹوبلر نے بتایا۔

”کریمر نام کے اس شخص کے گھر کا پتا مجھے چاہیے۔“ ڈینی نے کہا۔

ٹوبلر نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پتا لکھ دیا۔ پھول والے کی دکان سے نکل کر ڈینی نے ایرک ہوفمین سے ملنے کا ارادہ کیا اور زیورخ یونیورسٹی پہنچ گیا جہاں ہوفمین انگلش لٹریچر کا پروفیسر تھا۔ ہوفمین نے ڈینی کی خیریت پوچھی۔

”میں عارضی طور پر واپس ایجنسی میں آگیا ہوں اور ایک خفیہ مشن پر کام کر رہا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری ملاقات کا انتظام کرنل رائس سے کرا دو جس کا تعلق سوئس ملٹری انٹیلی جنس سے ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

ہوفمین نے کرنل کو فون کیا اور دوسرے روز لنچ کی دعوت دی جو قبول کر لی گئی۔

مقررہ وقت پر تینوں افراد ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ ابتدائی رسمی گفتگو کے بعد ڈینی نے اپنا تعارف کرایا اور شناختی دستاویزات دکھائیں۔

”مجھے امید ہے کہ آپ غیر سرکاری طور پر میری کچھ مدد کر سکیں گے۔“ ڈینی نے کہا۔

”تم نے ایجنسی کے مقامی آفس سے کیوں رابطہ نہیں کیا؟“ کرنل نے پوچھا۔

”میرے مشن کی نوعیت انتہائی خفیہ ہے اور میں کسی کو یہ بات ظاہر نہیں کر سکتا۔“ ڈینی نے کہا۔

”اچھا بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟“ کرنل نے پوچھا۔

”مجھے ایک امریکی، ویلنگٹن لائٹر کے بارے میں تفصیلی معلومات چاہئیں۔ اس شخص کا یہاں ایک خفیہ اکاؤنٹ بھی ہے۔ مجھے اس کی رہائش گاہ کا پتا بھی چاہیے۔ یہ اکاؤنٹ اب سے پانچ سال پہلے کھولا گیا ہے جب لائٹر کو سی آئی اے سے برخاست کر دیا گیا تھا۔“ ڈینی نے کہا۔

”اچھا، میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔“ کرنل نے کہا۔

اگلی صبح ہوٹل کے کمرے میں اسے ایک فون کال آئی اور کہا گیا کہ پندرہ منٹ میں ہوٹل کے پارک میں فوارے کے پاس ملو۔ ڈینی وہاں پہنچ گیا تو اسے کرنل رائس نظر آیا۔ کرنل نے بتایا کہ ویلنگٹن لائٹر کے خفیہ اکاؤنٹ میں لاکھوں ڈالرز موجود ہیں اور اس میں دنیا کے کئی ممالک سے رقوم آتی ہیں۔ ان میں لیبیا بھی شامل ہے۔ اسی طرح مستقل بنیادوں پر ساری دنیا میں رقوم بہت سی پارٹیوں کو بھیجی بھی جاتی ہیں۔ کرنل نے ڈینی کو ایک کاغذ پر لکھا ہوا پتا بھی دیا کہ یہ شخص ہرلی برگ میں نمبر 7 میس اسٹریٹ پر رہتا ہے۔

”میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔“ ڈینی نے کرنل سے کہا۔

”مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے کام آسکا۔ ہماری گورنمنٹ ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتی۔“ کرنل نے کہا۔

ڈینی نے لائٹر کی رہائش گاہ کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا اور اس پتے پر پہنچ گیا۔ یہ ایک بڑا تین منزلہ گھر تھا جو پہاڑی کی ایک جانب تھا جبکہ اس کا پچھلا لان نیچے اتر کر ”جھیل زیورخ“ کے کنارے تک پہنچ گیا تھا۔ رہائش گاہ کا پورا علاقہ ایک دس فٹ اونچی دیوار سے محفوظ کیا گیا تھا۔ گھر سڑک سے ہٹ کر اندرونی جانب واقع تھا۔

لوہے کے بڑے گیٹ کے پاس پہنچ کر ڈینی نے گھنٹی بجائی۔ سائڈ میں لگے ایک بکس میں سے آواز آئی۔ ”تم کون ہو اور آنے کا کیا مقصد ہے؟“

”میرا نام ولیم ڈینی ہے اور میں مسٹر کریمر سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ڈینی نے کہا۔

جواب ملا۔ ”وہ گھر پر نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تو میں مسٹر ویلنگٹن لائٹر سے ملنا چاہوں گا۔“ ڈینی نے کہا۔

ایک بزر کی آواز آئی اور ڈینی گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر ایک آہنی باڑ کے پیچھے تین خطرناک ڈوبرمین کتے اس کو دیکھ کر غرا رہے تھے۔ یقیناً یہ کتے رات کو آزاد کر دیے جاتے ہوں گے۔ ڈینی نے گھر کے مین دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجائی تو ایک ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس کے ساتھ ڈینی کو ایک بڑے ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا جہاں لائٹر اپنی میز کے پیچھے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا تھا۔

”ڈینی! تم سے سات سال کے طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ تعجب ہے کہ تم نے مجھے تلاش کر لیا۔“ لائٹر

بولا۔

"ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے کینیڈا میں ایک فشنگ کیمپ شروع کیا ہے لیکن میں شروع ہی سے مالی مشکلات کا شکار ہوں۔ میرے یہاں آنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ میری کچھ مدد کریں اور مجھے کچھ بین الاقوامی کمپنیوں کے کنٹریکٹ دلوا دیں تاکہ میں ان مشکلات سے نکل سکوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ ایجنسی کے ریٹائرڈ شدہ "اولڈ بوائز" کے ایک نیٹ ورک کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ لوگ خود کو صرف "گروپ" کہلواتے ہیں۔" ڈینی نے کہا۔

"مجھے تو یہ لگتا ہے کہ یہ ایجنسی کے موجودہ ڈپٹی ڈائریکٹر کے دماغ کی اختراع ہے۔ ایسا کوئی گروپ موجود نہیں ہے۔ تم اتنی کوشش کے بعد مجھ تک پہنچے لیکن یہ کوشش بے فائدہ رہی۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ صرف تمہیں کافی پیش کرسکتا ہوں۔" لائٹر نے کہا۔

ڈینی نے گفتگو کے دوران کمرے کا جائزہ بھی لیا۔ کمرے کے مرکز میں ایک پیتل کا بنا ہوا مجسمہ رکھا تھا جس پر پتلی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور پنکھے کی ہوا سے آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ ڈینی نے کافی پینے کے بعد لائٹر کا شکریہ ادا کیا اور اس کی کوٹھی سے باہر آ گیا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہاں سے وہ سیدھا پھول والے کی دکان پر پہنچا۔

"اگر کریمر کے گھر سے پھولوں کا کوئی آرڈر ملے تو میں تمہارے ڈیلیوری بوائے کے ساتھ خفیہ طریقے سے وہاں جانا چاہتا ہوں۔" ڈینی نے فیلکس سے کہا۔

"ہاں، کل صبح پھول وہاں پہنچانے ہیں۔" فیلکس نے کہا۔ اس نے اپنے بھتیجے کو آواز دی۔ "کارل! یہ میرے امریکی دوست کل تمہارے ساتھ وین میں ڈیلیوری کے لیے جائیں گے۔ جیسے یہ کہیں، تم نے ویسے ہی کرنا ہے۔"

دوسری صبح ڈینی فلاور شاپ پر پہنچ گیا۔ اس نے عام ورکر کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

"تم اپنے نارمل روٹ پر آرڈرز ڈیلیور کرو۔ میں اپنی گاڑی میں پیچھے آرہا ہوں۔ جب کریمر کے گھر کے قریب پہنچو گے تو ایک بلاک کے فاصلے پر جھیل کے کنارے میرا انتظار کرنا۔" ڈینی نے کارل سے کہا۔

مقررہ مقام پر ڈینی وین کے پچھلے حصے میں پہنچ گیا۔

"مجھے وہ پھول چاہئیں جس کا آرڈر کریمر نے دیا ہے۔" اس نے کہا۔

"یہ سرخ گلاب کا بڑا سا گلدستہ کریمر کے گھر دیا جائے گا۔" اس نے بتایا۔

ڈینی نے بہت احتیاط سے اس گلدستے کے درمیان پھولوں کے اندر ایک چھوٹا سا بگ جو مکھی کی شکل کا تھا، فٹ کردیا۔ یہ ایک سینٹی میٹر سے بھی چھوٹا تھا اور اس میں انتہائی طاقتور مائیکروفون تھا جس کے ذریعے اڑتالیس گھنٹے کی ریکارڈنگ کی جاسکتی تھی۔ یہ ایجنسی کی خفیہ ایجاد تھی۔ اس کا ٹیپ ریکارڈر ڈینی نے پہلے ہی اپنی گاڑی میں حفاظت سے رکھ دیا تھا۔

کریمر کے گھر پہنچ کر پھولوں کا یہ گلدستہ ڈیلیور کردیا گیا۔ واپسی پر ڈینی نے کارل سے کہا۔ "میری گاڑی دوسری جگہ کھڑی ہے لیکن میں تمہاری وین میں پھولوں کی دکان پر جاؤں گا۔"

ڈینی نے اپنے ہوٹل پہنچ کر دو دن سیر میں گزارے اور تیسرے دن ہوفمین کے ساتھ جا کر اپنی گاڑی واپس لے آیا۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے اپنی گاڑی کے خفیہ خانے سے ٹیپ ریکارڈر نکالا اور اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ ٹیپ نکال کر اس نے ہیڈ فون لگایا اور ریکارڈنگ سننے لگا۔

یہ پارٹی والی رات کی ریکارڈنگ تھی۔ ان میں چند آوازیں ڈینی نے شناخت کرلیں۔ یہ لوگ سی آئی اے چیف کے بارے میں بات کررہے تھے۔ اس گفتگو سے ڈینی کو پتا چلا کہ یہ گروپ چیف کو امریکی صدر کی نظروں سے گرا کر اپنی پسند کا چیف لگوانا چاہتے ہیں۔ وہ خود ویلنگٹن لائٹر ہی ہوگا۔

کسی نے پوچھا۔ "ہمیں ابھی تک اس شخصیت کا نام نہیں معلوم ہوا جو انتہائی اہم معلومات ایجنسی ہیڈ کوارٹر سے ہمیں بھیج رہی ہے۔ کیا کوئی اس کی آواز بھی نہیں پہچانتا۔"

لائٹر نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ جب مجھے پہلا ٹیپ ملا تھا تو ساتھ ہی وارننگ بھی دی گئی تھی کہ اس آواز کا کھوج لگانے کی کوشش ہرگز نہ کی جائے۔" لائٹر نے کہا۔ "کیا تم لوگ تازہ ترین ٹیپ سننا چاہو گے؟"

لیکن ڈینی کے ٹیپ میں مزید کوئی آواز نہیں آئی۔ وہ ریکارڈر بند کرنے والا تھا کہ ٹیپ کے آخری حصے میں اسے گھنٹیاں بجنے کی آواز سنائی دی۔ ڈینی نے ریکارڈر بند کیا اور غور کرنے لگا کہ یہ کس چیز کی آواز تھی اور کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس کو اندازہ ہوگیا کہ یہ کس جگہ اور کس چیز کی آواز تھی۔

لینگلے واپس پہنچ کر اس نے سام گرین سے کہا۔ "مجھے زیورخ کے ایک خاص علاقے میں ایک مخصوص گھر کی سیٹلائٹ تصاویر چاہئیں۔"

دو روز بعد سام نے اسے ایک لفافہ دیا جس میں "10"x12 کی کئی تصاویر تھیں۔ لائٹر کے گھر اور لان کی

تفصیل بہت واضح تھی۔ ایک تصویر میں چھت پر بنے ہوئے کمرے اور اس کے لاک کی واضح تفصیل تھی۔ ڈینی یہ تصاویر لے کر اور اپنی ضرورت کے سامان کی لسٹ کے ساتھ اس سیکشن میں پہنچ گیا جس کا نام ڈائریکٹریٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی تھا۔

"مجھے اس تالے کی چابی کی نقل چاہیے اور یہ سارا سامان بھی جو میں نے لسٹ میں لکھا ہے۔" ڈینی نے کہا۔ "مجھے ایک ڈارٹ گن بھی چاہیے جس کے ذریعے ڈوبر مین کتے کو کم از کم ایک گھنٹے کے لیے بے ہوش کیا جاسکے۔ آخری آئٹم ایک ربر کی شیٹ چاہیے جس میں آدھے انچ کے برابر فاصلے پر سوراخ بنے ہوں۔ یہی شیٹ سب سے اہم ہے اور میری زندگی کی ضامن ہوگی۔" ڈینی نے مزید کہا۔

واشنگٹن میں ڈینی کا زیادہ وقت جولی کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ دونوں کے تعلقات بڑھتے جارہے تھے۔

آخرکار مکمل تیاری کے بعد ڈینی ایک مرتبہ پھر زیورخ کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک غیر معروف ہوٹل میں کمرا بک کرایا۔ اس نے آڈی کار کرائے پر لی۔ بازار سے ایک ایلومینیم کا آکسیجن ٹینک خرید کر اسے بھروالیا۔ سارا ضروری سامان کار کی ڈکی میں محفوظ کردیا اور زیورخ لیک کی طرف روانہ ہوگیا تاکہ سورج کی روشنی میں صورت حال کا جائزہ لے سکے۔

اس جھیل کی چوڑائی، لمبائی سے کم تھی۔ دوربین کے ذریعے اس نے جھیل کے مخالف کنارے ویلنگٹن لائٹر کے قلعہ نما گھر کا جائزہ لیا۔ یہ گھر تین اطراف سے حفاظتی دیوار میں محفوظ تھا لیکن جھیل کے کنارے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی۔

ہر طرح سے مطمئن ہوکر ڈینی واپس ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ رات کا کھانا جلدی کھا کر وہ آرام کی خاطر بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے اپنے موبائل پر رات ایک بجے کا الارم لگایا لیکن نیند پھر بھی اسے نہ آسکی۔ ایسا لگا کہ الارم فوراً ہی بج گیا ہو۔

ڈینی اٹھ کر تیار ہوا اور اپنے مشن پر روانہ ہوگیا۔ اس مشن میں کافی خطرہ تھا لیکن اپنی بیٹی کیری کی رہائی کی خاطر اس نے ہر خطرے کا سامنا کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ لائٹر کے گھر کے قریب جھیل کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں ڈینی نے گاڑی روکی اور کپڑے اتار کر ربر کا ڈائیونگ سوٹ پہن لیا۔ پیروں میں تیرنے والے جوتے پہن کر آکسیجن ٹینک کمر پر باندھا اور جھیل میں اتر گیا۔ اس کا تمام ضروری سامان اس کے جسم پر بندھا ہوا تھا۔

بارہ فٹ کی گہرائی میں پہنچ کر اس نے لائٹر کے گھر کی سمت تیرنا شروع کردیا۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے گھر کی طرف چلنا شروع کردیا۔ پورے چاند کی روشنی میں منظر واضح نظر آرہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ تین سیاہ اجسام تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہ ڈوبر مین کتے تھے جن کی یہ ٹریننگ ہوتی ہے کہ خاموشی سے اپنے شکار پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

وقت بہت کم تھا۔ آگے آنے والا کتا ڈینی پر حملہ کرنے والا تھا جب اس نے ڈارٹ گن فائر کی۔ وہ اس کے پیروں کے قریب گر کر بے ہوش ہوگیا۔ دو سیکنڈ بعد اس نے دوسرا ڈارٹ دوسرے کتے پر ماردیا۔ یہی حشر تیسرے کتے کا بھی ہوا۔

ڈینی نے آکسیجن ٹینک اور ڈائیونگ سوٹ اتار دیا اور ضروری سامان کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ لائٹر کے گھر کی چھت کا ایک حصہ بقیہ حصے سے ذرا نیچا تھا۔ ڈینی نے چھت پر جانے کے لیے اس مقام کو ہی چنا تھا۔ چھت پر پہنچ کر ڈینی نے اوپر والے کمرے کے دروازے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہوگیا اور خاموشی سے لاؤنج میں پہنچ گیا۔ اسے تلاش تھی کہ ٹیپ کہاں محفوظ کیے گئے ہیں۔

پیتل کا مجسمہ کمرے کے وسط میں رکھا ہوا تھا۔ ڈینی نے بہت احتیاط کے ساتھ سوراخوں والی ربر شیٹ کو پیتل کی سلاخوں میں لگادیا تاکہ وہ آپس میں ٹکرا کر شور نہ پیدا کریں پھر اس نے مجسمے کا نیچے کا بیس کھولا۔ اس خانے میں ایک ہی ٹیپ رکھا ہوا تھا۔

ڈینی نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا ریکارڈر نکالا اور وہ ٹیپ اس میں لگادیا۔ چند سیکنڈ میں تیز رفتاری کے ساتھ اس نے اپنے ریکارڈر کے ٹیپ میں اس گفتگو کی کاپی تیار کرلی۔ ٹیپ واپس اسی جگہ پر رکھ دیا اور احتیاط سے ربر شیٹ اتار کر واپسی کی راہ اختیار کی۔

جھیل کے کنارے پہنچ کر ڈینی نے جلدی جلدی ڈائیونگ سوٹ پہنا۔ تینوں کتوں نے ہلنا شروع کردیا تھا۔ ان کے ہوش میں آنے میں بہت کم وقت بچا تھا۔ اس نے ان کے جسم سے ڈارٹ نکالے اور جھیل میں اتر کر تیرنا شروع کردیا۔ لائٹر کے گھر میں کسی کو بھی پتا نہیں چلنا تھا کہ کون آیا تھا۔

واشنگٹن پہنچ کر ڈینی نے اپنے ایک پرانے ساتھی سے ملاقات کی جو ایجنسی سے ریٹائر ہوچکا تھا۔ یہ شخص کمپیوٹر کے استعمال کا ماہر تھا۔ ڈینی نے اسے ٹیپ دیا کہ اس کو چیک کرے۔ اس شخص نے ٹیپ اپنے ریکارڈر میں لگا کر چلایا تو ایک خاتون کی آواز میں ایک پیغام تھا۔ اس خاتون کا لہجہ ہکلاہٹ کا شکار تھا۔

"میرا خیال ہے کہ آواز کمپیوٹر کی مدد سے تبدیل کی گئی ہے۔ میں کوشش کرکے دیکھتا ہوں۔" ایجنٹ نے کہا۔

کئی گھنٹے کی محنت کے بعد ٹیپ دوبارہ چلایا گیا تو اس میں ایک مرد کی آواز تھی۔ ڈینی یہ پیغام سن کر حیران رہ گیا۔ وہ پہچان گیا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ اس کے اب تک کے سارے اندازے غلط ثابت ہو چکے تھے۔

سوئٹزرلینڈ کے مشہور اسکی ریزورٹ، برف پوش ”آنگر ماؤنٹین“ کے کیبل کار اسٹیشن میں دو افراد انتظار کر رہے تھے۔ لمبے قد والے شخص نے اسکیئنگ کا سرخ لباس اور گاگلز پہنے ہوئے تھے۔ دوسرا شخص نسبتاً چھوٹے قد کا اور ذرا بھاری جسم کا تھا۔ اس نے پیلے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ دونوں کے کاندھوں پر اسکیز لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ کیبل کار اسکیئرز کو سات ہزار فٹ کی بلندی پر لے جاتی تھی۔ وہاں سے یہ لوگ اسکیز کے ذریعے نیچے آتے تھے۔

جیسے ہی ایک سرخ رنگ کی کیبل کار آ کر رکی، دونوں افراد اس میں سوار ہو گئے اور کار نے سفر شروع کر دیا۔ پستہ قد شخص کا نام الیکسی پاؤلوف تھا اور یہ روسی جاسوس ایجنسی کے جی بی کا چیف تھا۔

اس نے دوسرے شخص سے کہا۔ ”میٹنگ کے لیے تم نے یہ بہت اچھی جگہ چنی ہے۔ یہاں نہ ہمارے گارڈز ہیں اور نہ کوئی اور سننے والا ہے۔“

”تمہارا شکریہ کہ تم اس ملاقات کے لیے آ گئے۔“ طویل قامت شخص نے کہا۔ یہ شخص امریکی سی آئی اے کا ڈائریکٹر بروکس جارڈن تھا۔

یہ دونوں جاسوسی کی دنیا میں طاقتور ترین اشخاص تھے۔ کئی سال پہلے ان دونوں کی ملاقات جرمنی میں ہوئی تھی۔ جب سے یہ دوستی چل رہی تھی۔ دونوں برابری کی بنیاد پر ایک دوسرے کو حساس معلومات فراہم کر رہے تھے۔ جارڈن نے ”گروپ“ کی مدد سے جو تازہ کارروائیاں کی تھیں، ان کو پاؤلوف نے اپنے کھاتے میں ڈال کر روسی پولٹ بیورو میں اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم کر لیا تھا۔ موجودہ روسی صدر یوری کیلن بھی اس سے مطمئن تھا۔

”تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے؟“ جارڈن نے پاؤلوف سے کہا۔

پاؤلوف نے جیب سے ایک سفید رنگ کا لفافہ نکال کر جارڈن کو دیا۔ ”اس میں ہمارے SS-18 میزائل کی ڈرائنگز ہیں۔ ہمارے پاس ایسے تین سو میزائل ہیں۔“

جارڈن نے وہ لفافہ جیب میں رکھ لیا۔

”امریکی صدر کی نظر میں تمہاری پوزیشن مزید بہتر ہو جائے گی۔“ پاؤلوف نے کہا۔

جارڈن کی پریشانی یہ تھی کہ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ امریکی صدر کے اطراف لابی کا ایک گروپ اس کا مخالف تھا اور اسے ڈائریکٹر شپ سے ہٹانا چاہتا تھا۔ پاؤلوف نے اسے اطمینان دلایا کہ تم فکر نہ کرو۔ ہم دونوں کا باہمی تعاون دونوں کی ذات کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔

”آئندہ ملاقات میں، میں تمہیں روسی لیزر گن کی تفصیلات دے سکوں گا۔“ پاؤلوف نے کہا۔

جارڈن جانتا تھا کہ اس فیلڈ میں روس، امریکا سے کافی آگے تھا۔

جارڈن حیرت زدہ تھا۔ اس نے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ کوئی شرط بھی شامل ہے؟“

”امریکی سی آئی اے کو روسی صدر کیلن کو قتل کرنا ہوگا۔“ پاؤلوف نے جواب دیا۔

”لیکن مجھے یہ سودا بہت مہنگا لگتا ہے۔ یہ ایک ناممکن کام ہے۔ ذرا سوچو، اگر یہ کوشش ناکام ہو گئی تو تیسری عالمی جنگ شروع ہو سکتی ہے۔ اس کے نقصانات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی بلکہ دونوں بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہوئے مزید ترقی کر سکتی ہیں۔“ پاؤلوف نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر ایجنسی یہ کام کر دے گی تو تمہاری جانب سے معلومات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ میں یہ یقین دہانی چاہتا ہوں۔ مزید یہ کہ چین کی سرحدوں پر اپنا دباؤ ختم کروانے میں بھی تم مدد کرو گے۔“ جارڈن نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ یہ تم سے میرا وعدہ ہے۔ ہم اس آپریشن کا نام ”آپریشن ویلکی“ رکھتے ہیں۔ ویلکی، یوکرین میں وہ جگہ ہے جہاں کیلن پیدا ہوا تھا۔“ پاؤلوف نے کہا۔

اس دوران کیبل کار پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ چکی تھی۔ دونوں افراد اتر کر ایک دوسرے سے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

واشنگٹن پہنچ کر ڈینی نے جولی کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی کام سے ملک سے باہر گئی ہوئی ہے۔ ڈینی نے ایجنسی کے ڈائریکٹر کے آفس فون کر کے اس سے ملنے کا اپائنٹمنٹ لیا۔ صبح دس بجے وہ ڈائریکٹر جارڈن سے ملنے کے لیے اس کے آفس میں داخل ہوا۔

”میں نے بھیدی ایجنٹ کو تلاش کر لیا ہے۔“ ڈینی نے بتایا۔

”وہ کون ہے؟“ جارڈن نے پوچھا۔

”اس سوال کا جواب آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔

میرے پاس آپ کے تازہ ترین کیسٹ میں آپ کی آواز میں پیغام موجود ہے جو آپ نے زیورخ بھیجا تھا۔" ڈینی نے کہا۔

جارڈن نے چند سیکنڈ سوچا اور بولا۔ "ایجنسی میں کوئی بھیدی ایجنٹ نہیں تھا لیکن ڈکسن ہیڈلے، ڈپٹی ڈائریکٹر کو شک ہوا کہ کوئی اندر سے ہمارے بیرون ملک آپریشنز کی اطلاعات باہر بھیج رہا ہے اور وہ روسیوں تک بھی پہنچ رہی ہیں اس لیے تمہیں بلایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ایک روسی ڈبل ایجنٹ کو کنٹرول کر رہا ہوں۔ اس کا نام الیکس پاؤلوف ہے جو کے جی بی کا سربراہ ہے۔"

"لیکن تم نے خود گروپ کو معلومات فراہم کر کے ایجنسی کے بیرونی آپریشنز کو ناکام بنایا۔" ڈینی نے حیرانی سے سوال کیا۔

"پاؤلوف کو کچھ تو دینا ہی تھا۔" جارڈن بولا۔ "روسیوں نے تمہاری بیٹی کو بھی اسی لیے اغوا کیا کہ تم پر دباؤ ڈالا جا سکے۔"

"مجھے اپنی بیٹی واپس چاہیے۔ میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایک ہفتے میں تم میری بیٹی کو واپس لے آئے تو میں خاموشی اختیار کرلوں گا ورنہ میرے پاس تمہاری غداری کے جو ثبوت ہیں، وہ میں میڈیا کو دے دوں گا اور تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہے گی۔" ڈینی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں لیکن اس کام میں چند روز لگیں گے۔" جارڈن بولا۔

ایک ہفتے بعد ڈپٹی ڈائریکٹر ہیڈلے نے ڈینی کو فون کیا اور کہا کہ میں تم سے وائلڈ لائف پارک میں شیر کے جنگلے کے پاس ملنا چاہتا ہوں۔ ڈینی مقررہ وقت پر پارک پہنچ گیا۔

"یہ جگہ محفوظ اور پرائیویٹ ہے۔ ہماری بات چیت کوئی نہیں سن سکتا۔" ہیڈلے نے کہا۔ "میں نے اسپیشل آپریشنز سیکشن سے متعلق کچھ بات سنی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے کا کھوج لگاؤ۔" ہیڈلے نے ڈینی سے کہا۔ "اس سیکشن کا کوئی ایجنٹ ملک سے باہر بھیجا گیا ہے اور وہ مبینہ طور پر سرکس کے مسخرے کی ٹریننگ لے رہا ہے۔ مجھے اس ایجنٹ کا نام نہیں معلوم۔" ہیڈلے نے بتایا۔

"میرا کنٹریکٹ تو اب ختم ہونے والا ہے۔" ڈینی نے بتایا۔

"میری پریشانی یہ ہے کہ جارڈن اور اسپیشل آپریشنز کے لوگوں میں پچھلے ہفتے میں کوئی میٹنگ ہوئی ہے۔ ضرور دال میں کچھ نہ کچھ کالا ہے۔" ہیڈلے نے کہا۔

ڈینی نے بھی غور کیا تو ذہن میں یہ بات آئی کہ جارڈن سے ملاقات کے دوران اس سے کچھ باتیں چھپائی گئی ہیں۔ جارڈن نے کہا تھا کہ ایک دو معاملات مکمل ہو جائیں تو وہ روسیوں سے اس کی بیٹی کے متعلق بات کرے گا۔ ڈینی نے سوچا کہ شاید اس معاملے کا تعلق بھی کیری کی زندگی سے ہو لہٰذا اس نے اس معاملے کو دیکھنے کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔

ڈینی نے گوگل پر تلاش کر کے دو تین سابق سرکس کے اسٹار مسخروں کو فون کیے۔ اسے پتا چلا کہ اس وقت اس کام کی ٹریننگ کے لیے جرمنی کے شہر بون میں موجود کلاؤن کالج بہترین ہے جسے دو بھائی چلا رہے ہیں۔ ڈینی نے اپنے ایک دوست کو سول ایوی ایشن میں فون کیا اور کہا کہ مجھے ان تمام مسافروں کی فہرست چاہیے جو پچھلے ایک ہفتے میں بون (جرمنی) کے سفر پر روانہ ہوئے ہیں۔

فہرست ملنے پر اس نے تین نام منتخب کیے۔ ان میں سے دو کا تعلق کولمبیا سے تھا اور ایک کا نیویارک سے۔ ڈینی بھی جرمنی روانہ ہو گیا۔ بون پہنچ کر اس نے کلاؤن کالج کا ایڈریس حاصل کیا اور دو گھنٹے کے ٹرین کے سفر کے بعد اس مقام پر پہنچ گیا۔

کالج بگ پائن کے مقام پر تھا جو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ وہاں رہائش کا ایک ہی ہوٹل تھا۔ ڈینی نے ہوٹل کے استقبالیہ کلرک سے پوچھا۔ "کیا تمہارے ہاں کوئی مسافر ڈومینک کوب کے نام سے مقیم ہے؟"

"ہاں، یہ لڑکی یہاں کالج کی اسٹوڈنٹ ہے۔ یہاں اور اسٹوڈنٹس بھی مقیم ہیں۔" کلرک نے کہا۔

ڈینی نے کالج کا راستہ دریافت کیا اور تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا۔ تمام اسٹوڈنٹس ایک کلاس روم میں جا رہے تھے۔ ڈینی بھی ان کے ساتھ مل کر اندر داخل ہو گیا اور پچھلی نشستوں کی لائن میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک موٹا سا پست قد آدمی اندر داخل ہوا جس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے آج کی کلاس کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"میرا تعلق نیویارک ہیرالڈ اخبار سے ہے اور میں سرکس کالج کے بارے میں ایک فیچر لکھ رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ یہ صاحب کون ہیں؟" ڈینی نے اپنے برابر بیٹھی لڑکی سے پوچھا۔

"یہ دونوں میں سے چھوٹا بھائی چیکو ہے۔" لڑکی نے کہا۔

پہلے میک اپ کی ٹریننگ شروع ہوئی۔ آدھے لوگوں نے سفید چہرے والا میک اپ کرنا تھا اور دوسرے گروپ نے گلابی میک اپ کرنا تھا۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو چیکو نے کہا۔ "اب ہم دوبارہ اس اسکرپٹ کی ریہرسل کریں گے جس میں چور اور سپاہی کا رول ہے۔"

اسٹیج پر چند چور داخل ہوئے اور تجوری کو کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ ناکامی کے بعد ایک نے جیب سے پٹاخوں کا

بنڈل نکالا اور ماچس سے اسے آگ دکھادی۔ پٹاخے پھٹنے لگے۔
"تم دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لو...... اور ڈومینک! تم آنکھوں پر ہاتھ رکھ لو۔" چیکو نے کہا۔
ڈینی نے غور سے اس لڑکی کو دیکھا تو اسے کچھ شک ہوا۔ چیکو نے آواز دی۔ "پولیس مین۔" ایک اور کلاؤن مصنوعی پستول لیے اندر داخل ہوا اور فائرنگ شروع کردی۔ سب چور گولیاں لگنے سے نیچے گر پڑے۔ کلاس نے تالیاں بجائیں۔
"بہت اچھا۔ آج کا کام ختم۔ سب لوگ منہ ہاتھ دھولیں۔ اب لنچ کا وقفہ ہے۔" چیکو نے کہا۔
ڈینی خاموشی سے اٹھا اور ڈومینک کے برابر والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔
"ہیلو جولی! تم کیسی ہو؟" ڈینی نے کہا۔
جولی ذرا حیران ہوئی۔ "ڈینی! تم یہاں؟ باہر آؤ۔ ہم یہاں بات نہیں کرسکتے۔" دونوں لنچ کے لیے قریبی کینٹین میں چلے گئے۔
"تم یہاں کیا کررہے ہو؟" جولی نے پوچھا۔
"مجھے ہیڈلے نے بھیجا ہے۔ اسے معلوم ہوا تھا اسپیشل آپریشنز سیکشن کا کوئی ایجنٹ سرکس کے مسخرے کی ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا ہے لیکن یہ تو ایک انتہائی خفیہ مشن ہے۔" ڈینی نے کہا۔ "جولی! تم جانتی ہو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"
لنچ کے بعد دونوں واپس کلاس روم میں آگئے۔ اب بڑے بھائی روتو کا لیکچر تھا جس کا تعلق سرکس میں پیش کیے جانے والے مزاحیہ خاکوں سے تھا۔ اس نے دنیا کے مختلف ملکوں کے مسخروں کا ذکر کیا جس میں سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور آسٹریا کے تاریخی سرکسوں کا ذکر تھا اور بتایا کہ روس میں بھی سرکس کی پرانی تاریخ ہے۔ اب بھی وہاں کئی مشہور سرکس ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور "ماسکو سرکس" ہے۔
شام کو جب کلاسز ختم ہوگئیں تو جولی، ڈینی کی کار میں ایک ساحلی مقام پر گئی تاکہ دونوں سکون سے بات کرسکیں۔
"تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔" جولی نے کہا۔
"یقیناً مجھے بھی۔ تمہیں گئے ہوئے اتنے دن گزر گئے تھے۔ میں اداس ہوگیا تھا۔" ڈینی بولا۔
"قوانین کے تحت مجھے اپنے باس کو بتانا پڑے گا کہ یہ مشن اب خفیہ نہیں رہا لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی۔" جولی نے کہا۔
"پھر نہ بتاؤ۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسپیشل آپریشنز کی وہ ایجنٹ تم ہو۔"

ڈینی نے کہا۔
"میں ایک اور اعتراف کرنا چاہتی ہوں کہ ہمارا شعبہ شروع ہی سے تمہاری نگرانی کررہا تھا اور اس کے احکامات براہِ راست جارڈن کی طرف سے ملے تھے۔" جولی نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے، ایجنسی نے ہمارے درمیان شکوک پیدا کردیے۔"
"اگر تم چاہتی ہو کہ ہمارے باہمی تعلقات ہر شک و شبے سے پاک ہوجائیں تو میری طرح تم بھی استعفا دے دو پھر ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔" ڈینی نے کہا۔
"میں ابھی ایسا نہیں کرسکتی کیونکہ میں مجبور ہوں۔" جولی نے کہا۔
واشنگٹن واپس پہنچ کر ڈینی اپنے آفس گیا اور پرسنل ڈیپارٹمنٹ میں فون کیا کہ میں جولی نکولس کی فائل دیکھنا چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں فائل آگئی اور وہ اس کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ فائل سے دو اہم باتیں پتا چلیں کہ جولی اپنے والدین کے ساتھ کئی سال ماسکو میں بھی رہی اور دوسری بات یہ کہ وہ ایک ماہر نشانہ باز ہے۔
ڈینی اب ہیڈلے سے ملاقات کے لیے اس کے آفس پہنچ گیا۔ ہیڈلے نے پوچھا۔ "کیا تم نے سرکس کلاؤن والے ایجنٹ کو تلاش کرلیا؟"
"ہاں، اس کا نام جولی نکولس ہے۔ یہ روسی زبان کی ماہر اور بہت اچھی نشانہ باز ہے اور یہ اسپیشل آپریشنز کے شعبے میں کام کرتی ہے۔ یہ جرمنی کے کلاؤن کالج میں میک اپ اور مختلف اقسام کے مزاحیہ اسکرپٹ میں کام کرنا سیکھ رہی ہے۔" ڈینی نے کہا۔
"اصل سوال یہ ہے کہ اس کا نشانہ کون اور کہاں ہوسکتا ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ ٹارگٹ روس میں ہے لیکن کون......؟" ہیڈلے نے کہا۔
"میں کوشش کرتا ہوں انٹرنیٹ سے کچھ پتا چلے۔" ڈینی نے کہا۔
ڈینی نے اپنے آفس پہنچ کر نیٹ پر تلاش شروع کی کہ کن ملکوں کے سربراہ سرکس کا شوق رکھتے ہیں۔ تین نام سامنے آئے جن میں روسی صدر کیلن کا نام بھی شامل تھا۔ اب ڈینی کو یقین ہوگیا کہ ٹارگٹ کون سی شخصیت ہے۔ ڈینی نے سی آئی اے کے دوسرے سیکشن میں فون کیا اور پوچھا کہ مجھے یہ معلومات چاہئیں کہ روس میں ماسکو سرکس کن تاریخوں میں اپنا شو کرتا ہے۔
ڈینی کو تفصیل بتادی گئی اور پھر اس شخص نے کہا۔ "عجیب بات ہے۔ ایک ہفتہ پہلے یہی معلومات اسپیشل آپریشنز کے کسی

عہدیدار نے بھی مانگی تھیں۔‘‘

ڈینی نے ہیڈلے کو یہ ساری تفصیل بتائی۔ ہیڈلے نے کہا۔ ’’اگر یہ آپریشن کامیاب ہوگیا تو دنیا میں ایٹمی جنگ چھڑ سکتی ہے۔ ڈینی! تمہیں ماسکو جانا ہوگا اور کسی طرح اس آپریشن کو ناکام بنانا ہے۔‘‘

ڈینی نے آسٹریا کے شہر ویانا سے ماسکو کے لیے ایروفلوٹ کی پرواز کا ٹکٹ لیا۔ پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات جعلی تھے لیکن ویزا اصلی لگا ہوا تھا جو واشنگٹن میں روسی ایمبیسی سے جاری ہوا تھا۔ ڈینی نے اپنا حلیہ بھی کافی حد تک تبدیل کیا ہوا تھا۔ اس نے ماسکو پہنچ کر ایک غیر معروف ہوٹل میں کمرا لیا۔ رات کو آرام کے بعد دوسرے دن صبح وہ ٹیکسی کے ذریعے امریکن ایمبیسی پہنچا اور کمرشل اتاشی سے ملاقات کی۔ دونوں ایک محفوظ کمرے میں گئے اور بات کی۔ ڈینی کو دو پارسل دیے گئے۔ ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔ یہ دونوں آج ہی موصول ہوئے تھے۔ ڈینی نے انہیں اپنے بیگ میں رکھ لیا اور ایمبیسی سے باہر آ گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ایک بڑے ٹرین اسٹیشن میں گیا اور دونوں پارسل ایک لاکر میں محفوظ کردیے۔ لاکر کی چابی اس نے حفاظت سے اپنی جیب میں رکھ لی اور ہوٹل واپس آ گیا۔

رات کو آرام کے بعد دوسرے روز صبح ڈینی نے اپنے مشن کی تیاری شروع کی۔ اس نے بیگ سے ایک پارسل نکال کر کھولا تو اس میں سے سرکس کے مسخرے کا لباس برآمد ہوا جو نائلون کا بنا ہوا تھا۔ یہ گہرے گلابی رنگ کی قمیص اور سرخ و نیلے دھاری دار پاجامے پر مشتمل تھا۔ اس پیکٹ میں ربر کا فیس ماسک بھی تھا جس کے ساتھ سرخ رنگ کی ناک لگی ہوئی تھی۔

ڈینی نے سائڈ ٹیبل سے اپنا چھوٹا ریڈیو اٹھایا اور اس کا پچھلا کور کھول کر ایک دھاتی ڈبا نکالا۔ اس ڈبے کے ڈھکن میں چھ پیچ لگے ہوئے تھے۔ ڈینی نے اپنے جیبی چاقو کی مدد سے یہ پیچ کھولے اور ڈھکن ہٹایا تو ڈبے میں سے ایک ٹیزر گن برآمد ہوئی۔ یہ بیٹری والی چھوٹی ٹارچ کے برابر تھی۔ اس گن سے پندرہ فٹ کے فاصلے تک دو چھوٹی سوئیاں (ڈارٹ) فائر کی جاسکتی تھیں۔ ڈارٹ باریک تاروں کے ذریعے گن سے جڑے ہوئے تھے۔ اس گن کے ذریعے اپنے شکار پر طاقتور بجلی کا کرنٹ پہنچایا جاسکتا تھا۔ ایک عام انسان کو اس گن کے ذریعے آدھے منٹ تک مکمل طور پر بے حس کیا جاسکتا تھا۔ اس کی ہلنے جلنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی لیکن اس گن کے فائر سے کوئی مہلک اثرات نہیں ہوتے۔ آہستہ آہستہ چند منٹ میں وہ شخص نارمل ہوجاتا ہے۔

ڈینی کو آج دو بجے والے سرکس کے شو میں جانا تھا۔

مقررہ وقت سے ایک گھنٹا پہلے ڈینی نے تیاری شروع کی۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی پینٹ اور شرٹ پہنی۔ جیبوں میں ٹیزر گن، بٹوا اور سیف ڈپازٹ باکس کی چابی سنبھال کر رکھی۔ اب اس نے سرکس کلاؤن کا لباس پہنا، اوپر سے اوورکوٹ پہن لیا۔ اس کوٹ نے اس کا لباس پیروں تک چھپالیا تھا۔ ماسک کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس تیاری کے بعد اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ رچرڈ کلور کے نام کا جعلی پاسپورٹ اور موٹے شیشوں والا چشمہ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ایک بجے باہر آ کر ڈینی ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور اسے ماسکو سرکس جانے کا کہا۔

آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ٹیکسی نے اسے ماسکو سرکس کے باہر اتار دیا۔ یہ ایک بڑے گول گنبد والی شاندار عمارت تھی۔ کچھ دیر بلڈنگ کے چاروں طرف جائزہ لینے کے بعد پچھلے دروازے سے ڈینی اندر داخل ہوا۔ یہاں بہت سے ڈریسنگ روم تھے۔ اندر جانے سے پہلے ڈینی نے جیب سے پلاسٹک کا ایک شناختی کارڈ نکال کر چیک کرلیا تھا۔ اس کارڈ پر ماسکو سرکس کے ملازم میخائل اور یوف کا نام موجود تھا۔ اندر ایک ٹیبل پر ایک خاتون آنے والے ملازمین کے پاس سرسری طور پر چیک کررہی تھی۔ ڈینی نے بھی اپنا کارڈ ہاتھ میں لے کر دکھادیا۔ ایک خالی ویٹنگ روم میں داخل ہوکر ڈینی نے اوورکوٹ اتاردیا۔ فیس ماسک لگا کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ وہ بالکل دوسرے مسخروں کی طرح لگ رہا تھا۔ سرکس کے بڑے ہال سے بینڈ کی تیز آواز اور لوگوں کے تالیاں بجانے کی آواز آئی۔ ڈینی سمجھ گیا کہ روسی صدر گیلن پنڈال میں آچکے ہیں۔

ڈینی نے دروازے میں سے دیکھا کہ سرکس کا ایریا شائقین سے مکمل بھرا ہوا ہے۔ پہلی قطار کے درمیان اسٹیج کے عین سامنے روسی صدر گیلن اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں جانب گہرے سیاہ سوٹ میں ملبوس دو گارڈز بیٹھے تھے۔ اسی طرح ان کے پیچھے بھی دو گارڈز بیٹھے تھے۔

مقررہ وقت پر سرکس شروع ہوگیا۔ مختلف فنکاروں نے اپنا کمال پیش کیا۔ ہاتھی، چیتے، ریچھ اور بندروں کے ایکٹ پیش کیے گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ ڈینی نے گھڑی دیکھی۔ اب ساڑھے تین بجنے والے تھے۔ موٹرسائیکل کے ایکٹ کے بعد پروگرام کے مطابق اب مسخروں نے داخل ہونا تھا۔ ڈینی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹیزر گن کو چیک کیا۔ ایک بڑی سی کھلی ہوئی گاڑی ہارن بجاتی ہوئی ایک جانب سے اسٹیج پر داخل ہوئی۔ اس میں سے دس مسخرے برآمد ہوئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر ان کو خوش آمدید کہا۔ ڈینی اس گروپ میں جولی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے امریکی کاؤبوائز کا لباس پہنا ہوا

تھا اور بیلٹ میں دو گنز لگی ہوئی تھیں۔ جولی ایک جانب بنے ہوئے مصنوعی بار کے قریب گئی اور اپنے لیے شراب کا جام طلب کیا۔ بارمین نے ایک بڑا گلاس بنا کر پیش کیا۔ ایک دوسرا مسخرہ آیا اور کہا کہ یہ میرا گلاس ہے۔ جولی نے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اوپر دیکھا تو جولی نے پستول نکال کر فائر کیا۔ پٹاخے کی زوردار آواز آئی اور وہ کلاؤن نیچے گر پڑا۔ اسی طرح دوسرے مسخرے آتے گئے اور جولی ان سب پر فائر کرتی گئی۔ سب اسٹیج پر گر پڑے۔

یہ سب ایکٹنگ تھی۔ شائقین تالیاں بجا رہے تھے۔ آخری مسخرہ ایک چھوٹے قد کا انسان تھا۔ اس کے پاس بھی ایک کاؤبوائے گن تھی۔ ڈینی تیزی سے اسٹیج پر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ جولی نے مصنوعی گن پھینک کر ایک روسی ٹوروکف ریوالور بیلٹ سے نکال لیا اور صدر کیلن کی طرف نشانہ لیا۔ اس کے اور صدر کے درمیان تقریباً پچیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ ڈینی نے جلدی سے ٹیزر گن نکالی اور جولی پر فائر کر دیا۔ جولی نے اس کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

گن کے ڈارٹ جولی کی ران پر لگے تھے۔ جولی اسٹیج پر گر گئی اور گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ڈینی نے جولی کو ہاتھوں میں اٹھایا اور کلاؤن کار کی طرف بڑھا۔ پستہ قد مسخرے نے اسے روکنے کی کوشش کی تو ڈینی نے اسے ایک لات مار کر گرا دیا۔ حاضرین خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے یہ سب مسخروں کے ایکٹ کا حصہ ہے۔ ڈینی نے بائیں جانب ذرا سا مڑ کر دیکھا کہ صدر کیلن کے گارڈز اس کو اپنی حفاظت میں باہر کی جانب لے جا رہے تھے۔

جولی کو کار میں بٹھا کر ڈینی تیز رفتاری سے باہر نکلا اور کمپاؤنڈ سے باہر سڑک پر نکل آیا۔ وہاں ایک سیاہ کار موجود تھی۔ اس دوران جولی ہوش میں آ گئی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور ڈینی آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا۔ جولی نے روسی زبان میں ڈرائیور کو ہدایات دیں اور کار تیزی سے روانہ ہو گئی۔

”ڈینی! تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس آپریشن کے احکامات صدر امریکا نے دیے تھے۔“ جولی نے کہا۔

”یہ حقیقت نہیں ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

ڈرائیور نے مرکزی اسٹیڈیم کے قریب ٹرن لیا اور گاڑی روک دی۔ گاڑی سے اتر کر وہ ڈینی کی سائڈ پر آیا اور سائلنسر لگی ہوئی گن تان لی۔ ڈینی نے اچانک دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور نیچے گرا۔ ڈینی نے اس کی کنپٹی پر ٹانگ سے ضرب لگائی تو وہ بے ہوش ہو گیا۔ ڈینی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”ڈرائیور تو باہر انتظار کر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ میں نے روسی صدر کو گولی مار دی ہے یا نہیں۔“ جولی نے کہا۔

”جارڈن کا پلان کے جی بی کے ساتھ یہی تھا کہ تمہیں کسی حالت میں زندہ نہیں چھوڑنا ہے۔ اب کے جی بی ہمیں پورے شہر میں تلاش کر رہی ہو گی اس لیے ہمیں بیرونی سڑکیں استعمال کرتے ہوئے اس ٹرین اسٹیشن پہنچنا ہے جہاں میں نے دو پیکٹ محفوظ کیے تھے۔ اس دوران تم کپڑے سے اپنا کلاؤن کا میک اپ صاف کرنے کی کوشش کرو۔“ ڈینی نے کہا۔

اسٹیشن کے قریب پہنچ کر ڈینی نے جولی سے کہا۔ ”میں اسٹیشن کے اندر جاؤں گا، تم اتر کر پیدل دوسری جانب آ کر مجھ سے ملو۔“

ڈینی نے دونوں پیکٹ وصول کیے اور دوسری جانب سے باہر آ کر جولی کو تلاش کیا۔ وہ دونوں ایک ٹیکسی میں بیٹھے اور ریڈ اسکوائر کی جانب روانہ ہو گئے۔

”اب سے دو گھنٹے بعد ماسکو سے برٹش ائرویز کی ایک فلائٹ لندن کے لیے روانہ ہونے والی ہے۔ ہمیں وہ فلائٹ پکڑنی ہے۔“ ڈینی نے کہا۔

ٹیکسی سے اتر کر وہ دونوں سیاحوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے اور اٹلی کے سیاحوں کے ایک گروپ کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ راستے میں وہ دونوں گروپ سے الگ ہو کر ایک چھوٹے سے چرچ میں داخل ہو گئے۔ وہاں پیچھے کی جانب واش روم بنے ہوئے تھے۔ ڈینی نے جولی کو ایک پیکٹ دیا اور کہا کہ اندر جا کر لباس تبدیل کر لو۔

جب جولی باہر آئی تو برٹش ائرویز کی ہوسٹس کی یونیفارم میں تھی۔ ڈینی بھی پائلٹ کے یونیفارم میں تھا۔ ڈینی نے جولی کو برٹش پاسپورٹ اور ائرلائن کا شناختی کارڈ دیا جو گلے میں پہنا جاتا ہے۔

”ہم دونوں کا تعلق انگلینڈ سے ہے اور ہم آج کی فلائٹ 711 کے اسٹاف میں شامل ہیں۔“ اس نے کہا۔

جب وہ باہر آئے تو دیکھا کہ دروازے پر چار آدمی ہر ایک کے کاغذات چیک کر رہے ہیں۔ ڈینی اور جولی دوسرے راستے کی طرف بڑھے۔ وہاں بھی چیکنگ ہو رہی تھی۔

”ایسا لگتا ہے کہ کے جی بی نے سب راستے بند کیے ہوئے ہیں۔“ ڈینی نے کہا۔

”اب کیا کریں؟“ جولی بولی۔

”ہم تھوڑی دیر اندر ہی انتظار کرتے ہیں۔“ ڈینی نے کہا۔

وہ ریڈ اسکوائر میں دوبارہ ایک بڑے سیاحتی گروپ میں شامل ہو گئے۔ اس گروپ کی بس ایک جانب کھڑی تھی۔

دوسرے لوگوں کے ساتھ یہ دونوں بھی بس میں بیٹھ گئے۔ بس باہر نکلنے کے راستے کی جانب بڑھی تو جولی نے ڈینی کا بازو پکڑ لیا اور باہر اشارہ کیا۔

راستے میں ایک چیک پوائنٹ بنا ہوا تھا اور ایک جانب ایک سیاہ شیشوں والی کار بھی موجود تھی۔ بس رک چکی تھی۔ کار سے ایک چھوٹے قد کا درمیانی عمر کا شخص برآمد ہوا۔

''یہ پاؤلوف ہے۔ روس کے جی بی ایجنسی کا سربراہ۔'' ڈینی نے کہا۔

وہ بس میں داخل ہوا اور مسافروں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈینی اور جولی کے قریب پہنچا اور بولا۔ ''آپ دونوں اپنے کاغذات دکھایئے۔''

دونوں کے پاسپورٹ اور کارڈز دیکھنے کے بعد پاؤلوف بولا۔ ''آپ دونوں ذرا بس سے باہر آ جائیں۔''

دونوں نے سمجھ لیا کہ اب کھیل ختم ہو گیا۔ دونوں کے جی بی کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ بس سے باہر آ کر پاؤلوف نے کہا۔ ''مسٹر ڈینی! میرے پاس دو راستے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ تم دونوں کو خاموشی سے ختم کر دیا جائے لیکن قانون کے مطابق پہلے تم دونوں سے پوچھ گچھ ہوتی چاہیے لیکن یہ میرے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں تم دونوں کو جانے دوں لیکن میں تمہیں وارننگ دینا چاہتا ہوں کہ میرے اسٹاف کو تم دونوں کی گرفتاری کے احکامات ہیں۔ آگے کیا ہوتا ہے، تمہاری قسمت۔''

وہ دونوں بس میں آ کر بیٹھ گئے۔ بیریئر ہٹا دیا گیا اور بس روانہ ہو گئی۔ اگلے اسٹاپ پر سب سیاح اتر کر سیر کے لیے چل دیے۔ ڈینی اور جولی ایک ٹیکسی میں بیٹھے اور ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر جولی نے کہا۔ ''ہمارے پاس روسی ویزا تو ہے نہیں۔'' ڈینی نے بتایا۔ ''ایئر لائن اسٹاف کے پاسپورٹ پر مستقل ویزا لگا ہوا ہے۔''

ڈینی اور جولی بغیر کسی رکاوٹ کے ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ ڈیپارچر لاؤنج میں دروازے کے اندر تین افراد لمبے رین کوٹ پہنے ہوئے آنے والے مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے۔

''ان کا تعلق کے جی بی سے ہے۔ بالکل نارمل رہو۔ ہم لوگ ایئر لائن کے اسٹاف میں ہیں۔ ان لوگوں کا آنا جانا روز کا معمول ہے۔'' ڈینی نے کہا۔

دونوں لائن میں لگ گئے اور کاؤنٹر پر پہنچ کر اپنے پاسپورٹ پیش کر دیے۔ کاؤنٹر پر خاتون نے پوچھا کہ اور کوئی سامان؟ دونوں نے بورڈنگ کارڈ حاصل کیے اور امیگریشن کاؤنٹر کی لائن میں لگ گئے۔ کاؤنٹر پر ان کے کاغذات ایک مرتبہ پھر تفصیل سے چیک کیے گئے۔ پاسپورٹ واپس ملنے کے بعد ڈینی اور جولی جہاز میں سوار ہو گئے۔

کچھ دیر بعد جہاز نے اڑان بھری اور لندن فلائٹ 711 اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جہاز کا کیپٹن ان کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے، روسی حکام نے فلائٹ 711 کو واپس ماسکو بلا لیا ہے۔''

''ہم اس وقت کہاں سے گزر رہے ہیں؟'' ڈینی نے پوچھا۔

''کیٹوبا سے۔ ابھی ہم روسی فضائی حدود میں تقریباً پینتیس میل اندر ہیں۔'' کیپٹن نے کہا۔

''کیپٹن! اب آپ کیا کریں گے؟'' جولی نے پوچھا۔

''قوانین کے مطابق تو مجھے جہاز واپس موڑ لینا چاہیے لیکن اگر مجھے پیغام ملا ہی نہیں تو پھر مجبوری ہے۔'' اس نے کہا۔

دونوں نے اطمینان کی سانس لی اور بولے۔ ''بہت بہت شکریہ کیپٹن!''

امریکا واپس پہنچ کر ڈینی نے سی آئی اے ڈائریکٹر بروکس جارڈن کو فون کیا۔ ''میں آپ سے گھر پر ملنا چاہتا ہوں۔''

رات آٹھ بجے ڈینی، جارڈن کے گھر پہنچ گیا۔

''ڈینی! تمہیں آپریشن ولکس میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس کو صدر صاحب نے منظور کیا تھا۔'' جارڈن نے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم اس بات کو ثابت نہیں کر سکتے۔ روسی صدر کو قتل کرنے کا مطلب عالمی جنگ کا چھڑ جانا ہوتا۔'' ڈینی نے کہا۔

''صدر کیلن اب اور بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔'' جارڈن نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے بلکہ تم نے پاؤلوف سے کوئی سودا کیا تھا۔'' ڈینی نے کہا۔

''چھوڑو...... اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' جارڈن نے کہا۔

''لیکن میری بیٹی کی زندگی کا سوال اب بھی موجود ہے۔ میری پچھلی آفر اب بھی قائم ہے۔ میری بیٹی کو اڑتالیس گھنٹے میں میرے حوالے کر دو ورنہ میرے پاس تمہاری آواز کا ٹیپ اور آپریشن ولکس کی پوری تفصیل کمپیوٹر ڈسک پر موجود ہے۔ میں نے یہ چیزیں اچھی طرح محفوظ کی ہوئی ہیں۔ میں یہ سب چیزیں میڈیا میں بھیج دوں گا۔'' ڈینی نے کہا۔ ''پاؤلوف کو تو روس میں گولی ماری دی جائے گی اور تمہارا مقدر تاحیات جیل کی کوٹھری ہے۔ میری خاموشی کی قیمت یہی ہے کہ میری بیٹی کیری

زندہ مجھے مل جائے۔“
”اچھا ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہتے ہو، ایسا ہی ہوگا۔“
جارڈن نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔
بارہ گھنٹے بعد ڈینی کے فلیٹ میں فون کی گھنٹی بجی۔ فون پر ایک غیر امریکی لہجے میں کسی نے کہا۔ ”تم آج فوراً کیلی فورنیا چلے جاؤ۔ غروب آفتاب کے وقت ”ہاف مون بیچ“ پر اکیلے پہنچ جانا۔“ اس پیغام کے بعد فون بند ہوگیا۔
ڈینی نے دوپہر کی فلائٹ سے کیلی فورنیا کی سیٹ بک کرائی۔ اس کے بعد اپنے دوست سام گرین کو فون کر کے کہا کہ ٹھیک دس بجے مجھ سے شمالی کار پارک میں ملو۔
”میں تو اس وقت ائرپورٹ جا رہا ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو میرے نائب کو کینیڈا فون کرنا۔ وہ تمہیں ایک بینک کا نام اور سیف ڈپازٹ باکس کا نمبر بتائے گا۔ اس باکس میں اہم حساس میٹریل ہے۔ تمہیں وہ چیزیں سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی کے چیئرمین کو پہنچا دینی ہیں۔“ ڈینی نے سام کو ہدایت دی۔
ڈینی کی فلائٹ تین بجے لاس اینجلس پہنچ گئی۔ باہر پہنچ کر اس نے کار کرائے پر لی اور دو گھنٹے کے سفر کے بعد ساحل کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ریت کے ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا۔ سورج غروب ہونے میں تقریباً پندرہ منٹ باقی تھے۔ ڈینی سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے یہ روسی کے جی بی نے اس کے لیے پھندا تیار کیا ہو اور وہ اب اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتے ہوں۔
جیسے ہی سورج غروب ہوا، ڈینی نے ساحل کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ کچھ منٹ بعد اس نے دیکھا کہ دور سے کوئی بچہ اس کی طرف چلتا ہوا آ رہا ہے۔ ذرا قریب آنے پر اس نے دیکھا کہ یہ اس کی بیٹی کیری تھی۔ دونوں دوڑ کر ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے۔ ڈینی نے کیری کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگا۔
”خدا کا شکر ہے تم خیریت سے ہو۔“ دونوں باپ بیٹی سانٹا باربرا کے قصبے میں کیری کی ماں کے پاس پہنچ گئے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ڈینی نے شیرف ڈیپارٹمنٹ میں فون کر کے انچارج انسپکٹر کو بھی بتا دیا کہ میری بیٹی کیری گھر واپس آگئی ہے۔ وہ اپنی خالہ کے گھر رہ رہی تھی۔ کیری کی گمشدگی کا کیس داخل دفتر کروا دیا گیا۔ ڈینی نے چند روز اپنی بیٹی کے ساتھ گزارے اور واپس واشنگٹن پہنچ گیا۔
رات کو ٹی وی کی خبروں سے ڈینی کو پتا چلا کہ سی آئی اے کے ڈائریکٹر بروکس جارڈن نے سر میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔ ایک اور خبر روس سے متعلق بھی تھی کہ روسی کے جی بی کے سربراہ پاڈلوف کو برطرف کر دیا گیا ہے اور ان کو سائبیریا کے ایک بیگار کیمپ میں دس سال کے لیے بھیج دیا گیا۔ ادھر واشنگٹن میں ڈکسن ہیڈلے کو سی آئی اے کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا ہے۔

☆☆☆

واشنگٹن کی نیشنل آرٹ گیلری میں ڈینی اور جولی ایک ساتھ سیر کر رہے تھے۔
”کیا واقعی تم واپس کینیڈا جا رہے ہو؟“ جولی نے پوچھا۔
”ہاں، یہاں میرا کام اب ختم ہوگیا ہے۔ مجھے واپس جا کر اپنے فشنگ کیمپ کے معاملات سنبھالنے ہیں۔“ ڈینی نے کہا۔
”میں تمہیں بہت مس کروں گی۔“ جولی نے کہا۔
”ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ ڈینی نے کہا۔ ”جولی! کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں مل کر ایک نئی زندگی کی ابتدا کریں؟“
جولی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کہا۔ ”یہ میری دلی خواہش ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ ایک طرف ایجنسی میں میرا کیریئر ہے اور دوسری طرف نئی زندگی۔ میرے لیے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا بہت مشکل ہے۔“
”اچھا، ٹھیک ہے۔“ ڈینی نے کہا۔
دونوں نے ایک دوسرے کو بھاری دل سے خدا حافظ کہا اور جدا راستے پر چل پڑے۔
ڈینی کینیڈا پہنچ کر فشنگ کیمپ میں کاموں میں مصروف ہوگیا۔ اس نے جولی کو بھولنے کی کوشش کی لیکن اکثر اس کا خیال آ جاتا تھا۔
موسم بہار کی آمد تھی۔ درجہ حرارت کچھ بڑھنے لگا۔ برف پگھلی تو دریا کا بہاؤ بھی تیز ہوگیا۔ جنگل کے درختوں نے نئے پتوں کا سبز لبادہ پہن لیا۔ اپریل کے درمیان میں سیاحوں کی آمد متوقع تھی۔ ایک روز وہ صبح کی نرم دھوپ میں دریا میں بنسی ڈالے سالمن مچھلی کے شکار میں مصروف تھا۔ اسے کانوں میں ہلکی سی آواز آئی۔ اس نے اوپر دیکھا تو ایک سی پلین (sea plane) جنوب کی سمت سے آ رہا تھا۔ جلد ہی وہ کیمپ کے سامنے دریا میں آ کر اتر گیا۔ وہ چلتا ہوا ڈینی کی طرف آ کر رک گیا۔ پائلٹ نے انجن بند کیا۔ جہاز کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون جینز اور سرخ سوئٹر پہنے ہوئے برآمد ہوئی۔ یہ جولی تھی۔ دونوں گرمجوشی سے ملے۔
”میں نے ایجنسی کی ملازمت سے استعفا دے دیا ہے۔ اب میں بیروزگار ہوں۔“ جولی نے کہا۔
”کوئی بات نہیں۔ اب ہم دونوں مل کر بہتر طریقے سے اس کیمپ کو چلائیں گے اور ہماری زندگی خوشیوں سے بھرپور گزرے گی۔“ ڈینی نے خوش ہو کر کہا۔

⌘⌘⌘

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 25

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ درو دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی...... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ میں تو راحیلہ کو بچپن سے ہی سگی بہن سمجھا کرتا تھا مگر وہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی "نگاہ" سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ حقیقت آشکار ہونے کے باوجود بھی میرے اس جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اب بھی اسے ایک "بہن" کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ راحیلہ نے میرے اس برتاؤ پر برا منایا مگر میں اسے بری طرح جھڑک دیتا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ پتا چلا کہ اصل نحوست غربت کی نہیں بلکہ ایک غصہ ور شخص کی روز روز کی دانتا کل کل کی تھی۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر چونکہ شاید میری رگوں میں "نسلی" خون دوڑ رہا تھا اسی لیے میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس "سنبھلنے" کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا "باس" کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میں جسامت کے لحاظ سے چھریرا، لمبا اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ سلیم مناسب قد و قامت کا جبکہ راجو اور ماجد قدرے گھٹی ہوئی جسامت کے مالک تھے۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے "لاحقے" نتھی کر ڈالے۔ میں سہراب لبو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ "چھالیا" نتھی ہو گیا۔ راجو "بوری" ہو گیا جبکہ ماجد "ماجا"۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے "باس" اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں کہ بھتا نہ دینے کی صورت میں اس کی فیکٹری کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر جہاں سیکڑوں غریب ورکروں کی جان بچائی، وہیں سیٹھ سکندر کو بھی بھاری مالی اور جانی نقصان سے بچا لیا۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری "نمک حلالی" سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر تو تھا ہی میرا معترف۔ عقدہ کھلا کہ سدرہ کا ماموں یعنی سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب ہے۔ بعد میں اس راز سے بھی پردہ ہٹا کہ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ بھائیوں والی محبت جتا کر سوتیلی بہن کا سب کچھ ہتھیانا چاہتا تھا اور اپنے گروہ کو بھی مالی فائدہ پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر نہ ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا۔ اسی دوران کوئی "چھوٹا خان" نامی اجنبی میری مدد کو آیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ گروہ کا کوئی مخالف تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ادھر سدرہ کو اپنے نام نہاد ماموں سجاد بیگ سے بھی جان کا خطرہ تھا۔ سیٹھ سکندر کے دو وفادار محمود قریشی اور مشتاق بھی تھے۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر "چودھری جی برادران" کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ اس کی الگ کہانی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن گیا۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا تھا۔ وہاں دو چوکیدار اور ملازم ارشد وغیرہ تھے۔ ایک خفیہ گروہ "کالی لہر" سے میرا ٹکراؤ ہو گیا۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ تھا۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم پچھی سے میری دشمنی عروج پر تھی اور ان کے میرے خلاف جادو ٹونے بھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی

جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آکر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی...... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کردیے اور اچانک وہاں ہانڈیوں کی بارش ہونے لگی۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مرچکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ عجیب عجیب شعبدہ بازیاں دکھائی گئیں، پھر مجھے حالتِ بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کردیا تھا وہاں بجو نے حملہ کیا اور تب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کردیا تھا۔ وہاں کے چودھری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں آکر ہم لوگوں کو ہراساں کرنے لگا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کرلیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ جنگل میں عورت کی چیخ پر میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک تیندوا عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے درندے کو ٹھکانے لگا دیا۔ زخمی عورت صمد یار کی ماں شمیلہ خانم تھی۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگادی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کردیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکال کر شہر پہنچا دے گا تاہم میں مطمئن نہ تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس ایک پراسرار آدمی کو دیکھا۔ جب تھوڑا تحقیق کی تو پتا چلا ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا مگر وہ نکل گیا اور ہمیں مجبور کیا کہ جیسا وہ کہے، ہم کریں۔ تاہم دھینگا مشتی میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آگیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور رراڑاں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کرکے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہوگئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھگایا اور قبضے میں موجود بدمعاش سے کالی حویلی کا پتا معلوم کرلیا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانگا سے ٹاکرا ہوا۔ رانگا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کردیا۔ میں نے رانگا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانگا بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کرلیا۔ میں زخمی بھی ہوگیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کردیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چودھری برادران نے مجھ سے مفاہمت کرلی تاہم اس کے پیچھے ان کا کوئی خاص مقصد تھا۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپنے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ وہ کسی لاش کو اٹھا رہے تھے۔ جگنو کو مار دیا گیا تھا۔ میں نے انتقام کی ٹھان لی۔ میں نے تیمور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی ''شے'' لے کر کہیں جارہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کردیا۔ ایک مقام پر میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ میں نے پیدل ہی ان کا تعاقب شروع کردیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے میں گڑھے میں گرا۔ سر پر چوٹ لگنے سے بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا راجا تیمور اور ڈرائیور ہلاک ہوچکے تھے اور کینوس سے ڈھکی شے غائب تھی۔ راجا تیمور کا ایک ساتھی زندہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ معلومات پر پتا چلا کہ کسی گروہ نے انہیں ہلاک کیا تھا اور بومبورگا نامی قدیم مجسمہ لے اڑے تھے۔ میں نے میڈم چھمی تک پہنچنے کے لیے ان کا پیچھا کیا اور ان کے ساتھیوں کی کشتی میں سوار ہوگیا۔ بومبورگا کا مجسمہ بھی انہی کے پاس تھا۔ کشتی ایک جگہ رکی تو بھیڑیوں نے حملہ کردیا۔ ایک بھیڑیے نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگادی۔ تاہم بھیڑیوں سے نمٹ لیا گیا۔ آگے چل کر ایک مگرمچھ نے ہم پر حملہ کیا اور کشتی میں صرف دو افراد بچے۔ ایک میں اور دوسری شینا۔ میں نے شینا کو الٹی سیدھی کہانی سنا کر اسے اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ ہماری کشتی ندی کی طغیانی کے باعث تباہ ہوگئی۔ ہم ایک جگہ پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے ایک بارہ سنگھے کو شکار کرنا چاہا اور شینا زخمی ہوگئی۔ وہاں موجود میاں بیوی نے ہماری مدد کی۔ ہم ان کے گھر آگئے تاہم وہاں اچانک کچھ لوگ آگئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میوخ مجسمے کے حوالے سے الجھ گیا تھا۔ اسے نام یاد نہیں آرہا تھا۔ میں نے بے اختیار نام لیا ''بومبورگا'' تو وہ چونک گیا۔

''بومبورگا + بدمعاشوں کا ٹولا = صحرائی عقاب......''

متوقع نتیجہ ظاہر تھا۔ یہ اس ٹولے کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا جنہیں میں ''بلف'' کیے ہوئے تھا اور جن کی نائب لیڈی لارا سے میری بات چیت رہی تھی۔ اگرچہ میں اس سے ''لاسلکی'' گفتگو کے دوران نہایت چالاکی سے ان کی تبت کے ایک سرحدی علاقے ''تسانگ پو'' میں موجودگی معلوم کرچکا تھا لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ اس طرح اچانک ان سے سامنا ہوجائے گا۔

یوں اگرچہ میرے پاس ''رامو'' والا ترپ کا پتا تھا۔ یہ کارڈ میں کھیل سکتا تھا لیکن پھر شینا کا جواز پیش کرنا پڑتا۔ وہ ان کے سخت مخالف دشمن گروپ سے تھی۔ تاہم یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ وہ اسے دشمن کی حیثیت سے پہچانتے ہوں۔ رامو نے کچھ بتا رکھا ہوتو اور بات تھی۔

بہرکیف، زیادہ سوچنے کا وقت نہ رہا تھا کیونکہ ان کے زور زور سے باتیں کرنے اور بدمست قہقہوں کی آوازیں قریب آچکی تھیں۔ وہ پھر یہاں غل غپاڑا کرنے آگئے تھے لہٰذا چند ثانیے تو جھونپڑی کے محدود ماحول میں یکایک خاموشی طاری ہوگئی۔ اس کے بعد ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔ یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ میوخ کی بیوی صوبی متوحش ہوگئی۔ اس کے دونوں معصوم بچے بھی ڈر کر اس سے چپک گئے تھے اور ماں کے عقب سے خوف بھری آنکھوں کے ساتھ دروازے پر کھڑے ان چاروں مشٹنڈے بدمعاشوں کو تکتے اور سمٹتے جاتے۔

میوخ بیچارہ پہلے ہی پریشان تھا۔ ان کا پالتو کتا ایک بار بھونک کر خاموش ہورہا۔ ان چاروں میں ایک ۔۔۔۔ دراز قامت اور بھرے بھرے جسم کی گوری عورت بھی تھی۔ خاصی پرکشش لیکن دبنگ ۔۔ اس کے سنہری بالوں پر لی کیپ تھی اور ارد گرد پھیلی بالوں کی لٹوں سے سفید برف چپکی ہوئی تھی۔ آنکھیں نیلی اور ان میں خاص قسم کی شکاری چمک ہلکورے لیتی محسوس ہوئی۔ بالخصوص مجھ پر نگاہ پڑتے ہی یہ چمک اور گہری ہوچلی تھی۔

اس چمک میں مجھے مکاری کا عنصر غالب محسوس ہوا۔ چہرے کی گوری رنگت میں سرخی کا امتزاج اسے خاصا پرکشش بنائے ہوئے تھا۔ اس نے چست مگر گرم لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اس پر بھی برف کے ان گنت ذرات نظر آئے۔ اس کی شخصیت میں حسن کے ساتھ دبدبہ نمایاں تھا۔ مجھے یہ لیڈی لارا لگی۔ باقی اس کے تین مرد ساتھی بھی اسی طرح کے دکھائی دیے۔ ان کی آنکھوں سے ہی نہیں، چہروں سے بھی سفاکی ہویدا تھی۔ مجھے بھی وہ چونک کر گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ ان کے پاس اسلحے کی جھلک نظر آئی تھی۔ انہوں نے سامنے کی دیوار والے آتش دان کے سامنے شینا کو نیم بے ہوشی کے عالم میں لیٹے دیکھ کر بھویں سکیڑیں۔

ان تینوں میں ایک نسبتاً ہٹا کٹا اور دراز قامت تھا۔ اس کا سر سامنے کی طرف سے گنجا تھا۔ پیچھے بال گدی سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ اس کے چہرے سے بے حسی اور آنکھوں سے درندگی مترشح تھی۔ پہلی نظر میں اس پر کسی قصاب کا ہی گمان محسوس ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ بدہیئت اس کا تھوتھنا تھا جیسے کوئی پلا ہوا وحشی سؤر ہو۔ وہ متوقع لیڈی لارا کے بالکل ساتھ ہی کھڑا تھا۔ باقی دو ان کے دائیں بائیں۔

''کون ہو تم؟''

عورت نے پہلے مجھ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالنے کے بعد خاصے دبدبے سے پوچھا۔ اس کی کشادہ نیلی آنکھیں ہنوز میرا جائزہ لینے میں مشغول رہیں۔ اس کی آواز اور مخصوص لہجے نے اس بات کی تصدیق کر ڈالی تھی کہ یہی عالمی کرمنل گینگ کے سربراہ البرٹ رمنڈو کی نائب لیڈی لارا تھی جس سے میں لاسکی رابطہ کرچکا تھا۔ اب مجھے ڈر ہوا کہ میری آواز اور لہجے سے وہ مجھے بھی رامو کے نام نہاد ساتھی ''شیان'' کی حیثیت سے نہ پہچان لے۔ پل کے پل میں فیصلہ کرچکا تھا کہ ان مخدوش حالات میں مجھے کیا کردار نبھانا چاہیے۔

''میرا نام شیان ہے۔ تم لوگ......؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اگلے ہی لمحے گوری حسینہ کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے جن میں کچھ کچھ غیر یقینی کا عنصر بھی غالب نظر آیا۔ واضح طور پر اس کے ساتھ کھڑا قصائی نما آدھے سر کا گنجا بھی چونکا۔

''کیا تم وہی شیان ہو، رامو کے ساتھی؟'' لیڈی لارا نے پوچھا تو اب میرے چونکنے اور حیرت ظاہر کرنے کی باری تھی۔

''اوہو...... یو لیڈی لارا......؟'' میرا لہجہ مستفسرانہ تھا۔ گفتگو شستہ انگریزی میں ہورہی تھی۔

''ہاں، مگر تم یہاں کیسے؟'' لارا بولی۔ نیلی آنکھوں میں ہنوز لہراتے تشکیک کے سائے مجھے عجیب لگے۔ میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور تھکے تھکے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''امید تو تھی مجھے کہ یہاں کہیں تم سے میرا سامنا ہوجائے گا مگر اتنی جلدی اور اچانک کی توقع نہ تھی کیونکہ تم نے مجھے بتا رکھا تھا کہ تم لوگ تسا تنگ پو......''

''مسٹر شیان!'' دفعتاً ہی اس آدھے گنجے سر اور سؤر جیسے تھوتھنے والے نے مجھے درمیان میں ٹوک دیا۔ میں ایک دم چپ ہوکر اسے تند نظروں سے گھورنے لگا۔

''پہلے مادام لارا کے سوال کا جواب دو، اپنی کہانی بعد میں سنانا...... سمجھے؟'' اس کا لہجہ مجھے اکھڑ اور پُرغرور سا لگا جس نے میرے جیسے جنگ باز کے اندر آگ سی بھر دی اور ترکی بہ ترکی میں بھی اسی لہجے میں اس سے مخاطب ہوکر بولا۔

''اپنی زبان سنبھالو مسٹر! اور اپنا لہجہ بھی درست رکھو۔ تم بھی سمجھے یا نہیں......''

میرے بھی اسی انداز کے جوابی کلامی وار نے اسے بپھرا دیا۔ اسے خود پر کچھ زیادہ ہی غرور تھا اور وہ ''ہتھ چھٹ'' بھی لگتا تھا۔ اس کی انا اور غرور کو شاید میرے اسی انداز کے جواب نے زبردست دھچکا پہنچایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتا اور درندے کے مانند غراتا ہوا میری جانب لپکا۔ لارا نے بھی اسے روکنے کی

کوشش نہیں کی جبکہ اس کے باقی دونوں ساتھیوں کی آنکھوں سے جوش اور دلچسپی مترشح ہونے لگی تھی۔

ماحول یکا یک کشیدہ ہوگیا۔ اس درندے کو بپھرتا دیکھ کر صوبی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کا شوہر میوخ مزید پریشان ہوگیا۔ دونوں بچے سہم گئے۔ ان کا پالتو کتا بھی بھونکنے لگا۔

وہ خبیث سیدھا مجھ پر آن پڑا۔ اس نے مجھے ''آسان'' لے لیا تھا لہٰذا جیسے ہی وہ میرے قریب پھٹکا، میں نے اپنی جگہ اطمینان سے کھڑے کھڑے اپنی دائیں ٹانگ مخصوص ٹرک کے ساتھ اس کے پہلو میں اس زور سے رسید کر ڈالی کہ اس کا رخ بدلا اور وہ چند انچ اچھل کر قریب کی ایک میز پر جا پڑا۔ میز ٹوٹ گئی اور اس کے دو ٹکڑوں سمیت وہ بھی فرش بوس ہو رہا۔

لارا ہکا بکا تھی البتہ اس کی آنکھوں کی مکارانہ چمک ایک لمحے کے لیے تیز ہو کر معدوم ہوئی۔ اس کے باقی دو ساتھی جن کے چہروں پر کچھ دیر پہلے جوش اور دلچسپی کے بلب جل اٹھے تھے، وہ شاید اپنے تنومند ساتھی کے ہاتھوں میری درگت کے ''نظارے'' کے منتظر تھے لیکن اب اپنے ہی ساتھی کا حشر دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔

میں نے اپنے مضروب مدمقابل کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور اسی طرح کھڑے کھڑے لارا سے مخاطب ہو کر حقارت سے بولا۔

''لیڈی لارا! اپنے اس کتے کو سنبھالو ورنہ اس کا برا حشر کر دوں گا۔''

''جیکی! اسٹاپ ناؤ۔'' وہ ایک دم بولی۔ اس کا نام شاید جیکی تھا جو چوٹ کھانے کے بعد تیزی سے سنبھلا تھا اور اس بار مجھ پر پہلے سے زیادہ ہلا بولنے کے لیے پر بھی تولنے لگا تھا مگر اپنی ''مادام'' کے حکم پر وہیں رک گیا لیکن اپنی اس تضحیک پر اس کا چہرہ مسخ ہوگیا۔

''بس کرو...... اتنی جلدی غصے میں نہیں آجایا کرو اور دوست دشمن کی تمیز رکھا کرو۔''

جیکی نے اپنا غصہ ٹوٹی ہوئی میز کے ٹکڑوں کو لات مار کر نکالا اور وہیں جم کر کھڑا ہوگیا۔

''شکریہ مادام!'' میں نے مختصراً لارا سے کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بھی مجھے مکاری کی تہ میں دبی محسوس ہوئی۔

وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے ہمیں آرام سے پہلے کام کی بات کر لینی چاہیے۔''

''یقیناً۔'' میں نے یکسر جیکی کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ اس کی طرف دوبارہ دیکھا تک نہیں۔

لارا نے آتش دان کی طرف ایک نگاہ ڈالی جہاں شینا نیم بے ہوش پڑی تھی۔

''یہ کون ہے؟''

''جب آرام سے گفتگو ہوگی تو سب معلوم ہو جائے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہمارا یہاں ذرا فاصلے پر کیمپ ہے۔ وہیں چل کر بات کر لیتے ہیں۔''

''ابھی نہیں، صبح بات ہوگی مادام! مجھ پر شدید تھکن طاری ہے اور میں کچھ گھنٹے آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ میرے جواب پر لارا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا پھر وہ ہونٹ سکوڑ کر بولی۔

''او کے۔ میں نرڈی کو صبح یہاں بھیج دوں گی۔ اس کے ساتھ آجانا۔'' پھر اس نے حیران پریشان کھڑے میوخ اور صوبی کی طرف دیکھ کر تحکمانہ درشتی سے کہا۔

''ہمارے لیے جو پکایا ہے، لے آؤ جلدی۔''

صوبی ڈرے ڈرے انداز میں کچن کی جانب بڑھنے کے لیے پلٹی اور ایک ذرا سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ مجھے اس غریب کی نگاہ میں بے چارگی کا تاثر محسوس ہوا اور میں نے فوراً اپنا ایک ہاتھ آگے کر کے اس کا راستہ روک لیا۔

''ٹھہر جاؤ۔'' وہ رک گئی۔ چند لمحے محدود ماحول میں پھر سکوت طاری ہوا۔ تب میں نے لارا سے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''مادام! یہ اب میرے محسن ہیں۔ انہوں نے ایک نازک موقعے پر ہماری جان بچائی ہے اور یہاں سخت موسم میں پناہ دی ہے۔ تمہارے یہ تین ہٹے کٹے ساتھی کس کام کے ہیں؟ باہر شکار موجود ہے۔ ان سے کہو کہ آدھا شکار ساتھ لے جائیں، باقی ہمارے لیے چھوڑ دیں۔ یہ بھی تم پر میرا احسان ہے کہ اپنا شکار کیا ہوا تمہیں دے رہا ہوں ورنہ تم خود بھی شکار کر سکتے ہو۔ باہر میدان کھلا پڑا ہے۔''

''مسٹر شیان!'' لارا برہم سی ہوگئی۔ ''مت بھولو کہ تم ہمارے آلۂ کار ہو۔''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے بھی فوراً اور بلاخوف کہا۔ ''میں چند دن پہلے تم سے لاسلکی رابطے کے دوران یہ کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارا زرخرید نہیں ہوں۔ جو معاملہ ہم دونوں کے درمیان ہے، وہ خالصتاً پیسے اور برابری کی بنیاد پر ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔''

یہ بات درست تھی کیونکہ چند دن پہلے میں نے لاسکی رابطے کے دوران لارا کو اس کے اسی تحکمانہ لہجے پر بڑی رکھائی سے یہ باور کرادیا تھا۔

جیکی سمیت اس کے دونوں مشٹنڈے ساتھیوں کی آنکھوں میں میرے لیے بڑی خونخوار چمک ابھری۔ وہ اپنی ''مادام'' کے حکم کے بے چینی سے منتظر نظر آنے لگے کہ کب وہ انہیں مجھ پر پل پڑنے کا اشارہ کرے اور تینوں میری تکا بوٹی کر کے رکھ دیں۔

میرے جواب پر لارا کے حسین چہرے پر بھی ایک لمحے کو طیش کی سرخی ابھری مگر شاید کسی ''مصلحت'' کے تحت اس نے ایک گہری سانس لے کر جیسے خود کو پُرسکون کرلیا اور بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم چلتے ہیں لیکن کل صبح نرڈی تمہیں لینے آجائے گا۔'' نرڈی شاید تندخو جیکی کے علاوہ ان دونوں میں سے کوئی ساتھی تھا۔

میں نے اس کی بات پر صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ تینوں باہر چلے گئے۔

''یہ بہت خطرناک لوگ تھے لیکن حیرت ہے تم نے انہیں کیسے......'' ان کے مکان سے نکلتے ہی میوخ نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تلے مجھ سے کہنا چاہا مگر میں اسے نظرانداز کرتا ہوا شینا کی طرف متوجہ ہوا۔

اس کی حالت اب کچھ بہتر ہونے لگی تھی۔ صوبی نے اس کا جڑی بوٹیوں سے خوب علاج کیا تھا۔ البتہ زخم کو بھرنے میں وقت درکار تھا۔ اب موجودہ حالات میں شینا کا ساتھ میرے لیے اور بھی ضروری ہوگیا تھا لیکن ان صحرائی عقاب والوں کی یہاں موجودگی بھی خطرے سے خالی نہ تھی۔ وہ بنی بنائی راہ کھوٹی کر سکتے تھے۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ کل صبح یہ میری ان باتوں سے کس طرح مطمئن ہونے والے تھے جو میں سوچ چکا تھا۔

میں تھکا ہوا تھا اور نیند سے بھی میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میری وجہ سے اگرچہ دونوں میاں بیوی کو حوصلہ ہوا تھا مگر وہ اب بھی انجانے خوف کا شکار تھے۔

''ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کل صبح تک انہیں سنبھال لوں گا بلکہ انہیں یہاں سے کوچ کرنے پر بھی مجبور کردوں گا۔ یہ اب تمہیں تنگ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔'' میں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا میں چند گھنٹے آرام کرسکتا ہوں؟''

''ضرور۔'' میوخ نے کہا اور پھر اپنی بیوی سے کچھ بولا۔ وہ میرے لیے فوراً سمور کا گرم بستر لے آئی جو میں نے آتش دان کے قریب اور شینا سے ذرا فاصلے پر بچھالیا اور سوگیا۔

نہ جانے رات کے کس پہر اچانک میری آنکھ کھلی۔ میں ہڑبڑا کر جاگا لیکن خود کو بے بس پایا۔ گہری نیند اچانک ٹوٹنے پر پہلے تو میرا دماغ ہی بوجھل سا رہا۔ چند لمحے تک میری سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ ہوا کیا ہے۔

حواس بحال ہوئے تو خود کو پہلو کے بل پایا۔ اس طرح کہ میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ ماحول میں ہڑبونگ سی مچی ہوئی تھی۔ گھٹی گھٹی چیخیں، رونے اور سسکنے کی آوازیں۔ اس درمیان شیطانی قہقہے اور انسانی غراہٹیں تھیں۔

میں نے دیکھا وہ شیطانی ٹولا ایک بار پھر وہاں آن دھمکا تھا۔ نہ جانے رات کا وقت تھا یا صبح دم بیدار ہو چکی تھی۔ میرے دونوں میزبان میاں بیوی اپنے دونوں معصوم بچوں کے ساتھ ایک کونے میں کھڑے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے اور میری طرف تکے جارہے تھے۔ بچے اپنی ماں اور باپ کے عقب میں دبکے کھڑے تھے۔

لارا کے ہاتھ میں لمبی نال والا پستول چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی مکارانہ چمک اب ایک مسکراہٹ تلے ظاہر تھی۔ اس کے دو ساتھی بھی اسلحہ بدست اس کے دائیں بائیں موجود میری جانب زہرخند مسکراہٹ سے گھور رہے تھے۔

جیکی میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکانہ تاثرات تھے۔ شینا کو بھی جگا دیا گیا تھا اور وہ بے چین اور پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے اوپر سے گرم موٹا لحاف ہٹا دیا گیا تھا۔

پل کے پل مجھے یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ انہوں نے دھوکے سے دوبارہ شب خون مارا تھا اور جیکی نے مجھے سوتے ہوئے جکڑ بند کر ڈالا تھا۔ میرے میزبان کا کتا ان پر بری طرح بھونکنے لگا تو جیکی نے نرڈی کو اشارہ کیا۔ نرڈی نے اس معصوم بے زبان کو جا دبوچا اور ساتھ ہی خنجر نکال لیا۔

اپنے پالتو کتے کے نرڈی کے ہاتھوں متوقع بے رحمانہ حشر کے تصور سے صوبی اور میوخ چیخ پڑے۔ دونوں بچے بھی رونے لگے لیکن نرڈی کتے کو باہر لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس معصوم بے زبان کی آخری چیخ ابھری اور خاموشی طاری ہوگئی۔ نرڈی جب لوٹا تو اپنا خون آلود خنجر صاف کر کے اپنی پنڈلی میں اڑس رہا تھا۔

نرڈی کی اس بے رحمی پر قہر و غضب تلے میری حالت غیر ہونے لگی۔ صوبی اور بچے رونے لگے۔ میوخ نے دکھ سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ان کا پالتو کتا شاید بہت عرصے سے ان

کے ساتھ رہتا تھا بلکہ ان کے مختصر خاندان کا حصہ بن چکا ہوگا۔

"یہ...... یہ سب کیا ہے مادام؟" میں نے پہلو کے بل لیٹے لیٹے لارا کو گھورتے ہوئے حلق کے بل چلا کر کہا تو اسی وقت قریب کھڑے جیکی کی ٹانگ حرکت میں آئی جس کی زوردار ضرب میرے پیٹ پر پڑی۔ میرے منہ سے دردانگیز کراہ نکلی اور میں دہرا ہوگیا۔ یہی نہیں، اس نے دوسری ٹانگ بھی چلادی۔ میں تب تک اپنی سانس روک کر اپنے پیٹ کے عضلات کو تکلیف کی شدت سے بچانے کے لیے سخت کر چکا تھا اسی لیے دوسری ضرب سے مجھے کم تکلیف محسوس ہوئی۔

اس رذیل نے اس پر بھی بس نہ کیا اور لاتوں کی ضربات سے اپنی بھڑاس نکالتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میرے حلق سے چیخیں برآمد ہونے لگیں اور شینا نے میرا یہ حشر دیکھ کر چلّانا شروع کردیا۔ لارا نے اپنے ایک ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا تو وہ فوراً لپک کر شینا کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کے اپنے ہی ساتھی یعنی جیکی نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

"رک جاؤ نرڈی! میں مادام کے حکم سے سب سنبھال لوں گا۔"

نرڈی نامی وہ آدمی شیطانی انداز میں ہنستا ہوا واپس پلٹ کر اپنی جگہ پر جا کھڑا ہوا۔ لارا نے شاید اپنے اس بپھرے ہوئے کتے جیکی کو میرے سلسلے میں "فری ہینڈ" دے دیا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر شینا کی طرف بڑھا۔ اس سنگدل نے شینا کے زخمی پہلو پر لات چلادی۔ شینا کے حلق سے شدت درد تلے ایسی چیخ ابھری جیسے وہ آخری ہو۔ اس کے پہلو کا زخم کھل گیا، جڑی بوٹیوں کے لیپ نے جریان خون روکنے کا جو بند باندھ رکھا تھا، وہ جیسے ٹوٹا تو وہاں سے سرخ اور گاڑھے خون کی ندی بہہ نکلی۔ وہ کسی زخمی بلی کی طرح سکڑ کر کپکپاتی اور گھٹے گھٹے انداز میں کراہتی رہی۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھانے لگی۔

شینا کی یہ ہیئت کذائی تڑپا دینے والی تھی۔ شینا کا زندہ رہنا میرے لیے ضروری تھا۔ ساتھ ہی مجھے پچھتاوا ہوا کہ میں ان مکار اور سنگدل لوگوں سے غافل کیوں ہوا۔ یہ لوگ بے رحم اور سفاک ہی نہیں بلکہ حد درجے کے مکار بھی تھے۔

جیکی بے رحمی سے ہنسنے لگا اور ساتھ ہی میری جانب تپا دینے والے انداز میں گھورا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے وحشت انگیز انتقام اور بغض کی آگ بھڑک رہی تھی۔ گزشتہ رات میں نے اس کی پُرغرور انا کو جو دھچکا پہنچایا تھا، وہ اب اس کا ادھار چکا رہا تھا لیکن لارا سے مجھے یہ امید نہ تھی کیونکہ وہ مجھ سے برابری کے لیول اور دوستانہ انداز کا برتاؤ رکھے ہوئے تھی اور اسی نے اپنے منہ چڑھے اور غصہ ور ساتھی جیکی کو میرے ساتھ الجھنے سے منع بھی کیا تھا مگر اب...... شاید لارا کی اپنی بدنیتی اور مکاری بھی کھل کر میرے سامنے آچکی تھی۔

بدقسمتی سے میں اسی دھوکے میں رہ گیا تھا کہ بومبورگا کے مجسمے کے حصول کے سلسلے میں لارا میرے ساتھ مصالحت سے پیش آئے گی لیکن ان لوگوں نے شاید رات یہاں سے جانے کے بعد کچھ اور ہی منصوبہ بنالیا تھا اور یقیناً اس میں جیکی کے ہی مشورے کا زیادہ دخل ہوسکتا تھا۔

"لارا......!" میں حلق کے بل چیخا۔ میرا انداز للکارنے والا تھا۔ "یہ تم اچھا نہیں کررہی ہو۔ اپنے اس بزدل کتے کو پٹا ڈال دو۔ اس سے پہلے کہ تمہارے اور میرے بیچ راموو والے معاملے کی بات ختم ہوجائے۔" میں نے دانستہ ابھی بومبورگا والے مجسمے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ لارا کچھ عقلمندی سے کام لے گی مگر اس نے بدستور مکارانہ خاموشی اختیار کرتے ہوئے لاتعلقی کا رویّہ قائم رکھا اور اپنے خار کھائے ساتھی جیکی کی طرف دیکھا۔ اشارہ کلیئر تھا۔ جیکی جیسے وحشی درندے کو وہ فری ہینڈ دے چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جیکی پُرطیش انداز میں دوبارہ میری جانب بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑ اپھر اٹھا کر مجھے کرسی پر گرانے کے سے انداز میں بٹھادیا اور قہرآلود لہجے میں غرا کر بولا۔

"اب ایک لفظ بھی مادام کے لیے منہ سے نکالا تو تیرا حشر خارش کھائے کتے کی طرح کرڈالوں گا۔" اس نے یہ بات میرے چہرے کے اتنے قریب ہوکر کہی کہ اس کے سؤر جیسے تھوتھنے سے جھاگ کے چھینٹے اڑتے میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیے۔ مجھے اس ناپاک درندے سے کراہیت آنے لگی لیکن اس نازک موقعے پر بھی اسے جواب دینے سے خود کو روک نہ سکا۔

"مار کھائے ہوئے بزدل سؤر! میرے ہاتھ کھول کر دیکھ۔ تجھے معلوم ہوجائے گا کہ کون کس کا خارش زدہ کتے والا حشر کرتا ہے۔"

میرے اس جواب نے جیکی کے تن بدن میں جیسے آگ لگادی۔ اس کی سؤر جیسی چنی چنی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے سلسلے میں کوئی انتہائی قدم اٹھاتا، لارا کی آواز نے اسے روک دیا۔

"جیکی! یہ تمہیں طیش دلاتا رہے گا اور ہمارا وقت ضائع کرتا رہے گا۔ کام کی بات پوچھو اس سے...... یہ سب چھوڑو۔"

جیکی بھنا کر رہ گیا پھر لارا خود آگے بڑھی اور جیکی کو پیچھے ہٹا دیا۔ شینا کی گھٹی گھٹی چیخیں مجھے بے چین کیے دے رہی تھیں۔ لارا میرے قریب آ کر مکارانہ فروتنی سے بولی۔

''ڈیئر شیان! بس ختم کرو اب۔ وہ مجسمہ میرے حوالے کر دو بغیر کسی ڈیلنگ کے۔ ہم چلے جائیں گے یہاں سے۔''

میں پہلے تو خونخوار نظروں سے اس مکار عورت کو گھورتا رہا پھر اسی لہجے میں بولا۔

''لارا! تم نے یہ میرے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔''

''اب تم فالتو باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔'' لارا درمیان میں بولی۔

''ہماری بوٹ کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ نیپالی اور تبتی فورسز سے جان بچا کر ہم پہاڑی نالے میں بوٹ سمیت جا گرے تھے۔ وہاں سے بچتے بچاتے یہاں تک پہنچے۔'' میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔

لارا کی بھویں سکڑ گئیں۔ نیلی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ پھر وہ بولی۔ ''ٹرانسمیٹر تمہارے پاس موجود تھا۔ میں نے تمہیں ہدایت کر رکھی تھی کہ پل پل کی اطلاع مجھے دیتے رہو۔''

شینا تکلیف اور جریانِ خون کی وجہ سے ہنوز کراہ رہی تھی۔ صوبی بے چاری اس دہشت زدہ ماحول کے باوجود اس کی مدد کرنے کے لیے ڈرتے ڈرتے اس کی جانب بڑھی تھی مگر مردود جیکی نے بے دردی سے اسے بالوں سے پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے دونوں معصوم بچے ماں کی چیخ پر رو پڑے۔ لارا کے دو ساتھی انہیں ڈرا دھمکا کر خاموش کرانے کی کوشش کرنے لگے۔ میوخ نے اپنی بیوی کو سنبھال لیا۔

''لارا! یہ میری ساتھی ہے۔ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ لارا نے شینا کی طرف دیکھا۔ میں پھر بولا۔ ''اس عورت کو اجازت دو وہ اسے سنبھال لے ورنہ ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہے، وہ سب ختم ہو جائے گا۔ ضد کا میں بھی کچا نہیں ہوں۔''

میرے لہجے میں جانے ایسا کیا تھا کہ لارا نے ایک گہری سانس لے کر صوبی کو اجازت دے دی۔ جیکی کے چہرے پر ناگواری کے آثار ابھرے۔ وہ بلند آواز میں لارا سے بولا۔

''مادام! یہ اس کی کمزوری لگتی ہے ورنہ یہ مجسمے کے بارے میں کبھی نہیں بتائے گا۔''

جیکی ایک نمبر کا رذیل آدمی تھا۔ شینا سے متعلق میری ''بے چینی'' کو بھانپ گیا تھا لیکن داؤ کھیلنا میں بھی جانتا تھا۔ میں نے کہا۔

''مجسمے کی تلاش کے لیے تم لوگوں کو اب بھی میری ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' میں نے ایسا بم اچھالا تھا کہ لارا سمیت جیکی بھی بری طرح چونکے۔

''تلاش...... کیا مطلب؟'' لارا کے منہ سے برآمد ہوا۔ میرا خیال ٹھیک نکلا۔ وہ مجھے صحیح سلامت یہاں پا کر سمجھے تھے کہ مجسمہ میرے ہی پاس ہے اور میں اتنی آسانی سے انہیں نہیں بتاؤں گا لہٰذا مجھ پر دہشت جما کر وہ اسے حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھے۔

''میں نے بتایا نا کہ بوٹ کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ مجھ سمیت دو ساتھی بھی بہتے بہتے پہاڑی نالے سے نیچے جا گرے تھے۔'' میں نے چال جاری رکھی۔ ''مجسمہ جس جگہ پانی میں غرق ہوا وہ مقام مجھے ازبر ہے۔''

''اوہ۔'' لارا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میرا دل اندر سے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ لارا کو میرے جھوٹ پر سچ کا گمان ہوا تھا۔

''مادام! یہ بکواس کر رہا ہے۔'' جیکی غرایا۔ ''مجسمہ اسی مکان میں چھپا رکھا ہے۔''

''تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ تلاشی لو پورے مکان کی۔'' لارا نے انہیں حکم دیا۔ آن کی آن میں ان بدبختوں نے سارا گھر الٹ دیا۔ مجسمہ ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ صوبی اور میوخ سے بھی ڈرا دھمکا کر پوچھا گیا تھا۔ ان بے چاروں کو بھلا کیا معلوم تھا۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ان پر تشدد کیا گیا۔

شینا بے ہوش ہو چکی تھی۔ لارا نے صوبی کو اسے سنبھالنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اب مکان میں سب کچھ بکھر چکا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے میرے مہربان میزبانوں کو یہ سب برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ میرے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میرے اندر ایک طوفان تھا جو امڈنے کو بے چین تھا۔ ایک آتش فشاں اندر ہی اندر ابلنے لگا تھا۔

ہر طرح سے ناکام ہونے کے بعد جیکی بپھرے ہوئے سور کی طرح بے ہوش اور نیم مردہ حالت میں پڑی شینا کی طرف لپکا۔ صوبی کو ایک بار پھر اس نے بے دردی سے پرے دھکیل دیا اور شینا کو گردن سے پکڑ کر دبوچ لیا اور پھر گردن موڑ کر سفاک لہجے میں غراتے ہوئے مجھ سے بولا۔

''شیان! آخری موقع دے رہا ہوں۔ مجسمہ کہاں ہے؟''

جیکی کی اس بے رحمی پر میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے کہا۔

''جیکی! میں نے کہا نا مجسمے تک میں تم لوگوں کی رسائی میں مدد کر سکتا ہوں۔''

جیکی غرایا پھر اس نے اپنے لباس سے تیز دھار قرولی

نکال لی۔ وہ اسے شینا کے جسم میں گھونپنے والا تھا کہ اچانک ایک تیز سیٹی کی آواز پر سب چونک پڑے۔

''ٹھہر جاؤ جیکی! باس کی کال آرہی ہے۔'' لارا نے کہا اور اپنی جیب سے کوئی آلہ نکال کر کان سے لگایا اور کونے میں کھسک کر اس سے باتیں کرنے میں مصروف ہوگئی۔

جیکی نے شینا کو چھوڑ دیا اور ہانپتے ہوئے ایک طرف جا کھڑا ہوا۔ مجھے شینا کی طرف سے تشویش ہونے لگی اور میں امید بھری نظروں سے صوبی کی طرف تکنے لگا۔ آفرین تھا اس میزبان خاتون پر۔ وہ میری نگاہوں میں رحم کی فریاد بھانپ کر دوبارہ شینا کو سنبھالنے کے لیے بڑھی۔ جیکی اس وقت اپنے دونوں ساتھیوں کے قریب جا کر ان سے باتیں کرنے لگا۔

صوبی نے شینا کے کھلے زخم پر دوبارہ مرہم پٹی کرنا شروع کر دی۔ باہر سرد ہواؤں کا شور جاری رہا۔ یہ سب بڑا بے رحم اور جاں کش ماحول محسوس ہو رہا تھا۔ میوخ نے اپنے دونوں بچوں کو سنبھالا ہوا تھا۔ اسے اپنی رحم دل بیوی کی بھی فکر ہو رہی تھی۔

میں اندر ہی اندر بے چین اور تڑپ رہا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے پشت کے پیچھے بندھے اپنے دونوں ہاتھوں کے جکڑ بند کھولنے کی بھی تگ و دو شروع کر دی تھی لیکن وہ شاید کسی مضبوط رسی کے ساتھ دہرے تہرے انداز میں جکڑے ہوئے تھے۔

زیادہ زور لگانے کی صورت میں میرے چہرے کے تاثرات اور جسم کی جنبش سے میری اس ''کوشش'' کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔

''باس ہیلی کاپٹر میں خود یہاں پہنچ رہا ہے۔''

معاً ہی ہراس زدہ فضا میں لارا کی آواز ابھری۔ اس کی بات پر سب چونک پڑے۔

''کیا کہا مادام...... باس خود یہاں آرہا ہے؟'' جیکی حیرت سے بولا۔ ''مگر کیوں؟''

''شٹ اپ۔'' مادام نے اسے گھرکا۔ ''باس مرضی کا مالک ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا ڈارلنگ!'' جیکی بے تکلفی کے ساتھ لارا سے بولا۔ ''یہاں کا موسم خراب ہے۔ سفر میں انہیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔''

''یہ باس بہتر جانتا ہے۔'' لارا اس کی بے تکلفی کے باوجود سنجیدگی سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''اور تم اپنے آپ پر قابو رکھو۔ باس نے شیان کے سلسلے میں ہمیں نرم اور دوستانہ رویہ رکھنے کی تاکید کی ہے۔''

''اوہ، کیا تم نے باس کو سب بتا ڈالا؟'' جیکی کے لہجے میں تلخی عود کر آئی۔

''اور تمہارا کیا خیال ہے، باس سے یہ چھپاتی میں؟ جبکہ وہ خود یہاں پہنچ رہا ہے۔''

''تمہیں مصلحت سے کام لینا چاہیے تھا۔'' جیکی بولا۔

''مثلاً؟'' لارا منہ بھلا کر بولی۔

''یہی کہ ہم کامیابی کے بالکل قریب ہیں...... لیکن تم نے ساری بات بتا کر باس کو نہ صرف بد دل کر دیا بلکہ یہاں آنے پر بھی مجبور کر ڈالا۔ اب ہم آزادی سے کام نہیں کر پائیں گے۔''

''تمہارے اس آزادانہ کام کے طریقے سے باس پہلے ہی عاجز ہے۔'' لارا بولی۔ ''کاش! میں تمہارا کہنا مانتی۔''

لارا اور اس کا سرچڑھا ساتھی جیکی ایک دوسرے سے الجھ گئے تھے۔ میں غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ صحرائی عقاب کا بگ باس یعنی البرٹ رمنڈ خود ہیلی کاپٹر پر یہاں آرہا تھا۔ اس خبر پر میں بھی چونکا تھا۔ شاید وہ نیپال یا بھارت کے کسی شہر میں عارضی طور پر فروکش تھا۔

ان کی بحث جاری تھی۔

''مت بھولو لارا ڈارلنگ کہ اس سے پہلے دو مہمات کا میں بھی نائب بن چکا ہوں۔'' جیکی کے لہجے میں فخر تھا۔

''اور تمہاری ان دو مہمات کی ناکامی کو میں ہی نہیں، باس بھی نہیں بھولا ہے۔ اسی لیے اس بار مجھے نائب بنا کر اس نے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ میری ہی عقل ماری گئی تھی کہ تمہاری باتوں میں آگئی۔'' لارا کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔

''اس میں باس کی ٹھنڈی پالیسی کا دخل تھا۔ میرا قصور نہیں تھا۔'' جیکی بے پروا لہجے میں بولا۔ ''لارا ڈیئر! اب بھی تم میری پالیسی پر عمل کرتی رہو تو دو منٹ میں مجسمہ ہمارے پاس ہوگا۔''

''تم بہت جاہل اور گنوار ہو۔ مجسمہ شیان کے پاس نہیں ہے۔''

''مجسمہ اسی نے ادھر کہیں چھپا رکھا ہے۔'' کہتے ہوئے جیکی نے میری جانب گھورا۔ کمبخت کا سو فیصد خیال درست تھا۔ اگر انہیں اس پہاڑی نالے کے کنارے گھاس پھوس کے گڑھے کا پتا چل جاتا تو یقیناً ان کی مہم کی کامیابی کا سرخیل جیکی کو ہی سمجھا جاتا۔

''میرا خیال ہے اب جبکہ باس خود یہاں پہنچ ہی رہا ہے تو آپس میں الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' ان کے دوسرے ساتھی نرڈی نے پہلی بار مداخلت کی۔ اس پر ان کا تیسرا

ساتھی بھی بولا۔

''ہمیں خوش اور مطمئن ہونا چاہیے کہ اب اس پیچیدہ مسئلے کو باس خود آکر ہینڈل کرلے گا۔''

''تم سدا کے بدھو اور احمق ہی رہو گے جیڈ!'' جیکی نے پھنکار کر اپنے آخر الذکر ساتھی کو بری طرح گھرک دیا۔ وہ خائف ہو کر دبک سا گیا۔ ''میں باس کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح ہمارا اس پر کیا امپریشن پڑے گا؟ کب سے ہم اس منحوس مجسمے کو حاصل کرنے کے لیے خوار ہو رہے ہیں۔ اب جبکہ اس کا سراغ ملنے کی امید بلکہ معمول ہی گیا ہے تو لارا نے احمقانہ پن کر دیا اور باس کو......''

''غلط......!'' لارا نے جیکی کی بات کاٹ دی۔ ''باس کا یہاں پہنچنا اس کی اپنی مرضی ہے۔ میں نے اسے یہاں آنے کا کب کہا؟ میں تو پابند تھی کہ اسے مجسمے کی تلاش اور کامیابی کے چانسز کے بارے میں پل پل کی خبر دیتی رہوں اور میں نے وہی کیا۔ باقی باس کا اپنا فیصلہ ہے یہاں آنے کا۔ ڈیٹس اٹ!''

''ختم کرو۔'' جیکی جھلا کر بولا۔ ''مجھے ذرا اس سے بات کرنے دو۔'' کہتے ہوئے وہ اپنے دونوں بازو ہلاتا ہوا چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آگیا اور چند ثانیے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر بھیڑیے جیسی غراہٹ تلے بولا۔

''اگر مجسمہ تم نے کہیں چھپا رکھا ہے تو ہمارے حوالے کر دو اور جو ڈیل ہم نے پیسوں کی رامو سے کر رکھی تھی وہ تمہاری ہوئی۔ معاملہ ادھر ہی ختم ہو جائے گا۔ ہم اپنی راہ لیں گے اور تم اپنی۔''

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''جیکی! میں اب بھی اپنی بات اور ڈیل پر قائم ہوں لیکن تم نے بلاوجہ خون خرابا پھیلا کر میرا دل خراب کر ڈالا لیکن پھر بھی میں یہ سب بھول جانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر ایسی باتیں تم دوستانہ ماحول میں کرو تو پیسوں کا مجھے بھی لالچ ہے۔ مجسمہ جس مقام پر پانی میں غرق ہوا ہے وہ جگہ مجھے یاد ہے۔ ہم وہاں سے......''

''شٹ...... شٹ...... شٹ۔'' جیکی حسبِ عادت پاگلوں کی طرح بپھر گیا۔ میری بات درمیان میں رہ گئی۔ اس نے جھلا کر ایک گھونسا میرے کندھے پر رسید کر دیا۔ میں اس تکلیف کو سہہ گیا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ میرے آگے جھک آیا اور غراتے ہوئے بولا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہمارے ساتھ بلف کر رہے ہو۔ مجسمہ تم نے ادھر ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ ٹھہرو میں ابھی بتاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ہم سب اس کی طرف تکتے رہ گئے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ایک گہری سانس اندر کھینچنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا چوڑا سینہ پھولنے لگا۔ اس نے جب اچھی طرح ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھر لی تو وہیں رک گیا۔

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو چلا تھا۔ اس نے سانس اندر کھینچنے کے بعد روک رکھی تھی اور اس کے ہونٹ یوں ہل رہے تھے جیسے کوئی منتر جنتر پڑھ رہا ہو۔ محتاط اندازے کے مطابق اس نے دو منٹ تک سانس اسی طرح اندر بھر کر روکے رکھی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے اس نے سانس باہر نکالی اور ساتھ ہی اپنی آنکھیں بھی کھول لیں۔

میں نے دیکھا اس کے بدہیئت تھوتھنے پر بڑی سنگین مسکراہٹ تھی۔ مجھے لگا یہ سؤر پھر مجھ پر پل پڑے گا لیکن وہ جیسے ایک میکانکی انداز میں گھوما اور اس کا رخ بے ہوش پڑی شینا کی طرف ہو گیا جہاں میوخ کی رحم دل بیوی صوبی اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ نہ جانے کیوں جیکی کے اس انداز نے مجھے اندر سے ایک لمحے کے لیے دہلا کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

اس چھوٹے سے برفانی مکان کی محدود فضا یکلخت دم بخود سی ہو گئی۔ اس بدبخت سؤر کی شکل والے جیکی نے نہ جانے کون سا منتر جنتر پڑھا تھا کہ اسے شینا پر کچھ شبہ ہوا تھا۔ کیا؟ یہ ابھی نامعلوم تھا۔ میں سناٹے میں آگیا۔

نہ جانے اب یہ خنزیر النسل شینا کی طرف کیوں متوجہ ہوا تھا جبکہ وہ ابھی تک اپنے حواسوں میں ہی نہ تھی۔ لارا، نرڈی اور جیڈ بھی اسی کی طرف تکے جا رہے تھے۔ میری نظریں اسی پر جمی رہیں۔ وہ قریب پہنچا۔ صوبی سہم گئی۔

''اس کی حالت کب تک بہتر ہو جائے گی؟'' جیکی نے سپاٹ لہجے میں اس سے پوچھا۔

''کک...... کچھ وقت لگے گا؟'' صوبی نے ڈرے سہمے لہجے میں کہا۔

''کتنا؟''

''کچھ گھنٹے......''

''میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ بات کرنے کے قابل کب تک ہو جائے گی؟''

''میں کوشش کرتی ہوں کہ یہ تم سے تھوڑی بہت بات کر سکے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں اور تم اپنا کام

کرو۔" جیکی بولا پھر میری جانب بڑھا۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔

"جیکی! آخر تم کرنا کیا چاہ رہے ہو؟" لارا نے بے چینی سے پوچھا۔

"یہی کہ اس کی ساتھی کے منہ سے مجسمے کے متعلق سچ اگلواؤں گا۔ اسے سب معلوم ہے۔ مجھے مقدس آبور کی قسم ہے، اس نے بھی مجھے یہی اشارہ دیا ہے۔" جیکی نے جواب دیا۔ نہ جانے یہ آبور کیا بلا تھی؟ شاید یہ اس کا پجاری تھا، اس کا کوئی فرضی دیوتا تھا...... کون تھا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی۔ لارا بولی۔

"مگر شیان ہمارا ساتھ دینے پر رضامند ہے۔" لارا نے اسے سمجھایا۔

"یہ ہمارے ساتھ فیئر نہیں ہے۔" جیکی نے میری طرف گھور کر لارا سے کہا اور اس کا خیال یا خدشہ سو فیصد درست تھا۔ یہ اس کا اندازہ تھا اور قیاسات کم ہی غلط ثابت ہوتے ہیں۔ لارا نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اشتباہ انگیز نگاہوں سے مجھے تکنے لگی پھر جیکی سے بولی۔

"ہم اس کی ساتھی کو اس وقت تک یرغمال بنا کر رکھیں گے جب تک کہ یہ بوموروگا کے مجسمے تک ہماری درست راہنمائی نہیں کر دیتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ شیان، میں اور نرڈی ابھی یہاں سے جا رہے ہیں۔ تم اور جیڈ یہیں رکو گے۔" جیکی نے جیسے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ اس نامراد کا فیصلہ سن کر میرے اندر مسرت چمکی۔

میں مہلت ملنے کا منتظر تھا۔ بعد میں جیکی اور نرڈی کو میں پچھاڑ کر دوبارہ یہاں کا رخ کر سکتا تھا۔

"مجھے تمہارا یہ فیصلہ قبول ہے۔" یہ مسرت تلے میری جلد بازی تھی کہ میں نے جیکی سے ایسا کہہ دیا لیکن وہ یکلخت مکارانہ مسکراہٹ تلے مجھ سے سرسراتے لہجے میں بولا۔

"میں سب جانتا ہوں۔ تمہیں بھی، تمہارے ذہن میں پلنے والے منصوبے کو بھی۔" اس کی بات پر میں اندر سے ذرا خفیف سا ہوا۔

"تم راہ میں کوئی گل کھلانے کی اسکیم پر غور کر رہے ہو۔" وہ زہریلے لہجے میں دوبارہ بولا۔ "مگر یاد رکھنا یہ تمہاری محض خام خیالی ہوگی۔" کہتے ہوئے وہ لارا کی جانب گھوما۔

"تم ہر بیس منٹ بعد ٹرانسمیٹر پر مجھ سے اور نرڈی سے رابطے میں رہوگی۔ جہاں بھی دیر ہوئی سمجھ لینا اس نے ہمارے ساتھ کوئی دھوکا کیا ہے۔ سزا کے طور پر نہ صرف اس کی زخمی ساتھی (شینا) کو بلکہ اس مکان کو آگ لگا دینا۔ اس کے میزبانوں کو بھی پھر زندہ رہنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔"

اس رذیل کی بات نے مجھے تھوڑا پریشان کر دیا۔ وہ بے شک ایک درندہ صفت انسان تھا مگر عقل سے پیدل بھی نہیں تھا اور نہ عموماً اس فطرت کے لوگ دماغ اور عقل کا کم ہی استعمال کرتے ہیں۔ تاہم میں پھر بھی ناامید نہ تھا۔

"تم سن رہے ہو نا مسٹر شیان؟ اسی لیے کسی چالاکی کا خیال بھی اپنے دل میں مت لانا۔" جیکی نے مجھے بھی تہدید کر ڈالی۔

"اور باس کا کیا کریں؟ وہ یہاں پہنچ رہا ہے۔" لارا نے سوالیہ نگاہوں سے جیکی کی طرف دیکھا۔

"پہنچنے دو اسے۔ ہم نکل جاتے ہیں۔" جیکی نے بے پروا لہجے میں کہا۔

"تمہیں باس کا انتظار کر لینا چاہیے۔ اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں۔ باس ناراض ہو سکتا ہے۔ تم اپنا پلان اس کے سامنے رکھ دینا۔" لارا نے کہا۔ جیکی نے ہونٹ سکیڑ لیے۔ لارا نے بات جاری رکھی۔

"وہ کھٹمنڈو سے اب تک روانہ ہو چکا ہوگا۔ ڈیڑھ سے دو گھنٹے یہاں تک پہنچنے میں لگ ہی جائیں گے۔"

میں اس کی بات پر چونکا اور یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس منحوس مجسمے بوموروگا کی کتنی اہمیت تھی کہ ان کا باس خود اس کے حصول کے لیے میدان میں اترا ہوا تھا۔ یہ لوگ غیر ملکی تھے۔ یورپین یا امریکی ہو سکتے تھے۔ ضرور ان کا اصل ٹھکانا مذکورہ خطوں میں کہیں ہو سکتا تھا۔

"چلو، پھر کچھ ضیافت ہی اڑاتے ہیں۔" جیکی نے ایک دم قہقہہ لگایا اور صوبی سے کچھ کھانے پینے کو لانے کا حکم دیا۔ وہ بے چاری خاموشی سے اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ میورخ نے کچن میں بیوی کے پیچھے جانے کی کوشش کی مگر مردود جیکی نے اسے روک دیا۔ البتہ دونوں بچوں کو اس نے ماں کے پیچھے بھیج دیا۔

میں جیکی کی بدمعاشی اور چالاکی پر اندر ہی اندر کھولنے لگا۔ جگر بند کھولنے کی میری خاموش اور دھیمی تگ ودو جاری رہی۔ میں بار بار گردن تھوڑی گھما کر شینا کو دیکھنے لگتا تو مکار لارا اور جیکی مجھے غور سے تکنے لگتے۔

شینا کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے جس جان کنی کے آثار تھے، وہ اب بتدریج کم ہونے لگے تھے۔ صوبی کا یہ احسان تھا کہ اس نازک اور خطرناک حالات میں بھی وہ شینا کی تیمارداری کرتی رہی تھی حالانکہ خود اس کی فیملی پر خطرہ منڈلا رہا تھا۔

شاید رات کے آخری پہران رذیلوں نے دھوکے میں حملہ کیا تھا۔ اب شاید صبح ہونے والی تھی۔ صوبی بے چاری کچھ دیر بعد سب کے لیے ناشتا بنا لائی۔ وہ چاروں مشٹنڈے مربھکوں کی طرح ناشتے پر ٹوٹ پڑے۔ مجھے یا کسی اور کو ان رذیلوں نے پوچھا تک نہیں اور سب چٹ کر گئے۔

جیکی نے ایک ڈکار لی اور اٹھ کھڑا ہوا اور لارا سے بولا۔ ”میں اور نرڈی اس کے ساتھ روانہ ہو رہے ہیں۔“ اس نے جیسے فیصلہ سنایا۔ اشارہ میری طرف تھا اور پھر میوخ سے تحکمانہ درشتی سے بولا۔

”جاؤ، جا کر اپنا چھکڑا تیار کرو۔“ میوخ نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ جیکی، نرڈی کو کچھ ہدایات دینے لگا پھر وہ بھی میوخ کے پیچھے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد وہ جیڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

”جیڈ!“

”یس ماسٹر!“ جیڈ نے مؤدبانہ کہا۔

”مادام لارا کا خیال رکھنا۔ اسے تسلی دیتے رہنا۔ یہ جلد پریشان ہو جاتی ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے پاس کھڑی لارا کو آنکھ ماری۔ وہ مصنوعی خفگی سے مسکرا دی۔ جیکی نے بے تکلفی سے آگے بڑھ کر اس کا بوسہ لے لیا۔

”ڈارلنگ! پریشان مت ہونا۔ جیکی کی طاقت پر تمہیں بھروسا ہے نا؟“

”وہ تو ہے لیکن جیکی ڈیئر! یہ شخص بہت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ اس پر کڑی نظر رکھنا۔“ لارا نے اس سے کہا۔ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ وہ مجھ سے ڈری ہوئی تھی۔ شاید اس کی وجہ گزشتہ شب اپنے منہ چڑھے ساتھی جیکی کا میرے ہاتھوں حشر ہوتے دیکھنا تھی۔

”تم فکر نہ کرو ڈارلنگ!“ جیکی میری جانب ایک تضحیک آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے لارا سے بولا۔ ”میں ایسوں کو نکیل ڈالنا اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”اس دوران میں باس یہاں آ پہنچا تو اسے ہم کیا جواب دیں؟“ یہ سوال جیڈ نے جیکی سے پوچھا۔

”کہہ دینا کہ مجھے بوموروگا کے مجسمے کا ایک فوری سراغ مل گیا تھا۔“ جیکی سنجیدگی سے اس کی طرف گھوم کر بولا۔ ”تاخیر کی صورت میں وہ ہاتھ سے نکل جاتا۔ مجھے یقین ہے باس مطمئن ہو جائے گا اور یوں بھی میں خالی ہاتھ نہیں لوٹوں گا۔ تم لوگ بس یہاں پر کڑی نظر رکھنا اور مسلسل مجھ سے رابطے میں رہنا۔“

ذرا دیر بعد میوخ نے آ کر اسے بتایا کہ باہر چھکڑا تیار ہے۔ شاید وہ بھی خوش تھا کہ یہ درندہ صفت آدمی یہاں سے جلد ٹل جائے لیکن باس کی آمد اور اس کے دیگر ساتھیوں کی بدستور یہاں موجودگی پر دونوں غریب میزبان میاں بیوی بہرحال پریشان ضرور تھے۔

میں جیکی کے ساتھ جانے پر بالکل بھی رضامند نہیں تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں لیکن ”مہلت“ کے سبب کہ میں اس درندہ صفت جیکی پر قابو پا لوں گا، مجبور تھا۔ اگرچہ اس نے بھی چال چلی تھی۔ اس کے ذہن میں یہی خدشہ بدرجہ اتم موجود تھا کہ میں اس مہلت سے کسی قسم کا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اسی لیے اس نے پہلے ہی یہاں اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ اس سے اور وہ ان سے مسلسل رابطے میں رہے۔ رابطہ نہ ہونے کی صورت میں وہ نہ صرف شینا کو ہلاک کر ڈالتے بلکہ میرے ان مہربان میاں بیوی کو بھی جان سے مار کر ان کے مکان کو آگ لگا دیتے۔ یہ نامراد جیکی کی میرے خلاف بلاشبہ ایک خطرناک چال تھی۔ سوچنا یہ تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ صورت حال گمبھیر ہو گئی تھی تاہم ایک خیال کے تحت میں نے احتجاجاً ان سے کہا۔

”دیکھو، مجھے اب بوموروگا کے مجسمے سے کوئی دلچسپی رہی ہے نہ ہی پیسوں سے۔ اس وقت مجھے اپنی اور اپنی ساتھی کی جان سب سے زیادہ عزیز ہے لیکن راستے میں میری جانب سے کسی خطرے سے نمٹنے کا تمہارا یہ طریقہ خطرناک ہے۔ ہم کسی موسمی خرابی اور حادثے یا کسی اور مصیبت کا بھی تو شکار ہو سکتے ہیں۔ ایسے میں ممکن ہے کہ جیکی یا نرڈی، مادام لارا یا جیڈ سے لاسلکی رابطہ نہ کر پائیں تو پھر میں بھی اس ڈر یا خدشے سے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا کہ تم نے یہ سمجھ کر اس مکان کو آگ لگا دی اور میری زخمی ساتھی (شینا) کو بھی مار ڈالا۔“

میری یہ احتجاجی گفتگو ان لوگوں نے بڑے غور سے سنی پھر لارا نے جیکی کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھا جیسے اس سے کہہ رہی ہو کہ میری بات کا وہی جواب دے۔

”شٹ اپ!“ جواب میں جیکی میری جانب دیکھ کر پُرطیش آواز میں چیخا۔ ”زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ ہم نے وہی کرنا ہے جو ہم بہتر سمجھیں گے۔ چلو، آگے بڑھو۔“

مجھے پورا یقین تھا کہ اسی طرح میرا یہ احتجاج رد کر دیا جائے گا لیکن میرا احتجاج انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ یہ لوگ (بالخصوص لارا) اتنی جلدی یہ خطرناک اقدام نہیں اٹھائیں گے۔ میں نے جو بات ان کے (لارا) کے ذہن میں ڈالنا تھی، وہ ڈال دی تھی۔

وہ مکار اور چالاک ضرور تھی لیکن جیکی اور نزڈی وغیرہ کی طرح جوش سے کام لینے کی بہرحال عادی نہ تھی۔ یہ میرا محض قیاس تھا، یقین نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ میں بے بسی میں اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے خطرات کو جس قدر کم کرسکتا تھا اس کی میں نے کچھ کوشش تو کی تھی۔ اب آگے اللہ مالک تھا۔ لارا کو یہ باور کروانا بھی مقصود تھا کہ ایسی صورت میں، میں جیکی اور نزڈی کے ہمراہ چلا تو گیا تھا مگر بے چینی کا شکار رہتا پھر متذکرہ اور متوقع صورتِ حال میں، میں بھی ان کے ”کام“ آنے میں ہچر مچر سے کام لے سکتا تھا جب تک کسی تسلی کی تصدیق نہ ہو جاتی...... وغیرہ۔

☆☆☆

القصہ، مجھے اسی طرح رسن بستہ حالت میں ہی لے جایا گیا۔ نزڈی نے جیکی کے اشارے پر مجھے کھڑا کیا اور پھر ہم تینوں باہر آگئے۔ باہر کاٹ دار سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہر طرف برف زار کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ٹنڈ منڈ درختوں کی ٹیڑھی میڑھی شاخوں پر جمی ہوئی برف عجیب منظر پیش کررہی تھی۔ ہم نے گرم لباس پہن رکھے تھے۔

باہر چھکڑا تیار تھا۔ میوخ کو شاید اپنے خچر سے پیار تھا۔ اس نے اسے سردی سے بچانے کے لیے اس کے جسم پر موٹا سا بورا ڈال رکھا تھا حالانکہ اس جانور کو اس کی ضرورت نہ تھی۔

ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ چاروں طرف جائزہ لینے کے دوران ایک طرف مجھے سفید سفید برف کی چادر پر سرخ خون کے دھبے پڑے نظر آئے۔ اس پر بھی برف پڑی ہوئی تھی۔ میرا دل گھٹ گیا۔ وہ میرے غریب میزبانوں کے پالتو کتے کا ہی ہوسکتا تھا جسے سفاک جیکی کے ساتھی نزڈی نے اسی کے کہنے پر باہر لے جا کر خنجر سے شاید اس بے زبان کو ذبح کر کے برف میں ہی اس کی لاش دبا دی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ جیکی سمیت نزڈی کی بوٹیاں نوچ ڈالتا۔

خچر کا چوبی تختہ خاصا کشادہ تھا۔ اس پر چاروں طرف موٹی چادر کا خیمہ بنایا گیا تھا۔ اس سے آگے ایک چھوٹے اضافی تختے کا پلیٹ فارم تھا جس پر بیٹھ کر خچر کی لگامیں تھام لی جاتی تھیں۔

میوخ کو ساتھ لے لیا گیا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے اسے اپنی بیوی اور دونوں بچوں سے ملنے دیا گیا تھا۔ وہ سب پریشان تھے۔ ہم تینوں اندر خیمے میں جا بیٹھے اور میوخ نے ایک شاخ نما چابک ہاتھ میں تھام لیا اور چوبی پلیٹ فارم پر چڑھ کر خچر کی لگامیں تھام لیں۔

سرد جہنم میں ہمارا پُرخطر اور اندیشناک وسوسوں سے بھرا سفر شروع ہوا۔ میں نے اس پہاڑی نالے تک کی درست نشاندہی کردی تھی جدھر میری تراشیدہ فرضی کہانی کے مطابق بوموبر گا کا مجسمہ غرق آب ہوا تھا۔

خچر ہلکی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ میوخ یہاں کے راستوں کا دیدہ ور تھا۔ ہلکی برف باری بھی اب رک گئی تھی۔ سرد ہواؤں میں بھی کمی واقع ہونے لگی۔ موسم کچھ بہتر ہونے کی وجہ سے جیکی نے خیمے سے نکل کر باہر کی راہ لی اور وہ اس چوبی پلیٹ فارم پر میوخ کے برابر میں جا بیٹھا۔ کہیں کہیں ہلکی دھوپ کی چمک نظر آنے لگتی۔

اب میں اور نزڈی خیمے کے اندر تھے۔ نزڈی کبھی مجھے گھور گھور کر تکنے لگتا پھر اس نے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ ایک اور سگریٹ سلگا کر اس نے اندر سے ہی باہر جیکی کو بھی تھما دیا۔ میرے اندازے کے مطابق ہمیں مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں نصف سے پون گھنٹا یا اس سے بھی زیادہ کا وقت لگ سکتا تھا۔ رات بھر کبھی تیز، کبھی ہلکی برف باری ہوتی رہی تھی اور راستے ڈھک گئے تھے۔ سفر جاری رہا۔

میں نے اس ”چلت پھرت“ کے دوران اپنے ہاتھوں کی جکڑ بندوں پر دوبارہ اور اس بار ”آزادانہ“ زور آزمائی شروع کردی تھی کیونکہ خچر گاڑی میں اب ہلنے جلنے کے دوران مجھے زور آزمائی کا موقع مل رہا تھا۔ اگرچہ نزڈی نے مجھ پر بھی نگاہ رکھی ہوئی تھی لیکن وہ بہرحال جیکی کی طرح ہوشیار اور چوکنا کم ہی نظر آرہا تھا۔ وہ زیادہ تر تمباکو نوشی کیے جارہا تھا۔

ایک بار مجھے ذرا پھنسی ہوئی موٹی گرہ توڑنے یا کھولنے کے لیے کچھ زیادہ ہی زور لگانا پڑا تو میرے جسم کی مخصوص حرکت نے نزڈی کو شبہے میں مبتلا کردیا۔ وہ ایک دم میری طرف غور سے تکنے لگا۔ میں ڈر سا گیا۔ اگر یہ کمبخت شبہے میں پڑ جاتا تو مشکل پڑسکتی تھی۔ تب ہی اس کا دھیان بٹانے کے لیے میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔

”دوست! تم اکیلے ہی سگریٹ پیے جارہے ہو۔ کیا مجھے نہیں پوچھو گے؟“

میری بات پر اس کی توجہ بٹ گئی۔ زہرخند لہجے میں بولا۔ ”تم آرام سے نہیں بیٹھ سکتے اور یہ تم کیا کررہے ہو؟“

”کیا کررہا ہوں؟“ میں نے بھی احمق بن کر پوچھا۔

”تم کچھ زیادہ ہل جل کرنے کی کوشش کررہے ہو۔“

”مجھے پیشاب آرہا تھا۔ اسے روکنے کی کوشش کررہا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ اندر سے میں ڈرتا رہا۔ اگر اسے

شبہ ہو جاتا تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔

"ماسٹر!" اس نے ایک دم جیکی کو پکارا۔ میں اندر سے دہل گیا۔ جکڑ بند کھولنے کی کوشش میں نے فوراً ترک کر دی۔

"کیا بات ہے؟" خیمے کے باہر سے جیکی کی آواز ابھری۔

"یہ سگریٹ مانگ رہا ہے۔" نرڈی بولا تو بے اختیار میں نے سکون کی سانس لی۔

"دے دو بے شک۔" جیکی نے کہا۔ تب نرڈی نے ایک سگریٹ سلگا کر میرے ہونٹوں میں پھنسا دیا۔ میں سگریٹ دانتوں میں پکڑ کر جان بوجھ کر یوں گہرے گہرے کش لینے لگا جیسے جانے کب سے تمباکو کی طلب محسوس کر رہا تھا لیکن اس مردود نرڈی کا دھیان بٹانے کی یہ میری محض ایک ایکٹنگ تھی۔

اچانک ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں چونک پڑے۔ میں سمجھا شاید کہیں دھوپ نکلنے کے سبب برف کا کوئی تودہ لڑھکا ہو۔ دھماکے کی آواز سے کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہوا تھا۔ چھکڑا رک گیا۔ نرڈی نے باہر جھانک کر جیکی سے چلا کر پوچھا۔

"یہ دھماکے کی آواز کیسی تھی ماسٹر؟"

"مجھے دائیں جانب جنوبی سمت میں سیاہ دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا ہے۔" باہر میوخ کے برابر میں بیٹھے جیکی نے چلا کر کہا۔

"اوہ، کیا کوئی پلین کریش ہوا ہے؟" نرڈی نے کہا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

"بھاڑ میں ڈالو ماسٹر! یہاں یہ حادثے ہوتے ہی رہتے ہوں گے۔ آگے بڑھو۔" نرڈی نے بیزاری سے کہا۔

ذرا ہی دیر بعد چھکڑا دوبارہ چل پڑا لیکن پھر چند منٹوں بعد ہی میں نے جیکی کو اندر کودتے دیکھا۔ میں ہی نہیں، اس کا ساتھی نرڈی بھی اس کے یوں اچانک اندر خیمے میں کود پڑنے پر چونک پڑا۔ دیکھا، جیکی نے ٹرانسمیٹر ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور وہ کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے غور سے اس کے مکروہ چہرے کی طرف دیکھا جس پر گہرے تفکر اور الجھن کے آثار نمایاں تھے۔

باہر موسمی شور کے سبب شاید وہ اندر بات کرنے کے لیے آ گیا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ کوئی اہم کال تھی۔ وہ یا تو اپنے باس سے مخاطب تھا یا پھر لارا سے بلکہ ممکن تھا وہ لارا سے ہی مخاطب ہو کیونکہ باس ان کے بجائے لارا سے ہی بات کرتا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی وہ اس سے کر چکا تھا۔

میں اور نرڈی غور سے اس کی طرف تکتے رہے۔ جلد ہی عقدہ کھلا کہ لارا نے ہی اس سے رابطہ کیا تھا۔ میرے دل میں خدشہ ابھرا کہیں وہاں "میزبان گھر" میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔ ڈیوائس سے لارا کی بھی باریک سی آواز ابھر رہی تھی۔

"لل...... لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا لارا......؟ اوور۔"

"تھوڑی دیر پہلے مجھے باس نے ہی مطلع کیا تھا۔" لارا جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز لرز رہی تھی اور وہ حد درجہ متوحش اور بوکھلائی ہوئی تھی۔ "باس ابھی مجھے ہیلی کاپٹر میں ہونے والی کسی گڑبڑ کے بارے میں مطلع کر ہی رہا تھا کہ ایک دم رابطہ منقطع ہو گیا۔ جیکی! تم جس دھماکے کا ذکر کر رہے ہو وہ یقیناً باس کے کریش ہونے والے ہیلی کاپٹر کا ہی ہو سکتا ہے۔ تم فوراً اس طرف جاؤ اور مجھے مطلع کرو۔ میں یہاں سے جیڈ کو بھی اس طرف روانہ کر رہی ہوں...... اوور۔"

"اس کا اب کوئی فائدہ نہیں لارا ڈارلنگ!" جیکی بے پروا لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے پر اب الجھن آمیز پریشانی کی جگہ ایک خباثت نے لے لی تھی۔ "ایسے پُرخطر برفیلے پہاڑی مقام میں ہیلی کاپٹر کریش ہونے کے سبب پائلٹ بچا ہو گا نہ ہی باس...... اوور۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو جیکی؟" دوسری جانب سے لارا کی زخمی شیرنی جیسی غراہٹ ابھری۔ "البرٹ رمنڈو ہمارا باس ہی نہیں، محسن بھی ہے۔ بھول گئے تم اس نے ہمیں اٹلی میں اس وقت ڈیتھ چیئر کی سزا سے بچایا تھا جب ہم دونوں اپنی زندگیوں سے مایوس ہو چکے تھے۔ کیا تم واقعی اتنے ہی بے حس ہو گئے ہو۔ فوراً میرا حکم بجا لاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ اب مجھے بھی یہاں سب چھوڑ چھاڑ کر جیڈ کے ساتھ جائے حادثہ کی طرف روانہ ہونا پڑے گا...... اوور اینڈ آل۔"

جیکی نے ایک مکروہ قہقہہ خارج کیا اور اسی لہجے میں حقارت آمیزی سے جیسے خود کلامیہ بڑبڑایا۔

"ہونہہ، محسن...... سب اپنے اپنے مفادات کے لیے کرتے ہیں۔ ہم نے بھی تو باس کے لیے اب تک کم قربانیاں نہیں دیں۔ تم بھی اپنے مفاد کی سوچو لارا ڈارلنگ! باس کے بعد صحرائی عقاب ہمارا ہے۔ چلو تم صحرائی عقاب کی باگ سنبھال لینا۔ میں تو ویسے بھی تمہارا بے دام غلام ہوں...... اوور اینڈ آل۔" رابطہ منقطع کرنے کے بعد جیکی نے ایک شیطانی قہقہہ لگایا۔

"یہ کیا غضب ہو گیا ماسٹر! کیا یہ دھماکے کی آواز......" نرڈی بوکھلائے ہوئے لہجے میں جیکی کی طرف دیکھ کر بولا اور شاید عالم بدحواسی میں اپنی بات بھی پوری نہ کر سکا۔

"ہاں، یہ آواز شاید اسی ہیلی کاپٹر کی تھی۔" کہتے ہوئے جیکی نے اب پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔

یہ سب سن کر ایک طرف تو میرے اندر مسرتیں چھلکنے لگیں لیکن دوسری طرف پُراندیش خدشات کی ہولناکیاں بھی سر اٹھانے لگیں۔ اول تو یہ کہ انہیں اب اپنی پڑ چکی تھی مگر دوم، جیکی جیسے درندے کی بے حسی اور خباثت پر مجھے یہ خطرہ ہونے لگا کہ البرٹ رمنڈو کے اس کریش میں مرنے کے بعد اس کا مکروہ ذہن منطقی انداز میں جو کچھ سوچ سکتا تھا وہ مجھ سمیت شینا اور میرے مہربان میزبانوں کے لیے ہلاکت میں ڈالنے کے ہی مترادف ہوتا۔ اس صورتِ حال میں اب یہ اور بھی ضروری ہوگیا تھا کہ میں جلد سے جلد جیکی جیسے بھیڑیا صفت اور منہ زور درندے پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔

اچانک جیکی نے سب بھلا کر میری جانب خونخوار نظروں سے دیکھا۔ نہ جانے اس بدبخت کی نگاہ میں ایسا کیا تھا کہ یکبارگی تو میرا دل بھی زور سے دھڑکا۔ ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر ایک دو لحظے کے لیے جمی رہیں پھر اگلے ہی لمحے جیکی کے بدہیئت ہونٹوں پر بڑی بے رحم اور مکروہ مسکراہٹ ابھری۔

"تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا شیان! تم سب کی قبریں کھودنے کے لیے میں ابھی زندہ ہوں۔" یہ الفاظ اس مردار نے بڑے جمے ہوئے انداز میں کہے تھے۔ اس کا کہنا غلط بھی نہ تھا۔

"تم غلط سوچ رہے ہو۔ یہ تم لوگوں کا آپسی معاملہ ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ جیکی بدستور میری جانب غور سے تکے جارہا تھا۔ جانے اسے مجھ پر کس بات کا شبہ ہورہا تھا جس نے مجھے بھی بے چین کردیا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھے بغور تکتا رہا۔ یوں جیسے وہ میرا اندر پڑھنے کی کوشش کررہا ہو۔ اچانک وہ اٹھا اور اس نے مجھے پہلو کے بل بڑے زور کا دھکا دیا۔ میں ایک جانب تختے پر گرا۔ اس اچانک افتاد پر میں بوکھلا گیا۔ نہ جانے اس خبیث کو یکدم اب کون سا دورہ پڑا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میرا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ رذیل میرے جکڑ بند کو غور سے دیکھ رہا تھا پھر غراتے ہوئے اس نے اپنے حیران پریشان ساتھی نرڈی کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ وہ کراہتے ہوئے پیچھے کو سرک گیا۔

"مم...... ماسٹر! کیا ہوا؟" اس نے اپنا گال مسلتے ہوئے ہکلا کر جیکی سے کہا۔

"تمہیں میں نے اس کے پاس تمبا کو پینے کے لیے بٹھایا تھا؟" جیکی خونخوار لہجے میں اس سے بولا۔

"گگ...... کیا ہوا ماسٹر؟"

"تم نے اس پر نظر کیوں نہ رکھی۔ یہ دیکھو......" جیکی نے میرے ڈھیلے پڑے جکڑ بندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درشتی کے ساتھ اس سے کہا۔ "تمہاری ذرا سی غفلت کی وجہ سے یہ آفت کا پرکالا آزاد ہونے والا تھا۔ یہ مکار بڑی خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی کلائیاں مسل کر رسی کی گرہیں ڈھیلی کرنے کی کوشش کررہا تھا اور تم بڑے آرام سے سگریٹ پھونکے جارہے تھے۔"

نرڈی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرے قدرے ڈھیلے پڑے جکڑ بندوں کو تکے جارہا تھا پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس نے بھی غراتے ہوئے اپنی بھڑاس اور جیکی سے کھائے ہوئے تھپڑ کی خار مجھ پر نکالی اور ایک لات مجھے رسید کردی۔

"چھوڑو اب...... میری بات غور سے سنو۔" جیکی اس سے بولا۔ "سب سے پہلے اس کی رسی مضبوط کرو۔ ایک اور رسی مزید لو اور اسے اس کی دونوں ٹانگوں سے باندھ کر دوسرا سرا اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ گرہ لگادو۔"

نرڈی نے ایسا ہی کیا۔ اس دوران میں جیکی نے تحکمانہ درشتی سے میوخ کو چھکڑا ایک طرف موڑنے کا حکم دیا۔ اضافی رسی چھکڑے میں موجود تھی۔ میں بے بسی سے اپنے دانت پیس کر رہ گیا۔ جیکی کے ناپاک وجود میں جیسے کسی بدروح یا شیطان کی روح حلول کی ہوئی تھی۔ یا تو وہ غضب کا قیافہ شناس تھا کہ اپنی پاور آف آبزرویشن کے ذریعے فوری طور پر آنے والے خطرے کو بھانپ جاتا۔ ممکن تھا وہ کسی شیطانی قوت کا حامل بھی رہا ہو کیونکہ میں بھولا نہیں تھا جب اسے شینا پر شبہ ہوا تھا کہ مجسمے کے بارے میں وہ بھی بہت کچھ جانتی ہے۔

اگر ایسا تھا تو یہ مجھے رانگا لنگڑا کا دوسرا روپ ہی نظر آیا۔ سب باتوں سے قطع نظر جیکی کی سؤر جیسی چنی چنی آنکھوں میں کبھی کبھی ایک خاص چمک بھی میں نے محسوس کی تھی۔ ایسی چمک جو کسی خاص مواقع پر اچانک ہی ابھرتی۔ چھکڑے کا رخ یقیناً اسی جانب کردیا گیا تھا جدھر دھماکے کی آواز ابھری تھی۔

سفر ایک بار پھر شروع ہوا۔ نرڈی کو کچھ ہدایات دینے کے بعد جیکی دوبارہ باہر جاکر میوخ کے ساتھ جا بیٹھا۔ مجھے نرڈی نے اسی طرح رسن بستہ کردیا تھا جیسا کہ جیکی نے اسے تاکید کی تھی۔ میں بے بسی کے مارے اپنے دانت پیستا

رہا۔ معاملہ اور صورتِ حال مزید گمبھیر ہو چکی تھی۔ سفر جاری تھا مگر عارضی طور پر سہی، منزل بدل گئی تھی۔

کافی دیر بعد میرے نتھنوں سے گیس اور آئل کی بُو ٹکرانے لگی۔ خیمے کے سوراخوں سے میں نے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ دھوپ کی چمک اور سفیدی میں مجھے ملگجا پن محسوس ہوا۔ یہ سیاہ دھوئیں کے بادل تھے جو ان میں مدغم ہو رہے تھے۔

جیکی نے تیز آواز میں میوخ کو چھکڑا روکنے کا کہا۔ وہ رک گیا۔

"نرڈی! باہر اترو...... جلدی۔" جیکی چلّایا۔ نرڈی فوراً حرکت میں آیا اور چھکڑے سے اتر گیا۔ میں بھی باہر کا "تماشا" دیکھنے کا متمنی تھا۔ کیا وہ واقعی البرٹ رمنڈو کا ہیلی کاپٹر تھا اور ہم کیا اس کے تباہ حال ملبے کے قریب پہنچ چکے تھے؟

چھکڑے کے خیمے کے اندر تنہا ہوتے ہی میں نے ایک بار پھر اپنی سی تگ و دو شروع کر دی۔ اس بار کمبختوں نے مجھے باندھنے میں ذرا سی بھی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں بھی اپنے جسم کا پورا زور، پوری طاقت صرف کرنے میں لگا رہا۔ آزادی بھی۔ میری اس کوشش کو دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ وقت ضائع کیے بغیر میں اسی میں لگا رہا۔

اچانک ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں کوندا۔ میں نے ہولے سے میوخ کو آواز دی۔ جیکی اور نرڈی شاید بدحواسی یا پریشانی میں اسے وہیں چھوڑ گئے تھے۔

"میوخ...... میوخ......!" میں نے پھر دو تین بار پکارا تو اس نے ہوے سے سرگوشی میں جواب دیا۔

"خدا کے لیے خاموش رہو۔ انہوں نے مجھ پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ مجھے یہاں سے ہلنے سے بھی منع کر رکھا ہے۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ مجھے افسوس ہے دوست!"

میں دانت پیس کر رہ گیا لیکن ناامید ہونا تو میں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے یہ موقع مجھے دوبارہ نہیں ملے گا۔ میں نے دوبارہ کہا۔

"میوخ! اس طرح بزدل اور بے بس رہے تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ کوئی تیز آلہ یا چاقو وغیرہ اندر پھینک سکتے ہو تو کوشش ضرور کرو لیکن ذرا جلدی۔"

"تت...... تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" وہ خوف سے ہکلایا۔ اس کی بزدلی اور بے وقوفی پر میں اندر ہی اندر تاؤ کھا کر رہ گیا۔

"تمہارا سر کاٹوں گا۔ بے وقوف آدمی! اپنے ہاتھوں پیروں کی رسیاں کاٹنے کی کوشش کروں گا۔" میں جھلا کر بولا۔

"لل...... لیکن وہ مجھے ایسی ویسی حرکت کرتے دیکھ کر گولی مار دیں گے۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک برف زار سناٹے میں ایک دھماکے کی آواز ابھری۔ یہ گولی چلنے کی آواز تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں اس بے چارے میوخ کو گولی تو نہیں مار دی تھی ان رذیلوں نے؟ پہلا خدشہ یہی ابھرا۔ میں نے میوخ کو آواز دی۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔"

میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ "گولی کس نے چلائی تھی؟" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک اور فائر ہوا...... پھر تیسرا فائر۔ اس کے بعد باہر کسی کے زور سے بولنے اور چلّانے کی آوازیں ابھریں۔ میری بھویں پُرسوچ انداز میں سکڑ گئیں۔ یہ باہر کون سا خونی کھیل شروع ہو گیا تھا۔

دفعتاً کسی کے برف میں بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی ہمارے چھکڑے کے قریب آ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ خیمے کے اندر ہونے کی وجہ سے میں باہر دیکھنے سے قاصر تھا۔ مجھے پُرتشویش سی بے چینی نے آن گھیرا۔ میں بے بس تھا۔ ایسی حالت میں کسی بھی اچانک بگڑتی ہوئی خطرناک صورتِ حال کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

"میوخ! اسے سنبھالو...... اس کی مرہم پٹی کرو، جلدی...... خبردار کسی چالاکی کا سوچنا بھی نہیں ورنہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمہارے گھر کا رخ کروں گا اور بڑی بیدردی سے تمہارے بیوی بچوں کو جان سے مار ڈالوں گا، سمجھے......؟ میں آتا ہوں۔"

یہ جیکی تھا۔ اس کا ساتھی نرڈی شاید کسی نامعلوم حملے میں زخمی ہو چکا تھا۔ میں یہی اندازہ لگا سکا تھا۔ پھر اچانک خیمے کا پردہ ہٹا اور میوخ نے کراہتے ہوئے نرڈی کو اندر میرے قریب ڈال دیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھنے لگا۔ نرڈی کے دائیں پہلو سے خون جاری تھا۔ وہاں پر شاید گولی لگی تھی۔

وہ کراہتے ہوئے گہرے گہرے سانس بھی کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور ہاتھ برف کے ذرات سے لتھڑے ہوئے تھے۔ میوخ نے اسے لٹا دیا اور ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ اس کے بعد باہر کود گیا۔ میں نے اپنی سی کوشش جاری رکھی اور نرڈی کو آواز دی۔

"نرڈی! ہوا کیا تھا؟ کس نے تم لوگوں پر ہلّا بولا ہے اور تمہیں گولی کس نے ماری؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فقط ہانپتے اور کراہتے ہوئے مجھے دیکھا اور پھر اپنے پہلو کے زخم کو سہلانے لگا۔ چھکڑے میں عجیب قسم کی کھڑ بڑ ہونے لگی۔ میں چونکا۔ یہ آواز اس کے نیچے سے آرہی تھی۔ میں سمجھ گیا تختے کے نیچے کچھ اضافی سامان یا ٹول کی جگہ ہوتی ہے۔ شاید یہ میوخ تھا جو فرسٹ ایڈ کا باکس یا اسی قسم کی کوئی شے نکال رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد پھر ہر طرف گہرا سناٹا طاری ہوگیا۔ یوں لگا جیسے سب کو یا تو سانپ سونگھ گیا تھا یا پھر وہ آپس میں لڑتے مرتے ختم ہوگئے تھے۔

میوخ اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا کھال کا بنا تھیلا تھا۔ مجھے اس بے وقوف اور بزدل آدمی پر بری طرح طیش آرہا تھا۔ وہ نرڈی کی مرہم پٹی کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے ایک بار پھر نرڈی کی موجودگی کی بھی پروا کیے بغیر میوخ کو ڈپٹا۔

”یہ کیا بے وقوفی کررہے ہو میوخ! ہم پہلے سے زیادہ خطرے سے دوچار ہوسکتے ہیں۔ اسے چھوڑو اور میری رسیاں کھولو۔“

میوخ نے ڈری سہی نظروں سے نرڈی اور پھر میری طرف دیکھا۔ مجھے اس سے اس قدر تھڑدلی کی امید نہ تھی۔ نرڈی زخمی اور نیم بے ہوشی کے سے عالم میں ہونے کے باوجود میری بات پر غصے سے غرایا مگر کہہ کچھ نہ پایا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ مسلسل بے ہوشی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”میوخ! کیا سوچ رہے ہو؟“ میں نے پھر اسے کھد یڑا۔ وہ خیمے کے پردے سے باہر خوفزدہ سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس پر شاید ان لوگوں کا بالخصوص جیکی کا خوف بیٹھا ہوا تھا۔

دفعتاً تلے اوپر دو گولیاں چلیں۔ ایک گولی بدقسمتی سے شاید خچر کے کہیں لگی یا پھر قریب کہیں برف میں دھنس گئی تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے خچر چلایا، اچھلا اور پھر اس نے دوڑنا شروع کردیا۔ چھکڑے کو جھٹکا لگنے سے میں رسن بستہ حالت میں لڑھک کر نرڈی کے اوپر آرہا.... اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ نکل گئی۔ میوخ بھی لڑھک گیا۔

چھکڑا اندھا دھند دوڑا جارہا تھا۔ میں نرڈی سمیت الٹ پلٹ رہا تھا۔ بندھے ہوئے ہونے کے سبب میں خود کو اچھلنے، پٹخ کر گرنے اور ادھر ادھر لڑھکنے سے نہیں بچا پا رہا تھا جبکہ زخمی اور نیم بے ہوش نرڈی کی حالت مجھ سے بھی زیادہ قابلِ رحم تھی۔

ان طوفانی جھٹکوں کے سبب وہ بالکل بے ہوش ہوچکا تھا۔ کسی لاش کے مانند ادھر سے اُدھر لڑھکے جارہا تھا۔ اس کے زخمی پہلو سے خون بہہ بہہ کر چھکڑے کے چوبی فرش کو رنگین اور اس پر بچھی پیال گدلی ہوئی جارہی تھی۔ میوخ کا حال بھی میری ہی طرح تھا لیکن وہ سنبھالا لینے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرف کو کھسکنے لگا جدھر خچر ہنکانے والا چوبی پلیٹ فارم تھا۔ وہ جا کر بدمست خچر کو قابو کرنے کی کوشش میں تھا۔

بڑی عجیب اور لاینحل سی صورتِ حال تھی۔ چھکڑا الٹ بھی سکتا تھا یا پھر کسی گہرے کھڈ میں جا گرتا۔ جب تک میوخ سنبھالا لے کر اٹھا، اسی وقت چھکڑے کو جیسے ایک طوفانی جھٹکا لگا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کوئی دو تین فٹ سے بھی زیادہ اچھلا ہوگا اور پھر دوبارہ برفیلی زمین پر پڑا تھا تو اس کے بخیے ہی ادھڑ کر رہ گئے۔ میں نے میوخ کی چیخ سنی۔ خود میں بھی چلّا اٹھا۔ میرا سر زور سے ایک چوبی ڈنڈے سے ٹکرایا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

آنکھ کھلنے پر پہلا احساس کاٹ دار سردی کا ہوا۔ اس کے بعد حواس اور بحال ہوئے تو درد کا احساس شدید ہوگیا۔ ایک درد کی شدید ٹیس اس قدر ابھری کہ میرے وجود کو تڑپا کر رکھ دیا۔ میں نے اس گہری چوٹ کو سہلانے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گیا۔ میں ہلنے جلنے سے ہی قاصر تھا۔ سہلانے سے قاصر ہونے کے سبب درد شدید محسوس ہوا۔

میں نے تکلیف کی شدت کو پی لیا اور سر کو دو تین بار جھٹکے دیے۔ عقدہ کھلا کہ سر پر ہی گہری چوٹ تھی کیونکہ اسے ہلانے کے سبب درد دوگنا محسوس ہوا۔ اس قدر کہ میرے منہ سے مارے اذیت کے چیخ ہی نکل گئی۔ سر پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے چھٹتی ہوئی تاریکی کی چادر دوبارہ تن گئی۔ دماغ ایک بار پھر ماؤف ہونے لگا۔

میں اپنے اندر بہت کمزوری اور نقاہت محسوس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ مجھ پر نیم بے ہوشی طاری ہوگئی۔ حواس پھر معطل ہونے لگے لیکن میں نے قوتِ ارادی کے بل پر خود کو بیداری کے عالم میں رکھا اور سر کو اس بار تھوڑا تھوڑا جنبش دی۔ شکر رہا کہ میں دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہونے لگا۔

دن کا اجالا ہنوز طاری تھا۔ ہم کسی برف کے گڑھے میں گرے تھے لیکن نہیں، صرف میں تھا۔ مجھے یاد آیا میرے ہمراہ چھکڑے میں میوخ اور نرڈی بھی تھے۔ نرڈی کی حالت تو غیر تھی لیکن وہ دونوں ہی نظر نہیں آئے۔

گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن افسوس کہ میں رسن بستہ حالت میں تھا۔ ہل جل نہیں سکتا تھا اور چلنا بس میں نہیں رہا۔

میں نے حرکت کی۔ سردی شدید تھی۔ مجھے ڈر ہوا کہ اگر اسی طرح ساکت بیٹھا رہا تو جم ہی نہ جاؤں اور فراسٹ بائٹ کا شکار ہو جاؤں۔ برف اور ٹھنڈ ہونے کے باعث میرے وجود کا کوئی حصہ فروزن کی زد میں آسکتا تھا اسی لیے بندھے ہوئے ہونے کے باوجود میں اپنے جسم کو جس قدر حرکت میں رکھ سکتا تھا، کرتا رہا۔ منہ خشک ہو رہا تھا۔ گڑھے کا جائزہ لیا۔ جیسا کہ مذکور ہوا وہ زیادہ گہرا نہ تھا۔

برفانی کھڈ کی دیواریں تین طرف سے بالکل عمودی اور چوتھی سمت اس کی ڈھلوانی تھی۔ بلکہ وہ سمت ایک راستے کی شکل میں تھی۔ سر کا زخم جم چکا تھا اسی لیے خون رسنا از خود ہی بند ہو گیا تھا۔ میں اس وقت ہمت اور قوتِ ارادی کے ہی بل بوتے پر تھا۔ اس کے بعد میں نہیں رکا اور اپنے رسن بستہ وجود کو گھسیٹتا ہوا اسی چوتھی سمت کی ڈھلوانی طرف بڑھتا رہا۔

ڈھلوان سے اوپر کا سفر بہت کٹھن اور سست رو رہا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر نصف سے زیادہ سفر طے کر لیا۔ مجھے لگا جیسے میرے ناتواں اور نقاہت کے مارے وجود کی کھوئی ہوئی طاقت ایک دم سے بیدار ہونے لگی ہو۔ مجھے حیرت تو ہوئی لیکن ایک بات یاد کر کے میں بے اختیار مسکرا دیا۔ شاید یہ بھاگی بوٹی کا اثر تھا یا پھر میری غیر معمولی قوتِ ارادی اور خود اعتمادی اس کی وجہ رہی ہو۔ بہر کیف، کچھ بھی تھا، میں ذراستانے کے بعد دوبارہ اوپر کھسکتا اور گھسٹتا رہا۔

جسمانی قوت بحال ہوتے ہی میں نے پھر اپنی سی کوشش جاری رکھی اور آخر گڑھے سے باہر آ گیا۔ سامنے نظر پڑی تو چونک گیا۔ ٹوٹا پھوٹا چھکڑا الٹا پڑا برف میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کا جڑا خچر سمیت غائب تھا۔ قریب ہی مجھے ایک انسانی وجود بھی آڑا ترچھا پڑا دکھائی دیا۔ میں اس طرف گھسٹتا ہوا بڑھا تو پہچان گیا۔ یہ نرڈی تھا۔

اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں جس کی پتلیوں پر گرے برف کے ذرات سے اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے کب کی پرواز کر چکی تھی۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور اس کا جائزہ لینے کے دوران اچانک میرے اندر مسرت چمکی۔ اس کی دائیں ٹانگ کی پنڈلی سے مجھے قرولی اڑسی ہوئی نظر آ گئی جو نیام سے نکل کر دستے تک برف میں جا لگی تھی۔ ایسی ایک قرولی میں پہلے بھی جیکی اور جیڈ کے پاس دیکھ چکا تھا۔

میں نے اپنے وجود کے رسیوں سے بندھے ہوئے حصے کو اس کی طرف موڑا اور پیہم کوشش کے دوران قرولی کے خم دار نکیلے پھل پر وہ رگڑنے لگا۔ میری ہمت اور کوشش بار آور ثابت ہوئی اور میں اپنے جسم کو جکڑ بندوں سے آزاد کر چکا تھا۔

آزاد ہوتے ہی میں خود کو ایسا محسوس کرنے لگا جیسے کوئی بھوکا شیر پنجرے سے آزاد کر دیا گیا ہو۔ میں اپنے سر کی چوٹ کو بھی بھول گیا تھا۔ میں نے نرڈی کی لاش کی جلدی جلدی تلاشی لی مگر ماسوائے قرولی کے میرے ہاتھ کوئی ہتھیار نہ لگا۔ میں نے ادھر ادھر گھوم کر میوح کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ تاہم مجھے وہ مقام یہاں سے زیادہ دور نہیں لگا جدھر سے خچر بدک کر چھکڑے سمیت اندھا دھند بھاگا تھا۔

اچانک میں چونک پڑا۔ مجھے کسی کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھے آپس میں تیز اور ہانپتے ہوئے انداز میں باتیں کرتے ہوئے اسی طرف چلے آ رہے تھے۔ یہاں کچھ درخت اور روئیدگی تھی۔ اگرچہ وہ بھی برف تلے ڈھکی ہوئی تھی مگر مجھے ان کی آڑ میسر آ گئی اور میں تیزی سے دوڑ کر وہاں جا دبکا۔ اوٹ سے جھانکا تو یکلخت میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ جیڈ اور لارا تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ لارا نے رائفل تھام رکھی تھی اور جیڈ کے دائیں ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا۔

''مادام! وہ رہا چھکڑا...... وہ لوگ ضرور ادھر ہی کہیں ہوں گے۔''

اس کا مطلب تھا کہ لارا ابھی جیڈ کے ساتھ اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں البرٹ رمنڈو کا ہیلی کاپٹر کریش ہوا تھا لیکن جیکی کہاں تھا؟ کریش والی جگہ پر جو فائرنگ کی آواز ابھری تھی، وہ کیسی تھی؟ حملہ آور کون تھے؟ ایسے کئی سوال میرے ذہن میں ابھرے۔ تاہم پیش آمدہ حالات کے تناظر میں مجھے اس کا ایک ہی جواب سوجھا کہ بدفطرت جیکی نے موقع تاک کر اپنے ہی باس اور پائلٹ پر گولیاں چلا دی ہوں گی تاکہ رہی سہی کسر پوری کر دے اور پھر صحرائی عقاب کا خود باس بن جائے۔ جیسا کہ اس نے لاسلکی رابطے کے دوران لارا سے کہا تھا مگر لارا کو اس کی بات ناگوار گزری تھی۔

بہر کیف، اب یہ لوگ مجھے تلاشتے ہوئے یہاں آن پہنچے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جی تو کیا کہ اسی وقت انہیں واصلِ جہنم کر ڈالوں لیکن اپنی خواہش پر میں نے قابو پائے رکھا۔ یہ دونوں اسی طرف کو پلٹ پڑے تھے۔ میں بھی برفانی ٹیلوں، برف پوش جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا اسی طرف کو پلٹا۔

''اوہ مائی گاڈ! نرڈی بے چارہ تو ختم ہو گیا۔'' لارا کی آواز گونجی جس میں گہرا تاسف تھا۔ میں نے دیکھا جیڈ کا چہرہ

ست کر رہ گیا پھر اس کی لاش کا جائزہ لیتے ہوئے لارا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مادام! یہ چھکڑا الٹنے سے ہلاک نہیں ہوا ہے، اسے گولی لگی ہے۔''

''کیا؟'' لارا حیرت سے بولی۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اوہ...... شاید شیان (میں نے) اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہوگا اور خود موقعے سے فائدہ اٹھا کر بھاگ اٹھا۔''

''نہیں مادام! ایسا نہیں ہے۔'' جیڈ اِدھر اُدھر عقابی نظروں سے برف پر بنے نشانات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''ماسٹر جیکی ہم سے پہلے حادثے والی جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ ہوسکتا ہے ابھی پائلٹ اور باس زندہ حالت میں ہوں لہٰذا ماسٹر نے انہیں زندہ پا کر موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ کر دیا جو ناکامی سے دوچار ہوا ہوگا۔ باس بھی تو کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ اسے فوراً ماسٹر کی بدنیتی کا اندازہ ہوگیا ہوگا اور وہ بھی جوابی مقابلے پر اتر آیا ہوگا۔''

''کیا بے پر کی ہانک رہے ہو تم جیڈ!'' لارا نے جھلا کر کہا۔ ''تم تو ایسے یقین سے کہہ رہے ہو جیسے یہ سب تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔''

''آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر یہ نشانات اور حالات سب بتا رہے ہیں۔'' جیڈ کے لہجے میں عجیب سا یقین تھا۔ میں بھی اس کی عقل سلیم پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ میرا اپنا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ جیسا جیڈ بتا رہا تھا ویسا ہی ہوا ہوگا۔

''ماسٹر کی جائے حادثہ پر غیر موجودگی اور صرف پائلٹ کی لاش کا ملنا جس کی پیشانی پر گولی کا بھی نشان تھا۔ تو اسے گولی مارنے والا باس ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ماسٹر (جیکی) نے ہی ایسا کیا تھا لیکن خوش قسمتی سے البرٹ رمنڈو بچ کر بھاگ نکلا اور جیکی ضرور البرٹ رمنڈو کو ہلاک کرنے اس کے تعاقب میں گیا ہوگا۔''

''اوہ مائی گاڈ! تم کس قدر درست کہہ رہے ہو۔ میں اب تمہاری بات کو نہیں جھٹلا سکتی۔ مجھے بھی اب ایسا ہی سوچنا پڑ رہا ہے۔'' لارا جیسے ایک دم لرز کر بولی۔ ''لیکن پھر یہاں یہ چھکڑا؟ نرڈی کی لاش اور...... اور شیان کی غیر موجودگی کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے مادام!'' جیڈ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''فائرنگ کے دوران خچر بدک کر اندھا دھند بھاگ اٹھا ہوگا۔ زخمی نرڈی بھی اندر موجود تھا۔ شیان تو پہلے ہی بندھا ہوا ہوگا۔ اب چونکہ بدمست خچر کو قابو کرنے والا کوئی نہ ہوگا اسی لیے خچر اس مقام پر آکر الٹ گیا۔ یہ دیکھو، نرڈی کی پنڈلی والی نیام خالی ہے اور اس کی قرولی غائب ہے۔ شیان نے اس قرولی سے اپنی رسیاں کاٹ ڈالی ہوں گی اور اب وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔'' کہتے ہوئے جیڈ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دیکھو مادام! برف پر اس کے قدموں کے نشانات کہاں جا رہے ہیں۔''

لارا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرف دیکھنے لگی اور ادھر میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔ جیڈ غضب کا زود فہم ثابت ہوا۔ میں نے ان سے بھڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور چھپتا چھپاتا میوخ کے گھر کے راستے پر چل دیا۔

ان لوگوں کی آپس میں ٹھن گئی تھی اور مجھے ان سے کوئی لینا دینا نہیں تھا لیکن لارا وغیرہ کا پلڑا بھاری تھا۔ باس البرٹ رمنڈو مفرور تھا۔ جیکی اس کے تعاقب میں نہ جانے کہاں در بدر تھا۔ ممکن تھا وہ البرٹ رمنڈو کو جلد ہلاک کر کے میرے پیچھے پڑ جاتا۔

بہر حال مجھے شینا کی فکر تھی۔ میں اسے لے کر اپنی منزل کی جانب نکلنے کی فکر میں تھا۔ سوچتا رہا۔ شکر تھا کہ موسم خوشگوار تھا لیکن سردی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ برف باری ہوسکتی تھی۔ ابھی تو کھلے نیلے آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے سفید ٹکڑے راج ہنسوں کی طرح تیرتے نظر آئے۔

میں میوخ کے بارے میں سوچتا جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ غریب کہاں چلا گیا تھا لیکن نہیں، اس نے بھی موقع تاک کر اپنے ہی گھر کی راہ لی ہوگی کیونکہ اسے اپنے بیوی بچوں کی فکر تھی۔ میری وجہ سے یہ بے چارے بھی ان خطرناک کرمنلز کے چنگل میں جا پھنسے تھے اور میرا ان کی مدد کرنا فرض تھا۔

اچانک گولی چلی، میں برف پر گر گیا۔ ایسا میں نے غیر ارادی دفاع کے طور پر کیا تھا۔ گولی واقعی مجھ پر ہی چلائی گئی تھی۔ میں شاید انہیں نظر آ گیا تھا کیونکہ گولی میرے دائیں جانب بہ مشکل دو فٹ کے فاصلے پر برف میں دھنسی تھی اور یہ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

دوسرا فائر ہوا تو گولی میرے چہرے سے محض چند انچ کے فاصلے پر پیوست ہوئی اور اڑنے والی برف کے ذرات میرے چہرے سے ٹکرائے۔ میں نے وہیں سے پلٹنی کھا کر جگہ بدل لی اور راہ بدل کر برف سے ڈھکی جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے تیزی کے ساتھ پیٹ اور سینے کے بل رینگتا ہوا برف کے ایک نسبتاً بلند ٹیلے کی آڑ میں چلا گیا۔

اسی وقت مجھے جیڈ کی للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شیان! ہم نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سامنے آجاؤ ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دیے جاؤ گے۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اب ان سے مقابلہ ناگزیر ہو چکا تھا۔ مفر کی راہ بھی نہ رہی تھی۔ وہ اسلحہ بدست تھے اور میرے پاس فقط قرولی تھی لیکن میرا حوصلہ اور عزم ہی میرا اصل ہتھیار تھا۔ تب ہی میرے ہونٹوں پر ازخود زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔ یہ مسکراہٹ تب ہی میرے چہرے پر ابھرتی تھی جب میں جنگ کے لیے پوری طرح موڈ میں آجاتا۔

میں نے تاک کر ایک اوٹ لی اور مطلوبہ سمت کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً برف پر میرے گھسٹنے کے نشان دیکھ چکے تھے۔ دونوں مجھے صاف دکھائی دیے۔ لارا اور جیڈ ساتھ ساتھ ہتھیار سنبھالے بڑے محتاط انداز میں اسی ٹیلے کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے جس کی آڑ میں نے لے رکھی تھی۔

اس بار لارا کی بھی للکار سنائی دی۔ ”شیان! ہمیں معلوم ہے تم خالی ہاتھ ہو۔ بہتر یہی ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کردو تاکہ ہمارے درمیان مجسمے والی ڈیل مکمل ہوجائے۔ ہم بلاوجہ کسی کی جان نہیں لیتے۔“

وہ قریب آنے لگے۔ میں کسی برفانی چیتے کی طرح سینہ برف سے لگائے ایک دائرے میں حرکت کرتے ہوئے ان کے نزدیک جا پہنچا۔

”تم اگر نہیں آؤ گے تو پھر تمہاری ساتھی اور وہ تمہارے محسن میزبان بھی زندہ نہیں بچ پائیں گے۔“ جیڈ نے اپنے خبیث ماسٹر جیکی کی طرح مجھے بلیک میل کرنا چاہا۔

میں دوبارہ مسکرایا لیکن اس بار میری مسکراہٹ میں منتقمانہ پن تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان کی طرف دیکھا اور قرولی فضا میں لہرا کر ایک مخصوص ٹرک کے ساتھ جیڈ کی طرف اچھال دی۔ قرولی فضا میں لہراتی چکراتی ہوئی جیڈ کے دائیں شانے میں پیوست ہوگئی۔ وہ ایک کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ برف پر گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

لارا بری طرح بدکی اور وحشیانہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسے قرولی کی سمت کا اندازہ نہ ہوسکا تو اس نے اندھادھند چاروں طرف فائر کھول دیا۔ میں دوبارہ ٹیلے کی آڑ میں ہوگیا۔ ان کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہوئے میں نے بڑے محتاط انداز میں وہاں سے بھی اپنی جگہ بدل لی۔ اب میں ٹیلے کی مشرقی سمت سے سر ابھار کر ان کی جانب تکنے لگا۔

جیڈ برف پر پڑا بری طرح کراہ رہا تھا۔ لارا زخمی ناگن کی طرح بپھری ہوئی جیسے پھنکاریں مار رہی تھی اور فائرنگ بند کرکے پرطیش آواز میں چلائی۔

”شیان! تم بڑی بھیانک غلطی کررہے ہو۔ میں جانتی ہوں تمہارے پاس بھی ایک ہتھیار تھا۔ اب کیا تم اپنی موت کا انتظار کرو گے؟“ آخری جملہ اس نے بڑے مکارانہ طنز سے ادا کیا۔ میں کچھ نہیں بولا۔ ان کی بے چینی اور بے بسی سے حظ اٹھاتا بغور انہیں تکتا رہا۔

لارا فائرنگ اور مجھے للکارنا بند کرکے جیڈ کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے دائیں شانے سے قرولی نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہی وہ وقت تھا جب یخ بستہ برف کے اس صحرا میں ایک خوفناک گڑگڑاہٹ گونجی۔ میں نے چونک کر عقب میں دیکھا۔ ذرا فاصلے پر ایک برف کی چٹان سے بڑا سا برف کا تودہ کھسکنے لگا تھا۔ اس کی ڈھلان سے برف کے ٹکڑے لڑھکتے نیچے آرہے تھے پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑا حصہ چٹان سے الگ ہوا اور تیزی سے نیچے گرنے لگا۔

لارا نے بھی یہ خوفناک منظر دیکھ لیا تھا۔ میں نے دوڑ لگادی۔ اس طرح کہ لارا اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر مجھے گولی کا نشانہ بنانے کی کوشش نہ کرسکے لیکن برف کے اس دیوہیکل سرکتے ہوئے تودے کو دیکھ کر وہ بھی دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ وہ بھی دوڑی تو برف پر زخمی پڑے جیڈ نے چلا کر اس سے فریاد کرڈالی۔

”مادام...... ! مم...... مجھے اس طرح چھوڑ کر مت جاؤ۔ خدا کے لیے...... مادام...... لارا......“ وہ چیخنے لگا۔ ساتھ ہی لیٹے لیٹے گردن موڑ کر اپنی جانب تیزی سے آتے برف کے دیوہیکل تودے کو بھی پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا جاتا۔

لارا اس قدر دہشت زدہ ہوچکی تھی کہ اسے رائفل اٹھانا بھی بار لگا کہ اس کے دوڑ لگانے کی رفتار میں کمی نہ آجائے۔ لہٰذا وہ اس نے وہیں پھینک دی تھی اور جیڈ کی بھی اسے کوئی پروا نہ رہی۔ اس وقت جیسے قیامت کا منظر تھا۔ کسی کو کسی کی فکر نہ تھی۔ ہر کوئی اپنی اپنی جان بچانے کی تگ ودو میں تھا۔

میں بھی دوڑے جارہا تھا۔ ظاہر ہے میرے پاس بھاگی بوٹی کی کرامت یا طاقت تھی۔ شکر تھا کہ برف گہری نہیں تھی۔ اگرچہ دوڑنے میں بھی کمی ضرور واقع ہوئی لیکن کسی عام آدمی کے مقابلے میں پھر بھی میری رفتار کئی گنا زیادہ ہی تھی۔

یوں میں جیسے گھوڑے کی رفتار سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لارا کے عقب سے آگے نکل گیا۔ اسے بھی یقیناً حیرت ہوئی ہوگی۔ جلد ہی مجھے اپنے پیچھے لارا کی آخری دلدوز چیخ سنائی دی۔ میں چاہتا تو لارا کو اپنے کاندھے پر سوار کرکے گرتے ہوئے تودے کی زد سے بچا سکتا تھا مگر یہ لوگ اس رحم کے ہرگز مستحق نہ تھے جو اپنے ذرا سے مفاد کی

خاطر معصوم اور بے گناہ انسانی جانوں تک سے کھیلنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اگرچہ مجھے لارا جیسی حسین لڑکی کے اس عبرتناک انجام پر افسوس ہوا مگر میں مجبور تھا۔

میرے پیروں تلے زمین بری طرح لرز رہی تھی اور وہیں میرا ایک پاؤں بھی بدقسمتی سے رپٹا اور میں گر پڑا۔ تو وہ پہاڑی سے سرک کر نیچے آچکا تھا اور اب اس کا ''پھیلاؤ'' جاری تھا۔ شدت کم تھی۔ تیزی میں بھی کمی آچکی تھی مگر اس سے جو برف کا طوفان سا بلند ہوا تھا، وہ میرے تعاقب میں رہا۔ میں اٹھ کر پھر دوڑ پڑا۔ یہاں ایک بار پھر بدقسمتی نے میرے پاؤں پکڑ لیے کیونکہ اس مقام پر برف خاصی گہری تھی۔ میری رفتار کم ہوگئی اور اگلے ہی لمحے مجھے لگا جیسے عقب سے میرے اوپر برف کی چادر آن پڑی ہو۔

میں پھر گر پڑا۔ گڑگڑاہٹ معدوم ہو چکی تھی۔ برف کی جیسے ایک پوری دیوار میں نے خود پر گرتے محسوس کی مگر میں نے اپنے حواس مختل ہونے نہیں دیے۔ برف میں دبنے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے گھور تاریکی چھا گئی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ سناٹے میری سماعتوں میں گونجتے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے ہمت نہ ہاری۔ اگر میں ہاتھ پیر چھوڑ دیتا تو جیڈ اور لارا کی طرح اس سرد جہنم میں میری بھی قبر بن جاتی۔

☆☆☆

میں مسلسل حرکت پذیر رہا۔ یہاں تک کہ برف کی قبر سی توڑ کر باہر نکل آیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اب ہر طرف خاموشی اور گہرا سکوت طاری تھا۔ یوں جیسے ایک آنے والے طوفان اور ایک آکر چلی جانے والی قیامت۔

میں نے اپنے بچ جانے پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ جیڈ اور لارا اس قیامت خیز برف کے طوفان میں دھنس کر جہنم واصل ہو چکے تھے۔ میں نے اٹھ کر سفر شروع کر دیا۔ میرا رخ میوخ کے گھر کی طرف تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ اس نے یہاں سے بھاگ کر سیدھا وہیں کا رخ کیا ہوگا جو ایک منطقی سی بات تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جیکی اور البرٹ رمنڈو کہاں پائے جاتے؟

میں نے حواس بحال کیے اور گھر کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ آسمان پر تیرتے ہوئے برف جیسے بادلوں کے ٹکڑے اب گہرے اور ملنے لگے تھے جس کے سبب سہ پہر میں ہی شام کا گمان ہونے لگا تھا۔ سرد اور کاٹ دار ہواؤں میں بھی تیزی آنے لگی تھی۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ یا تو برف باری ہوتی یا پھر کوئی طوفان۔ میں نے دوڑنے کی رفتار بڑھا دی لیکن برف کہیں کہیں گہری ہونے کے سبب رفتار میں کمی آجاتی لیکن میں

رکا نہیں، دوڑتا ہی رہا یہاں تک کہ ایک ٹیلے کی اوٹ سے مکان کی ڈھلوانی چھت مجھے دکھائی دے گئی۔

میں تھوڑا استانے اور مکان کے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے لیے رکا۔ یہ خدشہ اپنی جگہ موجود تھا کہ جیکی وہاں موجود ہوسکتا ہے۔ اگرچہ اس کی وہاں موجودگی کے امکانات کم ہی تھے۔ مکان کے باہر سناٹا تھا۔ یہ دیکھ کر میں چونکا ضرور کہ وہاں چھجے تلے خچر موجود تھا۔ پہلے تو مجھے حیرت ہوئی پھر میں بے اختیار خود ہی مسکرا دیا۔

خچر یقیناً میرے میزبانوں کا پالتو اور مانوس تھا۔ وہاں سے بھاگ کر اس نے ادھر کا ہی رخ کیا تھا۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آیا وہ تھڑدلا میرا میزبان میوخ بھی اسی طرح یہاں لوٹا تھا یا نہیں۔

کھڑکی سے ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ابھی سہ پہر کا اجالا شام کے اندھیاروں کی زد میں دھیرے دھیرے آنے لگا تھا۔ میں تھوڑا اور قریب گیا۔ میرا انداز محتاط تھا۔ میں اندھا دھند اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ کیا خبر اندر جیکی یا البرٹ رمنڈو موت بنے میرے منتظر ہوتے۔ اگرچہ جیکی اور البرٹ رمنڈو کی آپس میں زبردست قسم کی ٹھن چکی تھی۔ کیا خبر ان دونوں دشمنوں میں سے کون پہلے کسے پچھاڑ کر یہاں آپہنچا ہو۔ یوں تو البرٹ رمنڈو کو اس مکان کا علم نہیں ہوسکتا تھا البتہ لارا نے اسے اپنے لاسلکی رابطے کے دوران بتایا ہوتو الگ بات تھی۔

بہرکیف، جیڈ، نرڈی اور لارا کے فنا کے گھاٹ اتر جانے کے باوصف بھی مجھے جیکی اور البرٹ رمنڈو سے خطرہ تھا لہٰذا میں مکان کے دروازے والی سمت کے بجائے اس کے عقبی حصے کی جانب سے آگے بڑھنے لگا۔

اس طرف برف سے ڈھکی جھاڑیوں اور گھنے درختوں کی بہتات پائی جاتی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھتا رہا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں کوئی آہٹ سنائی دی پھر اس سے پہلے کہ میں پلٹ کر دیکھتا، ایک سلاخ سی کسی نے عقب سے میری پشت سے لگا دی اور دوسرے ہی لمحے سانپ کی طرح پھنکاری آواز ابھری۔

''خبردار! اپنی جگہ اسی طرح جمے کھڑے رہو ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دیے جاؤ گے۔''

آواز پر میں چونکا۔ وہ میری شناسا تو نہیں تھی لیکن وہ آواز کسی عورت کی تھی۔ کسی جواں سال عورت کی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں تو البرٹ یا جیکی جیسے کسی مرد دشمن سے مڈبھیڑ کی توقع کیے ہوئے تھا۔ یہ نئی عورت کون تھی جو میری راہ کھوٹی کرنے آگئی تھی؟

اس نے جلدی جلدی میرے لباس کی تلاشی لی۔ اس کے لمبے بالوں کی جھلک کو میں نے بہرحال لہراتے دیکھا تھا۔ میں اس پر بہ آسانی قابو پا سکتا تھا مگر کسی مصلحت کے تحت ایسا نہیں کیا۔ نہ جانے کون تھی یہ عورت۔ ان کی ساتھی یا پھر کوئی اور...... پھر یہاں کیا کر رہی تھی یہ؟

''میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ کیا تم اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گی...... کون ہو تم؟'' میں نے پنچی آواز میں اس سے کہا۔

''اپنی زبان بند رکھو اور آہستہ آہستہ میری جانب گھومو۔'' اس نے دوسرا حکم صادر کیا۔ وہ اب مجھ سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مجھے خود بھی اسے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ دیکھا تو چونک پڑا۔ وہ ایک تیکھے اور خوبصورت نقوش کی حامل واقعی ایک جواں سال لڑکی تھی۔ لارا سے کم عمر لیکن انداز واطوار سے نہایت ہی تیز طرار معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ہلکے براؤن بال خاصے گھنے تھے اور ایک ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ رنگت سرخ وسپید تھی۔ اس امتزاج نے اسے لطافت آمیز حسن عطا کیا تھا۔ لارا کی طرح اس کے چہرے پر سختی تھی اور نہ ہی مردوں جیسا سپاٹ پن بلکہ اس کی جگہ لطافت اور نزاکت ہی نظر آتی تھی۔ قد لمبا تھا اور آنکھیں کشادہ براؤن۔ وہ بھی غیر ملکی لگی۔ اس نے چست گرم لباس یعنی جینز کی پینٹ پر سمور کی جیکٹ اور سر پر اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں میں موٹے گرم دستانے، پیروں میں لانگ بوٹ جو برف سے اٹے ہوئے تھے بلکہ وہ ساری ہی برف سے اٹی ہوئی تھی۔

''میں نے پوچھا ہے تم ہو کون اور اس مکان کی جانب یوں چوروں کی طرح کیوں بڑھے جا رہے تھے؟'' اس نے دوبارہ درشتی سے کہا۔ اس کی آواز کی تہ میں وہی نرماہٹ تھی جو اس جیسی پُرکشش اور کم عمر لڑکی کا خاصہ ہوتی ہے۔

میں ہولے سے مسکرایا۔ ''دیر ہو گئی تھی مجھے لوٹنے میں۔ بیوی بچے جاگ نہ جائیں اسی لیے خاموشی سے اپنے گھر میں داخل ہونا چاہتا تھا۔'' میں نے اس سر بہ سر اجنبی مگر اسلحہ بدست حسینہ کو بلف کرنا چاہا۔ ابھی اس کی اصل حقیقت سامنے نہیں آئی تھی۔

''اپنے گھر......؟'' وہ ہولے سے الجھے پن سے بڑبڑائی۔

''کیوں محترمہ! اپنے گھر میں داخل ہونا جرم ہے؟'' میں نے دانستہ مسکرا کر کہا۔

''کیا یہ گھر تمہارا ہے؟'' اس نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات تلے پوچھا۔ ایک الجھن آمیز حیرت میں تو میں خود بھی مبتلا تھا کہ یہ اس نازک اور سنگین وقت میں کون سی بلا اچانک میرے سامنے آ گئی تھی۔

''یقیناً میرا ہی گھر ہے لیکن تم اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔ اس کی بات پر میں اندر سے چونکا ضرور تھا کہ آخر اسے کیوں پریشانی ہو رہی تھی۔ کیا اسے معلوم تھا کہ میرے معصوم اور غریب میزبان اس وقت مجھ سمیت کس بھیانک خطرے سے دوچار تھے؟

''تم کب سے اپنے گھر سے باہر رہے ہو؟'' اس نے میرا دل دھڑکا دینے والا ایک اور سوال کیا۔ مجھے اپنے اندر سنسنی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ آخر ایسے سوالات کیوں کر رہی تھی۔ اسے اس مکان سے آخر کیا لینا دینا تھا؟ تب ہی کسی خیال سے میں چونکا۔ اس بار محتاط ہو کر جواب دیا۔

''دو روز تو ہو گئے ہیں۔ دراصل میرا کام ہی ایسا ہے۔ قریب قصبے میں مزدوری کرتا ہوں۔ کام زیادہ تھا، گھر نہ لوٹ سکا۔ ایسا اکثر میرے ساتھ ہو جاتا ہے تو میری بیوی ناراض ہو جاتی ہے۔''

وہ بری طرح الجھ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ اس مکان اور اس کے مکینوں کے بارے میں کچھ جانکاری رکھتی ہے اور وہ خود بھی تو یہاں گھات لگائے کب سے بیٹھی ہوگی مگر کیوں......؟ اس دوران کاٹ دار برفیلی ہواؤں میں تیزی آنے لگی، ہوا زور پکڑنے لگی، ہلکے طوفان کے آثار شروع ہو چلے تھے۔ عجیب منظر اور ماحول تھا۔

میں نے اسے خاموش پا کر دوبارہ پوچھا۔ ''میرا خیال ہے اب تم بھی میرے سوال کا جواب دے ہی دو۔ آخر تمہیں اتنی حیرت کیوں ہے...... اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میں...... میں......'' وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اچانک مکان کے اندر دھما کا ہوا۔ میں بری طرح چونک پڑا اور پلٹا۔ مکان کے اندر سے تیز نسوانی چیخ بھی ابھری تھی۔ میں دہل گیا۔ یہ چیخ میرے میزبان میوخ کی بیوی صوبی کی تھی۔ ساتھ ہی بچوں کے رونے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں اس لڑکی اور اس کی میری جانب اٹھی ہوئی گن کی پروا کیے بغیر مکان کی جانب دیوانہ وار دوڑ پڑا۔ ابھی میں دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ معاً دروازہ دھڑ سے کھلا۔ جس شخص کو میں نے گرتے پڑتے باہر نکلتے دیکھا، وہ میرے لیے اجنبی ہی تھا۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

انتقام کی آگ ہمیشہ کسی ناانصافی کے نتیجے میں بھڑکتی ہے... اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا کہ دل کی دنیا میں تلاطم برپا ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسی آندھی چلی کہ تمام وعدے اور قسمیں ایک طرف اور بدلے کی آگ دوسری جانب... بالآخر محبت کے نام پر ہونے والی سازشوں نے نقاب اتارا اور انتقام کا چولا پہنا... پھر نتیجہ تو یہی نکلنا تھا جو نکلا۔

ولداروں کی بدنیتی پر مبنی ایک دوشیزہ کا انتقام

چشمِ سیاہ

عائزہ احمد

صبح سے زلیخا اپنے موبائل پر ایران کے شہر تہران میں ہوٹل ڈھونڈنے میں مصروف تھی۔ شام ہو چکی تھی اور اسے ابھی تک کوئی ہوٹل پسند نہیں آیا تھا۔ اتنے میں مرتضیٰ کمرے کے اندر داخل ہوا جو تھکا ہارا دفتر سے آیا تھا۔

”نہیں مرتضیٰ! (دیکھیں تو مرتضیٰ) مجھے ایک بھی اچھا ہوٹل نہیں مل رہا ہے۔ ہم اپنے ہنی مون پر ایران تو جا رہے ہیں پر ہوٹل کا مسئلہ ہی حل نہیں ہو رہا۔“ زلیخا ایران جانے کے لیے بہت ایکسائیٹڈ تھی۔

"تو پھر چھوڑ دو ایران جانے کی ضد۔ ہم کہیں اور چلتے ہیں۔ ویسے بھی لوگ اپنے ہنی مون کے لیے یورپی ممالک کا انتخاب کرتے ہیں۔ تمہیں ایران جانے کی پڑی ہے جبکہ مجھے تو کوئی شوق نہیں۔" مرتضیٰ نے بیزاری سے کہا۔

"ایران ہمارے آباؤ اجداد کا ملک ہے۔ میں ایک بار بھی نہیں گئی۔ میں تو ضرور جاؤں گی اور آپ بھی چلیں گے۔" اس نے جیسے مرتضیٰ کو حکم دیا۔

"ٹھیک ہے۔ پر ابھی میرے لیے ایک کپ چائے کا کہہ دو۔ سر درد سے پھٹ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

☆☆☆

مرتضیٰ حسینی اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا تعلق بنیادی طور پر ایران سے تھا پر بہت عرصہ پہلے اس کے والدین متحدہ عرب امارات کے شہر عجمان میں شفٹ ہو چکے تھے۔ مرتضیٰ کی والدہ کا انتقال اس کے بچپن میں ہو گیا تھا۔

ایران میں مرتضیٰ کا کوئی نہیں تھا سوائے ایک دوست مراد کے جس سے اس کی دوستی عجمان میں ہوئی پر وہ بھی کچھ عرصہ پہلے عجمان چھوڑ کر ایران واپس چلا گیا تھا۔ مرتضیٰ نے تعلیم عجمان سے حاصل کی اور پھر وہیں پر اپنے والد کا کاروبار سنبھالا۔ کچھ عرصے بعد کاروبار میں نقصان ہونا شروع ہوا۔ اسی دوران مرتضیٰ کے والد چل بسے اور وہ اکیلا رہ گیا پھر اس کی شادی زلیخا سے ہوگئی۔ اس شادی سے مرتضیٰ کے بزنس کو کافی فائدے ہوئے یا یوں کہنا چاہیے کہ اس نے یہ شادی اسی بزنس کے لیے کی تھی کیونکہ مرتضیٰ کو زلیخا ذرا بھی پسند نہیں تھی کیونکہ وہ عام شکل وصورت کی تھی جبکہ مرتضیٰ خوش شکل نوجوان تھا۔

زلیخا کا بھی تعلق ایران سے تھا اور وہ بھی عجمان میں پلی بڑھی تھی۔ زلیخا کبھی ایران نہیں گئی پر وہ فارسی زبان بول بھی سکتی تھی اور سمجھتی بھی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے ہنی مون پر ایران جانا چاہتی تھی۔ مرتضیٰ اس کے سامنے کچھ نہیں بول سکا کیونکہ وہ بہت ضدی تھی۔ اپنے ماں باپ کی لاڈلی بیٹی تھی اور مرتضیٰ نے اس کی ضد مان لی کیونکہ مرتضیٰ بھی اپنے بزنس کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ مرتضیٰ کو ایران کا ذکر پسند نہیں تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔

☆☆☆

"ماشاء اللہ... چقدر زیباست! (ماشاء اللہ! کتنا خوبصورت ہے)۔" ائرپورٹ سے نکلتے ہی تہران کی خوبصورتی دیکھ کر زلیخا کے یہ پہلے الفاظ تھے۔

لیکن مرتضیٰ بالکل خوش نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کا خوف تھا۔ ایران کے اس ٹھنڈے موسم میں بھی مرتضیٰ پسینے سے شرابور تھا۔ زلیخا نے اسے دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔

"مرتضیٰ! کیا ہوا ہے؟" اس نے اپنا ہاتھ مرتضیٰ کے ہاتھ پر رکھا تو وہ اپنے ڈر سے باہر آیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنی پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں وہاں ایک ٹیکسی آکر رک گئی۔ وہ اس ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

"کہاں جانا ہے آپ لوگوں کو؟"

"ہم یہاں پہلی بار آئے ہیں۔ آپ ہمیں کسی ایسے ہوٹل کا بتائیں جو سنسان ایریا میں ہو، خاموشی ہو، سکون ہو۔" زلیخا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک جگہ ہے میڈم! لیکن وہ ہوٹل نہیں ہے، کاٹیج ہے۔"

کاٹیج کا سنتے ہی مرتضیٰ کے ہاتھ سے اس کا موبائل نیچے گر گیا۔ زلیخا اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ مرتضیٰ نے مشکل سے خود کو سنبھالا اور ڈرائیور سے سخت لہجے میں مخاطب ہوا۔ "ہم نے آپ سے ہوٹل کا پوچھا تھا، کاٹیج کا نہیں۔" زلیخا کو اس کا یہ رویہ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

"صاحب! لیکن......"

"بھائی! آپ اسی کاٹیج چلیں۔" زلیخا نے غصے سے مرتضیٰ کو دیکھا۔ صبح سے وہ اس کا یہ رویہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اب اس کے برداشت کی حد ہو چکی تھی۔ "زلیخا! ہم نہیں جا رہے کاٹیج۔" مرتضیٰ نے سخت لہجے میں کہا۔

"ہم جائیں گے کیونکہ آپ کو جو آرام چاہیے اپنا دماغ درست کرنے کے لیے، وہ آپ کو کاٹیج جیسی جگہ پر ہی ملے گا۔"

"پر زلی...... بس دیگ (بس بہت ہوا)۔" زلیخا نے اس کی بات بیچ میں کاٹ کر اسے چپ کرایا۔ مرتضیٰ اس کی بدتمیزیاں صرف اپنے مفاد کے لیے برداشت کر رہا تھا۔

☆☆☆

کاٹیج پہنچتے ہی اس کے مالک عزیز سے بھی زلیخا نے خود ہی بات کی اور کاٹیج ایک ہفتے کے لیے بک کرلیا۔ مرتضیٰ مسلسل کاٹیج کے مالک کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ وہ تو نہیں ہے جو میں سوچ رہا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہے۔ تو کیا یہ جگہ وہی جگہ نہیں ہے؟ لیکن نہیں، جگہ تو وہی ہے۔ کاٹیج کے پاس جو گھر تھا وہ بھی ہے پھر یہ نیا مالک کون ہے؟" مرتضیٰ دل ہی دل میں کچھ سوچ رہا تھا۔

زلیخا نے اسے بلایا اور باہر سے کاٹیج کو دیکھنے کے بعد دونوں اندر چلے گئے۔

مرتضیٰ اندر بھی ہر چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اسے کوئی

بھی چیز وہ نہیں لگی جو اس نے سوچی تھی۔
یہ کاٹیج شہر سے بہت دور تھا۔ اس کاٹیج کے آس پاس ہر وقت سناٹا رہتا۔ دور دور تک یہاں کوئی آباد نہیں تھا۔ لوگ یہاں پرسکون کے لیے آتے تھے۔ کاٹیج کے سامنے والے گھر میں صرف اس کا مالک عزیز اور دو نوکر رہتے تھے۔
زلیخا کاٹیج کی خوبصورتی میں کھو گئی۔ اس دلکش کاٹیج نے زلیخا کو مسحور کر دیا تھا۔
"ارے واہ۔ یہاں بھی گراموفون ہے۔ میں نے اپنی دوست سے سنا تھا کہ تہران کے ہر ہوٹل میں گراموفون ہوتا ہے لیکن یہاں تو کاٹیج میں بھی ہے۔" زلیخا تھوڑی سی کوشش کے بعد آخر کار اسے آن کرنے میں کامیاب ہوگئی۔
(گردش چشم سیاہی تو خوشم می آید...... خوشم می آید)
(تمہاری سیاہ آنکھوں کی گردش مجھے بہت پسند ہے)۔
"ارے واہ، میرا پسندیدہ گانا ہے یہ تو۔" زلیخا اس گانے کے سرور میں کھو گئی لیکن مرتضیٰ نے جب یہ سنا، اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں جیسے اس کے خوف کے بوجھ سے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں کانوں پر رکھ دیے اور زور سے چلّایا۔
"این آہنگ را ببست (بند کرو اس گانے کو)۔"
زلیخا اس کی چیخ سن کر ایک دم ڈر گئی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔
مرتضیٰ مسلسل کانپ رہا تھا اور پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔

☆☆☆

مرتضیٰ اب بھی بے ہوش بستر پر لیٹا تھا۔ مراد کو زلیخا نے فون کر کے بلوایا تھا۔ مراد اپنے دوست کے پاس بیٹھ کر اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ زلیخا کاٹیج سے باہر اپنے والدین سے فون پر بات کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد مرتضیٰ کو ہوش آگیا اور وہ ایک دم سے ڈر کے مارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"مرتضیٰ! بھائی ریلیکس کر۔ کیا ہوگیا ہے۔" مراد نے اسے سمجھایا۔
"مراد! وہ یہیں ہے۔ میں اسے محسوس کر سکتا ہوں۔"
خوف سے مرتضیٰ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔
"پس چہ چیزی دیوانہ شدہ است؟ (تو پاگل ہے کیا؟) وہ مر چکی ہے۔ 2 سال ہو چکے ہیں۔ اس بات کو اب بھول جاؤ تم بھی۔ تم یہاں بھابی کے ساتھ ہنی مون پر آئے ہو۔ اپنا وقت خراب مت کرو۔ سمجھ آئی میری بات؟"
"اگر وہ یہاں نہیں ہے تو وہ گیت جو میں اس کے لیے گایا کرتا تھا، وہ کہاں سے آیا؟" مرتضیٰ پر اس کے یہاں ہونے کا خوف طاری تھا۔
"یار! وہ ایک مشہور گانا ہے۔ اسی لیے تُو نے بھی اس کے لیے گایا...... اور چلو مان لیا اس کی روح بھٹک رہی ہے تو تیرا کام وہ کب کا عجمان میں تمام کر چکی ہوتی کیونکہ اگر بھوت وغیرہ کچھ ہوتا بھی ہے تو وہ ہر جگہ جا سکتے ہیں۔ کم از کم بچپن میں ہم نے تو یہی سنا تھا اور ایک بہت ہی عجیب بات یہ ہے کہ اگر وہ یہاں ہے تو کیا گانے گائے گی؟" یہ کہتے ہوئے اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور دل کھول کر مرتضیٰ پر ہنسا۔
مرتضیٰ اسے غصے سے دیکھ رہا تھا۔ "اچھا سوری! تُو اٹھ اور تیار ہو جا۔ آج میں تم لوگوں کو گھمانے لے کر جاؤں گا، چل اٹھ۔" نہ چاہتے ہوئے بھی مرتضیٰ کو اس کی ماننا پڑی۔

☆☆☆

دو سال قبل۔
سردیوں کی ٹھنڈی رات تھی۔ مرتضیٰ اور اس کے دوست الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ کاٹیج کا مالک خلیل بھی بیٹھا تھا۔ تبھی خلیل کی بیٹی پریسہ ان کے اور مہمانوں کے لیے چائے لے کر آئی۔
مرتضیٰ اور اس کے کچھ دوست عجمان سے یہاں ایک مہینے کے لیے بزنس کے سلسلے میں آئے تھے اور ساتھ ساتھ گھومنا پھرنا بھی لگا تھا۔ یہ کاٹیج مرتضیٰ کے دوست فرحان کے جاننے والے نے ان کے لیے بک کرایا تھا۔ پہلے ہی دن جب مرتضیٰ نے پریسہ کو دیکھا تو اپنی دل پھینک طبیعت کی وجہ سے اس پر عاشق ہوگیا۔
پریسہ بہت خوبصورت تھی۔ کمال کا حسن تھا اس کا۔ دودھ جیسی رنگت، سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں اسے باقی فارسی لڑکیوں سے مختلف کرتے تھے۔ کالے لباس میں وہ بالکل کالی رات میں چمکتے چاند کے مانند لگ رہی تھی۔ ان ہی چشم سیاہ کا مرتضیٰ دیوانہ تھا۔ پریسہ بھی اس کی آنکھوں میں چھپی اپنے لیے پسندیدگی کو پہچانتی تھی۔
سب کو چائے دینے کے بعد مرتضیٰ کی باری تھی۔ اس نے چائے کا کپ اٹھا کر مرتضیٰ کو دیا تو بے اختیار نظر اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا لیکن مرتضیٰ کی آنکھیں پہلے ہی اس کی صورت پر جمی تھیں۔ مرتضیٰ کی نظروں کی تپش سے پریسہ کے گالوں پر لالی آگئی اور نظر چرا کر ہاتھ میں ٹرے لیے وہاں سے چلی گئی۔ اس کا گھر یہیں کاٹیج کے پاس تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی مرتضیٰ کی آنکھیں اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔
"یار مرتضیٰ! کوئی اچھا سا گانا تو سناؤ کہ مزہ آجائے۔" مراد نے فرمائش کی۔

"ٹھیک ہے۔" مرتضیٰ نے مسکرا کر جواب دیا۔

پریسہ اسے اپنے باورچی خانے کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مرتضیٰ اسے کس نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اسے یہ احساس اچھا لگتا تھا۔

مرتضیٰ کی نظر اس پر پڑی تو مرتضیٰ نے اپنا گیت شروع کیا۔

گردشِ چشمِ سیاہی تو خوشم می آید

خوشم می آید

گانا سن کر سب نے مرتضیٰ کی تعریف کی۔ مرتضیٰ کو بچپن سے گانے کا شوق تھا۔ سب نے مرتضیٰ کے گانے کو سراہا لیکن اس کی نظریں تو صرف پریسہ پر جمی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پریسہ سے اپنے دل کی بات کردے۔

پریسہ جانتی تھی کہ یہ گانا صرف ایک گانا نہیں بلکہ مرتضیٰ کے بے چین دل کا ایک پیغام ہے جو وہ اس تک پہنچانا چاہتا ہے۔ مرتضیٰ کے اس گیت نے اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھادیں۔ چاہے جانے کے احساس نے اسے بہت خوش کردیا تھا۔

مرتضیٰ کے فون پر اس کے والد کی کال آئی تو وہ خلیل سے اجازت لے کر فون سننے کے لیے وہاں سے اٹھ گیا کیونکہ اس جگہ پر نیٹ ورک کا مسئلہ تھا۔

وہ کاٹیج سے تھوڑی دور پریسہ کے گھر کے پاس آگیا مگر اس کے موبائل کا نیٹ ورک اب بھی بحال نہ ہوسکا۔ تبھی اچانک اسے پریسہ کی آواز سنائی دی جو کچن میں کھڑی یہی گانا گنگنا رہی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے اس نے پریسہ کو دیکھا۔ وہ جب جب پریسہ کو دیکھتا، اس کا حسن اسے مسحور کردیتا۔ وہ دبے پاؤں کچن کے دروازے پر کھڑا ہوگیا اور پریسہ کی توجہ پانے کے لیے کچن کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ پریسہ اسے دیکھ کر چونک گئی اور حیا سے اس کی نظریں جھک گئیں۔

"آپ کو...... کچھ...... چاہیے؟" پریسہ نے بہ مشکل اس سے سوال کیا۔

"وہ دراصل میرے موبائل میں نیٹ ورک کا ایشو تھا۔ اسی لیے اس طرف آیا تھا۔" مرتضیٰ نے بتایا۔

دونوں کے بیچ ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ بولنے کو الفاظ تو بہت تھے پر نہ جانے کیوں وہ خاموش تھے۔

"آپ نے بہت اچھا گایا۔" پریسہ نے دھیمی آواز سے کہا۔ مرتضیٰ وہ واحد شخص تھا جس کے لیے اسے کچھ محسوس ہورہا تھا۔

"بس سمجھ لیں کہ میرے دل کی آواز تھی۔ کسی کی کالی کالی آنکھوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔" مرتضیٰ نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار کیا۔

☆☆☆

رات ڈھل رہی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی سرخ کرنیں اوپر آسمان کو روشن کررہی تھیں۔ شام کے وقت مراد، زلیخا اور مرتضیٰ کو ساحل سمندر پر لے آیا تھا۔

جلد ہی سورج افق کے نیچے غائب ہوگیا اور آسمان پر اندھیرا ہوگیا۔ کب رات ہوگئی پتا ہی نہیں چلا۔ زلیخا ساحلِ سمندر پر بیٹھی اس جگہ کو دیکھتی رہی جہاں سورج غروب ہوا تھا۔ اس کے لیے غروبِ آفتاب مسحور کن تھا۔

"رات ہونے والی ہے زلیخا! مجھے لگتا اب ہمیں چلنا چاہیے۔" مرتضیٰ نے کہا۔

"چلے جائیں گے، اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ مجھے اس منظر کا لطف تو اٹھانے دو۔ تمہیں جانا ہے تو تم جاؤ، میں خود آجاؤں گی۔" زلیخا نے اسے سختی سے جواب دیا۔ مراد جو مرتضیٰ کے پاس کھڑا تھا، زلیخا کا یہ رویّہ دیکھ کر حیران تھا۔

"بھائی تیری ہمت کو داد دینی پڑے گی۔ بھابی تو بڑی غصے والی ہیں۔" مراد نے مرتضیٰ کے کان میں سرگوشی کی۔

"بس کیا کروں۔" مرتضیٰ نے بے بسی سے جواب دیا۔

"ویسے تو اتنی جلدی کاٹیج واپس کیوں جانا چاہتا ہے؟ ابھی تو ہمیں ریسٹوران جانا ہے۔ یہاں کی مشہور ڈش "کباب کوبیدہ" بھابی کو کھلانا ہے۔" مرتضیٰ نے کہا۔

"نہیں یار! میں تھک گیا ہوں۔ کاٹیج جا کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" مرتضیٰ نے شرٹ کی پاکٹ سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ رات ہونے کی وجہ سے تم ڈر رہے ہو؟" مراد نے سوال کیا۔

مراد کا سوال اسے عجیب لگا۔

"اس بات کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کہیں تمہیں یہ ڈر تو نہیں کہ پریسہ کی روح آکر تمہیں تنگ کرے گی۔ گردشِ چشمِ سیاہ گا گا کر۔" یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ زلیخا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

مراد شرمندہ ہوگیا۔

"کچھ نہیں بھابی! ہم پرانے دوست بس آپس میں مذاق کررہے ہیں۔" اس نے بات کو چھپالیا۔

"اچھا ہے، تھوڑا انہیں ہنسانے کی کوشش کیجیے تاکہ ان کا بھی موڈ اچھا رہے اور دوسروں کا بھی۔" زلیخا نے پھر طنز کیا۔

زلیخا کے موبائل پر اس کی ماں کی کال آئی تو وہ کال اٹھاتے ہوئے دوسری طرف چلی گئی۔

مراد نے مرتضیٰ کی طرف دیکھا جو غصے میں سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

"اچھا یار سوری! مذاق کررہا تھا نا۔" مراد نے معافی مانگی۔

مرتضیٰ وہاں پر کھڑا، سمندر کی لہروں کو دیکھتا زلیخا کا انتظار کر رہا تھا تبھی اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو کالے لباس میں ملبوس تھی۔ سر پر اسکارف تھا جیسے عموماً فارسی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ وہ سمندر کی طرف جا رہی تھی۔ مرتضیٰ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ سے بریسلیٹ پھسل کر گر گیا۔ وہ اس لڑکی کی جانب بڑھ گیا تا کہ اس کا بریسلیٹ اٹھا کر دے سکے۔

''ببخشید لطفا! (بات سنیے پلیز)۔'' اس نے لڑکی کو روکا تو لڑکی اس کی آواز سن کر رک گئی۔

''دستبند شما...... (آپ کا بریسلیٹ)۔'' ابھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بریسلیٹ دیکھ کر وہ چونک گیا۔

لڑکی نے جب مڑ کر مرتضیٰ کو دیکھا تو مرتضیٰ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ پریسہ تھی۔ وہ پریسہ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ان سیاہ آنکھوں کو پہچانتا تھا۔

پریسہ کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا خوف ایک ٹھوس زندہ قوت بن گیا جو کسی بھوکے درندے کی طرح اس پر چھا گیا، اسے متحرک کر دیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔

''مرتضیٰ!'' اس نے مرتضیٰ کو پکارا۔

مرتضیٰ بہ مشکل قدم پیچھے ہٹا رہا تھا تا کہ وہ اس سے بھاگ سکے۔

''تم مجھ سے دور نہیں جا سکتے مرتضیٰ! میں پھر آؤں گی۔''

اس کی یہ بات سن کر خوف سے مرتضیٰ بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

دو سال قبل۔

''بابا! میں بس ابھی گل کے گھر سے ہو کر آتی ہوں۔ اس نے کہا تھا، اسے کچھ کام ہے۔ دیکھتی ہوں شاید اس کے گھر کل مہمان آ رہے ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا! بس جلدی آنا۔''

پریسہ نے جلدی سے اپنی بڑی سی چادر پہنی اور گھر سے نکل گئی۔

آج پہلی بار اس نے اپنے والد سے جھوٹ بولا تھا، صرف مرتضیٰ سے ملنے کے لیے۔ مرتضیٰ اور پریسہ کے درمیان محبت کا بہت گہرا تعلق بن چکا تھا۔ دونوں چھپ چھپ کر ملتے تھے لیکن آج مرتضیٰ نے اسے ساحل سمندر پر بلایا تھا اور محبوب کے بلانے پر پریسہ دوڑ کر جا رہی تھی۔ پریسہ کے دل کا حال اور اس کی محبت کا قصہ پریسہ کی بہن فاطمہ کو بھی معلوم تھا جو ایران کے شہر مشہد میں پڑھ رہی تھی۔ پریسہ اسے اپنے اور مرتضیٰ کے بیچ کی ساری باتیں بتاتی۔ فاطمہ اسے سمجھاتی تھی کہ عقل سے کام

لو۔ مرتضیٰ ایک مسافر ہے۔ وہ کیا جانتی ہے اس کے بارے میں لیکن پریسہ کی آنکھوں پر محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے مرتضیٰ نے پوری طرح اپنی محبت کے جال میں پھنسایا تھا۔

کچھ ہی وقت میں وہ ساحل سمندر پہنچ گئی۔ وہاں پر مرتضیٰ پہلے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ان دس دنوں میں پریسہ اپنی نادانی سے پوری طرح مرتضیٰ کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔

''ماشاء اللہ! بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ درست مثل ماہ کامل در شب تاریک (سیاہ رات میں چمکتے چاند کی طرح لگ رہی ہو)۔'' مرتضیٰ اس کے حسن کا دیوانہ تھا۔

پریسہ اس کی بات سن کر شرما گئی اور آنکھیں جھکا لیں۔ مرتضیٰ نے نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ ''میں ایران اس کی خوبصورتی دیکھنے کے لیے آیا تھا اور واقعی ایران کی سب سے خوبصورت لڑکی اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے۔'' مرتضیٰ کی پیار بھری باتیں پریسہ کے دل کی دھڑکن بے ترتیب کرتی تھیں۔ اسے یہ پیار کا احساس ایک انجانی خوشی میں مبتلا کر دیتا تھا۔

مرتضیٰ نے اپنی جیب سے ایک خوبصورت سا بریسلیٹ نکال کر پریسہ کو پہنایا۔

''بہت خوب صورت ہے یہ مرتضیٰ!'' پریسہ نے بریسلیٹ کی طرف دیکھا۔

''بس کوشش کی ہے کہ تمہاری طرح خوبصورت ہو۔'' مرتضیٰ نے کہا۔

''یہ میری طرف سے تمہارے لیے میری محبت کی نشانی ہے۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا اور تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر لے کر جاؤں گا۔'' مرتضیٰ نے اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔

پریسہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک ہونے والے ہیں۔

پریسہ مرتضیٰ کے مکر و فریب سے بے خبر اپنی نئی زندگی کے خواب سجا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ زندگی اس کے لیے پھولوں کی سیج بننے والی ہے لیکن اس کے لیے تو کچھ اور ہی اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

اس واقعے کے دو دن گزرنے کے بعد آج مرتضیٰ کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ وہ کچھ بولنے کے قابل تھا ورنہ وہ خوف کی وجہ سے بار بار بے ہوش ہو جاتا تھا۔ مرتضیٰ نے کسی کو کچھ نہیں بتایا، بس یہی کہا اسے خود بھی پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ زلیخا نے اسے بہتر دیکھا تو اس سے باہر جانے کی ضد کی کیونکہ وہ یہاں پورا شہر گھومنے آئی تھی۔ مرتضیٰ نے جانے سے منع کر دیا تو

وہ تیار ہو کر اکیلی ہی جانے والی تھی مگر مراد نے اپنی بہن کو اس کے ساتھ بھیج دیا اور خود مرتضیٰ کے پاس بیٹھ گیا۔

"خدا کا شکر ہے اب تم ٹھیک ہو۔" مراد نے کہا۔

"ہاں، لیکن پریسہ......" ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ مراد نے روک لیا۔

"یار! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف تیرا وہم ہے۔"

"یہ میرا وہم نہیں ہو سکتا مراد! میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور تجھے پتا ہے اس کے ہاتھ میں وہ بریسلیٹ بھی تھا جو میں نے اسے تحفے میں دیا تھا پھر کیسے سب میرا وہم ہو سکتا ہے؟" مرتضیٰ کو پریسہ کی موجودگی کا یقین تھا۔

"اچھا، اگر ایسا ہے تو وہ صرف تیرے پیچھے کیوں پڑی ہے؟ جبکہ اس کھیل میں تیرے ساتھ میں اور فرحان بھی شامل تھے؟"

"تو کہاں ہے آج فرحان؟ کیا وہ زندہ ہے؟ کس قسم کی دردناک موت مرا تھا وہ۔ یاد نہیں تجھے؟" مرتضیٰ کے ایران سے جانے کے بعد فرحان کا بہت خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

"فرحان کے ساتھ جو بھی ہوا وہ ایک حادثہ تھا۔ اس کا پریسہ سے کیا لینا دینا؟ تم ان سب باتوں کے بارے میں مت سوچو۔ میں تو کہہ رہا ہوں اگر اسے واقعی اپنا بدلہ لینا ہے تو آجائے پھر ہم دونوں سے بدلہ لے کیونکہ میں برابر کا شریک ہوں۔" مراد نے بے خوف ہو کر کہا۔

"یہ سوچ سوچ کر میرا سر پھٹ جائے گا۔" مرتضیٰ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"مرتضیٰ برادر! شما نگران نباشید (تم فکر مت کرو)۔ میں بس تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں پھر شام کو ہمیں ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔" مراد یہ کہہ کر وہاں سے جانے والا تھا مگر مرتضیٰ نے اسے روک لیا۔

"کہیں مت جانا مراد! کھانا آرڈر کر لو۔ ہم یہیں کھا لیں گے۔" مرتضیٰ نے جیسے اس کی منت کی۔ مراد اس کے کہنے پر رک گیا اور کھانا آرڈر کروا لیا۔

کھانا کھانے کے بعد مراد نے مرتضیٰ سے اجازت لی اور وہ چلا گیا۔ کاٹیج سے باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اپنے گھر جانے لگا تب ہی کچھ دیر میں اسے اندازہ ہوا کہ گاڑی کے بریکس فیل ہو چکے ہیں۔ اس کی گاڑی کاٹیج سے تھوڑی ہی دور جا کر ٹکرا گئی اور وہ شدید زخمی ہوا۔ اس نے یہاں وہاں مدد کے لیے دیکھنا چاہا، کسی کو آواز دینا چاہی لیکن درد کی شدت سے وہ آواز نہ دے سکا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆☆☆

دو سال قبل۔

"یار مرتضیٰ! قسم سے تو ماسٹر مائنڈ ہے۔ ہاں، تُو نے کیسے اس لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا لیا۔" فرحان زور زور سے ہنس رہا تھا۔

"کہا تھا میں نے مراد کو، مجھے چیلنج مت کرنا، میں دنیا کی کسی بھی لڑکی کو اپنی محبت میں گرفتار کر سکتا ہوں۔" مرتضیٰ نے فخر سے کہا۔

مراد نے مرتضیٰ کے ایران آنے کے بعد اسے چیلنج کیا تھا کہ وہ کسی بھی لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں لا کر دکھائے جو مراد اتنے سالوں میں نہیں کر سکا۔

"ہاں یار! ماننا پڑے گا تجھے تو۔ صرف کچھ ہی دنوں میں تم نے اس لڑکی پر ایسا جادو کر دیا کہ وہ تمہاری ہو گئی۔" فرحان بھی حیران تھا۔

"بس یہ سب اس کی چرب زبانی کا کمال ہے۔" مراد نے کہا۔

"ویسے پریسہ بڑی سادہ سی لڑکی ہے۔ کسی ماڈرن لڑکی کو پھنساتے تو بات بنتی۔" مراد نے کہا۔

"اب تجھے جلن ہو رہی ہے کیونکہ تُو بھی تو ہے یہاں پر۔ وہ ہماری دیوانی ہو گئی۔"

"چل چل، جلن کیسی؟ اتنی بھی کوئی خاص نہیں ہے وہ۔" مراد اب شرط ہارنے کے بعد جل رہا تھا۔

"اچھا یہ سب چھوڑو۔ ایک خوشخبری سنو۔ میرے والد نے لیلیٰ کا اور میرا رشتہ پکا کر دیا ہے۔" مرتضیٰ نے خوشی سے سب کو بتایا۔

"ارے واہ، کیا بات ہے۔" مراد، فرحان اور مرتضیٰ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے اور مرتضیٰ کو مبارک باد دی۔ لیلیٰ، مرتضیٰ کی عجمان میں کلاس فیلو تھی جس سے مرتضیٰ محبت کرتا تھا۔

"چل پھر بھائی ہم نکلتے ہیں۔ کہیں فلائٹ مس نہ ہو جائے۔ تُو بھی کچھ دنوں میں کام ختم کر کے آجانا۔ جب تک ہم عجمان میں کام دیکھ لیں گے۔" فرحان اور مراد خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

مرتضیٰ کے لیے آج کا دن یادگار تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس کی محبت سے اب اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ دروازے پر کھڑی پریسہ ان کی ساری گفتگو سن چکی تھی۔ وہ اندر سے اس قدر ٹوٹ چکی تھی کہ اب اس کے دل میں مرتضیٰ کے لیے صرف انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔

☆☆☆

''لیلیٰ! مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ ہم ایک ہونے جا رہے ہیں۔'' رات کے وقت اپنے کمرے میں مرتضیٰ فون پر لیلیٰ سے بات کرنے میں مگن تھا تبھی پریسہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی سرخ آنکھیں اور اجڑا وجود دیکھ کر مرتضیٰ حیران تھا۔

مرتضیٰ نے بغیر کچھ کہے فون بند کر دیا مگر وہ بند نہ ہو سکا۔ وہ دوڑتا ہوا پریسہ کی طرف گیا۔

''پریسہ! کیا ہوا، تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟ انکل نے دیکھ لیا تو۔'' مرتضیٰ کو اپنے پکڑے جانے کا ڈر تھا۔

''مرتضیٰ! کیوں کیا تم نے ایسا؟'' پریسہ نے اس سے سوال کیا۔

''کیا؟'' مرتضیٰ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کس بارے میں بات کر رہی ہے۔

''تمہیں کیا ملا میری زندگی برباد کر کے۔ میرے ساتھ پیار کا ناٹک کر کے کیا حاصل ہوا تمہیں؟ مجھے اس طرح سے زندہ لاش بنا کر کیا سکون ملا تمہیں؟'' پریسہ چیخ چیخ کر اس سے پوچھ رہی تھی۔

''پریسہ! میری جان......'' وہ اس کا ہاتھ پکڑنے والا تھا تبھی پریسہ نے زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔

''ہاتھ مت لگانا مجھے گھٹیا انسان! تمہیں کوئی حق نہیں مجھے چھونے کا۔ میں تمہاری اور تمہارے دوستوں کی ساری بکواس سن چکی ہوں۔''

''اچھا ہے کہ تم نے سن لیا۔ تمہیں کیسے لگا کہ تم جیسی پسماندہ علاقے میں رہنے والی سادہ سی ان پڑھ لڑکی سے میں شادی کروں گا۔ کیوں تمہیں تم اتنی بے وقوف جو اس طرح کے خواب دیکھ رہی تھیں۔'' مرتضیٰ نے اس پر طنز کیا۔

''تم ایک بے غیرت انسان ہو۔ ایک شرط کے لیے تم نے مجھے برباد کر دیا۔'' پریسہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''غلطی تمہاری ہے پریسہ! تمہیں اتنی جلدی کسی کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا لیکن پھر بھی تمہارا شکریہ۔ تمہاری وجہ سے ٹرپ اچھا گزرا۔ میرا تم سے ناٹک ہی سہی پر دل بہل گیا۔'' مرتضیٰ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

پریسہ کی نظر روتے روتے مرتضیٰ کے موبائل پر پڑی جہاں پر لیلیٰ اب بھی کال پر موجود تھی۔

پریسہ ہنسنے لگی۔ مرتضیٰ اسے دیکھ کر حیران ہو گیا۔

''کیا تم پاگل ہو گئی ہو جو ایسے ہنس رہی ہو؟''

''تمہاری محبوبہ نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ اب وہ تمہیں چھوڑ دے گی، جیسے تم نے مجھے چھوڑا۔'' پریسہ نے اس کے موبائل کی طرف اشارہ کیا جہاں اب کال بند ہونے کے بعد میسج آیا تھا کہ لیلیٰ اب اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔

یہ میسج دیکھ کر مرتضیٰ غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور پریسہ کو زوردار تھپڑ رسید کیا۔ پریسہ ایک دم سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر گر گئی جہاں اس کے سر پر شدید چوٹ آئی۔ اس نے مرتضیٰ سے التجا کی کہ اسے اٹھائے مگر مرتضیٰ پتھر کا بن چکا تھا اور پھر پریسہ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

مرتضیٰ یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کیونکہ اس وقت اسے پریسہ سے شدید نفرت ہو رہی تھی۔ فجر کی اذان سن کر مرتضیٰ نے اپنا سامان باندھا اور وہاں سے بھاگ گیا کیونکہ وہ جانتا تھا یہ پریسہ کے والد کے اٹھنے کا وقت ہے۔ مرتضیٰ کی برائیوں کی وجہ سے اس کی زندگی کا سب سے خوشگوار دن اس کے لیے بدترین بن گیا۔

☆☆☆

مراد کو دفنانے کے بعد زلیخا اور مرتضیٰ کا میج واپس آ چکے تھے۔ زلیخا کی والدہ کا فون آیا تو وہ فون سننے باہر چلی گئی۔

مرتضیٰ کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے تبھی مرتضیٰ کو وہ گیت پھر سے سنائی دیا۔

گردشِ چشمِ سیاہی تو خوشم می آید
خوشم می آید

''بس، بس کرو۔ کیا چاہتی ہو تم مجھ سے؟ سب کچھ تو چھین لیا تم نے۔ میرے دوست، میری محبت...... اور کیا چاہتی ہو؟'' مرتضیٰ چیختے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

ایک دم سے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گئی۔ آج مرتضیٰ اس سے نہیں ڈر رہا تھا بلکہ وہ شرمندہ تھا اس کے سامنے۔

''تمہاری زندگی چاہتی ہوں۔'' پریسہ نے اس سے کہا۔

''تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ ایک حادثہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری جان جائے۔'' مرتضیٰ نے اسے یقین دلانا چاہا۔

''بکواس بند کرو اپنی۔ اب تمہیں میرے انتقام سے کوئی نہیں بچا سکتا۔'' پریسہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی تبھی زلیخا وہاں آ گئی۔

''کون ہو تم؟'' زلیخا ایک انجان لڑکی کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''زلیخا! کیا تم بھی اسے دیکھ سکتی ہو؟'' مرتضیٰ نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں، مجھے سب دیکھ سکتے ہیں کیونکہ میں پریسہ نہیں،

اس کی جڑواں بہن فاطمہ ہوں۔" فاطمہ نے پریسہ کا انتقام لینے کے لیے پریسہ کا روپ دھارا تھا۔

یہ سن کر مرتضیٰ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ فاطمہ کی شکل پریسہ سے ملتی تھی۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ اس کی جڑواں بہن بھی ہے۔" مرتضیٰ کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

"تم کبھی اس کی باتیں سنتے تو وہ تمہیں بتاتی نا۔ اگر دل سے اسے چاہتے تو اسے سنتے نا۔"

"نہیں، یہ سب جھوٹ ہے۔ تمہیں کیسے پتا میں ایران آرہا ہوں؟"

"ہاں، نہیں پتا تھا مجھے لیکن میری بہن کو جس دن تم نے مارا، میں اس کے اگلے دن مشہد سے یہاں آگئی تھی۔ تمہاری ایک ایک بات وہ مجھے بتاتی تھی۔ تمہاری تصویر تک اس نے مجھے بھیجی تھی۔ کس کس طرح کی حرکتیں کرکے تم نے میری بہن کو برباد کرکے موت سے ملادیا، میں سب جانتی ہوں۔ یہ کاٹیج اب میرا اور میرے شوہر عزیز کا ہے۔ تمہاری وجہ سے...... صرف تمہاری وجہ سے میں نے کچھ ہی عرصے بعد اپنے بابا کو بھی کھو دیا۔ وہ پریسہ کا دکھ برداشت نہ کرسکے اور چلے گئے۔ تمہیں لگتا ہے میں تمہیں چھوڑ دوں گی؟ تمہارے دوست کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اب تمہاری باری ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے مرتضیٰ؟ کیا اسی لیے تم ایران کے نام سے اتنے خوفزدہ تھے؟" زلیخا کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مرتضیٰ اسے کوئی بھی جواب نہیں دے پایا۔

"کیا یہ سب کچھ واقعی تم نے کیا؟ میرے دوستوں کو تم نے مارا اور سمندر پر بھی تم آئی تھیں میرے سامنے؟"

"ہاں، سب میں نے کیا تھا۔ جس دن سے تم کاٹیج آئے ہو، اسی دن سے میں تمہارے پیچھے ہوں۔ اللہ میرے ساتھ تھا اسی لیے میں نے تمہیں دیکھ لیا اور میں تمہاری اس گھٹیا صورت کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں تمہاری ساری باتیں خود کان لگا کر سنتی تھی۔ میں سمندر کنارے بھی تم سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ مراد کی گاڑی کے بریک بھی میں نے ہی خراب کرنے کو کہا تھا۔ جس دن تم یہاں آئے، اس گراموفون میں وہ گانا لگانے کے لیے بھی میں نے ملازم سے کہا تھا۔ اب بس بہت ہوگیا۔ آج تمہارا آخری دن ہے۔" یہ کہتے ہوئے فاطمہ نے پستول تان لیا۔

مرتضیٰ گھبرا گیا اور فاطمہ سے پستول چھیننے کی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ اب وہ فاطمہ پر پستول تانے کھڑا تھا۔

"ہاں، میں نے ہی مارا ہے تمہاری بہن کو۔ اس بے وقوف کو ویسے بھی جینے کا حق نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے میری محبت مجھ سے روٹھ گئی۔ میرے ٹینشن میں ہونے کی وجہ سے میرا بزنس ڈوب گیا۔ میرے والد اس دنیا سے چلے گئے اور مجھے اس کے جیسی بدشکل اور نک چڑھی لڑکی سے شادی کرنا پڑی جس سے میں نفرت کرتا ہوں۔ بہت محبت ہے نا تمہیں اپنی بہن سے۔ تمہیں بھی بھیج دیتا ہوں پھر۔" مرتضیٰ گولی چلانے والا تھا تبھی زلیخا آگے بڑھی اور زلیخا نے مرتضیٰ کو زوردار تھپڑ رسید کیا۔

"بے غیرت انسان! میں نے اور میرے والد نے کیا کچھ نہیں کیا تمہارے لیے...... اور تم مجھے کہتے ہو کہ نفرت کرتے ہو مجھ سے؟ زبردستی نکاح ہوا ہے ہمارا؟ تمہیں شرم نہیں آتی۔" زلیخا اس کی باتوں سے بری طرح سے ٹوٹ چکی تھی۔

"تو تم خود کو دیکھو۔ کہاں سے تم میرے لائق ہو۔ ہاں بتاؤ کہاں سے؟ میری مجبوری نہ ہوتی تو میں تمہاری طرف دیکھتا بھی نہیں۔" مرتضیٰ نے حقارت سے کہا۔ "خیر، اچھا ہے آج کے دن تم دونوں سے میری جان چھوٹ جائے گی۔ تمہیں میں طلاق دے کر اسے مار دوں گا۔"

مرتضیٰ کے کچھ کرنے سے پہلے ہی عزیز وہاں آچکا تھا۔ عزیز نے اس کے بازو پر گولی مار کر اسے زخمی کردیا۔ مرتضیٰ کے ہاتھ سے پستول گر گیا جسے فاطمہ نے اٹھالیا اور مرتضیٰ پر گولیوں کی بارش کردی جس سے موقع پر ہی مرتضیٰ کی موت واقع ہوگئی۔

فاطمہ کے ہاتھ سے پستول گر چکا تھا۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ عزیز نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔

"میں نے اپنی بہن کا بدلہ لے لیا عزیز! اب تو میری بہن سکون میں ہوگی نا؟" اس نے عزیز سے پوچھا تو عزیز نے اثبات میں سر ہلایا۔

زلیخا اس کی لاش کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ فاطمہ، زلیخا کے پاس آئی اور کہا۔

"میں نے اپنی بہن کا انتقام لے لیا ہے زلیخا! چاہو تو مجھے پولیس کے حوالے کرسکتی ہو۔"

زلیخا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ آدمی ایک معصوم لڑکی کا قاتل تھا۔ یہ اسی لائق تھا۔" یہ کہتے ہوئے زلیخا وہاں سے چلی گئی۔

فاطمہ اب سکون محسوس کررہی تھی۔ وہ جانتی تھی اب پریسہ جب اس کے خواب میں آئے گی تو اس کی پیاری کالی کالی آنکھوں میں آنسو اور درد نہیں بلکہ خوشی ہوگی۔

⌘⌘⌘

گجرات کے شیخ کبیر کی خدمت میں مریدوں اور ارادت مندوں کا ہجوم قابلِ دید تھا۔ برصغیر کے ہر حصے اور گوشے کے آدمی اس دربار میں موجود تھے۔ شیخ وعظ و تلقین میں منہمک، دنیا و مافیہا سے دور، حالتِ جذب و شوق میں اسرار سے پردے اٹھانے میں مشغول تھے۔ ان کا موضوع تھا حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ پر بول چکنے کے بعد آپ نے فرمایا۔

”عزیزو! اللہ اپنے بندے کے ان گناہوں کو معاف نہیں کرے گا جن کا تعلق کسی دوسرے بندے کی حق تلفی سے ہوگا۔

ناگور کے ایک مشہور صوفی خاندان کے چشم و چراغ... ان کی عظمت اور بزرگی کی سند یہ تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آپ کی راہنمائی فرمائی۔ وہ بھی بعد وصال۔ گجرات اور دوسرے شہروں میں گھومنے پھرنے والا یہ جوان صوفی اپنے پیر مرشد کی ہدایت پر اجمیر گیا اور وہاں سے انہیں جو ہدایت ملی اس پر عمل کیا۔ خواجہ چشتیؒ نے انہیں ان کے آبائی وطن ناگور بھیج دیا۔ پھر یہاں سے رشد و ہدایت کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی۔

خواجہ حسین ناگوری علیہ الرحمۃ

ضیا تسنیم بلگرامی
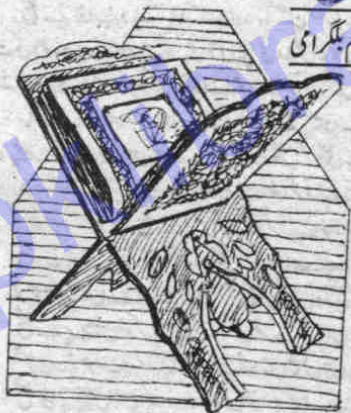
بندوں کے حقوق بندے کس طرح تلف کرتے ہیں؟ سنو، قتل کر کے، حق غصب کر کے، جسم کے کسی عضو یا حصے کو نقصان پہنچا کے، تہمت لگا کر، گالیاں دے کر۔ ان کے علاوہ اللہ کے ایسے ظالم بندے بھی ہیں جو اپنے ایماندار اور متقی بھائیوں کے دین اور مذہب کو تلف کر دیتے ہیں، یہ بھی حق تلفی ہے۔''

ایک نوجوان کھڑا ہو گیا اور سوال کیا۔ ''شیخ! دین اور مذہب کی حق تلفی کا مفہوم اپنی سمجھ میں نہیں آیا، ذرا اس کی وضاحت فرما دیں۔''

شیخ نے اس نوجوان کو شاید پہلی بار اپنی مجلس میں دیکھا تھا، پوچھا۔ ''تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''شیخ! میں نے آپ سے جو کچھ پوچھا ہے، اس کا آپ کے سوال سے کوئی تعلق نہیں۔ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں، سر دست ان دونوں سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔''

شیخ نے شفقت سے فرمایا۔ ''نوجوان! تیرے سوال میں حمید الدین سوالی ناگوری کی بُو آ رہی ہے۔''

نوجوان پر سکتہ سا طاری ہو گیا، بولا۔ ''حضرت! آپ نے تو کمال کر دیا۔ بخدا جس کو آپ جانتے ہیں اس سے اس کا تعارف کیوں چاہتے ہیں؟''

شیخ مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے نوجوان کو آواز دی۔ ''خواجہ حسین! تم وہاں کہاں بیٹھے ہو، یہاں میرے پاس آؤ، تمہارے جد اعلیٰ حمید الدین ناگوری سوالی تھے۔ ان سے سوال کیے بھی جاتے تھے اور وہ خود بھی سوال کیا کرتے تھے۔ تم نے اتنے بڑے ہجوم میں میری شخصیت سے مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر جو سوال کر دیا ہے اس میں جرأت، دیانت اور تجسس کی روشنی پائی جاتی ہے۔''

نوجوان حسین ناگوری ہجوم سے نکل کر شیخ کے پاس چلا گیا۔ شیخ نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور بہ آوازِ بلند کہا۔ ''بابا حسین! تم نے کیا پوچھا تھا؟ ذرا اونچی آواز میں ایک بار پھر اپنا سوال دہرا دو تا کہ جو تمہارا سوال نہ سن سکے ہوں، سن لیں۔ اس کے بعد میں جواب دوں گا۔''

نوجوان حسین نے کھڑے ہو کر اپنا سوال دہرا دیا۔ ''میں یہ پوچھ رہا تھا کہ دین اور مذہب میں حق تلفی کس طرح ہوتی ہے؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''بابا حسین اور سامعین حضرات! اگر کوئی شخص کسی صحیح العقیدہ اور متبع سنت مسلمان کو گمراہی اور بدعت کی دعوت دے اور اس کو اپنی چکنی چپڑی، مدلل باتوں سے گناہوں کی طرف لے جائے تو یہ اس کے دین کی حق تلفی ہوئی اور اللہ اس بہکانے اور گمراہ کرنے والے کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''

سامعین نے واہ واہ، سبحان اللہ کی صدائے تحسین سے اپنے پیر مرشد کی تعریف کی اور نوجوان حسین کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ یہ نوجوان جو شاید ناگور سے چل کر پہلی بار اس مجلس میں شریک ہوا تھا، شیخ کی نظروں میں اتنا برگزیدہ اور عزت دار ہو گیا تھا کہ آپ نے اس کو ہجوم سے بلوا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے پاس بٹھایا۔

نوجوان حسین نے شیخ سے عرض کیا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو اس ضمن میں کچھ یہ ناچیز بھی عرض کر دے۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''بالکل، بالکل۔ اجازت ہے۔ کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

نوجوان حسین نے جواب دیا۔ ''آج کل بعض واعظین بھی حق تلفیاں کرتے ہیں۔''

شیخ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟ کیا ان میں، میں بھی شامل ہوں؟''

حسین نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں آپ ان میں شامل ہیں یا نہیں لیکن دوسرے بہت سے واعظین ان میں ضرور شامل ہیں۔''

شیخ کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، پوچھا۔ ''بابا حسین! کس طرح؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔''

حسین نے جواب دیا۔ ''شیخ! وہ واعظین جو اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت اور خوف و خشیت کے پہلو کو دبا کر اس کی رحمت اور مغفرت کے پہلو کو ابھار دیتے ہیں۔ یہ بندوں کی حق تلفی کرتے ہیں کیونکہ اس سے لوگوں میں معصیت کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔''

شیخ نووارد نوجوان حسین کی باتوں سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ ''حسین اپنے جد اعلیٰ حمید الدین سوالی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ ایسی جچی تلی اور پُرعزم باتیں حمید الدین سوالی کا خون ہی کر سکتا ہے۔''

حسین نے کہا۔ ''شیخ! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب آپ اپنا وعظ جاری رکھیں۔''

شیخ نے حاضرین کو مخاطب کیا۔ ''تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں سے ایک دفتر ایسا ہے جو بخشا نہیں جا سکتا اور یہ ہے کفر و شرک کا دفتر۔ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف نہیں کرے گا۔ دوسرا دفتر وہ ہے جو بخشا جا سکتا ہے اور اس دفتر کا

تعلق ہے ان حقوق اور فرائض سے جو اللہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بندوں پر فرض ہیں۔ تیسرا دفتر وہ ہے جسے ترک نہیں کیا جاسکتا اور یہی وہ دفتر ہے جس کا تعلق بندوں سے ہے یعنی بندوں کے حقوق بندوں پر۔ اگر کسی بندے کے حقوق تلف کیے گئے ہیں تو اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا جب تک متعلقہ بندہ یا بندے خود معاف نہ کردیں۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”اے لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے؟“ آپ ﷺ کے صحابیوں نے جواب دیا۔ ”ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ ساز و سامان۔“

آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”ہاں، دنیا کی نظروں میں یہی مفلس ہوگا لیکن میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزے اور حج وزکوٰۃ اپنے ساتھ لائے گا مگر اس حال میں کہ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر اتہام لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا تو ان میں سے ہر ایک کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی اور اگر تمام مطالبات پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ اس نمازی، روزے دار، حاجی اور زکوٰۃ ادا کرنے والے پر ڈال دیا جائے گا جس نے ان کے حقوق تلف کیے ہوں گے اور یہ مفلس شخص جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔“

مجلس میں سناٹا طاری تھا۔ اس پُراثر وعظ نے سامعین کو خوفزدہ کردیا۔ ان کے دل و دماغ میں خشیت الٰہی نے جگہ بنالی تھی۔ ان میں بعض تو اپنے گھٹنوں میں سر ڈالے زار و قطار رو رہے تھے۔ انہیں اپنا ماضی، اپنا کردار یاد آرہا تھا اور وہ حق تلفیاں جو نادانستگی میں ان سے سرزد ہوچکی تھیں۔ اس ہنگامہ خیز وعظ نے سننے والوں میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا اور انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ان لوگوں سے معافیاں مانگیں گے جن کی ان سے حق تلفیاں ہوچکی ہیں اور اس وقت تک معافی مانگتے رہیں گے جب تک انہیں معاف نہیں کردیا جائے گا۔

شیخ کو حسین ناگوری بہت اچھے لگے تھے۔ انہوں نے تخلیے میں حسین سے پوچھا۔ ”بابا حسین! اب تم کہاں جاؤ گے؟“

حسین نے جواب دیا۔ ”حضرت! ناگور سے چل کر گجرات آیا ہوں۔ اب یہاں سے کہاں جاؤں گا؟“

شیخ بہت خوش ہوئے، بولے۔ ”حسین! تم یہاں رہو، میرے بیٹے کی طرح، صالح، نیک اور جانشین بیٹے کی طرح۔ میں تم پر فخر کرسکوں گا۔“

اس وقت تک حسین نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ شیخ نے انہیں ظاہری علوم کے ساتھ ہی باطنی علوم کا درس دینا شروع کردیا۔ اکتساب علوم کا یہ حال تھا کہ شیخ حیران رہ جاتے۔ انہیں ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ حسین کو وہ پڑھا نہیں رہے ہیں بلکہ پڑھے ہوئے اسباق کی نظر ثانی کرا رہے ہیں۔ آخر کچھ عرصے بعد شیخ نے ان سے کہہ دیا۔ ”بابا حسین! میں تمہیں کیا پڑھاؤں۔ ایسا لگتا ہے گویا سب کچھ تو تمہارا پڑھا ہوا ہے۔“

حسین نے عاجزانہ عرض کیا۔ ”حافظے اور مذاق نے آپ کو مغالطے میں ڈال دیا ہے ورنہ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں جو کچھ بھی حاصل کر رہا ہوں، آپ ہی سے حاصل کر رہا ہوں۔“

شیخ نے اپنے ہونہار مرید میں تقریر اور وعظ کی زبردست صلاحیت اول دن سے ہی محسوس کرلی تھی۔ جب کسی موضوع پر بولتے تھے تو موتی رولتے چلے جاتے تھے۔ لفظوں کا برمحل اور مناسب ترین انتخاب اور استعمال ان کے مافی الضمیر کی شاندار ترجمانی کرتا تھا۔ بعض مریدوں کو شیخ کی خصوصی توجہ گراں گزرتی تھی اور وہ آپس میں بیٹھ کر حسین اور شیخ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

کسی مرید نے دوسرے سے پوچھا۔ ”کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ شیخ اس نووارد اور اجنبی نوجوان پر اتنے زیادہ کیوں مہربان ہیں؟“

کسی دوسرے مرید نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں۔“

پہلے مرید نے پوچھا۔ ”تب پھر چپ کیوں ہو، بتاؤ ذرا میں بھی تو وہ خاص بات سنوں جس نے حسین کو شیخ کی نظروں میں تارا بنا کر رکھ دیا ہے۔“

دوسرے مرید نے جواب دیا۔ ”سنتے ہیں حسین مشہور صوفی شیخ حمید الدین ناگوری سوالی کے اخلاف میں سے ہیں۔ بس یہی نسبت خاص ان کے لیے کافی ہے۔“

ایک اور مرید سرد آہ بھر کر بولا۔ ”اے کاش ہم بھی کسی مشہور خانوادے یا مشہور شخص کے بیٹے ہوتے، ہمیں بھی یہی عزت اور توقیر حاصل ہوجاتی۔“

یہ باتیں شیخ کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک دن آپ نے ایسے تمام مریدوں کو اپنے سامنے بٹھایا اور ان سے

پوچھا۔ ''ہم نے سنا ہے تم سب آپس میں یہ پوچھتے رہتے ہو کہ میں خواجہ حسین کو اتنی زیادہ اہمیت اور عزت کیوں دیتا ہوں؟''

مریدوں کے چہرے فق ہو گئے اور ان میں سے اتنی جرأت کسی ایک میں بھی نہ تھی کہ وہ کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیتا کہ ہاں ہم وہ وجہ، خصوصیت اور اہمیت جاننا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے آپ نے اس نووارد کو اپنے سر چڑھا لیا ہے اور اپنے دل میں بٹھا لیا ہے۔

شیخ اپنے معترض مریدوں کی شکلیں دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے اپنے معترض مریدوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ وہ کمالِ محبت پر تقریر کرے۔ ایسی تقریر جو وعظ بن جائے، وعظ کہلائے۔

وہ مرید کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر کھنکھار کھنکھار کر اپنا گلا صاف کرتا رہا اور بار بار یہی کہتا رہا کہ ''معزز سامعین! کمالِ محبت کہتے ہیں اس جذبے کو جو......'' اور اس کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی ہو۔

آپ نے ایک دوسرے مرید کو حکم دیا۔ ''تم وعظ شروع کرو، شکل کیا دیکھتے ہو؟''

یہ مرید بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی بولنے کی بار بار کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ وعظ کے لیے اس کو مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

اب شیخ نے سبھی کو مخاطب کیا اور فرمایا۔ ''تم میں کوئی ایسا ہے جو کمالِ محبت پر لب کشائی کر سکے؟''

مریدوں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی اور ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جو سامعین کو مسحور اور از خود رفتہ کر دیتا۔

آخر خواجہ حسین کا نمبر آ گیا۔ مرشد نے انہیں مخاطب کیا اور کہا۔ ''بابا حسین! خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ آؤ اور میری طرح انہیں بھی مسحور کر دو۔''

حسین اپنی جگہ سے اٹھے اور پیر مرشد کے قدموں میں کھڑے ہو گئے۔ دل و دماغ میں اتر جانے والی نگاہ سامعین پر ڈالی اور بولنا شروع کر دیا۔ ''سامعین کرام! کیا آپ جانتے ہیں کہ محبت اور ملکیت ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ اپنی جان، اپنا مال اور اپنا نفس سب کچھ اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ اللہ کے تصرفات پر اعتراض نہیں کرتا۔ اللہ کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے، اسے قبول کر لیتا ہے۔ ایک سمت (یعنی اللہ) کے سوا جملہ سمتیں اس کے لیے بند ہو جاتی ہیں۔ اے اللہ کی محبت کا دعویٰ کرنے والے! جب تک تیرے حق میں جملہ اطراف مسدود ہو کر صرف ایک طرف باقی نہ رہ جائے گی، تیری محبت کامل نہ ہو گی۔ جب محبت رگ رگ میں سما جاتی ہے اس وقت کسی کی نصیحت ایسی لگتی ہے گویا ٹھنڈے لوہے پر چوٹ لگائی گئی ہو۔ نصیحت بیکار و بے اثر ہو جاتی ہے۔''

حسین کی تقریر سننے والوں کے دلوں میں اترتی جا رہی تھی۔ اچانک تقریر نے ایک عجیب انداز اختیار کر لیا۔ حسین اپنی تقریر کے نشے میں ڈوب چلے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''اے اللہ! ہمیں اپنی رحمت سے مایوس نہ کر کیونکہ اس صورت میں ہم دنیا اور وجود کے دریا میں ڈوب جائیں گے۔ اے کرم، عقل اور تقدیر کے بخشنے والے! ہمیں سہارا دے اور اے وہ شخص جو میری باتیں سن رہا ہے، میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ کیا تو میری باتوں پر عمل کرے گا؟ عمل تو، تو اس وقت کرے گا جب تو میری باتیں سمجھے گا لیکن میں جانتا ہوں کہ تو مجھ سے حسنِ ظن نہیں رکھتا۔ جب تو مجھ سے حسنِ ظن رکھے گا تو میری بات بھی سمجھے گا لیکن جب حسنِ ظن ہی نہیں اور میں جو کچھ کہتا ہوں، اس پر تیرا یقین ہی نہیں تو پھر تو میری بات کس طرح سمجھے گا؟ تو بھوکا ہے اور میرے سامنے کھڑا ہے۔ تو میرے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوتا پھر تیرا پیٹ کیونکر بھرے گا؟

''لوگو! تم بیمار ہو مگر خوش فہمی سے خود کو تندرست سمجھتے ہو۔ تمہارے پاس کھوٹ ہے مگر تم اس کو اصل اور جوہر سمجھتے ہو۔ تم جھوٹے ہو مگر خود کو سچا سمجھتے ہو۔ میرا تمہارے ساتھ یہی کام ہے کہ تم کو جھوٹ سے منع کروں اور سچ کی تلقین کروں۔ تم مجھ سے پوچھو گے کہ سچ کیا ہے اور میں اس کو کس طرح پرکھتا ہوں؟ تو سنو، میری باتیں بہت غور سے سنو۔ میرے پاس تین کسوٹیاں ہیں، کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے لیے۔ اللہ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور میرا قلب۔ آخری کسوٹی یعنی قلب پر عکس پڑتا ہے۔ قلب اس وقت تک مطمئن اور راضی نہیں ہوتا جب تک کتاب اور سنت سے اس کی تصدیق نہیں ہو جاتی۔ سامعین کرام! علم پر عمل کرنا علم کا تاج ہے۔ علم پر عمل کرنا علم کا نور ہے۔ صفائی کی صفائی، جوہر کا جوہر اور مغز کا مغز ہے۔ علم پر عمل کر کے قلب پاک صاف ہو جاتا ہے۔ جب قلب درست ہوتا ہے تو بقیہ اعضاء بھی درست اور پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ جب قلب کو خلعت (تقویٰ) عطا ہوتا ہے تو جسم کو بھی خلعت مل جاتا ہے۔ جب گوشت کے اس ٹکڑے کی اصلاح ہو جاتی

ہے تو بدن کی اصلاح بھی ہوجاتی ہے۔ قلب کی صحت اس باطن کی صحت پر موقوف ہے جو پروردگار اور انسان کے درمیان ہے۔ باطن پرندہ ہے اور دل اس کا پنجرہ، دل پرندہ ہے تو بدن اس کا پنجرہ، قبر ساری مخلوق کا پنجرہ ہے کیونکہ انجام کار سبھی کو اس میں جانا ہے۔''

حسین کے وعظ نے ہر دل پر ایک سحر طاری کردیا تھا۔ آج ان کے مخالفین اور حاسدین کو ان کے مرتبے اور مقام کا صحیح اندازہ ہوا تھا۔

شیخ بھی اس سحر میں گرفتار تھے۔ جب سکوت ہوا تو انہیں ہوش آیا اور انہوں نے حاضرین سے پوچھا۔ ''تم لوگ اب حسین کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

کئی مریدوں نے کھڑے ہوکر معافی مانگی اور کہا۔ ''بخدا ہمیں حسین کی اس عظمت کا کوئی علم ہی نہ تھا۔ آج ہم بہت شرمندہ ہیں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''شرمندہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ بابا حسین بہت نیک ہے۔ اس سے معافی مانگ لو، معاف کردے گا۔ تم لوگوں نے اس کا بہت دل دکھایا ہے۔ اب اس کی تلافی اسی طرح ممکن ہے کہ تم اس شریف انسان سے معافی مانگ لو۔''

معافی چاہنے والوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور معافی مانگنے لگے۔ آپ نے ہر شخص کو بہت آسانی سے معاف کردیا۔

شیخ نے ان سے کہا۔ ''بابا حسین! میں یہ محسوس کررہا ہوں کہ خدا نے تمہیں جو کچھ دے رکھا ہے، وہ کافی ہے اور میں اس میں مزید اضافہ نہیں کرسکتا۔''

حسین اپنے پیر مرشد کی منشا سمجھ گئے، پوچھا۔ ''پھر اب میں کہاں جاؤں؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''پہلے اجمیر جاؤ اور سلطان الہند کے دربار میں حاضری دو۔ وہی تمہارے جدِ اعلیٰ کے مرشد تھے، وہیں سے تمہیں کل کے لیے حکم اور اجازت ملے گی۔''

ان کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اپنے شیخ سے جدا ہوں لیکن مرشد کی ایما پا جانے کے بعد وہ گجرات میں مزید رک بھی نہیں سکتے تھے۔ چپ چاپ اجمیر کے لیے روانہ ہوگئے۔

خواجہ حسین پہلی بار اجمیر جارہے تھے۔ آپ اس مشہور اور مقدس جگہ کے لیے اپنے دل میں بے پناہ جذبۂ عقیدت محسوس کررہے تھے۔ ان دنوں یہ جگہ زیادہ آباد نہیں تھی۔ آپ ایک جنگل کے کنارے پر تنہا چھوڑ دیے گئے۔ جس قافلے نے آپ کو یہاں تک پہنچایا تھا اس نے اس جنگل کے پاس سے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔ قافلے والوں نے اس جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب! اس جنگل کے اس پار اجمیر ہے اور قافلہ اس جنگل میں نہیں جائے گا۔''

خواجہ حسین نے پوچھا۔ ''کیوں، اس جنگل میں کیا خاص بات ہے؟''

میرِ قافلہ نے جواب دیا۔ ''یہ جنگل درندوں کا مسکن ہے اس لیے انسان اس جنگل میں نہیں جاتے۔''

خواجہ حسین نے اس ہرے بھرے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اجمیر میں داخلے کا اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے؟''

میرِ قافلہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، کئی راستے ہیں لیکن ہر راستے میں اس قسم کا جنگل ضرور ہے اور یہ جنگل درندوں کے مسکن ہیں۔''

خواجہ حسین نے قافلے والوں کو چھوڑ دیا اور جنگل کی طرف جاتے ہوئے بولے۔ ''جنگل میں شیر ہوں یا بھیڑیے، مجھے تو خواجہ معین الدین چشتی کے دربار میں حاضری دینا ہی ہے۔''

میرِ قافلہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، بولا۔ ''جوان انسان! تو مجھے ضرورت سے زیادہ عاقبت نااندیش نظر آتا ہے۔ درندے تجھے کھا جائیں گے۔''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں جس کے دربار میں جارہا ہوں وہ ہندوستان کا سلطان ہے اور اس سلطان کا اقبال ہر جگہ کارفرما ہے۔ یہاں تک کہ جنگل کے درندے بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو میں اس سلطان کے اقبال کے زیرِ سایہ بحفاظت اجمیر میں داخل ہوجاؤں گا۔''

قافلے والے افسوس ہی کر سکتے تھے، وہ افسوس کرتے رہے اور آپ اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ خودرو درختوں اور پودوں کی جھاڑیاں ان کا راستہ روک رہی تھیں اور بڑے بڑے اونچے اونچے گھنیرے درختوں نے شام کی سیاہی جیسا اندھیرا پھیلا رکھا تھا۔ یہاں کہیں اور کسی طرف سے بھی ان پر حملہ ہو سکتا تھا۔ احتیاط اور حفاظت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

چلتے چلتے جب کچھ تکان محسوس ہوئی تو آپ ایک درخت کے سائے میں آرام کرنے لگے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پُرلطف ہواؤں نے سکون پہنچایا اور ان کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر بعد پرندوں کے شور سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں اپنے قریب ہی کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ آس پاس کا جائزہ جو لیا تو دیکھا ان سے دس بارہ قدم دور ایک شیر لیٹا ہوا ہے اور اس کے آس پاس درختوں پر پرندے شور کر رہے ہیں۔ جب یہ شیر کی طرف دیکھ رہے تھے تو شیر نے بھی ان کی طرف دیکھا۔ اس کی لاتعلقی بتا رہی تھی کہ اس کو حسین کی کوئی فکر نہیں اور نہ وہ حسین میں کسی قسم کی دلچسپی لے رہا ہے۔ حسین اٹھ کر بیٹھ گئے اور شیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تو یہاں کیوں لیٹا ہے مگر تیری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ہندوستان کے بادشاہ خواجہ معین الدین سنجری چشتی کے دربار میں جا رہا ہوں۔''

اپنی باتوں کے دوران حسین کو یہ احساس ہوا کہ ان کے گرد و پیش شیر کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ ان کی تیز اور متجسس نگاہوں نے ان بھیڑیوں، چیتوں اور دوسرے درندوں کو بھی دیکھ لیا جو شیر کے آس پاس اس سے دور گویا موقع کی تلاش میں کھڑے تھے لیکن شیر کی موجودگی انہیں آگے نہیں آنے دے رہی تھی۔

حسین کو پہلے تو کسی قدر خوف سا محسوس ہوا مگر اللہ کو اپنے دل میں بسا کے اور اس کا نام لے کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں شیر کے پاس سے گزرنا تھا۔ حسین نے شیر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اے درندے! مجھے نہیں معلوم کہ تو کس کے حکم اور کس نیت سے یہاں آیا ہے لیکن میں اپنی نیت سے آگاہ ہوں۔ میں اللہ کا بندہ، اللہ ہی کے حکم سے ہند کے سلطان کے دربار میں جا رہا ہوں۔ اگر تجھ کو اللہ کی طرف سے یہ حکم مل چکا ہے کہ تو مجھے ہلاک کر کے اپنی غذا بنالے تو میں راضی بہ رضائے الٰہی ہوں۔ تو اپنا کام کر۔ میں دم بھی نہ ماروں گا اور اگر تجھ کو میری ہلاکت اور تغذیہ کا حکم نہیں ملا ہے تو مجھ کو جانے دے اور دوسرے درندوں سے میری حفاظت کر۔''

اتنا کہہ کر آپ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ شیر بھی آپ کے آگے آگے چلنے لگا۔ شیر کی موجودگی میں کسی بھی درندے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ حسین کے قریب آتا۔

حسین اس خطرناک جنگل سے بخیر و خوبی اور آرام کے ساتھ نکل گئے۔ اب اجمیر ان کے سامنے تھا۔ یہاں حضرت خواجہ کے مزار پر اس وقت تک کوئی عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے مزار پر حاضری دی اور دست بستہ عرض کیا۔ ''حضرت! میرے جدِ اعلیٰ حمید الدین ناگوری آپ کے مرید تھے۔ انہوں نے آپ سے فیض پایا۔ اب میں آپ کے پاس امیدِ کرم لے کر حاضر ہوا ہوں۔ مجھ پر بھی لطف و کرم کی پھوار پڑ جائے، آپ کی نوازش زبان زدِ خلائق ہے۔''

آپ نے خواجہ غریب نواز کے روضے کی تعمیر کا آغاز کیا۔ آپ نے روضے کی عمارت کی بنیاد ڈالی اور محنت و مشقت کے دوران فرماتے رہے۔ ''یہ کیا بات ہے کہ سلطان الہند کی آخری آرام گاہ یوں بے عمارت رہے۔''

آپ اس عمارت کی جتنی تعمیر تن تنہا کر سکتے تھے، کرتے رہے۔ خواجہ حسین کے شیخ نے ان سے کہا تھا کہ تمہیں اب جو کچھ ملے گا، اجمیر سے ملے گا چنانچہ خواجہ حسین اللہ سے لو لگائے خواجہ کے در پر پڑے ہوئے تھے۔

دوپہر کی شدید گرمی میں خواجہ حسین نے چند مسافروں کو پانی پلایا اور پھر عمارت کے طاق میں اور دیواروں پر پرندوں کے لیے پانی سے لبریز پیالے رکھ دیے۔ دھوپ اور گرمی کے ستائے ہوئے پرند اس پانی سے اپنی پیاس بجھانے لگے۔ اس دن دوپہر کے بعد ظہر کی نماز حضرت خواجہ کے مزار کے پاس ادا کی اور وہیں قدموں میں سو گئے۔ خواجہ حسین کو ایسا لگا گویا وہ سو نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے خواب میں دیکھا حضرت خواجہ غریب نواز ان کے پاس کھڑے انہیں غور سے دیکھ رہے ہیں۔ خواجہ حسین ادب سے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا۔ خواجہ غریب نواز نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا۔ ''خواجہ حسین! تُو نے جس طرح ہماری خدمت کی ہے، خدا اس کا شاندار اجر عطا فرمائے گا۔''

خواجہ حسین نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں تو گجرات کے شیخ کبیر کے پاس گیا تھا۔ ان سے میں نے فیض بھی حاصل کیا لیکن بعد میں انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اجمیر جاؤں، چنانچہ میں آ گیا اور اب آپ کے سامنے موجود ہوں۔''

حضرت خواجہ اجمیری نے فرمایا۔ ''بابا حسین! اچھا کیا جو یہاں آ گئے۔ کچھ دن یہیں میرے قریب رہو، اس کے بعد اپنے

وطن ناگور چلے جانا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ناگور ہی کو پسند فرمایا ہے۔ وہیں جا کر رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کرنا۔"
خواجہ حسین نے عرض کیا۔ "حضور بندہ نواز! بندے کی تو یہ خواہش تھی کہ اسے یہیں اجمیر ہی میں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔"
جواب ملا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تُو ناگور جائے گا اور وہاں کے لوگوں کو اپنی تعلیمات سے فائدہ پہنچائے گا۔"
خواجہ حسین کو اس وقت جتنا سکون اور جتنی خوشی میسر آرہی تھی، وہ ناقابل بیان تھی۔ پورا ماحول، پوری فضا مہک رہی تھی۔ ہر طرف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ ایک کیف، ایک نشہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ان کا پورا وجود اس کیف، اس نشے میں ڈوبتا جارہا تھا۔ خواجہ حسین نے ایک بار پھر عاجزی سے عرض کیا۔
"حضرت! مجھے اجمیر ہی میں رہنے دیجیے۔ اس مقدس اور پاک بستی میں۔ یہاں کا ذرہ ذرہ میری آنکھوں کا تارا اور دل کو پیارا ہے۔"
خواجہ غریب نواز نے جواب دیا۔ "صاحبزادے! مشیتِ ایزدی نے تیرے لیے ناگور کو مخصوص کر دیا ہے۔ اب اس زمین میں تو پہنچے گا اور سلوک کی راہ طے کرے گا۔ جا، ناگور جا، تیرے ہم وطن تیرا انتظار کر رہے ہیں اور اپنی محبت اور ریاضت سے تو نے جو کچھ یا جتنا کچھ حاصل کر لیا ہے اس سے اہالیانِ ناگور ہی کو فیض پہنچنا چاہیے۔"
خواجہ حسین نے مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔ اسی وقت آنکھ کھل گئی۔ وہاں وہ تنہا پڑے ہوئے تھے اور وہاں کی فضا خوشبو سے مہک رہی تھی۔
اب انہیں ناگور جانے کی اجازت مل چکی تھی۔ خواجہ حسین نے یہاں کچھ دن مزید قیام کیا اور پھر ناگور چلے گئے۔ ناگور والوں کو آپ کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی۔ یہاں آپ نے شادی بھی کر لی اور پہلے سے بھی زیادہ ریاضت کرنے لگے۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیلتی جارہی تھی۔ ناگور والے آپ پر جان چھڑکتے تھے۔
کچھ دنوں بعد خواجہ حسین نے اپنے ارادت مندوں سے مشورہ کیا، کہا۔ "دوستو! جیسا کہ آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں مولانا حمید الدین سوالی کی نالائق اولاد ہوں۔"
ابھی آپ یہیں تک ہی کہہ سکے تھے کہ ایک ارادت مند کھڑا ہو گیا، بولا۔ "شیخ! آپ کا جو منصب ہے وہ آپ کو جھوٹ نہیں بولنے دے گا۔ کیا آپ مجھے یہ بتائیں گے کہ آپ نے ہم سے یہ تعارف کیوں نہیں کرایا تھا کہ آپ حضرت حمید الدین ناگوری سوالی کی اولاد میں سے ہیں۔ اور یہ کہ......"
آپ نے اس کی بات کاٹ دی، فرمایا۔ "اے بھولے بھالے انسان! مجھے ذاتی طور پر وہ تعارف پسند نہیں، جس میں کسی کی تعریف و توصیف اس کے اعلیٰ خاندان اور ولی صفت انسانوں کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ حالانکہ کسی کا صحیح تعارف یہ ہے کہ انسان کی شناخت اور پہچان اس کے اپنے نام اور کام کے حوالے سے کی جائے۔"
آپ کے ارادت مند آپ کی باتوں سے اس حد تک متاثر اور مرعوب تھے کہ اب ان میں سے کسی کی بھی بولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔
آپ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا۔ "لوگو! میں اپنی بات کو بلاوجہ کیوں طول دوں، میں اپنے جدِ امجد کا عرس کرنا چاہتا ہوں اور لوگوں کو اس عرس کا کھانا کھلانا چاہتا ہوں کیونکہ اس وقت میں جو کچھ بھی ہوں، انہی کے لطف و کرم سے ہوں۔"
کئی مریدوں نے بڑی سرگرمی اور جوش سے جواب دیا۔ "آپ یہ عرس ضرور کریں، ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور آپ ہم سے جو خدمت لینا چاہیں ہم انجام دینے کو تیار ہیں۔"
آپ نے مریدوں اور ارادت مندوں کی سرگرمی اور جوش کو دیکھتے ہوئے شاندار عرس کی تقریب منعقد کر دی۔ اس تقریب میں آپ نے اپنی طرف سے جو کھانا تیار کرایا تھا وہ تو تھا ہی، اس کے علاوہ ناگور والوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان لوگوں نے چاول اور ساگ کی کئی دیگیں اپنی طرف سے پکوائی تھیں۔ پورا ناگور اور قرب و جوار کے لوگوں نے اس کھانے کو جی بھر کے کھایا۔ آپ نے اس روز روزہ رکھ لیا تھا اور اس کھانے میں سے اپنا حصہ الگ کر کے اپنی افطار کا بندوبست کر لیا تھا۔
شام کو افطار سے کچھ دیر پہلے چار اجنبی آپ کے پاس آئے اور دور ہی سے آواز بلند کی۔ "خواجہ حسین کہاں ہیں؟ ذرا انہیں بلوانا تو۔"

خواجہ حسین اندر افطار کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ جب آپ نے یہ آواز سنی تو کسی مرید سے کہا۔ ''باہر جا کر دیکھنا تو سہی، یہ کون لوگ ہیں؟ کتنے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟''

مرید باہر گیا تو وہاں چار اجنبی چہرے اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ مرید نے پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''اللہ کے بندے۔''

مرید نے دوسرا سوال کیا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''اللہ کے شہر سے۔''

مرید نے تیسرا سوال کر دیا۔ ''کیوں آئے ہو؟''

تیسرے نے جواب دیا۔ ''اللہ کے ایک نیک بندے سے ملاقات کرنے۔''

مرید نے کہا۔ ''تب پھر تم لوگ اللہ کے اس نیک بندے کا انتظار کرو۔ افطار اور نماز کے بعد ملاقات ہو جائے گی۔''

چوتھے نے طنزاً کہا۔ ''واہ بابا! یہ کیا بات ہوئی۔ اللہ کا نیک بندہ اکیلے اکیلے افطار کرے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا، ہم بھی تو اس کے پاس بھوکے آئے ہیں۔ اس سے کہہ دو کہ یہ مروت سے بعید ہے، ملنا ہے تو ابھی ملے۔ اس کے بعد تو ہم خود نہیں ملیں گے۔''

مرید نے ان چاروں میں ایک مرض مشترک دیکھا۔ یہ چاروں کسی جلدی مرض میں مبتلا تھے اور ان کے ہاتھ قطعی اس لائق نہیں تھے کہ کوئی صحت مند انسان ان کے پاس یا ان کے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھاتا پیتا۔ مرید نے سوچا ان چاروں کو مرشد سے نہیں ملوانا چاہیے۔ یہیں سے ٹال دینا چاہیے۔ چنانچہ مرید نے کہا۔ ''صاحبان! آپ کے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ کچھ توقف فرمائیں۔ رہ گیا افطار اور کھانے کا مسئلہ تو اس کا انتظام میں خود کر دوں گا۔''

ایک نے ذرا بے مروتی اختیار کی، بولا۔ ''تو کون ہوتا ہے بچر بچر کرنے والا۔ ہم خواجہ حسین کے پاس آئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے بارے میں جو کچھ پوچھا تھا، تجھ کو بتا دیا گیا۔ اب تو اندر جا اور ہماری باتیں ان تک پہنچا دے۔ بابا حسین ہم سے ملنا چاہیں گے تو مل لیں گے، نہیں ملنا چاہیں گے تو ویسا بتا دیں گے۔''

مرید جز بز ہو کر اندر گیا اور آپ سے کہا۔ ''پیر مرشد! عجیب گندے اور ضدی مہمان آئے ہیں۔ چاروں کے ساتھ کوئی شریف آدمی گھڑی دو گھڑی بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرے گا چہ جائیکہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''وہ کہتے کیا ہیں؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''وہ کہتے ہیں ہم اسی وقت آپ سے ملاقات کریں گے۔ جب میں نے ان سے یہ کہا کہ پیر مرشد نے آج روزہ رکھا ہے تو وہ کہنے لگے کہ ہم بھی روزے سے ہیں اور ہم چاروں ان کے ساتھ ہی افطار بھی کریں گے اور کھانا بھی کھائیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ بات ہے تو میں ان کے پاس جاتا ہوں۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''پیر مرشد! جیسا کہ میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت آپ کا ان کے پاس جانا ٹھیک نہیں ہے۔ بخدا ان کا گھناؤنا مرض آپ کو پریشان کر دے گا اور آپ مہینوں اپنی طبیعت پر قابو نہیں پا سکیں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''کوئی بات نہیں۔ وہ چاروں میرے مہمان ہیں۔ مجھ سے ملنے آئے ہیں چنانچہ میرا فرض ہے کہ میں ان کی تواضع کروں، دل جوئی کروں، میں ان سے ابھی اور اسی وقت ملوں گا۔''

مرید نے آخری بار کوشش کی کہ یہ باہر نہ جائیں۔ اس نے کہا۔ ''حضرت! خدا کے لیے آپ ان کے پاس نہ جائیں۔ وہ بڑے ڈھیٹ اور گھناؤنے لوگ ہیں۔ آپ خوامخواہ پریشان ہو جائیں گے ان سے مل کر۔''

لیکن آپ نہیں مانے اور باہر چلے گئے۔ چاروں درویش انہیں دیکھتے ہی بُرا بھلا کہنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''بابا حسین! ہم نے تو آپ کا بڑا شہرہ سنا تھا لیکن آپ کے مرید نے تو آپ کی تصویر ہی بگاڑ کر رکھ دی۔''

دوسرے نے کہا۔ ''بابا! وہ تو ہم سے ایسی بحث کرنے لگا کہ ہم کیا کہیں۔''

تیسرا بولا۔ ''اور کمال تو یہ ہے کہ اس نے ہمیں کھانے تک کو نہ پوچھا۔''

چوتھے نے کہا۔ ''ہم نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ جب ناگور آئے ہیں تو ہم آپ سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔ چاہے ہمیں کتنا ہی انتظار کرنا پڑے۔''

خواجہ حسین نے دیکھا، ان کی انگلیوں سے خون رس رہا ہے۔ انہیں کراہت تو ہوئی لیکن پھر بھی بڑے تحمل سے جواب

دیا۔ ”بزرگو! میرے مرید نے اگر آپ کو کسی قسم کی تکلیف پہنچائی ہے تو میں اس پر شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔“

درویش مسکرانے لگے۔ ایک نے بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کیا، کہا۔ ”بابا! تم بھی کیا کہو گے۔ چلو معاف کیا لیکن شرط یہ ہے کہ ہمیں افطار کراؤ، کھانا کھلاؤ لیکن تم خود بعد میں کھاؤ وہ بھی پس خوردہ۔ ہم جو کھانا چھوڑیں گے، وہ تم کھاؤ گے۔“

یہ بڑے ظلم و کراہت کی بات تھی لیکن آپ نے ان کی یہ شرط مان لی۔

مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے اپنے حصے کا کھانا ان کے پاس ہی منگوالیا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ ان درویشوں نے ہاتھ دھوئے بغیر کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے سوچا، یہ کیسے درویش ہیں کہ مغرب کی اذان کا بھی انتظار نہیں کیا اور کھانا کھانے لگے۔

وہ کھا رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ایک نے آپس ہی میں کہا۔ ”بھائیو! بابا حسین بہت پریشان ہے کہ ہم نے ذرا پہلے ہی افطار کیوں کر لی۔ اب اس کو بتاؤ کہ ہم مسافر ہیں اور حالتِ مسافرت میں روزہ فرض ہی نہیں۔“

آپ شرمندہ ہو گئے۔ وہ چاروں کھانا کھاتے رہے اور آپ پر ہنستے رہے۔ آخر میں ایک جھوٹا، تھوڑا سا کھانا ان کے لیے چھوڑ دیا، بولے۔ ”بابا! ہم ناانصاف لوگ نہیں ہیں، یہ تمہارا اصلہ ہے۔ اس کو تم کھالو۔“

خواجہ حسین نے ان کا پس خوردہ لے لیا اور جیسے ہی اذان ہوئی، اس سے افطار کرنے لگے اور افطار کے بعد نماز ادا کی اور سلام پھیرنے کے بعد اپنے پیچھے دیکھا تو وہ چاروں درویش شاید کہیں اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ آپ کو حیرت تو ہوئی لیکن کچھ بولے نہیں۔

نماز کے بعد آپ نے کھانا کھایا اور اب جو دوبارہ مڑ کر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چاروں درویش موجود ہیں اور انہیں کھانا کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ وہ چاروں بہت خوش ہوئے۔

ایک نے پوچھا۔ ”بابا حسین! تم نے ہماری یہ زخمی انگلیاں دیکھیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں دیکھیں، کیوں پھر؟“

دوسرے نے پوچھا۔ ”تمہیں ان سے گھن نہیں آئی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، آپ اللہ والے لوگ ٹھہرے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔“

تیسرے نے اٹھ کر آپ کو گلے لگالیا، کہا۔ ”شاباش بابا حسین! تم امتحان میں پورے اترے۔ اللہ نے چاہا تو آج کے بعد تم کامل ہو جاؤ گے۔“

اس کے بعد بقیہ تین نے بھی انہیں باری باری گلے سے لگایا اور انہیں دعائیں دیں۔ اب جو آپ نے انہیں دیکھا تو وہ سارے کے سارے اچھے خاصے صاف ستھرے کھڑے تھے۔ ان کی انگلیاں بالکل صحیح تھیں۔ ان سے خون نہیں ٹپک رہا تھا۔ خوبصورت، پاک صاف، شہزادوں جیسے۔

آپ کو وہ چاروں دعائیں دیتے رہے۔

اب تو آپ نے اپنے آپ میں ایک عجیب سی طمانیت محسوس کی۔ آپ خود کو مالا مال محسوس کر رہے تھے۔

آپ نے ان سے پوچھا۔ ”بزرگو! آپ نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔“

ایک درویش نے جواب دیا۔ ”ہم عالمِ بالا کے لوگ، کبھی کبھی اللہ کے نیک بندوں کو اس کے حکم سے جب کچھ دینے آتے ہیں تو اسی طرح پہلے انہیں آزمائش میں ڈال دیتے ہیں پھر جب وہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو جو کچھ انہیں دینا ہوتا ہے، بخش کر چلے جاتے ہیں۔“

باتیں کرتے کرتے آپ نے دیکھا وہ چاروں درویش ہوا میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ اب ان کا کہیں وجود تک نہ تھا۔ آپ خاموشی سے اندر گئے اور مرید سے کہا۔ ”آج تو نے ان درویشوں کو ناراض کر کے ہمارا بڑا نقصان کر دیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہم نے اس بگڑے معاملے کو سنبھال لیا۔“

مرید نے کہا۔ ”کیا آپ نے ان زخمی گھناؤنے درویشوں پر غور نہیں کیا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”غور کرنا کیا معنی۔ میں نے تو ان چاروں کا پس خوردہ تک کھایا ہے۔“

مرید کو حیرت تھی کہ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”اللہ کے بندے! نظر پیدا کر، حوصلہ پیدا کر، اللہ کے بندوں کو پہچاننے والی نظریں پیدا کر۔ وہ کون تھے، کیا دینے آئے تھے، کس کے حکم سے آئے تھے؟ یہ ساری راز کی باتیں تھیں

اور میں خوش ہوں کہ میں نے انہیں سمجھنے اور پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔"

مرید حیرت سے آپ کی باتیں سنتا رہا۔ وہ کچھ دیر بعد باہر گیا اور درویشوں کو تلاش کیا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ مرید نے سوچا، یہ تھا کیا؟ درویش کہاں چلے گئے اور یہ پیر مرشد ان کے لیے کیا فرما رہے ہیں۔

ناگور میں یہ دستور تھا کہ ان کے ساز و سامان میں ایک گھوڑا گاڑی کا ہونا بہت ضروری تھا اور لوگ سوجتن کر کے اس کا انتظام کر لیتے تھے۔ آپ کے پاس بھی ایک گھوڑا گاڑی تھی اور اسے آپ خود چلایا کرتے تھے۔ اس گاڑی میں کبھی کبھی بیل بھی جوت لیے جاتے تھے۔ آپ دور دور کے کاموں کو اس کی مدد سے انجام دیا کرتے تھے۔

انہیں سماع کا بے حد شوق تھا۔ آپ محفل سماع خود بھی منعقد کرتے تھے اور دوسروں کے ہاں بھی جاتے تھے۔ محلے کا خاکروب ایک مدت سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے رئیسوں اور امیروں کو بھی دیکھا تھا۔ ان میں اور خواجہ حسین میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا تھا۔ وہ اکثر آپ کے آس پاس رہنے لگا تھا اور آپ کی باتیں اور صحبت اپنا کام کیے جا رہی تھیں۔

ایک دن خلیے میں یہ خاکروب حاضر تھا اور حسبِ معمول باتیں بہت دلچسپی سے سن رہا تھا۔ جب آپ باتیں کر چکے تو خاکروب نے آپ سے کہا۔ "حضرت! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "ضرور کر، تو ایک نہیں ہزار بار میری صحبت میں اٹھتا بیٹھتا بھی رہ۔ اب مجھے ذرا یہ تو بتا کہ میری ہم نشینی نے تجھ پر کیا اثر دکھایا؟"

خاکروب نے جواب دیا۔ "یہ کہ اب میں اپنے آبائی دین کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا چاہتا ہوں اور آپ کے دستِ حق پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔"

آپ کو اس کی باتوں پر نہ تو حیرت ہوئی اور نہ ہی وحشت۔ آپ نے پوچھا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو اسلام کیوں قبول کرنا چاہتا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میرا دل اسلام کی طرف معلوم نہیں کیوں کھنچا رہتا ہے۔ اسلام کا سحر مجھ پر اثر کر چکا ہے۔"

آپ نے خاکروب کو مسلمان کر لیا۔ یہ پاک صاف رہنے والا انسان مسلمان ہو جانے کے بعد آپ کے کھانے پینے میں اس طرح شریک و شامل رہتا جیسے وہ بھی اس گھر کا ایک فرد ہے۔ وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بہت زیادہ معزز ہو گیا تھا۔ وہ آپ کے مشاغل کا ایک ضروری اور لازمی ساتھی تھا۔

آپ کے ایک ارادت مند نے محفلِ سماع منعقد کی اور اس میں شرکت کی آپ کو بھی دعوت دی گئی۔

جب آپ اس محفل میں شریک ہوئے تو آپ کے ساتھ یہ خاکروب بھی تھا اور دوسرے مرید اور ارادت مند بھی۔

قوالوں نے حقانی کلام شروع کیا اور آپ پر اس کا اثر شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب قوالی ختم ہو گئی تو آپ اس کے زیرِ اثر جنگل کی طرف چل دیے۔ خاکروب آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جنگل سے پہلے مگر ناگور کے باہر ایک حوض تھا اور اس حوض میں ہر وقت پانی رہتا تھا۔ آپ اس حوض پر چلنے لگے۔ پانی کی سطح پر یوں چلے جیسے وہ کسی سخت شے پر چل رہے ہوں۔ خاکروب نے بھی آپ کی اتباع کی اور وہ بھی اسی طرح چلتا ہوا حوض میں داخل ہو گیا۔ اس کو بھی کوئی گزند نہ پہنچا۔ لوگ اس غیر معمولی فیضان پر رشک و حسد میں مبتلا ہو رہے تھے۔

آپ کے پاس غیر مسلموں کا تانتا لگنے لگا۔ یہ لوگ اسلام قبول کر رہے تھے اور خاکروب جیسی حیثیت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن ۔

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر بدعتی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

ان دنوں مانڈو پر غیاث الدین خلجی کی حکومت تھی۔ سلطان کو آپ کی ساری خبریں پہنچ رہی تھیں۔ ایک دن اس نے اپنے کئی آدمی آپ کے پاس بھیجے اور خواہش ظاہر کی کہ میں آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں اس لیے آنے کی اجازت دی جائے۔

آپ نے ان آدمیوں سے کہہ دیا کہ "اپنے بادشاہ کے پاس واپس جاؤ اور اس سے کہہ دو کہ وہ اپنی دنیا میں مگن رہے، میں اپنی دنیا میں خوش ہوں۔ ہمیں اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔"

سلطانی وفد کے ایک رکن نے کہا۔ "وہ تو آپ بجا فرما رہے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ مانڈو کا سلطان یہ درخواست کر رہا

ہے ورنہ وہ اگر چاہے تو یہ بات شاہی فرمان کی صورت میں مسلط کر سکتا ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''بابا! ہم درویشوں کی دنیا میں شاہی فرمان نہیں چلتے کیونکہ یہاں تو کسی اور ہی کی بادشاہت ہوتی ہے اور کسی جگہ بیک وقت دو بادشاہوں کے فرمان نافذ العمل نہیں ہو سکتے۔''

اس شخص نے کہا۔ ''جنابِ والا! میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ضد نہ کیجیے اور بادشاہ کو زحمت نہ دیجیے بلکہ آپ خود میرے ساتھ چلیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں سلطان سے آپ کو کئی لاکھ کی جاگیر دلوا دوں گا۔''

آپ کو غصہ آ گیا۔ جوش میں فرمایا۔ ''بابا! میں اس بات کا خیال کر رہا ہوں کہ تم لوگ میرے پاس چل کر آئے ہو۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تم لوگوں کو یہاں سے ہلنے بھی نہ دیتا۔''

وفد کے عاقبت نااندیش رکن نے پوچھا۔ ''ورنہ آپ کیا کرتے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں کیا کرتا، جو کچھ کرتا میرا خدا، میرا اللہ کرتا۔ میں کیا کرتا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''تو ہم یہ سمجھ لیں کہ آپ شرافت سے سلطان کے پاس نہیں جائیں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میرا یہی جواب ہے۔''

سلطانی نمائندے نے کہا۔ ''اے شخص! یہاں شور نہ کر۔ ہم نے ابھی تک انتہائی ضبط و تحمل سے کام لیا ہے۔ اپنی حدود میں رہ اور بات اتنی نہ بڑھا کہ ہمیں بھی کچھ کرنا پڑ جائے۔''

شاہی وفد کے دوسرے ارکان آپ کی حمایت میں بولنے لگے۔

آپ نے ان سب سے کہا۔ ''صاحبان! آپ لوگ معمولی سی رقم کے عوض زندگی بھر کی غلامی خرید لیتے ہیں۔ بڑی ہمت کا کام ہے یہ۔ خدا تم پر رحم فرمائے اور اس کی توفیق دے کہ تم ان سے محفوظ رہو اور اپنے دین دنیا کی تعمیر و تشکیل کرو۔''

ایک اعتدال پسند رکن نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ ناراض نہ ہوں۔ پتا نہیں آپ کن خیالوں میں پھنس گئے ہیں جو ہم غریبوں پر توجہ نہیں دیتے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''فضول باتیں نہ کر۔ تجھے تیرے سوالوں کے جواب مل گئے۔ اب واپس جا اور ہمارا وقت برباد نہ کر۔''

وہ لوگ واپس چلے گئے تو آپ نے مریدوں سے کہا۔ ''ملاحظہ فرمایا آپ نے، یہاں کیا ہو رہا ہے؟ ہم فقیروں کو سلطانی نمک خوار، ادنیٰ سی سپاہ دھمکیاں دیتی پھر رہی ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے، کیا میں الٹ دوں ماٹو کو۔''

لوگ آپ کی پھر خوشامدیں کرنے لگے۔ کئی مریدوں نے عرض کیا۔ ''حضرت! ان نادانوں کو معاف فرما دیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اللہ نے چاہا تو ایک بار سلطان سے ضرور ملوں گا۔ نہ وہ......''

خاکروب نے پوچھا۔ ''کیا آپ سلطان کے پاس تشریف لے جائیں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں وہاں کیوں جانے لگا۔''

خاکروب نے پوچھا۔ ''کیا سلطان آپ کے پاس آئے گا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، وہ میرے پاس کیوں آنے لگا۔''

خاکروب نے کہا۔ ''پھر دونوں کی ملاقات کس طرح ہوگی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''وہ جس طرح چاہے گا، ملاقات کرا دے گا۔''

کچھ عرصے بعد ہر طرف یہ خبر پھیل گئی کہ سلطان غیاث الدین خلجی کے پاس کہیں سے رسول مقبول ﷺ کی ریشِ مبارک کا ایک بال آیا ہوا ہے۔ آپ کو اس خبر نے بے چین کر دیا۔ آپ نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، گاڑی میں بیل جوتے اور اس پر بیٹھ کر چل دیے۔

خاکروب نے پوچھا۔ ''حضرت! کہاں؟ یہ کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں آپ؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں رسول اللہ ﷺ کی ریشِ مبارک کے بال کی زیارت کو جا رہا ہوں۔''

خاکروب خاموش ہو گیا۔

سلطان یہ بال لے کر آپ کے پاس آ رہا تھا۔ راستے میں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔

سلطان کے مصاحبوں نے آپ کی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے یہ خواجہ حسین کہاں سے آ رہے ہیں؟''

سلطان نے پوچھا۔ ''خواجہ حسین؟ کہاں ہیں وہ؟''
ایک صاحب نے ان کی بیل گاڑی کی طرف اشارہ کیا، کہا۔ ''وہ رہے خواجہ حسین!''
سلطان نے اس گاڑی کو پُرشوق نظروں سے دیکھا۔ اس نے گاڑی میں ایک ایسے شخص کو بیٹھے دیکھا جس کا لباس زیادہ صاف نہیں تھا اور لباس میں کئی پیوند بھی موجود تھے۔ سلطان نے کہا۔ ''یہ تو کوئی دیہاتی یا نوکر معلوم ہوتا ہے کسی کا۔''
سلطان کے مصاحب نے بادشاہ کو یقین دلایا۔ ''حضورِ والا! آپ یقین کریں، یہی خواجہ حسین ہیں۔''
سلطان نے کہا۔ ''خوب، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ہماری اچانک ان سے ملاقات ہوگئی مگر یہ یہاں تک آئے کیوں ہیں؟''
مصاحب نے جواب دیا۔ ''موئے مبارک کی زیارت کرنے۔ انہیں یہ بات اپنے کشف سے معلوم ہوگئی ہوگی۔''
سلطان نے حیرت سے کہا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ خوب، تو انہیں موئے مبارک کا پتا چل گیا۔ جب میں نے انہیں بلوایا تھا تو یہ نہیں آئے تھے لیکن آج یہ بن بلائے مہمان بن کر نازل ہوگئے ہیں۔ دیکھتا ہوں یہ موئے مبارک کی کس طرح زیارت کرتے ہیں۔''
آپ نے سلطان کے ایک سپاہی سے کہا۔ ''جا، سلطان سے کہہ دے کہ وہ ہمیں کیا زیارت کرائے گا، اس وقت وہ موئے مبارک ہمارے پاس ہے۔ اگر سلطان چاہے تو میں اس کی زیارت کراسکتا ہوں۔''
جب یہ بات سلطان کے کانوں تک پہنچی تو اس نے گھبرا کر موئے مبارک کی ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر بال تلاش کیا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بال غائب تھا۔
سلطان گاڑی کو آگے بڑھا لے گیا۔ بالکل آپ کے پاس۔ سلطان نے ان سے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کچھ دیر پہلے ایک چیز ہمارے پاس تھی۔ اب وہ چیز آپ کے پاس ہے۔ ایسا ہوا کیونکر؟''
خواجہ حسین نے جواب دیا۔ ''کیا ہم نے پچھلے دنوں یہ نہیں کہا تھا کہ یہاں دو بادشاہوں کے فرمان نہیں چلیں گے۔ سلطان تو دکھاوے کا بادشاہ ہے۔ یہاں کا سلطان تو کوئی اور ہی ہے۔''
جب بادشاہ کے کہنے پر آپ نے موئے مبارک دکھایا تو بادشاہ کا حال ہی کچھ اور ہوگیا۔ اس دن بادشاہ نے آپ کی بے حد تعظیم کی۔

☆☆☆

آپ کی کوششوں سے آس پاس اور دور دور تک اسلام پھیل گیا۔ سلطان غیاث الدین خلجی نے بارہا بہت کچھ دینا چاہا مگر آپ نے انکار کردیا۔ سرکاری دربار سے ہمیشہ نفور رہے۔ ایک مرتبہ سلطان نے آپ سے معلوم کیا کہ کشف سے بتایئے قبر میں میرے باپ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔
آپ نے سلطان کے باپ کی قبر پر جا کر مراقبہ کیا اور سلطان کو بتایا کہ صاحبِ قبر اچھے حال میں ہے۔ اللہ نے اس پر بڑی مہربانیاں کی ہیں۔
خواجہ حسین 1390ء میں پیدا ہوئے تھے اور 1495ء میں معمولی علالت سے انتقال فرما گئے۔ ان کے وصال سے ہر طرف کہرام برپا ہوگیا۔ سلطان غیاث الدین خلجی نے جنازے میں شرکت کی اور آپ کے مزار اور عمارت کی تعمیر اپنی نگرانی میں کروائی۔
کہتے ہیں ان کے جدِ اعلیٰ حمید الدین سوالی ناگوری کا مزار سلطان محمد تغلق نے تعمیر کرایا تھا۔ حالانکہ سلطان محمد تغلق صوفیائے کرام سے چڑتا تھا۔ بات پھر وہیں پہنچ جاتی ہے۔ ایک ہی ملک میں دو بادشاہ ہوتے ہیں۔ بظاہر حکم کسی کا چلتا ہے اور یہ باطن حکومت کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ نہ دکھائی دینے والے حکمران ایسے ایسے فرمان جاری کردیتے ہیں کہ جب ان کی تعمیل ہوجاتی ہے تو اس پر حد درجہ حیرت ہوتی ہے۔ ایسا کیونکر ہوگیا ہے؟ ایک ایسا سوال جس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ جس کا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہوتا۔

ماخذات

اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دهلوی. سکینته الاولیاء، شهزاده داراشکوه. سفینة الاولیاء، شهزاده داراشکوه. الفتح الربانی. ملفوظات حضرت غوث الاعظم

جو آنکھیں اپنے محبوب کے ساتھ کا خواب دیکھ لیتی ہیں ان میں کسی دوسرے کا وجود جچتا ہی نہیں ہے... لیکن جب خواب اور مقدر میں جنگ ہوجائے تو وقت کا فیصلہ مقدر کے حق میں ہوجاتا ہے اور خواب ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جاتے ہیں... وہ بھی کرچیوں کو چنتے چنتے زخمی ہوگئی تھی لیکن... یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مرہم رکھنے کے لیے مسیحا بھی جلد مل گیا۔

دوراہا

بے سمت بھٹکتی حسینہ کو ملنے والے راہنما کی دل جوئی کا قصہ

خلیل انجم

''فار گاڈ سیک بلال! کچھ کرو...... جلدی۔ امی ابو میری انگیجمنٹ کے درپے ہیں۔'' کنزیٰ التجائیہ نظروں سے بلال کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور کاشف بھائی کے ساتھ سلمٰی بھابی بھی۔'' اس نے منہ پھلایا۔
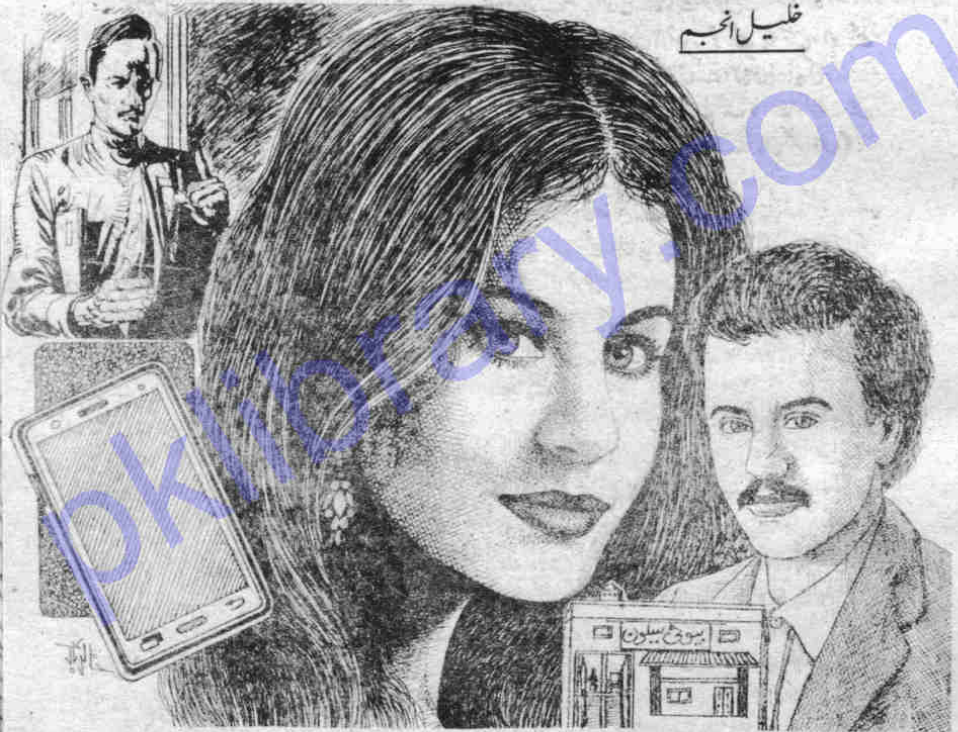
بلال نے اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے محبت پاش نظروں سے کنزیٰ کو دیکھا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''کنزیٰ! ٹرسٹ می...... میں ایسا کچھ بھی نہیں ہونے دوں گا۔ بس بابا کو پاکستان آلینے دو۔ میں پہلی فرصت میں انہیں تمہارے ہاں بھجواؤں گا۔''

''لیکن وہ کب امریکا سے آرہے ہیں؟'' کنزیٰ رودینے کے قریب تھی۔

''بہت جلد۔'' اس کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

"لیکن پھر بھی کب تک......؟" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا بزنس ٹور ہے یار...... کچھ وقت تو لگے گا نا۔"

"بزنس ٹور پر گئے ہیں یا وزٹ پر...... واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔" وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولی۔

"کم آن کنزیٰ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ کاروباری معاملات میں دیر سویر ہوتی رہتی ہے۔" اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو انکل سے فون پر بات کرلو؟"

"پرسنل باتیں آمنے سامنے ہوں تو بہتر ہوگا۔ ایسا نہ ہو بابا کسی بزنس کولیگ سے اس بارے میں پہلے ہی بات کر چکے ہوں۔" بلال نے کنزیٰ کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" کنزیٰ کی سوالیہ نظریں بلال کے چہرے پر جم گئیں۔

"بابا مجھ پر بہت ٹرسٹ کرتے ہیں۔" بلال نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا جبکہ کنزیٰ کی کافی ہنوز پڑی ہوئی تھی۔

"بلال! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم میرے ساتھ سیریس نہیں ہو۔ صرف فلرٹ کررہے ہو۔" کنزیٰ نے کھڑکی کے باہر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

بلال سراسیمگی سے اسے تکنے لگا۔ کنزیٰ کی نگاہوں کا رخ باہر تھا۔

"کنزیٰ......!" بلال نے متوجہ کرنے کے لیے اسے پکارا۔ وہ کہنی ٹیبل پر ٹکائے باہر دیکھتی رہی۔ وہ دونوں اس وقت کافی شاپ کے فرسٹ فلور کے کارنر میں بیٹھے تھے اور اپنی انگیجمنٹ کی خبر سنانے کے لیے کنزیٰ نے فوراً سے پیشتر بلال کو کال کرکے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اسی کافی شاپ میں دو دفعہ مل چکے تھے۔ سہ پہر کا وقت ہونے کی بنا پر شاپ میں رش زیادہ نہ تھا۔

"کنزیٰ! پلیز، میری طرف دیکھو۔" بلال کی آواز التجائیہ تھی۔ اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کنزیٰ کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ بلک بلک کر رو دینا چاہتی تھی۔

"کنزیٰ پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ...... میں تمہارے ساتھ فلرٹ کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں دل و جان سے تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہارے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ پلیز! ایسے مت روؤ۔" وہ بھی افسردہ ہوگیا تھا۔

کنزیٰ نے ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور بلال کو ٹکٹکی باندھے تکنے لگی۔ وہ بھی اسے محویت سے دیکھ رہا تھا۔ حجاب میں ہونے کی بنا پر اس کا چہرہ مزید دلکش ہوگیا تھا۔

"بلال! اگر تم مجھے نہ ملے تو یقین مانو......" کہتے ہوئے کنزیٰ کی آواز رندھ گئی۔

"پلیز کنزیٰ! ایسے تو نہ کہو۔" بلال تڑپ کر بولا۔ "تم جانتی ہو کہ بابا کے علاوہ میرا بڑا گھر میں کوئی نہیں۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں...... پھر اس کا یہی ایک حل ہے کہ میں خود تمہارے گھر والوں سے بات کرلوں۔"

"ایسے کیسے بلال؟ تمہارا تو مجھے پتا نہیں، ابو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" کنزیٰ نے اس کی تردید کی۔

"تو پھر پلیز، بابا کے آنے تک کا انتظار کرلو۔ میں نے کہا نا انہیں پہلی فرصت میں تمہارے ہاں بھجواؤں گا۔" بلال نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

کنزیٰ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

"اب مجھے چلنا چاہیے۔ میں بھابی کو سدرہ کا کہہ کر آئی تھی۔" کنزیٰ اٹھتے ہوئے بولی۔ بلال نے اس کی تقلید کی۔ بل پے کرنے کے لیے اس نے پرس نکالنا چاہا تو وہ یکدم گھبرا گیا۔ پرس جیب میں نہیں تھا۔ وہ کنزیٰ کو پشیمانی سے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" کنزیٰ حیرانی سے بولی۔

"آئی تھنک یار! میں پرس آفس میں بھول آیا ہوں۔" اس کے لہجے میں پشیمانی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" کنزیٰ نے پیسے نکال کر ٹیبل پر رکھے اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی جبکہ بلال کچھ لمحات کے لیے وہیں رک گیا۔ یہ ان کی ملاقات کا معمول تھا۔ بلال پہلے آتا تھا اور بعد میں جاتا تھا تاکہ کوئی مسئلہ نہ ہو۔ وہ سلمیٰ بھابی کو اپنی سہیلی سدرہ کے گھر جانے کا بتا کر نکلی تھی۔ ملاقات کو خفیہ رکھنے کے لیے وہ ہر ممکنہ اقدامات کرتی تھی۔ بلال ان تمام باتوں سے بہ خوبی آگاہ تھا اس لیے وہ کنزیٰ کو غیر ضروری تنگ نہیں کرتا تھا۔

دونوں کی محبت یونیورسٹی دور میں پروان چڑھی تھی۔ بلال، کنزیٰ سے سینئر تھا لیکن وہ اس پردہ دار و باحیا لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ بلال کی مردانہ وجاہت اور خوبصورت آنکھوں کے سحر میں جکڑی گئی تھی۔ وہ محبت میں فاصلوں کے فلسفے پر ایمان رکھنے والی

لڑکی تھی اس لیے حد سے تجاوز کے متعلق اس کا محبوب سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بلال نے اسے بتایا تھا کہ وہ البدر کارپوریشن کے منیجنگ ڈائریکٹر حیات بدر کا بیٹا ہے جو کہ اس کے آنجہانی دادا بدر محمود کے اثاثہ جات میں سے ایک تھی جو وصیت میں اس کے بابا حیات بدر کے حصے میں آئی تھی جس کو اس کے بابا نے اپنی انتھک محنت و لگن سے بین الاقوامی سطح پر متعارف کروایا تھا اور موجودہ دور میں البدر کارپوریشن اندرون ملک کے علاوہ بیرونِ ممالک میں بھی کامیابی سے بزنس کر رہی تھی۔ البدر کارپوریشن روزمرہ استعمال کی مختلف اشیا کی مینوفیکچرنگ سے وابستہ تھی۔

بلال حیات، بدر حیات کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ اربوں کے بزنس کا مالک بھی تھا۔ اس نے کنزیٰ کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے بابا اسے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہیں اور انہوں نے اپنا وصیت نامہ اپنی حیات میں ہی اس کے نام لکھ ڈالا تھا جبکہ اس کی ماں ناہید بدر گزشتہ سال انتقال کر گئی تھیں جس پر وہ بہت افسردہ تھا۔

کنزیٰ احمد، نذیر احمد کی بیٹی تھی جن کے شہر کے دو مختلف مالز میں مشہور بوتیکس تھے۔ کاروبار کی دن بہ دن بڑھتی مصروفیات کے تحت انہوں نے اپنے بیٹے کاشف کو جلد ہی تعلیم سے اٹھالیا تھا۔ دو برس قبل انہوں نے کاشف کی شادی اپنے ایک قریبی رشتے دار کے ہاں کر دی تھی۔ سلمیٰ دنیاوی تعلیم کے علاوہ دینوی علم سے بھی آراستہ تھی جس نے جلد ہی گھر کے تمام افراد کے دلوں میں گھر کر لیا تھا، سوائے کنزیٰ کے...... کنزیٰ اسے اپنی آزادی میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھنے لگی تھی۔ وہ اسے شرعی احکامات کی پاسداری کے لیے ہمہ وقت نصیحتیں فرمانے لگی تھی جن سے اکثر اوقات کنزیٰ چڑ جاتی۔

ان دنوں کنزیٰ کی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا جا رہا تھا اور سلمیٰ بھابی ان معاملات میں پیش پیش تھیں۔ تین پارٹیاں اس کے رشتے کے لیے چکر لگا کر جا چکی تھیں جن میں سے دو کو نذیر احمد اور ایک نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا۔ ”ضرورت سے زیادہ شرعی احکامات والی لڑکی کے وہ متحمل نہیں۔“ جس پر نذیر احمد نے لاحول پڑھ کر ان کو چلتا کر دیا تھا۔

ابھی چوتھی پارٹی جو چکر لگا کر جا چکی تھی، وہ رشتہ ہر لحاظ سے موافق نظر آ رہا تھا۔ وقار پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا۔ سلجھا ہوا، دیندار، پابند صوم و صلوٰۃ۔ خوبرو شخصیت کا مالک وقار پہلی نگاہ میں ہی نذیر احمد اور ان کی اہلیہ رقیہ بیگم کو پسند آ گیا تھا۔ وہ اپنے والد گرامی فاضل مہدی کے ساتھ کافی دیر نذیر احمد اور کاشف کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ باتوں باتوں میں اس نے نذیر احمد کو اپنے بارے میں مکمل معلومات بہم پہنچا دی تھیں۔ اس نے ایک سرکاری اسپتال سے ہاؤس جاب مکمل کر لی تھی اور بہترین کارکردگی کی بنا پر امریکا سے ایک اسپیشل کورس بھی کر رہا تھا۔ چونکہ اس کورس میں کم و بیش دو سال سے زائد کا عرصہ صرف ہونا تھا اس لیے اس کے ماں باپ کی خواہش تھی کہ امریکا جانے سے پہلے اس کی شادی کی خوشیاں دیکھ لیں۔ حتیٰ کہ وہ بذاتِ خود چاہ رہا تھا کہ امریکا سے واپسی پر شادی کے بندھن میں بندھے لیکن ماں باپ کی خواہش کے آگے اس نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

کنزیٰ کو تو جیسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اگلے دن اس نے بلال سے ہر حال میں ملاقات کی ٹھان لی۔ بلال اپنے بابا کے بزنس ٹور پر جانے کی وجہ سے خاصا مصروف تھا۔ کنزیٰ کے لیے اس نے بہت مشکل سے وقت نکالا تھا۔ وہ بھی دل و جان سے کنزیٰ کی محبت میں گرفتار تھا۔

☆☆☆

بلال کی یقین دہانی کی وجہ سے کنزیٰ کی کچھ ڈھارس بندھی تھی لیکن اندرونی طور پر اب بھی وہ خاصی شکستہ اور منتشر خیالات میں گھری ہوئی تھی۔

ان حالات نے اسے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا کہ نہ وہ انکار کر سکتی تھی اور نہ ہی اقرار۔

انکار کی صورت میں پورے گھر میں ایک کہرام مچ جانا تھا اور اقرار کی صورت میں اس کی زندگی میں......

رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ جب سے بلال سے مل کر آئی تھی، اپنے کمرے میں بند سوچوں کے گرداب میں الجھی بیٹھی تھی۔ اس کا دل مضطرب تھا، اعصاب شکست خوردہ اور نڈھال تھے۔ وہ رونا چاہ رہی تھی مگر رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اک موہوم سی امید کے سہارے اس کے آنسو، اس کی خوبصورت آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اچانک سے اسے خبر ملے کہ بلال اور حیات بدر اس کا ہاتھ مانگنے ان کے گھر پہنچ چکے ہیں۔ وہ بلال کے خیالوں میں مستغرق چھت کو تکے جا رہی تھی جب سلمیٰ بھابی کمرے میں داخل ہوئیں۔

”کنزیٰ کھانا نہیں کھانا کیا؟“ اس نے اندر آتے ہی سوال کیا۔

کنزیٰ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور نہایت

روکھے انداز میں بولی۔ ''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس وقت سلمٰی بھابی اسے زہر لگ رہی تھیں۔

''کیوں، خیریت؟'' سلمٰی تشویش سے بولی۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس کا روکھا پن ہنوز برقرار تھا۔

''کنزیٰ! مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی کیا؟'' سلمٰی نے اسے سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔

''کچھ نہیں ہے بتانے کو۔'' اس نے نظریں چرائیں۔ ''بس آپ کو تو میری شادی کی جلدی ہے۔''

''اوہو! تو یہ بات ہے۔ ہماری دلہنیا کو شادی کا روگ ستائے بیٹھا ہے۔'' سلمٰی نے اس کی ٹھوڑی پر چٹکی بھری۔

''نہیں ہے مجھے کوئی ایسا ویسا روگ۔'' کنزیٰ خفگی سے بولی پھر سیدھے بیٹھ کر گویا ہوئی۔ ''لیکن بھابی! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔''

''جلدی میری جان ہمیں نہیں ہے۔ آپ کے دُلہا میاں کو آپ کو امریکا لے جانے کی ہے۔'' سلمٰی پیار بھرے لہجے میں بولی۔

''تو کیا آپ لوگوں نے سب فائنل کرلیا اور وہ بھی مجھ سے پوچھے بغیر...... بھابی؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''نہیں۔'' سلمٰی نے تردید کی۔ ''تم سے امی ابو خود پوچھ لیں گے۔ فی الحال وہ اس پر غور کررہے ہیں۔ اب اٹھو اور جلدی... کھانے پر پہنچو۔ سب لوگ تمہارا انتظار کررہے ہیں۔'' سلمٰی اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے سکھ کا ایک گہرا سانس خارج کیا اور ڈائننگ ٹیبل پر جانے کے لیے اپنا حلیہ درست کرنے لگی۔ کھانے کے اوقات میں نذیر احمد اور کاشف بھائی گھر آکر کھانا کھاتے تھے۔

بلال سے فون پر اس نے دو مرتبہ بدر حیات کی واپسی کے بارے میں پوچھا جس پر اس نے بہت جلد آنے کی اطلاع کے ساتھ اسے پریشان نہ ہونے کی تلقین کی۔ اسے بلال پر پورا بھروسا تھا۔ وہی تو ایک مخلص تھا۔ باقی تو سب اسے حالات کے دھاروں میں جھونکنے پر تلے بیٹھے تھے۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب رات کو سب لوگ اس کے کمرے میں آموجود ہوئے تھے۔ کوئی اور بات ہوتی تو نذیر احمد اسے بلاکر کہتے مگر ایسی باتوں کے لیے والدین بیٹیوں سے پوچھنے کے لیے ان کے پاس جاتے ہیں۔ اس نے امی، ابو، سلمٰی بھابی اور کاشف بھائی کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر فوراً سے پیشتر بستر چھوڑ دیا اور سر پر دوپٹا درست کر کے کھڑی ہوگئی۔

''السلام علیکم ابو!'' اس نے خود سلام میں پہل کی۔

''وعلیکم السلام بیٹا! جیتی رہو۔'' نذیر احمد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور صوفے پر بیٹھ گئے۔

وہ بھی سہمی سہمی، سمٹی بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ایسا لگا جیسے کمرا گھوم رہا ہے اور کچھ پل بعد دھڑام سے اس کے اوپر آگرے گا۔

''کنزیٰ بیٹا! ہم ایک ڈسکشن کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ تم سے پوچھنا بے حد ضروری ہے۔'' نذیر احمد بول رہے تھے جبکہ سب ہمہ تن گوش دم سادھے بیٹھے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ نذیر احمد کے بولنے کے دوران کوئی ان کی بات کاٹنے کی سعی نہیں کرتا تھا۔ ''تمہارے متعلق بات ہے۔ تمہاری آئندہ زندگی کے متعلق بات ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے جس انداز میں اپنے بچوں کی پرورش کی ہے، مجھے ان سے پوچھنے یا ان کا خیال جاننے کی قطعی ضرورت نہیں ہے لیکن ہمارے مذہب، ہمارے دین کی مناسبت سے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ زندگی کے اہم فیصلوں میں، میں اپنے بچوں کی رضا کا خیر مقدم کروں۔'' وہ لمحہ بھر رک کے پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے مزید بولے۔

''کنزیٰ بیٹا! میں کافی دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر تمہیں رشتۂ ازدواج میں منسلک کردوں لیکن اچھے رشتے تو آج کل ملنا ہی بہت دشوار ہیں لیکن ہماری خوش قسمتی ہے، ہمارے اوپر اللہ کی کرم نوازی ہے۔ اس ذاتِ اقدس کا خصوصی کرم ہے کہ ہمیں وقار کی شکل میں ایک بہت مناسب، اچھا اور موافق رشتہ تمہارے لیے دستیاب ہوا ہے۔ بہت سلجھا ہوا، ایماندار اور مخلص لڑکا ہے۔ ارکان اسلام کی پاسداری و پابندی کرنے والا، لائق خوبصورت انسان...... یقین مانو! مجھے تو اس سے بہتر تمہارے لیے دنیا میں کوئی اور جچتا بھی محسوس نہیں ہورہا۔ ڈاکٹر ہے۔ میں یہ تمام باتیں اس لیے تم سے گوش گزار کررہا ہوں کیونکہ مجھے تو وقار بہت پسند آیا ہے اور باقی تم نے کچھ کہنا ہے تو تمہاری ماں تمہارے پاس ہے، اس سے گوش گزار کرسکتی ہو۔'' نذیر احمد اتنا کہہ کر اٹھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ''جیتی رہو'' کی دعا دیتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے جبکہ باقی تمام لوگ کمرے میں ہی تھے۔

اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر سب کو بتائے کہ وہ بلال سے محبت کرتی ہے، اسی کو چاہتی ہے اور اسی سے شادی

کرے گی لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ تمام الفاظ اس کے لبوں کے زنداں میں مقید ہوکر رہ گئے۔ سلمٰی بھابی، کاشف بھائی اور اس کی امی سب ہی لڑکے کے اور اس کے خاندان کی فصاحت و بلاغت کے معترف تھے۔ وہ سب چلے گئے لیکن اسے اپنی ''نہیں نہیں'' کی گھٹن کے قفس میں دھکیل گئے۔

☆☆☆

''بلال! میری انگیجمنٹ ہوگئی ہے۔'' اس نے فون پر بلال کو روتے ہوئے آگاہ کیا۔

''وہاٹ؟'' بلال چلایا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔''

''بلال! میں تو تمہیں پہلے ہی بار ہا بتا چکی تھی اس بارے میں...... '' وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ ''لیکن تم بھی بس......''

''کنزیٰ! پلیز مجھے تو دوش نہ دو۔ میں نے تو کہا تھا میں خود انکل سے بات کر لیتا ہوں۔'' بلال نے کہا۔

''لیکن تمہارے پاپا کب آئیں گے بلال؟'' وہ چلّا اٹھی۔

''بزنس میٹر کنزیٰ!'' وہ آہستگی سے بولا۔ ''کافی دن ہوگئے ہیں، اب تو آنے والے ہوں گے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔ ''تمہاری بات نہیں ہوتی ان سے؟''

''نہیں۔ میں نے ایسا تو نہیں کہا لیکن میں انہیں ذاتی الجھنوں میں نہیں الجھانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمام معاملات بہ خوبی سرانجام دے کر واپس آئیں اور ہماری شادی دھوم دھام سے کروائیں۔''

''بھلے ان کے آنے سے پہلے وہ دھوم دھام کوئی اور مچالے۔'' کنزیٰ طنزاً بولی۔

''کیوں نہ کنزیٰ ہم کورٹ میرج کرلیں؟'' بلال نے تجویز پیش کی۔

''میں ایسا غلط قدم ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ تم کچھ اور سوچو۔''

''پھر میں خود تمہارے ابو سے بات کرتا ہوں۔'' بلال نے دوسری تجویز پیش کی۔

''مجھے نہیں پتا، تم نے کیا کرنا ہے لیکن میں تمہارے بغیر کسی اور کا ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔'' کنزیٰ کے لہجے میں چھپی التجا بلال نے بہ خوبی نوٹ کرلی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں کل ہی ان سے بات کرتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''لیکن بات کچھ اس انداز میں کرنا کہ ابو کو مجھ پر شک نہ ہو۔''

''تم عجیب ہو۔ محبت بھی کرتی ہو اور ڈرتی بھی ہو۔'' وہ دھیرے سے ہنسا۔

''محبت میں اندھے ہوکر رشتوں کی تعظیم نہیں بھولنا چاہیے۔''

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔'' بلال نے کہا اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کردیا۔

کنزیٰ جذبات کے گھن چکر میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ بلال کی ہوجانا چاہتی تھی لیکن جائز طریقے سے۔ اسے اپنے آپ سے بڑھ کر بلال سے محبت تھی لیکن دل کے نہاں خانوں میں رشتوں کا تقدس و احترام بھی مقید تھا۔ وقت کا بے رحم ستارہ اس کے موافق گردش نہیں کررہا تھا۔ اس کی خوشیوں کو دیمک کی طرح کھا رہا تھا۔ حقیقی خوشی قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے کوسوں دور تھی۔ وہ رنج والم کے

دھارے میں تنکے کے سہارے بہے جا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں بلال کا پیغام اس کے موبائل فون کی اسکرین پر جھلملایا۔ اس نے بے تابی سے پیغام پڑھا۔ پیغام بھیجنے والا اسے بلا رہا تھا۔ اس سے ملاقات کی آرزو کر رہا تھا۔

یہ چھوٹا سا پیغام اس کے لیے نویدِ سحر بن کر طلوع ہوا۔ وہ سوچنے لگی، بلال ابو سے مل چکا ہوگا۔ انہیں اس نے قائل کر لیا ہوگا، منا لیا ہوگا جبھی تو وہ اتنی بڑی خوشخبری اسے سامنے بٹھا کر سنانا چاہتا ہوگا۔

پیغام کے جواب میں وہ خود اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا رُواں رُواں سرشار تھا۔

لیکن وہ پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ڈر گئی۔

"بلال! مجھے اچھی خبر کے لیے بلایا ہے نا؟"

"بتاتا ہوں۔" اس نے دو لفظی جواب دیا۔ وہ اس کے روبرو بیٹھ گئی۔

"میں تمہارے ابو سے ملا تھا۔" اس نے اداس نظروں سے باہر دیکھا۔

"پھر...... کیا کہا انہوں نے؟" کنزیٰ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"وہ...... وہ...... بہت غصہ ہوئے۔ کہنے لگے تمہیں کچھ شرم، حیا، تمیز تمہارے بڑوں نے نہیں سکھائی۔ رشتہ مانگنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ تمہارے بڑے کہاں ہیں؟" وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہرا پھر گویا ہوا۔ "انہوں نے کہا کہ انہوں نے تمہاری منگنی کر دی ہے اور جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔" وہ چپ ہو کر کنزیٰ کو دیکھنے لگا۔ وہ نم دیدہ اسے دیکھ رہی تھی پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

بلال نے لپک کر کنزیٰ کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "قسم سے کنزیٰ! میں نے آج تک اتنی ہتک آمیز باتیں نہیں سنیں مگر...... میں تو اب بھی کہتا ہوں، کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔"

وہ روتے ہوئے نفی میں گردن ہلانے لگی پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آرزو کا دیا بجھ چکا تھا۔ مبہم امید دم توڑ چکی تھی۔ وہ اپنے محبوب کے شانے پر سر رکھ کر رو دینا چاہتی تھی لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا شعور اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا تھا۔

وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ بلانے والا اسے آوازیں دیتا رہ گیا لیکن اس کا بلاوا بے سود تھا، آوازیں بے کار تھیں۔ وہ رشتوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی جو اس کے پیروں کی بیڑیاں بنی ہوئی تھیں۔

اس رات وہ جی بھر کر روئی۔ محبتوں کی اسیری بھی عجب اسیری ہے۔ نہ بھوک لگتی ہے، نہ نیند آتی ہے، نہ چین ملتا ہے۔ وہ بھی بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ موبائل سوئچ آف تھا۔ آن ہوتا تو جس کے لیے مضطرب و بے چین تھی، وہ اپنی بے چینی کا اظہار کر کے مزید بے چین کر دیتا۔

بلال کے والد حیات بدر امریکا سے واپس نہیں آئے تھے کہ وقار کے والد نے یہ اعلان کر دیا کہ وقار کو ایک مہینے بعد امریکا جانا ہے لہٰذا شادی کی تاریخ مقرر کی جائے۔ بات چٹ منگنی پٹ بیاہ والی ہو گئی تھی۔ کنزیٰ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو جائے گا۔ اس کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی موت کی تاریخ متعین کر دی گئی ہے۔ وہ بلال سے ملی۔ وہ بھی بہت پریشان تھا۔ اسے سب کچھ اپنے ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں جب کہہ رہا ہوں کہ کورٹ میرج کر لیتے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟"

"انکل اگر امریکا سے آ کر اب بھی تمہارے لیے میرا ہاتھ مانگ لیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟" وہ برجستہ بولی۔

"وہ کاروباری معاملات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"تو کیا گھریلو معاملات میں، میں دخل اندازی کرتی اچھی لگوں گی؟" کنزیٰ کا لہجہ تفہیمی تھا۔

"تم بے وفائی والی باتیں کر رہی ہو کنزیٰ۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بے وفائی یہ بھی تو ہے کہ تم مجھے جائز طریقہ کار سے حاصل بھی نہیں کر سکتے۔" آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

"کورٹ میرج بھی تو جائز طریقہ کار ہے۔" بلال نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس طرح کا جائز قدم میرے ابو، میرے بھائی پر کیا اثرات مرتب کرے گا، تمہیں کچھ اندازہ ہے؟" وہ اسے گھورنے لگی۔

"اونہہ۔" وہ خفگی سے بڑبڑایا۔ "صاف کیوں نہیں کہتی ہو کہ تم بزدل ہو۔"

"ہاں، میں بزدل ہوں کیونکہ مجھے اپنے ابو کو ذلالت میں جھونکنے سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے دلیل دی۔

اس بار بلال تنہ کر چلا گیا۔ وہ اس کی خفگی کو بہ خوبی

جانتی تھی لیکن اس کی رضا کے لیے سب کو خفا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی اس سے دوبارہ نہ ملنے کا سوچ کر آ گئی۔

دل میں طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پلکوں کے گوشے بار بار نمناک ہو رہے تھے لیکن اک جبر مسلسل تھا جو اسے پھوٹ پھوٹ کر رونے سے روک رہا تھا۔ اس نے خود کو وقت کے دھارے کے سپرد کر دیا۔ خالق کی رضا پر شاکر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

تمام عمر کی پاکیزگی کا روپ کنزیٰ کے دلہن کے نکھار میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ وہ سجی سنوری وقار کی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ہر طرف معطر خوشبوئیں رقصاں تھیں۔ خوبصورت پھولوں کی پتیوں کی سیج پر بیٹھی کنزیٰ نے گھونگھٹ لے رکھا تھا اور پیا گھر میں اپنے مجازی خدا کی منتظر تھی۔ جذبات سے عاری وجود میں اک کسک نے بسیرا ڈال رکھا تھا۔ خوابوں کی چبھن کرچیوں کے مانند اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔

کمرے میں کوئی آیا تھا۔ وہ آنے والے کو نہ دیکھ سکی۔ اپنے وجود میں سمٹ گئی۔ آنے والا وقار کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

''کنزیٰ!'' یہ آواز تو وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ اس نے فوراً نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے بلال کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

وہ دگرگوں حالت میں اس کے سامنے موجود تھا۔ الجھے بال اور سرخ آنکھیں اس کی حالتِ زار کا قصہ سنا رہی تھیں۔

''بلال تم؟'' وہ حیرت و بے یقینی کے عالم میں اسے تکتے ہوئے بولی۔

قبل اس کے کہ وہ کچھ کر پاتی، وہ مسہری پر اس کے روبرو بیٹھ چکا تھا۔

''کنزیٰ! تم نے مجھ سے بے وفائی کی ہے۔ تمہاری خوشیاں بھی میں اجیرن کر دوں گا۔'' وہ اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ وہ انگشت بدنداں پھٹی ہوئی آنکھوں سے بلال کو تک رہی تھی۔ یہ اس کا اپنا بلال نہیں تھا جس سے وہ دل و جان سے بڑھ کر محبت کرتی تھی۔

''تم اگر میری نہ ہو سکی ہو تو میں تمہیں کسی کی بھی نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ غیظ و غضب سے اسے گھورتے ہوئے جھنجوڑ رہا تھا۔ وہ اس شخص کو جانتی ہی نہیں تھی۔ وہ بلال کا ہم شکل ضرور تھا مگر وہ بلال نہیں تھا۔ اس کا بلال تو نہایت تحمل والا اور پیار کرنے والا تھا۔

اس کے اندر پتا نہیں کہاں سے اتنی طاقت آئی کہ اس نے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ وہ اس کی چیخ و پکار سن کر بھونچکا رہ گیا۔

نئی نویلی دلہن کی چیخوں نے وہاں مجمع لگا دیا۔ وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

بلال ہکا بکا کنزیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ان تھپڑوں کا بھی ادراک نہ ہو سکا جو پتا نہیں کدھر کدھر سے اس کے سر اور گردن کے پیچھے سے پڑے تھے۔ اسے گریبان سے پکڑ کر وہاں سے کھینچ کر لے جایا گیا۔

کچھ دیر بعد وقار اندر آیا تو وہ سب باہر چلے گئے۔

وقار تھوڑا سا جھلایا ہوا تھا۔ اس کا دل اندر سے بہت بری طرح ڈر رہا تھا۔ نہ جانے بلال نے وقار کو اس کے بارے میں کیا کیا بتایا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے لرز رہی تھی۔ تمام نیک نامی اور عزت اسے مٹی میں ملتی نظر آ رہی تھی۔ بلال نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا سانس سینے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ پھر اسے وقار کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا۔

''پتا نہیں کدھر سے منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں۔ ایسے ہی اول فول بک رہا تھا۔ بہرکیف تم پریشان مت ہو۔ ابو نے پولیس کو فون کر دیا ہے۔ پولیس پہنچنے ہی والی ہوگی۔'' وہ کچھ دیر کے توقف کے بعد بولا۔ ''میرے دوست کے بیوٹی سیلون میں کام کرتا ہے۔ آج صبح دلہا کے لیے اسی نے مجھے تیار کیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کل ولیمے میں بھی اسی سے تیاری کرواؤں گا مگر یہ بدبخت تو بہت کم ظرف نکلا۔'' وہ وقار کی بات پر حیرت سے اسے تکنے لگی۔ اس کے دیدے پھٹ گئے پھر آہستگی سے سر وقار کے شانے پر رکھ کر دھیرے سے بولی۔

''اچھا کیا آپ آ گئے...... مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔''

وہ دوراہے سے منزل کی طرف مڑ چکی تھی۔

⌘⌘⌘

بڑے لوگ بڑی باتیں

☆ ماں باپ کی خوشنودی دنیا میں موجبِ دولت اور عاقبت میں باعثِ نجات ہے۔

☆ خود کو فتح کرنا سب سے بڑی کامیابی ہے۔

☆ بدبخت ہے وہ شخص جو خود مر جائے مگر اس کا گناہ نہ مرے یعنی کوئی بری بات جاری کر جائے۔

☆ دنیا میں سب سے مہنگی چیز عزت اور سب سے قیمتی چیز دوستی ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ)

دل کے بہکاوے میں آ کر راستے اور رشتے بدلنے والے ایک عاشق کی بے کل زندگی کی داستان

ہر انسان کی زندگی بیک وقت کئی محاذوں پر برسر پیکار رہتی ہے لیکن... ان تمام حادثات و واقعات کو وہ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتا ہے... جبکہ وہ ہر رشتے کو اپنے نظریات کے مطابق ڈیل کرتا ہے جیسے کہ یہاں... ایک طویل عمر صحرا کی خاک چھان کر سمجھوتا کرنے والے کو اچانک نخلستان میسر آیا تو... صحرا کے سفر کی تکلیف نے اسے بے کل کر دیا... پیاسے جیون پر ہونے والی برسات نے اسے بوکھلا دیا تھا... سیراب ہونے کے باوجود اسے پیاس کی شدت نے ایسے آزار میں مبتلا کر دیا تھا جس سے چاہ کر بھی چھٹکارا ملنے والا نہیں تھا... دل کی طلب عجیب تھی اور دماغ زندگی کی الجھی گتھیوں کو سلجھا رہا تھا مگر... نہ طلب سکون دے رہی تھی اور نہ ہی الجھی ڈوریاں سلجھ رہی تھیں اور اسی کھینچا تانی میں ایک روز جب ڈوریاں ٹوٹ گئیں تو پوری ہونے والی طلب نے بھی ملنے والے گھاؤ کو نہ بھرا... جس تنہائی سے نکل کر وہ دل کی مدھر تالوں پر متوجہ ہوا... اسی تنہائی نے آخری پل تک اس کا تعاقب کیا۔

دل کی وہی تنہائی

احمد سلیم سلیمی

سراج میاں کی عمر پچاس برس ہوئی تو اس کی زندگی میں دو انقلاب آگئے۔ وہ ترقی پاکر سپرنٹنڈنٹ بن گیا۔ دوسرا یہ کہ اسے ایک بتیس سالہ مطلقہ خاتون سے طوفانی عشق ہوگیا۔

سراج الدین ایک سرکاری ادارے میں کلرک بھرتی ہوا تھا۔ محکمانہ ترقی کے روایتی طریق کار کے باعث بیس سال بعد سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ ایک ملازم کو بہت پہلے پتا ہوتا ہے کب اسے ترقی ملنے والی ہے مگر عشق کا پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ جوانی میں عشق ہو تو کسی کو حیرت نہیں ہوتی۔ بندہ ادھیڑ عمر ہو، چار بچوں کا باپ ہو، گھر میں ایک بیوی بھی ہو تب لوگ حیرت کی انگلیاں دانتوں تلے داب لیتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے سراج میاں کو عشق ہوا تو کسی کو اگر حیرت ہوئی بھی تو اس بات پر نہیں کہ انہیں ایسی عمر میں خلل دماغ ہوا تھا۔ اس بات پر لوگ حیران تھے کہ موصوف ایک صحت مند اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے اور ان کی بیگم سنجیدہ خاتون بس گزارے لائق شکل وصورت کی حامل تھیں اور پھر دائمی مریضہ بھی اور مزاج کے بالکل برعکس۔ دن کا بیشتر وقت اس کا منہ یوں بنا ہوتا جیسے کڑوے بادام چبا رہی ہو۔

سراج میاں کلرک تھا۔ پورے بیس سال کلرک رہنے کے بعد ترقی... پاکر سپرنٹنڈنٹ بن گیا تھا۔ کام تو اب بھی وہی کلرکی کا ہی تھا لیکن لوگوں کے لیے چھوٹا موٹا صاحب بن گیا تھا مگر زندگی حسن سے، رنگ روپ سے نا آشنا رہی تھی لیکن اللہ پاک نے اولاد کی صورت میں اسے خاص کرم سے نوازا تھا۔ اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سب بچے بڑے ہی فرمانبردار اور تمیز دار تھے۔ سب سے بڑا بیٹا تھا...... کمال۔ اس نے ایم اے کیا تھا اور ایک پرائیویٹ ادارے میں اچھی تنخواہ پر ملازم لگا تھا۔ دوسرا بیٹا اور بیٹیاں ابھی پڑھ رہی تھیں۔ سراج الدین نے کبھی انہیں کسی چیز کی طرف سے محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

مختصر یہ کہ اس کی زندگی کے پچاس برس بغیر کسی غیر معمولی حادثے کے گزر گئے۔ سپرنٹنڈنٹ بننے کے بعد ایک آدھ مہینا تو اسے کسی خاص تبدیلی کا احساس نہیں ہوا لیکن رفتہ رفتہ دفتر کے جونیئر اسٹاف کی تعظیم اور خوشامد کے مظاہرے ہوئے اور افسروں کی جانب سے التفات ہوئی تو یکا یک اس کی کایا پلٹ گئی۔ وجود کی گہرائیوں میں نہ جانے کس نیم روشن کوٹھری میں سویا ہوا سراج الدین ہڑبڑا کر بیدار ہوا اور سراج میاں نے خود کو فنا کر ڈالا۔

دبے دبے سے اور جھکے کندھوں والے سراج میاں نے راتوں رات جون بدل کر ایک پُرجوش اور باوقار سراج الدین کا خول چڑھا لیا۔ یہ شاید اسی کایا کلپ کا نتیجہ تھا کہ اسے طوفانی عشق ہوا۔

☆☆☆

اس صبح اس نے آئینہ دیکھا تو اپنی صورت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے صدیاں گزری ہوں اس نے آئینہ نہیں دیکھا ہو۔ جاذب نظر چہرے پر کوئی تازگی نہیں تھی۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے تھے، آدھے سے زیادہ بالوں میں سفیدی ڈیرے ڈال چکی تھی۔ اتنی عمر ہونے کے باوجود آدھے سے زیادہ بال کالے ہی تھے۔ وہ چند ثانیے آئینے میں خود کو دیکھتا رہا۔ افسوس اور دکھ سے گزرے دنوں کی بے کیف اور بے رنگ زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔

سراج الدین غسل خانے سے باہر آیا۔ اس کی بیٹی نے ناشتا تیار کر کے میز پر رکھ دیا تھا۔ ایک طرف سنجیدہ خاتون بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی ہی ناگواری سے بیگم کی طرف دیکھا۔ ایک دم ہی اس کے دل میں کراہت اور ناپسندیدگی کے جذبات پیدا ہوئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے آئینہ دیکھتے دیکھتے اس کے دل ودماغ میں جذبوں نے کچھ سرگوشیاں کی تھیں اسی لیے بیمار بیوی کے لیے نگاہوں کے تیور بھی بدل گئے تھے۔

اس نے جلدی سے ناشتا ختم کیا۔ بیوی کی طرف دیکھے بنا ہی کمرے سے باہر جانے لگا۔ وہ دروازے کے پاس آیا، پیچھے سے بیوی کی کراہتی ہوئی آواز آئی۔ ”ذرا میری بات سنیے۔“ سراج الدین نے پلٹ کر دیکھا۔

بیوی بولی۔ ”میری دوائیں ختم ہوگئی ہیں۔ دفتر سے ذرا جلدی چھٹی کر کے لے آئیں۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”میں وقت سے پہلے نہیں آسکتا۔ ترقی کے بعد میری ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں۔ تم کمال کو نسخہ دے دو، وہ لے آئے گا۔“

سراج الدین نے جیب سے پیسے نکال کر میز پر ہی رکھ دیے اور پلٹ کر تیز تیز چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ سنجیدہ خاتون دکھ سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ آج اسے شوہر کی آنکھوں میں بیگانگی اور بے مہری کے تاثرات نظر آئے تھے جن کی کاٹ بہت واضح طور پر محسوس کی تھی۔

☆☆☆

شام کو سراج الدین دفتر سے آیا تو ہاتھوں میں بہت

سے پیکٹس تھے جو مختلف چیزوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں سلے ہوئے کپڑے، قمیص، پتلون اور کوٹ تھے۔ ان کے علاوہ شیمپو، ہیئر کلر، شیونگ کا سامان اور پرفیومز بھی تھے۔ یہ سب وہ اپنے لیے لے کر آیا تھا۔ اس کی ہدایت پر بیٹیوں نے یہ ساری چیزیں اس کی الماری میں رکھ دیں۔ وہ سب حیران تھیں کہ یکا یک ابو میں یہ کیسی تبدیلی آگئی ہے۔ بڑی بیٹی ثمر کالج میں پڑھتی تھی، اس نے آخر پوچھ ہی لیا۔

سراج الدین نے کہا۔ ''ترقی پانے کے بعد بڑے بڑے لوگوں میں اور افسروں میں اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے۔ ڈھنگ کے کپڑے نہ ہوں تو سب مذاق اڑائیں گے۔ اس لیے یہ سب لے آیا ہوں۔''

چھوٹی بیٹی نمل جو آٹھویں میں پڑھتی تھی، سراج الدین اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''ابو! یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ ہیئر کلر اور شیونگ کا سامان کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''ارے بیٹا! ظاہر بات ہے اپنے لیے ہی لے کر آیا ہوں۔ تمہاری امی کی طرح جوانی میں ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ اب انہیں استعمال کر کے پھر سے جوان بن جاؤں گا۔''

اس کی بیٹیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں جبکہ ایک طرف بیڈ پر لیٹی سنجیدہ خاتون کا دل کٹ سا گیا۔ اسے اپنی بیماری اور بے کسی کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا۔

☆☆☆

اگلی صبح سراج الدین تیار ہو کر باہر آیا تو سب گھر والے دیکھتے رہ گئے۔ وجیہہ تو وہ شروع سے ہی تھا، اب ڈھنگ کا لباس پہن کر اور اپنا حلیہ درست کر کے وہ ایک دم اپنی عمر سے بہت کم لگنے لگا تھا۔ سنجیدہ خاتون نے شوہر کو اس روپ میں دیکھا تو اپنی کم مائیگی کا احساس کر کے جی بھر آیا اور کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

اس دن کے بعد سے سراج الدین کی روکھی پھیکی زندگی میں ایسا رنگ روپ آیا جیسے خزاں رسیدہ پیڑوں پر پھل پات آتے ہیں اور چند دنوں میں پچاس برس کا مضمحل اور بوجھل سا سراج ایک دم توانا اور خوش مزاج آدمی بن گیا۔ ایسے ہی زندہ دل دوستوں میں شریف صاحب بھی تھے۔ ان کا محلے میں جنرل اسٹور تھا۔ سراج الدین دفتر سے آ کر شام کے وقت شریف صاحب کے جنرل اسٹور میں جا کر بیٹھ جاتا۔ وہاں دو چار اور بھی باغ و بہار طبیعت کے لوگ جمع ہوتے۔ رات گئے تک خوش گپیوں اور ہنسی مذاق میں وقت گزارتے۔

شریف صاحب بڑے مجلسی آدمی تھے۔ ایک ادبی تنظیم کے رکن بھی تھے مگر غضب کے باتونی تھے۔ ایسی پھلجھڑیاں چھوڑتے کہ سننے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اگرچہ عمر نے بڑی مسافتیں طے کی تھیں مگر خیالات نوجوانوں جیسے تھے۔ شراب اور شباب کے قصیدوں کے بغیر ان کی بات مکمل ہی نہیں ہوتی تھی۔ جنرل اسٹور ملازم سنبھالتا تھا۔ وہ خود محفل یاراں کو گرم کر دیتے۔

جب سراج الدین وہاں آنے جانے لگا اور شریف صاحب کی باغ و بہار صحبت نے اپنا رنگ ڈھنگ دکھایا تو چند ہی دنوں میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ پھر تو محفل ادھیڑ عمراں تھی، بے باک قہقہے تھے، بادہ و ساغر اور شعر و ادب کی گفتگو کے پردے میں تشنگی دل کے قصے تھے، چاند چہرہ اور ستارہ آنکھوں کی باتیں اور گھاتیں تھیں۔ شریف صاحب اور دیگر کے احساسات تو وہ جانیں مگر سراج الدین اپنی بے رنگ اور بے کیف زندگی کی لاحاصلی پر ٹوٹ پھوٹ سا جاتا۔

ایک روز شریف صاحب بولے۔ ''یار سراج! ایمان سے کہوں، تمہیں دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے۔ اتنی عمر ہو گئی ہے لیکن بھرپور جوان لگتے ہو۔ کئی نظریں تمہیں دیکھ کر اب بھی ٹھٹک جاتی ہوں گی۔''

''پھر کیا کروں؟ جوانوں کی طرح عشق بازی کروں؟ اس عمر میں کیوں بیچ چوراہے میں عزت لٹوانا چاہتے ہو؟''

شریف صاحب نے ہنس کر کہا۔ ''میرا مطلب نہیں سمجھے۔ خدا لگتی کہوں، تم پر ترس آتا ہے۔ ایک زندہ دل اور بھرپور بیوی سے محروم رہے ہو۔ میں بھابی کا دشمن نہیں مگر اپنے دوست سے ہمدردی ہے۔ تم دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

سراج الدین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''چھوڑو بھی یار! کیوں جذبات کی بجھی راکھ کریدتے ہو؟ اندر سے صرف لاحاصلی کا دھواں ہی نکلے گا۔ ہماری خواہشیں اور وہ خواب جو ہم یہاں بیٹھ کر دیکھتے ہیں، کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوں گے کیونکہ یہ سماج ہمیں بیوی بچوں والے کے طور پر جانتا ہے اور بیوی بچوں والا خواب تو دیکھ سکتا ہے مگر لوگوں کی چبھتی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔''

☆☆☆

اگلے دن کی بات ہے۔ سراج الدین آفس میں تھا۔ سامنے میز پر فائلوں کے اوپر اس کا موبائل پڑا تھا۔ اس کی

گھنٹی گنگنائی۔ فون اٹھا کر "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف کسی نرم رو گھنٹی جیسی ہی نسوانی آواز میں کسی نے پوچھا۔
"آپ سراج الدین صاحب بول رہے ہیں؟"
"جی ہاں، عرض کر رہا ہوں۔"
"دیکھیے، میں آپ کی بیٹی نمل کے اسکول سے بات کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہوا ہے۔ بریک ٹائم میں کھیلتے ہوئے وہ سیڑھیوں سے گر پڑی ہے۔ آپ پلیز یہاں آجائیں۔"
سراج الدین کا دل دھک سے رہ گیا۔ "آپ کون ہیں؟ میری بیٹی خیریت سے تو ہے نا؟" اس نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔
"آپ پریشان نہ ہوں۔ اسے معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ بازو میں کچھ زیادہ تکلیف محسوس کر رہی ہے۔ میں اسکول کی وائس پرنسپل ہوں۔ آپ جلدی آسکتے ہیں نا؟"
سراج الدین اطمینان کی گہری سانس لے کر بولا۔ "میں آفس میں ہوں۔ آدھے گھنٹے تک اسکول پہنچ جاؤں گا۔"
رابطہ منقطع کر کے اس نے اپنے اسسٹنٹ کو بلایا۔ صورت حال بتا کر ہدایت دی۔ "اگر ڈائریکٹر صاحب پوچھیں تو جلدی جانے کی وجہ بتا دینا۔"
اسکول زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے سے کم وقت میں وہاں پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نمل پرنسپل کے دفتر میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ اسکول کے میڈیکل سینٹر سے اسے ابتدائی طبی امداد دی گئی تھی۔ جس بازو میں زیادہ درد تھا اس میں فریکچر کا اندیشہ تھا۔ فوری طور پر کسی ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔ پرنسپل نے اسکول کی وین میں اسپتال لے جانے کی پیشکش کی۔
جس ٹیچر نے وائس پرنسپل کے حوالے سے اسے فون کیا تھا وہ باہر تک آگئی۔ بڑے پیار اور نرمی سے اس کی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر وین تک لائی۔ درمیانی سی عمر کی پرکشش خاتون تھیں۔ ملیح چہرے سے سادگی، سنجیدگی اور شگفتگی کے تاثرات ساتھ ساتھ پھوٹ رہے تھے۔ رویے سے بڑی ہمدرد اور نرم مزاج لگتی تھیں۔ سراج الدین کی نظریں کئی بار غیر ارادی طور پر بھٹک کر بڑی نرمی سے اس کے چہرے پر منڈلائی تھیں۔ اندر وہ جو جذبوں کے سوکھے پیڑ بہار آشنا ہوئے تھے، یہ اسی کا اثر تھا۔ اب نہ جانے یہ کیا گل کھلانے والا تھا......!
وہ اسکول کی وین میں اپنی بیٹی کو اسپتال لے آیا۔ فون کر کے بڑے بیٹے کمال کو بھی بلا لیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔ ایکسرے کروایا۔ اندیشہ سچ ثابت ہوا۔ بیٹی کے بازو میں فریکچر ہوا تھا مگر یہ خوب ہوا کہ ہڈی زیادہ متاثر نہیں ہوئی تھی۔ ہلکی سی ضرب لگی تھی۔ پلاستر چڑھا کر معمولی دوا دے کر دو ہفتے آرام کا بتا دیا اور اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔
اگلے دن سراج الدین نے آفس سے نمل کے اسکول فون کیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی پھر کسی کی آواز ابھری۔ یہ شاید اس کے دل کی فرمائش تھی کہ دوسری طرف وہی نرم سی آواز تھی جس نے دل کی خواہش جگا دی تھی۔
سراج الدین بولا۔ "میں نمل کا والد بول رہا ہوں۔ اس کی میڈیکل رپورٹ آپ کو بتانی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے دو ہفتے آرام کی ہدایت کی ہے۔"
وہ بولیں۔ "ہماری دعا ہے نمل جلدی صحت یاب ہو جائے۔ آپ نمل کی میڈیکل رپورٹ کی ایک کاپی کسی کے ہاتھ اسکول بھجوا دیں۔"
بات ختم کر کے وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ دل سینے کے اندر دھک دھک دستکیں مارنے لگا۔ کانوں میں اس کی آواز کی نرمی اب بھی گنگنا رہی تھی۔ اسے یہ سب اچھا بھی لگ رہا تھا۔ ایک پھیکا پھیکا احساس بھی ہوک جگا رہا تھا۔
اس نے گھڑی دیکھی۔ اسکول کی چھٹی میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ وائس پرنسپل نے نمل کی میڈیکل رپورٹ جمع کرانے کا کہا تھا۔ اس نے بڑے بیٹے کمال کا نمبر ملایا۔ ایک گھنٹی بجی تھی، رابطہ کاٹ دیا۔ ایک دم دل میں سرگوشی ابھری۔ میڈیکل رپورٹ جمع کرانے وہ خود بھی تو جا سکتا ہے۔ یہ محض سرگوشی نہیں تھی، سراج الدین کی خاموش زندگی میں جذبوں کی پہلی سرکشی بھی تھی۔
اسی دم خانۂ دل سے کوئی کراہتی ہوئی سی صدا ابھری۔ "سراج میاں! یہ کیا گل کھلا رہے ہو؟ مت بھولو تم ایک بھرے پُرے خاندان کے سربراہ ہو۔ تمہارے چار بچے ہیں۔ خواب دیکھنا الگ بات ہے، ان کا سرا پکڑ کر دور تک جانا دیوانگی ہے۔"
اس نے اس احتجاجی آواز کو دبا دیا۔ "میں کیا غلط کر رہا ہوں؟ تہذیب کے دائرے میں اپنی بیٹی کی چھٹی کے لیے اس کی ٹیچر سے مل رہا ہوں۔ اس سے میرے دل کے صحرا آباد ہو رہے ہیں تو برائی کیا ہے؟"
اسی وقت موبائل کی گھنٹی بجی۔ خیالات کی سرخوشی اک ذرا بکھر گئی۔ اس کے بیٹے کمال نے فون کیا تھا۔
"ابو! آپ کی مس کال آئی تھی، خیریت ہے نا؟"
سراج الدین نے بات بنائی۔ "ہاں بیٹا! خیریت ہے۔ کسی اور کو فون کر رہا تھا، غلطی سے تمہارے نمبر پر انگلی دب گئی۔"

وہ اپنے اسسٹنٹ کو بتا کر باہر آیا۔ میڈیکل رپورٹ کے ساتھ اسکول پہنچ گیا۔ دھڑکتے دل اور بھٹکتی آنکھوں کے ساتھ پرنسپل کے آفس میں داخل ہوا۔ پرنسپل صاحبہ کے پاس کچھ ٹیچرز بیٹھی تھیں۔ مقصود نظر نہیں تھی۔ دو ہفتوں کی چھٹی کی درخواست کے ساتھ میڈیکل رپورٹ منسلک کر کے اس نے پرنسپل کو پیش کی اور بے کیف سے دل کے ساتھ خدا حافظ کہہ کر باہر نکلا۔ اسی وقت سامنے راہداری میں وہ دکھائی دیں۔ ایک ساتھی ٹیچر کے ساتھ اسی طرف آرہی تھیں۔

سراج الدین کے دل میں صبح دم کی شبنمی تازگی پھیل گئی۔ نظر پیاسی تھی مگر نوجوانوں کی سی بے باکی نہیں تھی اس لیے لمحے بھر کو اس کے چہرے پر پڑی پھر جھک گئی۔ اسی اثنا میں وہ قریب آگئی تھیں۔

سراج الدین کی جیسے مراد بر آئی۔ وہ پہچان کر رک گئی تھیں۔ سلام کر کے پوچھنے لگیں۔

"آپ نمل کے والد ہیں نا؟ اب اس کی صحت کیسی ہے؟"

سراج الدین عمر کے جس مرحلے میں تھا، وہ احترام اور سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ اندر دھڑام دھڑام کیسی ہی دیواریں ٹوٹ رہی ہوں باہر سے خود کو سنبھالنا پڑتا ہے۔

اس نے ہمت کر کے کہا۔ "جی ہاں، میں سراج الدین ہوں...... نمل کا ابو۔ اللہ کا کرم ہوا ہے۔ بازو میں ہلکا سا فریکچر ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے دو ہفتے بعد پلاستر اتار دیں گے۔"

وہ ہمدردی سے بولیں۔ "میں نمل کی کلاس ٹیچر بھی ہوں۔ جتنے دن وہ غیر حاضر رہے گی، میں کوشش کروں گی بعد میں اسے الگ سے پڑھاؤں۔ باقی ٹیچرز بھی امتحانوں سے پہلے جو اسباق رہ جائیں گے، وہ سارا پڑھائیں گی۔"

سراج الدین نے اس دل موہ لینے والے ملیح چہرے پر نہایت عقیدت سے نگاہ ڈالی پھر ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔ میں واقعی بہت فکر مند تھا۔ امتحانوں سے دو مہینے قبل اتنے دنوں کے لیے اسکول سے غیر حاضر رہنا اس کی امتحانی کارکردگی کو بہت متاثر کر سکتا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں سراج صاحب! نمل میری کلاس کی اچھی اسٹوڈنٹس میں شامل ہے۔ اس کی تعلیمی کارکردگی خراب ہونے نہیں دوں گی۔ اگر اسکول میں کوئی کمی رہ گئی تو میرے گھر میں آکر بھی اسے دور کرا سکتی ہے۔"

اسی وقت چھٹی کی گھنٹی ٹن ٹن بجنے لگی۔ سراج الدین کے کانوں میں بھی اس آخری بات سے نرم رو گھنٹیاں سی بجنے لگیں جیسے کوئی قافلہ لمبی مسافتوں کے بعد منزل آشنا ہوا ہو۔

☆☆☆

دو ہفتے گزر گئے۔ ڈاکٹروں نے دوبارہ معائنہ کر کے بیٹی کے بازو کا پلاستر اتار دیا۔ مزید چند دنوں کے لیے نرم پٹی باندھے رکھنے کی ہدایت کی۔

نمل پھر سے اسکول جانے لگی۔ سراج الدین معمول کے مطابق دفتر، گھر اور شریف صاحب کے جنرل اسٹور میں آتا جاتا رہا۔ مصروفیات بدل نہیں گئی تھیں، محسوسات بدل گئے تھے۔ ایک سانولے چہرے کا عکس دل سے اتر نہیں رہا تھا۔ دل کی کایا کلپ سے وہ حیران بھی تھا، پریشان بھی۔

وہ نہیں جانتا تھا نمل کی وہ ٹیچر کون ہے؟ اس کا تو نام تک معلوم نہیں تھا۔ وہ بظاہر ایسی نظر آتی تھیں کہ اس کے جملہ حقوق کسی اور کے نام لکھے ہوں، اس کا امکان برابر برابر لگتا تھا۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں جذبے اٹکھیلیاں کرنے لگے۔ ایسے میں کسی کے آگے حالِ دل کہنا چاہتا تھا۔ گلال رنگوں سے سجے اس چہرے کا عکس پیمانۂ ضبط چھلکا رہا تھا۔ بالآخر سراج الدین چھلک پڑا۔ ایک شریف صاحب تھے جن سے قربت تھی اور بے تکلف صحبت بھی...... سراج الدین نے اس ٹیچر سے ملاقات، اس کی نرم نرم گفتگو اور بے حد جاذب نظر ملیح چہرے کے بارے میں بتا دیا۔

شریف صاحب خاموشی سے اس کی گفتگو سنتے رہے پھر ایک زندگی سے بھرپور قہقہہ لگا کر بولے۔ "جیو میرے بادشاہو! مردانہ وار زندگی گزارنے کی سوچ اب تم میں پیدا ہوگئی ہے۔ اسی سے تمہاری زندگی باغ و بہار بھی ہوگی۔"

وہ آہستہ سے بولا۔ "یار شریف! میں نہیں جانتا وہ ٹیچر یوں اچانک میرے لیے اتنی اہم کیوں ہوگئی ہے مگر دل کی بات بتاؤں، وہ بہت اہم ہوگئی ہے۔"

شریف صاحب نے کہا۔ "میں ٹھہرا ایک شاعرانہ مزاج کا انسان۔ میں تو جذبے کی بات کروں گا اور تم جو کہہ رہے ہو، اسے جذبوں کی زبان میں محبت کہتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دل کی زمیں پر یہ موسم تو بن پوچھے اتر آتے ہیں۔"

سراج الدین نے جنرل اسٹور سے باہر دور آسمان کے ایک گوشے میں منڈلاتے بادل کے ٹکڑے پر نظریں جما دیں پھر ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "پچیس سال بیوی نام کی ایک بے کیف اور بے رنگ عورت کی قید میں رہا ہوں۔ ایسے میں اس قید سے ڈر کیسا؟ مگر خوف اس بات کا ہے اسے پانے کی تمنا کروں تو لوگ مجھے بخش دیں گے؟"

"خیر، بعد کی بات بعد میں دیکھتے ہیں۔ ابھی ایک

کام کرو۔ تمہاری بہن بھی تو اسی گرلز اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اس کے ذریعے معلومات حاصل کرو۔ وہ کون ہے، کس خاندان سے تعلق ہے، کہیں شادی شدہ تو نہیں؟''

''اس کا نام کیا ہے؟ میں کس حوالے سے اس کے بارے میں پوچھوں؟''

''نام کا تو مجھے خود پتا نہیں۔ بس ایک حوالہ ہے۔ وہ اسکول کی وائس پرنسپل ہے۔''

شریف صاحب نے وعدہ کیا کہ اپنی بہن کے ذریعے اس ٹیچر کے کوائف معلوم کرلیں گے۔

دو دن بعد اتوار تھا۔ سراج الدین ابھی گھر سے نکلا نہیں تھا۔ شریف صاحب نے فون کیا اور فوراً جنرل اسٹور پہنچنے کی تاکید کی۔ سراج الدین دھڑکتے دل کے ساتھ شریف صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

چھوٹتے ہی بولا۔ ''یار! کوئی اچھی خبر ہے تو فوراً سناؤ۔ میں سخت بے چین ہوں۔''

انہوں نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''بھائی سراج! مجھے افسوس ہے، تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں۔ وہ ٹیچر شادی شدہ ہے۔ اس کے دو بچے بھی ہیں۔''

سراج الدین بے یقینی سے یک ٹک انہیں دیکھتا رہا۔ چہرے پر یوں لکیریں کھنچ گئیں جیسے آئینے پر پتھر آکر لگا ہو پھر ایک مایوس کن ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''اپنی قسمت ہی خراب ہے یار! اتنے برسوں کے بعد یہ دل دھڑکنے کی لذت سے آشنا ہوا تھا۔ ان آنکھوں کے آئینے میں کسی کی صورت جھلکنے لگی تھی۔ افسوس، یہ محض سراب تھا۔''

''میرے دوست! اس دیس میں عورتوں کا کال نہیں پڑا ہے۔ ایک چھوڑ دس اور ملیں گی۔ بس تم دل زندہ رکھو۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں ایسا ممکن ہے۔''

شریف صاحب یکا یک زور زور سے ہنسنے لگے پھر ان کے گھٹنوں پر دھپ سے ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ ''لگتا ہے میرا یار بہت سنجیدہ ہے اس ٹیچر کے لیے۔ لو جی خوشیاں مناؤ۔ میری بات آدھی درست تھی۔ وہ شادی شدہ تو ہے مگر اس کا شوہر اور بچے موجود نہیں۔''

سراج الدین نا سمجھی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

شریف صاحب نے بات جاری رکھی۔ ''میں مذاق کر رہا تھا۔ میری بہن کی معلومات کے مطابق اس کا نام جمیلہ ہے۔ تیس بتیس سال اس کی عمر ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر دو بستیاں چھوڑ کر شاداب پور کا جو علاقہ ہے، وہاں کے سناروں کے خاندان سے اس کا تعلق ہے۔ پانچ سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کا خاوند عرب امارات میں کہیں کام کرتا تھا۔ شادی کے تین سال بعد ہی اسے طلاق دے دی تھی۔ کیوں دی تھی؟ یہ میری بہن کو معلوم نہیں۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں۔''

سراج الدین کو یوں لگا جیسے اجڑے دل پر ایک دم ہزاروں گلاب کھل اٹھے ہوں۔ ابھی چند ثانیے قبل وہ مایوسی کے جس گھور اندھیرے میں گھر گیا تھا، اب یک بیک بے شمار چاند روشن ہوگئے تھے۔

شریف صاحب بولے۔ ''سراج الدین میرے دوست! کہتے ہیں نا نیت صاف تو منزل آسان۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ کیسا حسنِ اتفاق ہے کہ پہلی بار جس لڑکی سے محبت ہونے لگی تھی وہ شادی شدہ ہو کر بھی کسی مرد کی قید سے آزاد ہے۔ دوسرے معنوں میں تمہارے جیسے شادی شدہ مرد کے لیے اس کا حصول اتنا مشکل بھی نہیں۔ میں تو کہتا ہوں اس کی ازدواجی زندگی کا المناک انجام سے دوچار ہونا، تمہارا اس سے ملنا، اس سے متاثر ہونا...... یہ غیبی اشارہ ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہو۔ بس اک ذرا کوشش سے تم دونوں کے راستے آگے جاکر مل سکتے ہیں۔''

سراج الدین بڑی دیر آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھا رہا۔ ہزاروں اندیشوں میں ایک بے رنگ زندگی میں اس ٹیچر جمیلہ جیسی گلاب رنگ خاتون کی قربت کے ولولے بھی تھے۔

شریف صاحب کی محفل سے اٹھ کر گھر آتے ہوئے دماغ نے احتجاج کیا۔ ''سراج میاں! تم کیا چاہتے ہو؟ چار بچوں اور بیوی کی موجودگی میں ایک جوان عورت کے خواب دیکھنے لگے ہو۔ ایسی دیوانگی ٹھیک نہیں، باز آجاؤ۔''

دل سے دفاعی آواز بلند ہوئی۔ ''مذہب اور اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی کو شریک حیات بنانا کس قانون کے تحت جرم ہے؟ ویسے بھی میں نے ابھی شادی کا فیصلہ تو نہیں کیا ہے۔ ایسا ہوا بھی تو اپنی بیوی اور بچوں سے بھرپور انصاف کروں گا۔''

عجیب بات ہے۔ عورت جتنی بھی حسین ہو، بہت کم مرد ایسے ہوں گے جو ایک ہی عورت کے کھونٹے سے بندھے رہ سکیں۔ رسی تڑوانے کی ہمت یا نوبت نہ بھی آئے تب بھی دوسری عورت کی خواہش دل میں مچلتی رہتی ہے۔

گرلز اسکول کی ٹیچر جمیلہ کو دیکھنے اور پھر اس کے حالات زندگی جاننے کے بعد سراج الدین بھی اب سنجیدہ خاتون کے کھونٹے سے آزاد ہونے کی سنجیدہ نیت

کر بیٹھے تھے۔

☆☆☆

سراج الدین کو ٹیچر جمیلہ سے ملنے کا پھر موقع مل گیا۔ اسکول انتظامیہ نے امتحانوں سے قبل والدین سے میٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سب بچوں کے گھروں میں چٹھی بھیجی گئی۔ پہلے بھی ایسا ہوتا تو بڑے بیٹے کمال کو بھیج دیتا تھا۔ اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دس بجے آفس سے چھٹی کر کے وہ بیٹی کے اسکول پہنچ گیا۔ وہاں بڑے سے ہال میں متعدد والدین موجود تھے۔ وہ بھی سامنے کی قطار میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نمل باپ کو دیکھ کر پاس آگئی۔

ایک آدھ بار وہ ٹیچر بھی بس ذرا سی دیر کے لیے نظر آگئی تھی۔ سراج الدین کی نشست سامنے کی قطار میں کچھ ایسے زاویے پر تھی کہ وہ پورے ہال کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ خواتین کی نشستیں علیحدہ تھیں۔ سر گھما کے اس طرف دیکھتے رہنا بھی معیوب بات تھی اس لیے وہ جی بھر کے دل کی تسکین سے محروم تھا۔ اسی وقت دل کی مراد جیسے پوری ہوئی۔ کوئی صورت نظر آنے کی امید بر آئی۔ پرنسپل صاحبہ نے لمبی چوڑی تقریر کے بعد یہ اعلان کیا کہ والدین چاہیں تو بچوں کی متعلقہ ٹیچرز سے ملاقات کر کے ان کی تعلیمی کارکردگی کے بارے میں جان سکتے ہیں۔

سراج الدین اندر سے لہرا اٹھا۔ گل رنگ جذبوں کی ہماہمی میں بیٹی کی انگلی پکڑ کر ٹیچر جمیلہ کے سامنے پہنچ گیا۔ پورے دو ہفتے بعد وہ سامنے تھی۔ آنکھوں میں شناسائی بھی تھی۔ چہرے پر نرمی بھی...... اسے نمل کے والد کے طور پر پہچان لیا تو سراج الدین کو لگا جیسے ست رنگی چوڑیاں سماعتوں میں کھنکنائی ہوں۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر کہا۔ ”مس جمیلہ! میں نمل کے حوالے سے بہت فکر مند ہوں۔ اس کے بہت سے اسباق ابھی رہتے ہیں۔ کیا یہ اچھے طریقے سے امتحان دے سکے گی؟“

وہ بولیں۔ ”مجھے آپ کی پریشانی کا احساس ہے سراج صاحب! ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں مگر امتحانوں کے لیے اتنے کم دن رہ گئے ہیں کہ محض نمل کے لیے الگ سے کلاس لینے کی گنجائش نہیں۔ آپ گھر میں بھی کچھ اضافی محنت کروائیں۔“

آٹھویں کلاس کی بچی کو گھر پر اس کے سارے بچے پڑھا سکتے تھے مگر بات نمل کی پڑھائی کی نہیں تھی، مس جمیلہ تک رسائی کی بھی تھی۔ اس لیے کہا۔ ”میرے باقی بچے ویسے تو اچھے پڑھے لکھے ہیں مگر نمل گھر کے ماحول میں شوق سے نہیں پڑھتی۔ کوئی ٹیچر ہی اسے ڈھنگ سے پڑھا سکتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا چند دن قبل آپ نے اسے اپنے گھر میں پڑھانے کی پیشکش کی تھی۔ کیا ایسا ممکن ہے؟“

”میرے پاس گھر میں بہت سی لڑکیاں پڑھنے کے لیے آتی ہیں۔ آپ کو لانے لے جانے میں دشواری نہ ہو تو مجھے بھی کوئی مجبوری نہیں۔“

دل اندر دھمال کرنے لگا۔ شوخ جذبے اچھل کود کر رہے تھے۔ انہوں نے جی جان سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مس جمیلہ نے اپنے گھر کا ایڈریس لکھ کر دے دیا۔ شام پانچ بجے نمل کو آنے کی ہدایت کی۔ وہ جوان جذبوں کی شبنمی فضا میں بھیگتا بیٹی کو لے کر گھر آگیا۔

☆☆☆

مس جمیلہ نے اپنے گھر کا جو پتا لکھوایا تھا وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل آدھے گھنٹے سے کم وقت لگ سکتا تھا مگر اس کی بیٹی ابھی ابھی صحت یاب ہوئی تھی۔ اتنا فاصلہ پیدل طے کرنے سے اسے تکلیف ہو سکتی تھی اس لیے سراج الدین نے محلے کے ایک ٹیکسی والے سے مقررہ وقت پر لانے لے جانے کی بات کی۔

عورت بڑی حساس ہوتی ہے۔ شوہر کی نظر اور چہرے کے تیور میں بہت کچھ پڑھ لیتی ہے۔ سنجیدہ خاتون بھی اپنے شوہر کو بڑے دنوں سے پڑھ رہی تھی۔

چھوٹی بیٹی نمل نے جب بتایا کہ ابو نے مس جمیلہ کے پاس ٹیوشن کی بات کی ہے تب سنجیدہ خاتون نے کرید کرید کر مس جمیلہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ نمل نا سمجھ تھی۔ اسے ماں کی باتوں میں رقابت کا ادراک نہیں تھا۔ اس نے جی بھر کر مس جمیلہ کی تعریف کی۔ وہ خوش شکل تھی، خوش لباس تھی، ابو سے اسکول میں کئی دفعہ ملاقات ہوئی تھی...... اور ابو کے کہنے پر ٹیوشن پڑھانے کے لیے بلایا تھا۔

اب شام کے وقت سراج الدین حلیہ درست کر کے بیٹی کو لے کر گھر سے روانہ ہونے لگا تو سنجیدہ خاتون کھٹک گئی۔ بیمار گزیدہ دل و دماغ میں وسوسوں کی آندھیاں چلنے لگیں۔ اس کے اندر کی عورت نے اک ذرا مزاحمت دکھائی۔

”سنیے! آپ کمال یا جمال کے ساتھ کیوں نہیں بھیج دیتے؟ ابھی دفتر سے آئے ہیں، تھک گئے ہیں۔“

سراج الدین ٹھٹک گیا۔ دل میں چور تھا۔ چوری چوری بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا کہیں اسے شک تو

نہیں ہو گیا؟ دوسرے لمحے اس خیال کو جھٹک دیا۔ رسانیت سے کہا۔

''نمل کی ٹیچر سے میں نے ہی بات کی تھی۔ آج پہلے دن خود جاؤں گا۔ بیٹی کو توجہ سے پڑھانے کی اس ٹیچر سے درخواست کروں گا۔ تم نہیں چاہتی ہو کہ نمل اچھے نمبروں سے پاس ہو؟''

یہ کہہ کر اس کا جواب سنے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ محلے کے اس ٹیکسی والے کے ساتھ بیٹی کو لے کر مس جمیلہ کے گھر پہنچ گیا۔ مکان تلاش کرنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔ بڑی سڑک سے اندر ایک کشادہ گلی میں اس کا مکان تھا۔ متوسط طبقے کے عام گھروں کی طرح وہ ایک منزلہ پکا بڑا مکان تھا۔

ٹیچر نے سراج الدین اور نمل کو دیکھ کر مسرت ...... کا اظہار کیا۔ اطمینان دلایا کہ بیٹی کو بھرپور توجہ سے امتحان کی تیاری کرائے گی۔ سراج الدین کے دل میں آیا کہہ دے...... ''محض بیٹی کو نہیں، اسے بھی توجہ کی تمنا ہے''...... مگر وہ ایسا سوچ ہی سکا۔

زبان سے کہا۔ ''آپ نے مجھے مایوسی سے نکالا ہے۔ اب میری بیٹی آپ کے سپرد ہے۔ حادثے سے اس کی تعلیم میں جو کمی رہ گئی ہے اسے دور کرائیں گی۔''

وہ بولیں۔ ''مجھے خوشی ہے آپ اپنی بیٹی پر بھرپور توجہ دیتے ہیں ورنہ اس پورے علاقے میں اکثر لوگ لڑکوں کی تعلیم کے لیے ہی فکر مند ہوتے ہیں، بیٹیوں کے لیے نہیں۔''

سراج الدین نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی طرح مہربان ٹیچرز ہوں تو ان بچیوں کے لیے بھی آگے پڑھنے کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں۔''

وہ بیٹی کو وہاں چھوڑ کر شریف صاحب کے جنرل اسٹور پر آیا۔ ٹیکسی والے کو مقررہ وقت پر بیٹی کو واپس لانے کی تاکید کر کے جنرل اسٹور میں داخل ہوا۔ حسنِ اتفاق سے شریف صاحب اکیلے تھے۔ سراج الدین کے چہرے پر ملاقات کی مسرت ابھی تک کھنڈی ہوئی تھی۔

شریف صاحب بولے۔ ''چہرے پر خوشیوں کا سیلاب امڈا ہوا ہے۔ لگتا ہے اس ٹیچر سے مل کر آ رہے ہو؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''یار شریف! تم تو محرم راز ہو، مزاج شناس بھی ہو۔ میں کئی برسوں سے صحراؤں کی پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ ٹیچر جمیلہ نے تو یہ پیاس بھڑکا دی ہے۔ اب تم ہی مجھے سمندر کا راستہ دکھا سکتے ہو۔ پلیز! مجھے ڈوبنے نہ دینا۔''

شریف صاحب اس کی بات سن کر کچھ لمحے خاموش ہوئے۔ گہری سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے رہے پھر بولے۔

''مجھے خوشی ہے تمہاری سوچ بدل رہی ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم پہلے ٹیچر جمیلہ سے رسم و راہ بڑھاؤ۔ تم سیکڑوں میں ایک نہیں ہو مگر کئی ایک سے بہت اچھے ہو۔ بس بیوی بچوں والے ہو۔ یہ پہچان کچھ نقصان دے سکتی ہے۔''

سراج الدین فکرمندی سے بولا۔ ''اسی خدشے کی وجہ سے حوصلہ ٹوٹ رہا ہے۔ ایک طرف میرے گھر والے ہیں، دوسری طرف لوگوں کی چبھتی باتیں ہیں پھر سب سے بڑھ کر ٹیچر جمیلہ اور اس کے گھر والے ہیں۔ بیوی اور چار بچوں کے باپ کو قبول کرنے میں ادھر سے بھی ہزار دیواریں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ ان ساری رکاوٹوں کو دور کرانے میں تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ میں صاف بتا دوں اس ٹیچر کو اپنی لائف پارٹنر بنانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا ہوں۔''

شریف صاحب نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی مذاق نہیں کرتا۔ تم اپنے گھر کے محاذ پر ذرا ہمت دکھاؤ، ٹیچر جمیلہ کے دل پر دستک دینے کا حوصلہ پیدا کرو۔ اس کے گھر کے دروازے پر دستک دے کر باپ اور بھائیوں سے بات میں کروں گا۔ ایک بات تمہارے حق میں ہے۔ تم شادی شدہ ہو تو وہ بھی کنواری نہیں اس لیے مایوس مت ہو۔''

یہ نہ جانے سپرنٹنڈنٹ بننے کے بعد اس کے مزاج میں در آنے والی انقلابی تبدیلی تھی، شریف صاحب کی جذبات انگیز صحبت تھی یا پھر ٹیچر جمیلہ کے ملیح چہرے کی ہوش ربا کشش...... سراج الدین نے ٹھان لی کہ جمیلہ کے دل پر دستک دینے، اس تک اپنے جذبات پہنچانے کی پوری تدبیر کرے گا۔

پہلے دن کے بعد ٹیوشن پڑھنے کے لیے اس کی بیٹی اکیلے ہی ٹیکسی پر جاتی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آیا بیٹی کے ساتھ جائے۔ ٹیچر جمیلہ سے پھر ملاقات کرلے مگر بڑی مشکل سے اس سوچ پر قابو پالیا۔ اس کے بار بار وہاں جانے سے سرگوشیاں ابھر سکتی تھیں۔ یوں کسی کے دل پر دستک دینے سے قبل ہی ان کی عزت اور نیک نامی کا دروازہ اکھڑ سکتا تھا اس لیے سراج الدین کسی مناسب موقعے کے انتظار میں دن کاٹتا رہا۔

شام کو بیٹی ٹیوشن سے واپس آتی تو سنجیدہ خاتون کی

غیر موجودگی میں پڑھائی کے بہانے جمیلہ کے بارے میں بھی پوچھ لیتا۔ وہ کیسا پڑھاتی ہے، اس کا مزاج کیسا ہے، غصہ کرتی ہے؟ بیٹی کو ماں کی رقابت کی طرح باپ کی محبت کا بھی علم نہیں تھا۔ وہ ٹیچر جمیلہ کی شفقت اور قابلیت کی بڑی تعریفیں کرتی۔ سراج الدین دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی تعریفیں سن سن کر اسے پانے کی تمنا میں بے قرار ہوتا رہتا۔

☆☆☆

سالانہ امتحان شروع ہونے والے تھے۔ گرلز ہائی اسکول میں اب پڑھائی بند ہوگئی تھی۔ امتحان کی تیاری کے لیے لڑکیوں کو چھٹی دی گئی تھی۔ نمل ادھوری پڑھائی مکمل کرنے کے لیے ٹیچر جمیلہ کے پاس جاتی تھی۔ امتحانوں سے دو دن پہلے سراج الدین کے دل نے ٹیچر جمیلہ سے ملنے کا حوصلہ کیا۔ اندر سے اٹھنے والی مزاحمتی آوازوں کو دبا دیا۔

اعتراض کسی کو ہو نہ ہو، اس کی بیوی کو شک ہوسکتا تھا اس لیے ٹیکسی والے کو فون کر کے اسے سمجھایا کہ وہ شریف صاحب کے جنرل اسٹور میں انتظار کرے گا۔ گھر سے بیٹی کو لے کر وہاں آئے۔ اسے بھی ساتھ لے جائے۔ شریف صاحب سے مشورہ کر کے اس نے بازار سے مٹھائی کا بڑا سا ڈبا بھی لے لیا۔

ٹیچر جمیلہ کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح سنجیدہ سی مسکراہٹ اور انسیت تھی۔ مٹھائی انہیں دیتے ہوئے بولا۔ ”مس جمیلہ! کچھ دن پہلے تک میں سخت فکر مند تھا۔ میری بیٹی انگلش اور حساب میں بہت کمزور تھی۔ جب سے آپ کے پاس ٹیوشن پڑھ رہی ہے، ان دونوں مضامین میں بہت بہتری پیدا ہوئی ہے۔ یہ مٹھائی آپ کے خلوص اور محنت کا ایک عاجزانہ صلہ ہے۔“

وہ خوش دلی سے بولیں۔ ”آپ شرمندہ کر رہے ہیں سراج صاحب! آپ کی بیٹی بہت ذہین اور محنتی ہے۔ اسے سمجھانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آرہی۔ ان شاء اللہ امتحانوں میں اس کی کارکردگی بہتر ہوگی۔“

ابھی ایسا کوئی سلسلہ نہیں چلا تھا کہ دل پر دستک دینے والی کوئی نرم گرم گفتگو کر لیتا۔ وقت اور مقام بھی مناسب نہیں تھا۔ گلی میں کھڑے کھڑے اس کے ٹیوشن سینٹر کے باہر وہ اس وقت بات کر رہا تھا اس لیے محض نصابی گفتگو ہی ممکن تھی۔ جذباتی گفتگو کے لیے مٹھائی کے ڈبے کو زینے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اب یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ آگے کیا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

سنجیدہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی، اس کا شوہر بہت بدل گیا تھا۔ اپنے لباس اور حلیے پر خوب خوب توجہ دینے لگا تھا۔ خوراک بھی بدل گئی تھی۔ پہلے گھر والوں کے ساتھ ہی کھاتا پیتا تھا اب اپنے لیے خصوصی اہتمام سے کھانا پکواتا۔ اچھا لباس اور غذائیت سے بھرپور کھانے کھا کر کچھ ہی عرصے میں وہ اپنی عمر سے دس سال کم لگنے لگا تھا۔ اس پر مستزاد خوش شکل بھی تھا۔ اک ذرا حلیہ درست کر کے، عمدہ لباس پہن کر گلی سے گزرتا تھا تو کوئی ایک جوان رشک سے اسے دیکھتے رہ جاتے۔ متعدد نسوانی آنکھیں اس کی طرف اٹھنے لگ جاتیں۔

سنجیدہ شوہر کی اس ہیئت کذائی پر خوش کیا ہوتی، الٹا اس کا دل ہول کھا رہا تھا۔ اپنے بیمار جسم کی بے رونقی کا احساس اسے اندر سے کچوکے لگا رہا تھا۔ بہت دن ہوئے تھے، شوہر پاس بھی نہیں آیا تھا۔ آفس سے آنے کے بعد گھر سے نکل جاتا اور رات گئے لوٹتا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں ہی بیٹیاں کھانا پہنچا دیتیں۔ کھانا کھا کر، ٹی وی دیکھ کر یا پھر کوئی کتاب پڑھ کر سو جاتا۔ سنجیدہ دوسرے کمرے میں بیٹیوں کے ساتھ سو جاتی۔ الگ الگ کمرے میں سوتے ہوئے تو مدت ہوئی تھی مگر پچھلے چند ہفتوں سے اس کا رویّہ بھی بہت بدل گیا تھا۔ آنکھوں میں بے مہری، باتوں میں بے توقیری تھی اور مزاج میں بے اعتنائی صاف جھلکتی تھی۔ پہلے تو کبھی کسی وقت اس کے پاس بیٹھ کر دو چار باتیں بھی کر لیتا تھا۔ اب کئی کئی دنوں تک سیدھے منہ بات کرنے سے بھی کتراتا تھا۔

اسی دوران نمل ٹیوشن پڑھنے جانے لگی پھر اس کی زبانی جو سنا، اس نے بھی بدگمانیوں کی آنچ تیز کر دی۔ معدے کی تکلیف کی وجہ سے نکلنے والی ہائے وائے میں اب دل کے روگ سے نکلنے والی ٹھنڈی آہیں بھی شامل ہوگئیں۔ وہ پہلے سے زیادہ بیمار اور کمزور نظر آنے لگی۔

دوسری طرف سراج الدین کی آنکھوں میں اب دلکش خواب اتر آئے تھے۔ پُرکیف موسموں کی مسحور کن ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ ایسے میں سنجیدہ سے فاصلے مزید بڑھنے لگے۔

☆☆☆

اسکول میں سالانہ امتحانات شروع ہوئے۔ جمیلہ نے سب بچوں کو ٹیوشن سے بھی فارغ کر دیا۔ انہیں ہدایت کی کہ اب امتحانات کی ڈیٹ شیٹ کے مطابق خود ہی تیاری کرلیں پھر بھی کسی مضمون میں دشواری محسوس ہو تو آجائیں۔

نمل بہت ذہین تھی۔ چوٹ کی وجہ سے پڑھائی میں

جو رکاوٹ پیدا ہوئی تھی اسے اپنی محنت اور جمیلہ کی توجہ سے دور کیا تھا۔ وہ امتحان میں خود ہی پڑھ کر پرچہ حل کرسکتی تھی لیکن سراج الدین کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ تو ٹیوشن کا راستہ پکڑ کے دل کی منزل تک پہنچنا چاہتا تھا پھر اسے ایک بہانہ سوجھا۔

رات کو بیٹی سے ریاضی کے کچھ سوال پوچھے۔ کتاب کی مشقوں میں سے کچھ حل کر کے دکھانے کو کہا۔ بیٹی نے ایک آدھ سوال غلط حل کیا۔ بس پھر کیا تھا، انہوں نے ایک دم فیصلہ سنا دیا۔

''ابھی تم حساب کے مضمون میں کمزور ہو۔ پرسوں اس کا پرچہ ہے۔ اس سے پہلے کل مس جمیلہ کے پاس جا کر یہ کمزوری دور کروالو۔''

بڑی بیٹی ثمر بولی۔ ''ابو! یہ بہت آسان مشقیں ہیں۔ میں بھی سمجھا سکتی ہوں۔ مفت میں آپ کو تکلیف ہوگی۔''

ان کے پاس گھڑا گھڑایا جواب تیار تھا۔ ''تمہارے پاس وقت کہاں ہے؟ اپنی کتابیں پڑھنے کا موقع نہیں، کالج سے آکر گھر کے کام کاج میں لگ جاتی ہو۔ تمہاری ماں تو بس بستر پر ہی پڑی رہتی ہے۔''

سنجیدہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میرا بستر پر پڑے رہنا آپ کو بُرا لگتا ہے۔ تھوڑا سا زہر لادیں۔ کھا کر مرجاؤں گی تو سب کی جان چھوٹے گی۔''

وہ کٹیلے لہجے میں بولا۔ ''بس بس، زیادہ موت کا وظیفہ مت پڑھو۔ میں نے بستر پر پڑے رہنے کی بات کی ہے۔ کیا غلط کہا ہے؟ کچھ گھر سے باہر بھی نکلو۔ اک ذرا چہل قدمی کرو، ہاضمے کی مشین کو تھوڑی حرکت دو، لباس اور حلیے پر توجہ دو۔ خود کو آئینے میں دیکھو، اپنی بیٹیوں کی دادی لگتی ہو۔''

وہ ایک دم پھُس پھُس کر کے رونے لگی۔ ''اس موئی بیماری نے میرا یہ حال کردیا ہے۔ کچھ کھاتی ہوں تو معدہ پکڑ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ دو قدم زیادہ چلتی ہوں تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ اس پر آپ کی جلی کٹی باتیں اور طعنے رہی سہی کسر نکال دیتے ہیں۔ خود تو صحت مند ہیں۔ جوانوں کی طرح بن ٹھن کے رہتے ہیں۔ اب مجھ سے جی بھر گیا ہے اس لیے دادی اماں لگتی ہوں۔ شاید کسی میم کو تلاش کررہے ہیں۔''

سنجیدہ خاتون کے دکھڑے طویل تھے۔ برسوں سے وہ یہ رونا روتی رہی تھی۔ اس کے بچے اور سراج الدین بھی ایسی باتوں کے عادی تھے اس لیے مسکرا کر ٹال جاتے تھے۔ اس وقت بھی بیٹیاں ہنس پڑی تھیں مگر سراج الدین کا دل دھک سے رہ گیا۔ دل بے ایمان ہوا تھا اس لیے یہ عام سی بات بھی شدت سے لگی تھی۔ کیا اس نے جان لیا ہے شوہر کی آنکھوں میں کوئی اور صورت مجسم مورت بنی موجود ہے؟ اس کے دل میں زندگی سے بھرپور کوئی عورت اتر آئی ہے؟

اس نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ سنجیدہ چادر کے پلو میں منہ چھپائے آہستہ آہستہ رورہی تھی۔ سراج الدین کے دل نے کہا۔ ''اچھا ہے سنجیدہ خاتون جان لے۔ آج نہیں تو کل اسے معلوم ہونے والا ہے۔''

اسی وقت دماغ نے ٹوکا۔ ''بیوی بیچاری کمزور ہے، بے بس ہے۔ تمہارے دباؤ میں آسکتی ہے۔ تمہارے بیٹے تو جوان ہیں۔ بڑی بیٹی بھی شادی کے قابل ہوگئی ہے۔ کیا انہیں قبول ہوگا؟''

ہمت کے پر ٹوٹ سے گئے۔ وہ اک ذرا گڑبڑا گیا پھر دل نے لہرا کر اپنی بات کی۔ ''اپنی بھرپور جوانی کے پچیس سالوں کو ان کے لیے قربان کیا ہے۔ انہیں اچھا کھلایا ہے، اچھا پہنایا ہے۔ آس پاس کے اکثر گھروں کے لڑکے لڑکیوں سے ان کا طرزِ زندگی بہتر ہے۔ آئندہ بھی انہیں کسی محرومی کا سامنا نہیں ہونے دوں گا۔ ایسے میں میرے جذبات کی کوئی قدر نہیں ہے کیا؟ میری زندگی میں ایک بھرپور عورت کی کمی رہی ہے۔ اب اسے دور کرنے کی خواہش جاگی ہے تو اس کی کچھ اہمیت نہیں ہے؟''

اس وقت جذبات حاوی تھے۔ دماغ کے ہر وار کا جواب موجود تھا مگر طبیعت مکدر ہوگئی تھی۔ وہ اٹھ کر بوجھل قدموں سے اپنی خواب گاہ میں آگیا۔ دل و دماغ کی جنگ ایسی تھی کہ بیڈ پر نیم دراز ہوکر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اسے پتا بھی نہ چلا کب بڑی بیٹی ثمر دودھ گرم کر کے لے آئی۔ وہ ہر رات گائے کے نیم گرم دودھ میں شہد ڈال کر پیتا تھا۔ گرم دودھ پی کر جب جذبات دھیمی آگ میں سلگنے لگے تو وہ اٹھ بیٹھا۔ سائڈ ٹیبل پر نوٹ پیڈ پڑا ہوا تھا۔ قلم لے کر بہت سوچ سوچ کر اس پر لکھنے لگا۔

''جمیلہ صاحبہ! میں نہیں جانتا یہ سطور پڑھ کر آپ میرے بارے میں کیسا سوچیں گی لیکن ایک بات جانتا ہوں...... آپ کو بہت اہمیت دے کر یہ سب لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے میری باتیں آپ کو پسند نہ آئیں۔ بس ایک التجا ہے، اس بنیاد پر آپ مجھے اوباش اور بدفطرت نہ سمجھیں۔

''جمیلہ صاحبہ! آپ قسمت پر یقین رکھتی ہیں؟ میں بھی رکھتا ہوں۔ میں پچیس سال ایک بیمار بیوی کی زنجیر سے بندھا رہا ہوں۔ ایک بے کیف اور بے رنگ زندگی...... اسے قسمت

کا لکھا سمجھ کر برداشت کرتا رہا ہوں...... پھر آپ سے ملاقات ہوگئی۔ پہلی، دوسری...... پھر کئی بار۔ جب جب آپ سے ملا اور آپ کی زندگی میں قسمت کے پھیر کا علم ہوا، میری پچیس سالہ ازدواجی زنجیر کی کڑیاں کمزور پڑنے لگیں۔

''میں آپ کے بارے میں تھوڑا سا جانتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم آپ جیسی بے مثال خاتون کی ازدواجی زندگی اس طرح متاثر کیوں ہوئی ہے؟ اسے بھی قسمت کے کھاتے میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی سے مجھے اپنی قسمت آزمانے کی ہمت ہوئی ہے۔ ہم دونوں کئی بار ملے ہیں۔ میں کسی خوش فہمی کے بغیر کہتا ہوں۔ یار دوست مجھے اب بھی جوان سمجھتے ہیں۔ میں نہیں جانتا آپ مجھے کیسا سمجھتی ہیں؟ شاید آپ نے مجھے کبھی ایسی نظروں سے دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ ایسی نیت سے میرے بارے میں سوچا بھی نہیں ہوگا مگر آج میری یہ جسارت مان لیں گی؟ میری یہ تحریر پڑھ کر میرے بارے میں سوچ لیں گی؟ ایک پچاس سالہ شادی شدہ مرد کے جذبات کی یہ گستاخی اک ذرا تحمل سے سنیں گی؟

''آج بیٹی کو حساب کے پرچے کی تیاری کے بہانے سے آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ اصل مقصد یہ تحریر آپ تک پہنچانا تھی۔ آج کے بعد شاید ملاقات کا موقع نہ مل سکے اس لیے آج یہ جرأتِ اظہار کی ہے۔ میرے ان محسوسات کو پڑھ کر اگر آپ کو مجھ سے نفرت نہ ہوئی تب میرے موبائل نمبر پر بس ایک میسج بھیج دیں۔ ایک ہفتے تک آپ کا میسج نہ ملا تو سمجھ جاؤں گا آپ نے میرے نمبر کی طرح مجھے بھی زندگی کی ڈائری سے ڈیلیٹ کر دیا ہے۔''

سراج الدین نے تحریر کے آخر میں اپنا موبائل نمبر لکھا۔ اسے ایک بار پھر پڑھا اور پھر اسے نوٹ پیڈ سے پھاڑ کر تہ کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ لائٹ بند کر کے خوش کن ساعتوں اور خوشبودار صحبتوں کے تصور میں بھیگتا بڑی دیر بعد سو گیا۔

اگلے دن شام کے وقت بیٹی کو ساتھ لے کر ٹیچر جمیلہ کے گھر پہنچ گیا اور اس سے درخواست کی۔

''دو عمل کو حساب کی کچھ مشقیں سمجھ میں نہیں آئی ہیں۔ کل امتحانی پرچے سے پہلے ان کی تیاری کرا دیں۔''

مس جمیلہ نے خوش دلی سے مان لیا۔ سراج الدین نے ہمت سے کام لیا۔ جتنے دن ٹیوشن پڑھائی تھی اس کی فیس اور رات کو سلگتے ارمانوں کی جو کتھا لکھی تھی اسے بھی ایک لفافے میں ڈال کر ٹیچر جمیلہ کو پیش کیا۔

ٹیچر جمیلہ سب سے ٹیوشن فیس لیتی تھی اس لیے یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ اصل بات فیس کے ساتھ لپیٹ کر پیش کی تھی۔ لفافے میں پیسے ہوں گے، جمیلہ سمجھ سکتی تھی۔ دل کے قصے ہوں گے، یہ بات لفافہ کھولنے کے بعد ہی جان سکتی تھی۔

سراج الدین کی ہمت نہیں ہو رہی تھی زیادہ دیر وہاں کھڑا رہے۔ اندر کی آگ لفافے میں منتقل کی تھی۔ کھولنے پر بھڑک بھی سکتی تھی۔ وہ اس کی لپٹیں محسوس کرنے سے قبل ہی کھسکنا چاہتا تھا۔

اس نے ٹیچر جمیلہ کا شکریہ ادا کیا۔ بس ایک ساعت کے لیے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھے شریف صاحب کی صحبت گل رنگ میں آ گیا۔

آج اس کے پاس کہنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں۔

☆☆☆

رات کسی ٹوٹے دل کی طرح افسردہ تھی، ویران جنگلوں کی کسی جھیل کی طرح خاموش تھی۔ انسانی بستیاں بھیگتی رات کے دامن میں منہ چھپا کر سوئی پڑی تھیں۔ بڑی سڑک پر سے کوئی گاڑی تیزی سے گزر جاتی تو یہ خاموشی اک ذرا ٹوٹ جاتی۔ ایسے میں اس بستی کی بڑی سڑک کے اندر گلی میں ایک کمرے میں ابھی رات جاگ رہی تھی۔

مس جمیلہ رات کے ایسے وقت کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی ستاروں کی خاموش رہ گزر میں اپنی قسمت تلاش کرتے ہوئے بے کل ہو رہی تھی۔ وہ قنوطی نہیں تھی۔ اچھی پڑھی لکھی اور پختہ فکر عورت تھی۔ مختصر سی ازدواجی زندگی میں بڑے دکھ اٹھائے تھے پھر بھی حوصلے اور خوشدلی سے زندگی جی رہی تھی۔

جوانی میں سہاگ نہ رہے تو زندگی جہنم کی آگ بن جاتی ہے۔ لوگوں کے طنز اور طعنے پھر اس کی شدت بڑھا دیتے ہیں۔ پچھلے دو سالوں سے وہ بھی اس قیامت کو جھیلتی رہی تھی۔ گرلز اسکول میں لڑکیوں کے ساتھ معروف ہو کر غمِ رفتہ کے دکھ بھولتی جا رہی تھی۔ وہ وائس پرنسپل تھی، کئی اضافی ذمے داریاں بھی اس کی ڈیوٹی کا حصہ تھیں۔ ان میں ایسی الجھ جاتی تھی کہ زندگی کی ڈور سلجھانے کی فکر ہی نہیں رہی تھی۔

مگر آج دل کے پُرسکون سمندر میں جوار بھاٹا اٹھا تھا۔ جذبات کی شانت جھیل پر کسی نے کنکر پھینک دیا تھا۔ اس کی شدت اتنی محسوس ہو رہی تھی کہ اتنی رات گئے بھی وہ کانپ رہی تھی۔ دل اتنے زوروں سے دھڑکا تھا کہ ابھی تک دھڑکنیں ہانپ رہی تھیں۔ سراج الدین کے خط کا لفظ لفظ اس کی ٹیسیں جگا رہا تھا۔ زندگی کی وہ گاڑی جو دو برس پہلے

محض تین سال ہی کی مسافت طے کر کے بیچ راہ میں رک گئی تھی، اب اس پر کوئی اور سوار ہونا چاہتا تھا۔ اسے منزل آشنا کرانے کے خواب دکھا رہا تھا۔

وہ شروع سے خوابوں کی اسیر لڑکی تھی۔ اس کے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔

اس پر بھی قدغنیں تھیں مگر اس کا خواب تھا پڑھنے کا۔ وہ خم ٹھونک کر میدان میں اتری۔ میٹرک کے بعد ایم اے تک پڑھا پھر ایم ایڈ کیا۔ حسنِ اتفاق سے سرکاری اسکول میں گریڈ سولہ کی ٹیچر بھی بھرتی ہوئی۔ یہ سارے خواب دیکھ کر ان کی تعبیر پانا اس اکیلی کے بس میں نہیں تھا۔ اصل میں اس کی پشت پر اس کا بڑا بھائی تھا۔ ایک سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے بہن کا شوق دیکھا تو تعلیم سے لے کر ملازمت تک، ہر مرحلے پر اس کی اخلاقی اور مالی مدد کی۔

پچیس سال کی عمر میں وہ ٹیچر لگ گئی۔ اسکول میں ملازمت ملتے ہی رشتوں کی قطار لگ گئی۔ وہ متوسط طبقے والوں کے لیے ایک طرح سے اے ٹی ایم کارڈ تھی۔ ہر مہینے چالیس ہزار سے زیادہ کمانے والی ''کماؤ پوت'' تھی۔ ایسے میں رشتے داری جتلا جتلا کر رشتہ مانگنے والوں کی کمی نہیں تھی۔

وہ اٹھائیس سال کی تھی جب اس کی شادی ہوگئی۔ ابھی تک بہت سے رشتوں سے انکار کر چکی تھی۔ بھائی کی اعانت سے اپنی بات منوانے میں کامیاب بھی ہوئی تھی مگر پھوپی نے سب کچھ تلپٹ کر دیا۔

انہوں نے جمیلہ کے والد شیخ برکت اللہ کے آگے اپنی چادر ڈال دی۔ اپنے بیٹے اکرام کے لیے رشتہ پکا کرنے یا پھر بہن کے رشتے کو ہمیشہ کے لیے توڑ دینے کی دوٹوک بات کی۔ شیخ صاحب کی یہ بڑی بہن بڑی گرم مزاج خاتون تھیں۔ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر آسمان سر پر اٹھالیتی تھیں۔ شیخ برکت اللہ بڑی بہن سے ہمیشہ دبے رہتے تھے۔ جمیلہ کے رونے دھونے کے باوجود انکار نہ کر سکے۔ بات پکی ہوئی اور جمیلہ رخصت ہو کر پھوپی کے گھر میں آگئی۔

اپنے شوہر اکرام کو بچپن سے جانتی تھی۔ اس سے تین چار سال بڑا تھا۔ عام سی شکل وصورت اور جسامت کا مالک تھا۔ تعلیم بھی بس واجبی تھی۔ جمیلہ جیسی پُرکشش اور تعلیم یافتہ لڑکی کا کسی بھی لحاظ سے آئیڈیل نہیں بن سکتا تھا مگر بڑوں نے رشتہ باندھا تھا، اس کی لاج رکھنی تھی اس لیے اس نے دل وجان سے اسے اپنا شوہر مان لیا۔ اس نے شادی سے پہلے بس یہی خواہش کی کہ اس کی ٹیچنگ پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

اکرام اللہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اس لیے کسی اچھی نوکری کا اہل بھی نہیں تھا۔ چھوٹا موٹا کاروبار کرتا تھا لیکن بڑا غیر مستقل مزاج بندہ تھا۔ کوئی بھی ڈھنگ کا کام جم کر نہیں کرتا تھا۔ ایک کام سے پیچھا چھڑا کر پھر کسی اور کاروبار پر قسمت آزماتا۔ کبھی تھوڑا بہت کماتا۔ اکثر گھاٹے میں پڑ جاتا تھا۔

اس کا فلسفہ تھا کہ ایمانداری، محنت اور مہارت سے زیادہ حیلہ بازی، خوشامد اور شارٹ کٹ سے کامیابی ملتی ہے۔ اس فلسفے پر عمل کرتا تھا اور ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھتا تھا مگر کامیابی کے اپنے خودساختہ اصولوں سے باز نہیں آتا تھا۔

ایسے میں بیوی گھر آگئی۔ ساتھ ہی چالیس ہزار کی اضافی آمدنی بھی گویا چھپر پھاڑ کر اتری، تب اس کی کاہلی اور بیکاری کچھ اور بڑھ گئی۔

چھ مہینے گزر گئے۔ ساس، دو نندیں اور شوہر اس کی تنخواہ میں سے کھاتے بھی رہے، پیٹھ پیچھے اسے بُرا بھی کہتے رہے۔

جمیلہ بہت اعلیٰ ظرف اور تحمل مزاج تھی۔ ایک اچھے اسکول کی مقبول ٹیچر تھی۔ بہت سے لوگ اس کی قابلیت اور طبیعت کی تعریف کرتے تھے مگر سسرال میں وہ محض بیوی تھی، بہو تھی اور بھابی تھی جس کا کام کھانا پکانا، برتن دھونا اور سب کی خدمت کرنا تھا۔

اکرام اللہ عجب بے نیاز شوہر تھا۔ بیوی سے کبھی پوچھا تک نہیں تھا کہ کھانے یا پہننے کے لیے کچھ لے آؤں؟ کبھی جمیلہ اپنی طرف سے کسی چیز کی فرمائش کرتی تو برا سا منہ بنا کر کہتا۔ ''دیکھو جمیلہ! میرے پاس پیسے ختم ہوگئے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے میرا کام ٹھیک نہیں چل رہا۔ تمہارے پاس تنخواہ کے پیسے ہوں گے۔ مجھے دے دو، تمہاری چیزیں لے آؤں گا۔''

وہ کٹ سی گئی۔ دکھ سے بولی۔ ''میں اتنا سارا تو گھر کے لیے خرچ کرتی ہوں پھر پھوپی اور تمہاری دونوں بہنوں کو بھی اکثر پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مہینا ختم ہونے تک دو چار ہزار روپے بھی پس انداز نہیں کر سکتی۔''

اکرام اللہ کی غیرت جاگ اٹھی۔ وہ گھور کر بولا۔ ''میری امی اور بہنوں کو کبھی ہزار پانچ سو دے کر جتلانے کی ضرورت نہیں۔ تم خود کتنی شاہ خرچیاں کرتی ہو، کیا مجھے خبر نہیں ہے۔''

وہ دکھ چھپا کر رسان سے بولی۔ ''میں ایک بڑے اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ اچھے خاندانوں کی ٹیچرز اور

اسٹوڈنٹس وہاں پر ہیں۔ اکثر تقریبات ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے میں بھی دوسرے تیسرے مہینے کوئی نیا سوٹ بنوالیتی ہوں۔ وہ بھی چار پانچ ہزار سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ باقی ایسے کون سے فضول شوق ہیں میرے؟"

اکرام اللہ جھنجلا کر بولا۔ "بس بس...... کتنی دفعہ کہوگی ہم پر خرچ کرتی ہو؟ یہ گھر تمہارا نہیں ہے؟ تم میری بیوی بن کر اس گھر میں آئی ہو۔ کیا تمہاری آمدنی میں میرا یا میرے گھر والوں کا حق نہیں ہے؟"

وہ بحث سے بچنے کے لیے بولی۔ "آپ سب کو اپنا سمجھ کر ہی تو ایسا کرتی ہوں مگر میری تنخواہ کوئی لاکھوں میں تو نہیں ہے۔ کٹ کٹا کر تیس ہزار سے زیادہ نہیں بنتی۔ جب مہینا ختم ہوتا ہے، پانچ ہزار روپے کسی مشکل وقت کے لیے بچا نہیں پاتی پھر بھی بدگمانی سی بدگمانی ہے۔"

کم و بیش ایسی باتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ اکرام اللہ بس واجبی سی عقل کا آدمی تھا۔ جمیلہ کے پاس آکر جیسے کڑوے بادام چبائے ہوں، اس طرح منہ بناتے ہوئے تفتیش کرنے لگ جاتا۔ جمیلہ بڑی مشکل سے اپنی قربت اور بصیرت سے شوہر کا مزاج معتدل کردیتی تھی۔

جمیلہ کے سسر عنایت میاں کافی عمر رسیدہ تھے۔ اچھے مزاج کے انسان تھے۔

شادی کو ایک سال ہوگیا۔ اس اثنا میں دو واقعات رونما ہوئے۔ سسر عنایت میاں، اللہ میاں کو پیارے ہوگئے۔ بڑی نند حمیرا کی منگنی ہوگئی۔ وہ بی اے کے امتحانات دے رہی تھی۔ تیسرے واقعے کا سب کو انتظار تھا مگر ایسا نہ ہوا۔ کسی خوشخبری کا سب کو انتظار تھا مگر ایک سال کی دلہن کو بھی دس سال کی بے اولاد بیوی کی طرح جان ہلکان کردیتے ہیں۔

جمیلہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پہلا سال گزر گیا۔ ساس صاحبہ کو ایک نیا محاذ کھولنے کا بہانہ مل گیا۔

یہ خوب تھا کہ اکرام اللہ کو بچوں کے حوالے سے ماں جیسی فکر نہیں تھی۔ ماں کی جلی کٹی باتیں سن کر وہ اکثر بے نیازی ظاہر کرتا۔ بچوں کے جھنجٹ سے فی الحال بچے رہنے پر مسرت کا اظہار کرتا۔

شادی کا دوسرا سال شروع ہوئے دو مہینے گزر گئے۔ بڑی نند حمیرا کی شادی ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اکرام اللہ نے اچانک یہ فیصلہ سنادیا کہ وہ متحدہ عرب امارات کی ریاست دبئی جانا چاہتا ہے۔ وہاں اس کے دوست ہیں۔ انہوں نے ایک بڑی کمپنی میں اس کے لیے اچھی ملازمت کا موقع ڈھونڈا ہے۔

گھر میں اور کوئی مرد نہیں تھا۔ ماں تھی، ایک بہن تھی اور بیوی تھی مگر زیادہ کمانے کی خواہش اس طرح دماغ پر سوار ہوچکی تھی کہ وہ سب کو روتا، بے یار و مددگار چھوڑ کر ایک دن دبئی چلا گیا۔

☆☆☆

جمیلہ اس کے جانے کے بہت دن بعد تک سکتے کی سی حالت میں رہی۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اکرام ایسا دولت پرست اور بے مہر ہوگا۔ دولت ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ رشتوں کی قدر ہی نہ رہے۔

جمیلہ اکثر خاموش رہنے لگی تھی۔ اسکول سے واپس آکر گھر کے اپنے حصے کا کام کرکے کمرے میں بند ہوجاتی۔ ساس اور چھوٹی نند نویرہ سے بس رات کے کھانے پر سامنا کرتی۔

نویرہ کو بھائی نے دبئی سے بڑا موبائل بھیجا تھا۔ وہ ہر وقت اس میں مصروف رہتی یا پھر ٹی وی دیکھتی رہتی۔

جمیلہ بوجھل بوجھل سی اپنے کمرے میں آجاتی۔ اگلے دن بچیوں کو پڑھائے جانے والے اسباق کو کچھ وقت دیتی۔ تھوڑی دیر ٹی وی دیکھنے میں مصروف رہتی۔ ایک اداس اور تھکے تھکے سے انداز میں نیند کی بستیوں میں پہنچ جاتی۔ کبھی رات رات بھر حسرتوں سے لپٹ کر جاگتی رہتی۔

ہفتے میں ایک دو دن کے لیے میکے چلی جاتی تھی۔ ایسی اعلیٰ ظرف بھی کہ سسرال کے دکھ امی یا بہنوں میں سے کسی کو بھی نہیں بتائے۔

مگر شیخ برکت اللہ کو اب افسوس ہو رہا تھا۔ بڑی بہن کے دباؤ میں آکر یہ رشتہ طے کرنے کا ملال رہنے لگا تھا۔ وہ سب اکرام کو قصوروار ٹھہراتے۔ زیادہ دولت کمانے کے لالچ میں عورتوں کو تنہا چھوڑ دینے پر غم و غصے کا اظہار کرتے۔

شادی کا دوسرا سال بھی گزر گیا۔ اکرام دو ہفتے کی چھٹی پر آیا۔ اپنے ساتھ دولت تو کچھ نہیں لایا مگر بڑے بڑے خواب لے کر آیا تھا جن کی تعبیر کی تمنا میں چند ہی دن بعد واپس چلا گیا۔

اس دوسرے سال کے اختتام پر بھی جمیلہ کی گود ہری بھری نہ ہوئی۔ اب تو اندر باہر سے کڑوی کسیلی باتوں کی کاٹ کچھ زیادہ ہی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ خود بھی اب فکرمندی سے اپنی خالی گود کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

اسکول کی ایک ساتھی ٹیچر اس کی بے تکلف دوست تھی۔ اس کا نام عابدہ تھا۔ وہ بھی شادی شدہ تھی۔ اکثر جمیلہ

اپنے دکھ سکھ اسے سناتی رہتی تھی۔ اس ساتھی ٹیچر کے کہنے پر شہر کی ایک مشہور گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر نے تفصیلی معائنہ اور مختلف ٹیسٹ وغیرہ کے بعد کہا کہ پیچیدگی کی کوئی بات نہیں۔ مختصر سی دوا سے مسئلہ دور ہوسکتا ہے مگر اس کے لیے شوہر کی موجودگی لازم ہے۔ اس کے بغیر دوا کارگر نہیں ہوسکتی۔

وہ ہفتے میں دو ایک بار اکرام سے فون پر بات کرتی تھی۔ اب کی بار اس نے ڈاکٹر سے ملاقات اور اس کی ہدایات کے بارے میں بتادیا۔

اکرام بڑی بے نیازی سے بولا۔ ”کمپنی میں میری ذمے داریاں زیادہ ہیں۔ ابھی کچھ ہی ہفتے ہوئے ہیں وہاں سے آئے ہوئے۔ مجھے بار بار چھٹی نہیں مل سکتی۔“

اکرام کے دماغ پر دولت مندی کا بھوت سوار تھا۔ جمیلہ کے دکھ درد، ماں اور بہن کی پریشانیوں کا احساس نہیں ہورہا تھا۔ پھوپی کو بیٹے کی کمی محسوس ہوتی ہوگی مگر اس امید میں دن گنتی تھی کہ سال کے آخر تک اکرام انہیں دبئی بلانے والا ہے پھر یہ سارے دلدر دور ہوجائیں گے۔

اور اسی بات سے جمیلہ کے دل میں ہول اٹھتے تھے۔ وہ کیسے ہمیشہ کے لیے ان سب سے ناتا توڑ کر جاسکتی ہے؟ عورت ذات کے لیے سرکاری نوکری آسانی سے نہیں ملتی۔ شوہر کے مزاج کو وہ سمجھتی تھی۔ اس کی باتوں میں آکر ایسی نعمت کو ٹھکرانے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ اس کا سکون لٹ گیا تھا۔ اکثر راتوں کو جاگنے اور پریشان رہنے سے اس کی صحت گرگئی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑگئے۔

☆☆☆

اکرام کا دبئی میں ایک سال پورا ہوگیا۔ وعدوں اور دعووں کے مطابق وہ دبئی میں اپنا کاروبار شروع نہیں کرسکا۔ جس کمپنی میں کام کرتا تھا اس میں تنخواہ تو معقول تھی، پابندی زیادہ تھی۔ سال ختم ہونے پر وہ بیس دنوں کی چھٹی پر آیا۔ بہت جلد سب گھر والوں کو دبئی لے جانے کا عندیہ دے کر لوٹ گیا۔

چھ مہینے اور گزر گئے۔ وعدے کے مطابق انہیں دبئی بلانے کے بجائے ایک دن سب کا دل دہلا دیا۔ اس نے جمیلہ کو فون کر کے بتایا کہ تین اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر وہ ایک ریسٹورنٹ کھول رہا ہے۔ اس ریسٹورنٹ کا مالک ایک ہندوستانی تاجر ہے۔ اب وہ سب کچھ لپیٹ کر ہندوستان واپس جارہا ہے۔ اس کی لاگت دو کروڑ پاکستانی روپوں کے برابر تھی۔ چار ساتھیوں میں یہ لاگت برابر تقسیم کی گئی تھی۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی مگر اگلی بات نے جمیلہ کا دل دہلا دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ بڑا منافع بخش منصوبہ ہے۔ دولت سنبھالے نہیں سنبھلے گی۔ اس مقصد کے لیے وہ آخری حد تک جانے کو تیار ہے۔ اس لیے اس نے گھر بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس کے سنبھل کر کچھ بولنے تک اکرام نے فون بند کردیا۔

پچاس لاکھ روپے اکرام جیسے اوسط درجے کی خوبیوں والے شخص کے لیے نہایت بڑی رقم تھی۔ کمپنی میں پچاس ہزار سے زیادہ اس کی تنخواہ نہیں تھی۔ ہمیشہ ہی حیثیت سے بڑھ کر اونچے اونچے خواب دیکھتا رہا تھا اور ہر بار ٹھوکریں ہی کھائی تھیں۔ یہ بات اس نے اپنی امی اور بہن کو بھی بتادی تھی۔ وہ بھی متفکر نظر آرہی تھیں پھر ایک دن وہ اچانک گھر آگیا۔ جھٹ پٹ پراپرٹی ڈیلروں سے بات کی۔ چالیس لاکھ میں گھر کا سودا طے کرلیا۔

ماں اور بہن کو دبئی کی چمک دمک، وہاں کی رونقیں اور راحتیں نظر آرہی تھیں اس لیے مکان بیچے جانے کا زیادہ دکھ نہیں تھا۔

اکرام اللہ فیصلہ کرچکا تھا۔ جمیلہ کا رونا دھونا اور احتجاج اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور نہ کرسکا۔ الٹا اس نے مطالبہ داغ دیا۔ ”دس لاکھ روپے ابھی کم پڑتے ہیں۔ ان میں سے آدھی رقم کا بندوبست تم کرلو۔ زرگروں کی بیٹی ہو۔ اپنے داماد کے اچھے مستقبل کے لیے پانچ لاکھ روپے نہیں دے سکتے کیا وہ؟“

جمیلہ نے بات گھر والوں کے سامنے رکھی مگر گھر والوں نے شدید غصہ اور ناراضگی کا اظہار کیا۔

☆☆☆

جمیلہ عجب دوراہے پر کھڑی تھی۔ دونوں راستوں پر اپنی تباہی صاف نظر آرہی تھی۔ شوہر کی بات مان لیتی تو ایک اچھی نوکری سے محرومی اور بہت سے رشتے داروں سے دوری کے دکھ اٹھانے پڑتے۔ شوہر کی بات نہ ماننے پر ازدواجی زندگی عذاب بن جاتی۔ باپ اور بھائیوں نے پانچ لاکھ دینے سے بھی انکار کردیا تھا۔ اکرام اس کا جینا دوبھر کردیتا۔

شدید پریشانیوں کی وجہ سے اس نے اسکول سے بھی چھٹی لے لی تھی۔ میکے میں ایک کمرے میں پڑی رہتی۔ ایک ہفتے بعد شوہر نے فون کیا۔

”میں آخری دفعہ تم سے بات کررہا ہوں۔ امی اور

نویرہ کا پاسپورٹ بن گیا ہے۔ مکان فروخت کے آخری مراحل میں ہے۔ میں اب بھی تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے پانچ لاکھ روپوں کی ضرورت ہے۔ انہیں لے کر آجاؤ۔ تمہارا بھی پاسپورٹ ارجنٹ تیار کروادوں گا پھر یہاں کی ساری محرومیاں چھوڑ کر خوابوں کے دیس میں چلے جائیں گے۔"

جمیلہ نے اس سے پہلے بہت سوچا تھا۔ باپ اور بھائیوں کے فیصلے پر بھی خوب غور کیا تھا۔ اس نے ہمت کر کے شوہر کو بتادیا کہ بھائی اور باپ پیسے دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ خود بھی ابھی فیصلہ نہیں کر سکی ہے۔ اسے سوچنے کے لیے مزید وقت دے دیں۔

اس کا جواب سن کر اکرام نے اسے بہت سخت سست کہا۔

شوہر سے بات ختم کر کے وہ تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈھائی سالہ ازدواجی زندگی ویسے تو مسرتوں سے بھرپور کبھی نہیں رہی تھی مگر آج تو اس کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔

دو ہفتے بعد جمیلہ نے سنا اکرام سب کچھ بیچ باچ کر ماں اور بہن کو ساتھ لے کر دبئی روانہ ہوگیا تھا۔ اس کی زندگی کانٹوں کی سیج بن گئی۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ اسکول جاتی تھی۔

چھ مہینے گزر گئے۔ اسے اپنے شوہر اور ان کی ماں بہن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہاں جا کر ان کے رابطہ نمبر بھی تو بدل گئے تھے۔ بھی اکرام نے پلٹ کر خبر بھی نہیں لی۔ پھر ایک دن اس نے فون کیا۔ وہ بڑا چہک رہا تھا۔ کاروبار میں اپنی کامیابی پر خوب اترا رہا تھا۔ دبئی کی رونقوں، رنگینیوں اور عیاشیوں کے قصیدے سنا رہا تھا پھر آخر میں کہا۔

"جمیلہ! تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتی تھیں نا، مجھے نکما اور ناکام محض سمجھتی تھیں۔ آج تم اپنی ہر بات میں جھوٹی ہو کیونکہ تم محض کتابی کیڑا رہی ہو جبکہ میں اپنے تجربے، قابلیت اور حکمت عملی کے باعث ایک کامیاب بزنس مین بن گیا ہوں۔ تمہارے بھائیوں نے مجھے پانچ لاکھ نہیں دیے، آج میں پانچ لاکھ ہر مہینے کما سکتا ہوں۔ تم ہمیشہ کے لیے استانی بن کر کتابوں کی بند گلی میں ہی بھٹکتی رہو گی جبکہ میری ماں اور بہن اس وقت دبئی کی رونقوں میں شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہیں۔ اب میں سوچوں گا عورت کی کمی کیسے دور کرنی ہے اور تب تم مزید دور ہوتی جاؤ گی۔"

اکرام کی باتیں بڑی کاٹ دار اور دل شکن تھیں۔

جمیلہ رات بھر سوچتی رہی۔ جوں جوں اپنے حالات اور مستقبل کے امکانات پر غور کرتی گئی، اپنی ضد اور انا ترک کر کے شوہر کی بات مان لینے کا خیال غالب آتا گیا۔ اگلے

دن اس نے چپکے چپکے پتا کیا۔ اسکول سے تنخواہ کے بغیر ایک سال کی چھٹی کی اجازت مل سکتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں پکا ارادہ کیا کہ اکرام سے بات کرے گی۔ اس کی بات مانے گی۔ کیا ہوا ایک سال اس کی بات مان کر پردیس کی زندگی بھی گزار کر دیکھ لے۔ اگر حالات موافق نہ ہوئے تو رو دھو کر سال کے بعد واپس آسکتی ہے۔ اسکول کی ملازمت بھی سلامت رہے گی۔ اس نے اپنے باپ اور بھائیوں سے بھی حتمی بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ انہی سوچوں کے ساتھ اپنی ہمت مجتمع کر رہی تھی کہ اس سے پہلے ہی بڑا دھماکا ہوگیا جس سے اس کی دنیا درہم برہم ہوگئی۔ اکرام کے فون کے دس دن بعد پوری برادری میں یہ بات گردش کرنے لگی کہ اس نے دبئی میں ایک پاکستانی خاندان کی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔

یہ خبر جمیلہ کے کانوں تک بھی پہنچی۔ اس کی شدت ایسی اعصاب شکن تھی کہ وہ اندر سے لرز اٹھی۔ تین سالہ ازدواجی زندگی ویسے تو کسی بھی لحاظ سے مثالی نہیں تھی پھر شوہر کی بات نہ مان کر اعتبار کی دیوار بھی خود اسی نے گرائی تھی مگر کسی عورت کے لیے اس سے ہولناک خبر کوئی اور نہیں ہوتی کہ اس کا شوہر تقسیم ہوجائے۔

اس کے گھر والوں کے لیے یہ خبر ملی جلی کیفیت کی حامل تھی۔ ماں اور بہنیں دکھ سے روئی تھیں۔ باپ نے متانت سے برداشت کیا۔ بڑے بھائی شیخ عنایت اللہ نے خوب ہنگامہ برپا کیا۔ اس نے اکرام کو فون کیا۔ بڑی تلخ اور کانٹے دار باتوں کا تبادلہ ہوا۔ اکرام نے صاف بتادیا کہ شادی اس کی ضرورت تھی۔ تم نے اپنی بہن کو روک کر رکھا۔ میں اپنے جذبات کی تیز آندھی کو روک نہیں سکتا تھا۔ گناہ سے بچنے کے لیے جائز راستہ اختیار کیا ہے۔ شرعی اور اخلاقی لحاظ سے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔

اس کے جواب کے ردعمل میں شیخ عنایت اللہ نے حتمی فیصلہ سنادیا کہ میری بہن اب تمہاری زندگی میں مزید نہیں رہ سکتی۔ اسے طلاق دے دو۔ اکرام نے انکار کیا مگر شیخ عنایت اللہ نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ خاندان کے بڑوں کو جمع کیا۔ ان کے ذریعے اکرام پر دباؤ ڈالا گیا پھر بڑی کوششوں کے بعد وہ جمیلہ کو طلاق دینے پر راضی ہوا۔ یوں تین برس قبل شروع ہونے والا یہ ازدواجی سفر بڑے نشیب و فراز کے بعد ایک دردناک انجام سے دوچار ہوگیا۔

☆☆☆

جمیلہ خوب صورت اور جوان تھی۔ ایک باوقار ملازمت بھی تھی۔ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔ طلاق کے کچھ مہینے بعد ہی رشتوں کی دستکیں سنائی دینے لگیں مگر کوئی ایسا نہ تھا جس پر دل خوشی سے راضی ہوجاتا۔

یوں ماہ و سال کی گردشوں کی شکل میں آگے بڑھتے ہوئے دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ ان دو سالوں کے دوران اس نے سنا کہ اکرام نے جو ریسٹورنٹ کھولا تھا اب وہ بند ہوگیا تھا۔ چاروں پارٹنرز میں اختلافات پیدا ہوگئے تھے جس کی وجہ سے ریستوران نہیں چل سکا۔ بہن نویرہ کی شادی اپنے ایک بنگالی دوست کے بھائی سے کرائی تھی۔ وہ دبئی میں ہی رہتے تھے۔ اکرام اپنی بیوی اور ماں کے ساتھ کرائے کے فلیٹ میں کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ ٹھکانے بدلتا رہتا تھا۔ وہ اکرام کو جتنا جانتی تھی اس کے مطابق یہ کوئی انہونی نہیں تھی۔ چلو اچھا ہوا، وہ یہ سب چھوڑ کر نہ گئی ورنہ ان کی طرح دربدری اور پریشان حالی اس کا بھی نصیب ہوتی۔

ان دو سالوں میں جمیلہ اسکول اور گھر کے بیچ ایک لگی بندھی زندگی گزارتی آئی تھی۔ اس نے اپنے جذبات، خواہشات کو تھپک تھپک کر سلادیا تھا۔ وہ اپنی ہی مصروفیات میں مسرت محسوس کرتی تھی۔

مگر...... مدتوں بعد پھر دل کے خاموش سمندر میں جوار بھاٹا اٹھا تھا جس کے تلاطم نے پورے وجود کے جزیرے ڈبو دیے تھے۔

اور اب رات کے ایسے پہر وہ ان ڈوبے جزیروں کے نشان پھر سے تلاش کرنے لگی تھی۔ یہ جزیرے ویران سمندروں میں زندگی کی نوید تھے مگر جمیلہ اب کسی خوش فہمی کے سراب میں بھٹکنا نہیں چاہتی تھی۔

طلاق کے بعد جتنے بھی رشتے آئے تھے، اس کی جذباتی کیفیت ایسی نہیں ہوئی تھی جس طرح کی سراج الدین کا خط پڑھ کر ہوئی۔ یہ نہ جانے اس کی تحریر میں موجود خلوص اور بے ساختگی تھی یا پھر سراج الدین کی پرکشش شخصیت کا اثر تھا کہ کئی گھنٹوں سے اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

رات کے اس پہر کی خاموشی میں سراج الدین کی تحریر کا لفظ لفظ اس سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کی جاذب نظر شخصیت کا عکس اس اندھیرے کمرے میں اپنی جھلک دکھلا رہا تھا۔ اسکول میں ہوئی ملاقاتیں کسی فلم کی طرح دماغ کی اسکرین پر نظر آرہی تھیں۔ اس کے اندر ایک حیا آلود جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔

پھر یکایک ایک چھناکا ہوا۔ احساس اور جذبے کا آئینہ جیسے کرچی کرچی ہوکر بکھر گیا۔ سراج الدین کے بیوی

بچے کسی کنکھجورے کی طرح دل و دماغ سے چپٹ گئے۔ جیسے سلگتے صحراؤں میں جاں بہ لب مسافروں کو جو پانی نظر آیا تھا، وہ اصل میں سراب نکلا ہو۔ ان سرابوں میں وہ پہلے بھی بہت بھٹکتی رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے ان سے دور نکل آئی تھی۔ اب سکت نہیں تھی کہ پھر سے وہاں قدم رکھے۔ پہلے محض ساس نندوں کے آزار تھے، اب سوکن اور اس کے بچوں کا عذاب سہنے کی ہمت نہیں تھی۔

سراج الدین نے اپنا نمبر لکھ کر ایک ہفتے تک جواب دینے کی التجا کی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی، خط کو تہ کیا پھر اسے ایک موٹی سی کتاب میں رکھ کر الماری میں سب سے نیچے کے خانے میں ڈال دیا۔ اپنے دل میں ابھرنے والی سرکش لہروں کو بے رحمی سے دبا دیا۔ کرسی سے اٹھ کر کھڑکیاں بند کر کے بیڈ پر آ گئی۔

☆☆☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ سراج الدین دن گنتے ہی رہ گیا۔ موبائل کی بجنے والی ہر گھنٹی سے مایوس ہی ہوتا گیا۔ وہ جیسے تنے ہوئے رسے پر چلنے والے بازیگر کی طرح ہو گیا تھا۔ آفس ہو یا گھر، ہر جگہ اس کا دھیان موبائل کی طرف جاتا۔ رات سوتے میں بھی اچانک چونک کر اٹھ بیٹھتا۔ بے تابی سے لپک کر موبائل اٹھاتا، اس کی اسکرین میں کسی نامعلوم نمبر کا مانوس نام تلاش کرتا مگر ہر بار مایوس ہوتا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ مایوسی دکھ کے کہر میں لپٹ کر نہایت بوجھل سا اضطراب پیدا کرتی۔

اسی اضطرابِ مسلسل کے ساتھ پیامِ وفا کا معینہ وقت بھی ختم ہوا۔

شریف صاحب اس کی بے قراری سے بے نیاز نہیں تھے۔ اسے تسلی دلاسا دے کر ہمت بندھاتے۔

ایک دن سراج الدین دکھ سے بولا۔ ”یار شریف! خط لکھ کر میں نے برا تو نہیں کیا؟ اس عمر میں تو جوانوں جیسے چونچلے معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ کہیں اس نے بھی تو برا نہیں منایا؟“

شریف صاحب نے کہا۔ ”تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ ایک مہذب طریقے سے اپنے جذبات اس تک پہنچائے ہیں۔ اس کا جواب نہ دینے کی وجہ تمہارا خط بالکل نہیں ہے۔ خود اس کا اپنا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔“

”مگر مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ اس نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟ کیا اس نے میری التجا مسترد کی ہے...... کیا اس کے بارے میں اب سوچنا ہی ترک کر دوں...... کیا ایسا کرنا میرے لیے آسان ہو گا؟“

شریف صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ”آج کل ان کے اسکول میں سالانہ امتحانات ہو رہے ہیں۔ کیا پتا اسے موقع نہیں ملا ہو۔ میں اپنی بہن شہلا کی مصروفیات سے واقف ہوں۔ اسکول سے آتے ہوئے امتحانی پرچوں کا بنڈل ساتھ لے آتی ہے۔ رات گئے انہیں چیک کر کے نشانات لگاتی رہتی ہے۔ مس جمیلہ بھی مصروفیت کی وجہ سے تمہارا خط نہیں پڑھ سکی ہو گی۔“

سراج الدین کی اک ذرا امید جاگی۔ وہ بے تابی سے بولا۔ ”اپنی بہن کی بات کر کے خوب یاد دلایا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ تم اس کے ذریعے میرے خط کی حقیقت معلوم کرواؤ؟ ایک ہی اسکول کی ٹیچرز اکثر ایک دوسرے سے راز و نیاز کی باتیں کرتی ہیں۔ تمہاری بہن اک ذرا حکمت اور بصیرت سے معلوم کر سکتی ہے۔“

شریف صاحب کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے رہے پھر بولے۔ ”پہلے پہل جب تمہارے کہنے پر بہن شہلا سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں تب اس نے وجہ پوچھی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ تم اس میں دلچسپی لے رہے ہو۔ یہ بات فی الحال میری بہن تک محدود ہے۔ اس کے بعد بارہا اسکول کے حالات پر بات کرتے ہوئے اس نے جمیلہ کے بارے میں بھی ایک آدھ بات بتائی تھی۔ شہلا کے مطابق وہ دونوں ایک اسکول کی کولیگز کی حد تک ملتے رہتے ہیں، اس سے زیادہ تعلق نہیں مگر میں شہلا سے بات کرتا ہوں۔ جمیلہ سے تعلقات بڑھانے کا مشورہ دیتا ہوں۔“

سراج الدین کے پاس شریف صاحب کی بہن شہلا کی صورت میں ایک آخری امید تھی۔

☆☆☆

گورنمنٹ سٹی گرلز ہائی اسکول میں امتحانات ختم ہوئے۔ ساری ہی ٹیچرز پرچوں کی چیکنگ کر کے نتائج ترتیب دینے میں مصروف تھیں۔ جمیلہ وائس پرنسپل ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ مصروف رہتی تھی۔ اپنی کلاس کے رزلٹ کے علاوہ پورے اسکول کے نتائج کا بروقت اعلان کرانے کے لیے جتن کر رہی تھی۔ اسکول کی طرف سے والدین کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آخری پرچے کے ایک ہفتے بعد نتیجے کا اعلان کیا جائے گا۔

جمیلہ اپنے اسکول میں بہت مقبول تھی۔ اس کی طبیعت اور پیشہ ورانہ قابلیت سب کا دل موہ لیتی تھی مگر سب سے زیادہ ٹیچر عابدہ اس کے قریب تھی۔ وہ اکثر اپنے ذاتی معاملات اس ساتھی ٹیچر کو بتاتی رہتی تھی اور اس سے مشورہ بھی

کرلیتی تھی لیکن سراج الدین کے خط کا معاملہ ابھی اس نے چھپا لیا تھا۔ دل سے ابھرنے والے جذبات کی شدت سے بچ بچا کر اسے الماری میں موٹی سی کتاب کے سیکڑوں صفحات کی دیواروں کے اندر دبا دیا تھا۔ اسکول میں بے انتہا مصروف رہنے کے بعد وہ گھر آتی تو رات کی بے رحم تنہائیوں میں کبھی کبھار اس کی نظریں الماری سے چپک جاتیں۔

☆☆☆

سالانہ نتیجے سے ایک دن پہلے ہی اسکول کی ساری ٹیچرز نے اپنی اپنی کلاس کا نتیجہ ترتیب دے کر مکمل کرلیا تھا۔ پرنسپل سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب کل والدین کی موجودگی میں بچیوں کے امتحانی نتیجے کا اعلان کرنے کے لیے وہ سب تیار تھیں۔ جمیلہ بھی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسٹاف روم میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس کی ساتھی ٹیچر عابدہ اس کے پاس آئی اور دھیرے سے بولی۔

''تم فارغ ہو تو کینٹین چلے چلتے ہیں۔ چائے میں گھول کر کچھ باتیں کرتے ہیں۔''

''کوئی خاص بات ہے کیا؟ ابھی آدھا گھنٹا پہلے تو چائے پی کر آئے تھے؟''

عابدہ نے کہا۔ ''باہر کاریڈور میں شہلا باجی ملی تھیں۔ آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ کچھ مجھے بتایا تو ہے۔ باقی باتیں آپ کی موجودگی میں کرنا چاہتی ہیں۔''

جمیلہ کو خیال آیا ممکن ہے اپنی کلاس کے رزلٹ سے متعلق کوئی بات کرنا چاہتی ہوگی۔ وہ عابدہ کے ساتھ اسٹاف روم سے باہر آئی۔ کینٹین تھوڑے سے فاصلے پر کوریڈور کے آخر میں موجود تھی۔ وہ دونوں کینٹین میں آگئیں۔ شہلا وہاں پہلے سے ہی موجود تھی۔ شریف صاحب کی یہ بہن ان دونوں سے عمر میں دو چار سال بڑی تھی۔ بہت سمجھدار اور باوقار خاتون تھی۔ جمیلہ اس کی بڑی عزت کرتی تھی مگر اسکول کے معاملات کے علاوہ کبھی کوئی ذاتی گفتگو نہیں کی تھی۔

وہ تینوں ایک میز کے گرد بیٹھ گئیں۔ رسمی گفتگو ہوئی۔ اچانک شہلا، جمیلہ سے مخاطب ہوکر بولی۔

''عورت تنہا ہو تو بہت سے لوگ باتیں بناتے ہیں۔ حقیقت جیسی بھی ہو، بہت سے افسانے بناتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہوگا۔ آپ یہ سب کیسے جھیلتی ہیں؟''

جمیلہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر ایک پھیکی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولی۔ ''جسے جینا آجائے وہ ایسی کڑوی باتیں جھیلنا بھی سیکھ جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں میری پیٹھ پیچھے بہت سی سرگوشیاں ابھرتی ہیں۔ میری ازدواجی زندگی کی ناکامی کو لے کر بڑی کن سوئیاں کی جاتی ہیں مگر میں پروا نہیں کرتی۔''

شہلا نے کہا۔ ''آپ جوان ہیں، خوش شکل اتنی ہیں کہ ہم سب رشک کرتے ہیں۔ اچھی بات ہے کہ آپ لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کرتیں مگر ایسی بے پروائی خوب تو نہیں کہ جوانی تیزی سے ڈھل رہی ہے اور آپ کو فکر نہیں۔''

ٹیچر عابدہ بولی۔ ''شہلا باجی! میں اسے سو بار کہہ چکی ہوں۔ ایسی پہاڑ سی زندگی اکیلے گزارتے گزارتے نفسیاتی مریض بن جاؤ گی۔ بھائی اور بہنیں ایک حد تک تمہاری تنہائی اور اداسی دور کرسکتے ہیں۔ تمہاری ذاتی اور جذباتی زندگی کی کمی ایک جیون ساتھی سے ہی پوری ہوسکتی ہے۔''

وہ سر جھکائے گہری اداس نظروں سے چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جما کر بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ ایک ایب نارمل زندگی گزار رہی ہوں۔ میں نے بھی ایک بھرے پُرے گھر کا خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب ایک ادھوری تعبیر دکھا کر اجڑ گیا اور میں...... ایک مطلقہ، ایک اجڑی ہوئی عورت...... اب مزید خواب بساتے ہوئے ڈرتی ہوں۔''

''آپ کوئی نادان اور جذباتی لڑکی نہیں۔ ایک سنجیدہ اور پختہ فکر خاتون ہیں۔ آپ کی قابلیت اور سمجھ داری کی مثالیں دی جاتی ہیں مگر اپنے بارے میں آپ سنجیدگی سے نہیں سوچتیں۔ اب یہ وقت خواب دیکھنے کا نہیں، ہوش مندی سے آنے والی زندگی کو عذاب بننے سے بچانے کا ہے۔''

عابدہ بولی۔ ''تمہاری عمر اس وقت بتیس سال سے زیادہ ہے۔ تم جانتی ہو زیادہ عمر کی عورت بچے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتی ہے۔ اب مزید چند برس بعد تم عمر کی اس حد میں داخل ہوجاؤ گی جس کے بعد بچے جنم دینے کا امکان کم ہوجاتا ہے۔ پلیز! تم سنجیدگی سے غور کرلو۔ کیا ایسی نعمت سے محروم رہنا چاہتی ہو؟''

وہ گہرے کرب سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔ ''پانچ سال قبل شادی کر کے میری کوکھ بچوں سے محروم رہی ہے۔ اب آئندہ کیا امید رکھوں گی؟''

عابدہ جلدی سے بولی۔ ''ایسی مایوسی کی بات مت کرو۔ یہ حقیقت ہے پہلی شادی کے دوران تمہارے سابق شوہر کی غیر سنجیدگی اور عدم موجودگی کی وجہ سے پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''اللہ خیر کرے۔ آپ دونوں

مل کر یلغار کر رہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کسی کے لیے مجھے آمادہ کرنا چاہتی ہوں؟"

ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جمیلہ کے قیافے کو دل ہی دل میں سراہا پھر شہلا سنبھل کر بولی۔ "میں آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ آپ کی زندگی میں آنے والے تغیرات سے آشنا ہوں مگر کبھی کھل کر اس موضوع پر آپ سے گفتگو نہیں کی تھی۔ آج ایسا کر رہی ہوں تو اس کے پیچھے بس یہ احساس ہے کہ جمیلہ جیسی شاندار عورت کی زندگی کانٹے دار نہ بنی رہے۔"

عابدہ نے کہا۔ "تم کئی سالوں سے میرے قریب ہو۔ مجھ سے بہت سی ذاتی اور جذباتی باتیں کرتی ہو لیکن شادی کے سلسلے میں میری بات نہیں سنتی ہو۔ آج شہلا باجی نے مجھ سے تمہارے بارے میں گفتگو کی۔ یہ بھی میری طرح تمہاری بھلائی کا سوچتی ہیں۔ تب ہم نے فیصلہ کیا کہ دونوں مل کر تمہاری ہچکولے کھاتی ناؤ ساحل تک پہنچانے میں مدد کریں گے۔"

جمیلہ کچھ نہ بولی۔ بڑی دیر سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

بڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جمیلہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "ان دو سالوں میں متعدد رشتے آئے تھے۔ کچھ کو بھائی نے اور اکثر کو میں نے مسترد کیا تھا۔ میں کسی آئیڈیلسٹ لڑکی کی طرح نہیں سوچتی مگر ایسا بھی ممکن نہیں کہ آنکھیں بند کر کے کسی دلدل میں اتر جاؤں۔"

شہلا بولی۔ "جمیلہ میری بہن! ضروری نہیں ہر بار آپ کے ساتھ برا ہو۔ اللہ پاک بڑے رحیم ہیں۔ مسبب الاسباب ہیں۔ آپ مایوسی اور خوف کے خول سے نکل آئیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

عابدہ شوخی سے بولی۔ "آج سے میں اور شہلا باجی تمہارے لیے مشاطہ گیری کا کام کریں گی۔ افسوس میرا کوئی بھائی نہیں ورنہ فخر سے اس کی تمہارے ساتھ شادی کرا دیتی۔ قسمت والے کو تمہاری جیسی خوبصورت اور خوب سیرت عورت ملے گی۔"

شہلا بولی۔ "جمیلہ! آپ اسکول میں میری سینئر ہیں مگر عمر میں، میں آپ سے بڑی ہوں۔ میری ایک بات یاد رکھیں۔ جب تک اپنا گھر نہ ہو جس میں شوہر ہو، بچے ہوں، عورت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ہم آپ کو اس ادھورے پن سے نکالنا چاہتے ہیں۔ کسی رشتے کو قبول کرنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالیں گے۔ فیصلہ آپ کریں، راستے ہموار ہم کریں گے۔"

اسی وقت اسکول کی ایک گریڈ ون خاتون انہیں ڈھونڈتی ہوئی ادھر آئی۔ جمیلہ کو پرنسپل کا پیغام پہنچایا کہ وہ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ تینوں کرسیوں سے اٹھ کر آفس کی طرف جانے لگیں۔

شہلا نے شریف صاحب کے مشورے پر ٹیچر عابدہ کے ذریعے جمیلہ سے راہ و رسم بڑھا لیے تھے۔ عابدہ خود بھی چاہتی تھی کہ جمیلہ کو سہاگ کا سائبان نصیب ہو۔ شہلا نے اسے سراج الدین کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں۔ ابھی بہت کچھ بتانا باقی تھا۔ وہ چاہتی تھی پہلے جمیلہ کچھ کھل جائے، اس کے جذبات پر جمی برف تھوڑی پگھل جائے اس کے بعد سراج الدین کو محور بنا کر اس سے بات کی جا سکتی تھی۔ آج کی گفتگو سے وہ بڑی پُرامید تھی۔ جمیلہ کی مایوسی اور خوف کسی قدر چھٹ گیا تھا۔

☆☆☆

سٹی گرلز اسکول میں آج نتیجے کا دن تھا۔ طالبات کے والدین کثیر تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ ایک بڑے سے ہال میں پہلے افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ ہر کلاس کی پہلی تین پوزیشن لینے والی طالبات کا نام پکارا گیا۔ انہیں انعامات اور میڈلز سے نوازا گیا۔

سراج الدین بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ اس کی بیٹی نمل نے اپنی کلاس میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ بیٹی کا جب نام پکارا گیا، وہ اٹھ کر اسٹیج پر گئی۔ پرنسپل کے ہاتھوں اپنا انعام اور میڈل وصول کیا۔ وائس پرنسپل جمیلہ بھی اسٹیج پر موجود تھی۔ اپنی پرنسپل کی معاونت کر کے بچیوں کو انعامات دلوا رہی تھی۔ سراج الدین نیچے ہال کی کرسیوں پر دوسری قطار میں بیٹھا تھا۔ اپنی پوری حسیات سمیٹ کر آنکھوں میں بھر کر جمیلہ کو دیکھ رہا تھا۔

وہ بہت قریب تھی۔ ایک ہی چھت کے نیچے موجود تھی مگر بے انت مسافتوں کی دوری بیچ میں حائل تھی۔ وہ چاند کی طرح تھی جسے دیکھ سکتا تھا، اپنی روح کی گہرائیوں تک جس کی روشنی محسوس کر سکتا تھا لیکن اسے پا نہیں سکتا تھا۔

انعامات کے اس مرحلے کے بعد اعلان ہوا کہ سب لڑکیوں کو رزلٹ کارڈ ان کی متعلقہ ٹیچر کلاس روم میں دیں گی۔ سراج الدین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس قاتل جاں سے اب سامنا ہونے والا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس سے ملتے ہوئے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اب نہ جانے اس کا رویہ کیسا ہو گا؟

پھر دل کو شریف صاحب کی باتیں حوصلہ دینے لگیں۔ اس کا جواب نہ دینے کی کوئی دوسری وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

اب اس کے سامنے جانا چاہیے۔ یہ ایک اچھا موقع ہے اس کے تاثرات جاننے کا۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

وہ بہت سی سوچوں کے ہجوم میں بیٹی کی انگلی پکڑ کر اس کی کلاس میں آ گیا۔ آٹھویں کلاس کی بہت سی لڑکیاں اور ان کے والدین رزلٹ کارڈ لینے کے لیے موجود تھے۔ سراج الدین کو اس بھیڑ میں بڑی مشکل سے جمیلہ نظر آ گئی۔ وہ بڑی سی میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھی ترتیب وار رزلٹ کارڈ دے رہی تھی۔ کسی کی تعریف کر رہی تھی، کسی کے لیے مزید محنت کی تلقین کر رہی تھی۔

سراج الدین اس کی نظروں کے سامنے سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بیٹی کا نام پکارنے تک بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ پانچ چھ ہی لوگ رہ گئے تھے۔ جب اس نے نمل کا نام پکارا تو سراج الدین بھاری بھاری قدموں سے نمل کو لے کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ جمیلہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بدلتے ہوئے رنگوں کی ایک واضح لہر اس کے ملیح چہرے پر نمودار ہوئی۔ سراج الدین کو اس کی آنکھوں میں لرزتے ہوئے دل کا ارتعاش بہت صاف محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں بہت کچھ سنا بھی رہی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے بے تاثر بھی تھیں۔

سراج الدین نے اسے سلام کیا۔ بڑی ہی سنجیدگی سے کہا۔ ”جمیلہ صاحبہ! میری بیٹی نے اپنی کلاس میں دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کا کریڈٹ آپ کو دیتا ہوں۔“

وہ سر جھکا کر اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ”شکریہ سراج صاحب! ویسے میں نے وہی کیا ہے جو بحیثیت استاد میری ذمے داری ہے۔ باقی سب کچھ آپ کی توجہ اور نمل کی محنت ہے۔“

وہ رسمی بات کر رہی تھی۔ سراج الدین کو ان رسمی اور نصابی باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کنکر پھینکا۔ ”نمل کی محنت اپنی جگہ لیکن آپ کی محبت اور شفقت کا اثر زیادہ رہا ہے۔ خاص کر آپ کے گھر ٹیوشن پڑھنا اس کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ امتیازی نمبروں سے یہ کامیابی اسی ٹیوشن کے سبب ملی ہے۔“

ٹیوشن کی بات پر جمیلہ کے چہرے پر مزید رنگ بکھر گئے۔ سراج الدین کے خط کے الفاظ، کمرے کی الماری میں کسی کتاب کی قید سے اڑ کر ایک دم سامنے آ گئے۔ مادی شکل میں نرم نرم انگلیوں سے اسے گدگدانے لگے تھے۔

وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ مجھے اس قابل سمجھ رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی بیٹی پر توجہ دیں گے۔“

مزید بات کا موقع نہیں تھا۔ دوسری لڑکیوں کے والدین سامنے ہی اپنی باری کے منتظر تھے۔ سراج الدین نے نمل کا کارڈ وصول کیا، اس کا شکریہ ادا کیا اور خدا حافظ کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔

وہ جمیلہ کی آنکھوں میں خط کا جواب ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا مگر اتنا سمجھ گیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی یا ناگواری نہیں تھی۔ ان میں شرم تھی، گھبراہٹ تھی اور ان سب میں سراج الدین کے لیے خوش گمانی تھی۔

وہ بیٹی کا رزلٹ کارڈ لے کر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا باہر نکلا۔ اسکول کے پھاٹک تک پہنچا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا نام لے کر آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ شہلا تھی، شریف صاحب کی بہن۔ سراج الدین اس سے شریف صاحب کے گھر پہلے بھی مل چکا تھا۔

وہ پاس آ کر سلام کرتے ہوئے بولی۔ ”سراج صاحب! میں آپ کو بڑی دیر سے ڈھونڈ رہی تھی۔ آپ کو ہال کی تقریب میں دیکھا تھا پھر اپنی اسٹوڈنٹس کو رزلٹ کارڈ دینے میں ایسی مصروف ہوئی کہ آپ سے مل نہ سکی۔“

سراج الدین نے کہا۔ ”نمل کا رزلٹ کارڈ لینے گیا تھا۔ مس جمیلہ سے کارڈ لے کر آ رہا ہوں۔“

شہلا نے بیٹی کی کامیابی پر اسے مبارکباد دی، نمل کو شاباش دی پھر اپنے پرس سے سو روپے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی نمل! تم کینٹین سے اپنے لیے چاکلیٹ لے کر آ جاؤ۔ ہم تب تک یہاں کھڑے ہیں۔“

نمل پیسے لے کر خوشی خوشی کینٹین کی طرف چلی گئی۔

شہلا معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”بیٹی کا رزلٹ کارڈ لے کر تو آ گئے ہیں مگر بتائیے کچھ احوالِ دل بھی جان سکے ہیں؟“

سراج الدین کن انکھیوں سے اپنی بیٹی کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ”کچھ لوگ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ آسانی سے سمجھ نہیں آتے۔ اسی لیے تو آپ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”ہماری میڈم جمیلہ اتنی سستی نہیں، بہت خاص ہیں۔ بڑے پاپڑ بیلنے ہوں گے ابھی۔“

اس نے کہا۔ ”شہلا میری بہن! تمہارا اس اسکول میں ہونا میرے لیے نہایت حوصلہ بخش ہے۔ پلیز! یہ جاننے کی کوشش کرو کہ وہ میرے بارے میں کس طرح سوچتی ہے؟“

وہ بولی۔ "اسکول کے معاملات سے ہٹ کر اس سے صرف ایک بار کچھ ذاتی گفتگو ہوئی ہے۔ میں اس کے قریب ہونے کی کوشش کر رہی ہوں مگر آج سے اسکول دو ہفتوں کے لیے بند ہے پھر نیا تعلیمی سال شروع ہوگا۔ آپ امید رکھیں اچھا ہوگا۔"

سراج الدین چونکتے ہوئے بولے۔ "دو ہفتے کا وقفہ زیادہ نہیں؟ آپ اس دوران کسی اور جگہ ملاقات نہیں کرسکتیں؟"

شہلا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "ویسے تو میں اس کے گھر بھی جاسکتی ہوں لیکن ایک تجویز ہے۔ آپ مٹھائی کا ایک ڈبا لے کر اس کے گھر جائیں۔ ثمل کی امتیازی نمبروں سے کامیابی کی خوشی میں مٹھائی پیش کرنے کا بہانہ بنائیں۔ بے شک زبان سے کچھ نہ کہیں۔ مٹھائی کا ڈبا آپ کے جذبات کی ترجمانی کرے گا۔"

اسی اثنا میں ثمل کینٹین سے چیزیں لے کر واپس آگئی۔ سراج الدین نے شہلا کو خدا حافظ کہا۔ امید اور مایوسی کے تصادم سے لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے ہوئے گھر آگیا۔

شریف صاحب کی بہن شہلا نے اسے مزید پیشرفت کا راستہ سجھا دیا تھا۔ اب اس پر قدم بڑھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے اس کے پاس جاتے ہوئے یہ خوف ہوتا تھا کہ لوگ باتیں بنائیں گے۔ خط کے ذریعے اظہارِ تمنا کے بعد اب خود اسی سے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ ثمل کا رزلٹ کارڈ لیتے ہوئے اگرچہ جمیلہ کے تیور اور گفتگو سے ایسے کسی ردِعمل کا احتمال نہیں رہا تھا لیکن سراج الدین کو یہ دھڑکا لگا تھا کہ وہ اسے ٹھکرا نہ دے، اس کی تمنا کا گلا گھونٹ نہ دے۔ اس نے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا۔ اس کی بھیدوں بھری خاموشی میں بھی ایک رومانس تھا۔ ساتھ ساتھ بے یقین رُتوں کی دل شکن سوچیں بھی تھیں۔

اس نے شریف صاحب کے آگے ساری کشمکش بیان کردی۔ جمیلہ سے ہوئی ملاقات اور اس کی بہن شہلا کی تجویز بھی رکھ دی۔

شریف صاحب بڑی دیر سوچنے کے بعد بولے۔ "سراج بھائی! تم مایوس مت ہو۔ جمیلہ تم سے ناراض نہیں ورنہ رزلٹ کے دن وہ اس طرح پیش نہ آتی۔ شہلا کی بات درست ہے۔ تم مٹھائی کا ڈبا لے کر اس کے گھر جاؤ۔ بیٹی کی کامیابی میں اس کا کردار رہا ہے۔ اس بہانے سے جاؤ گے تو وہ بھی منع نہیں کرے گی۔ اس کے دل کی بات جاننے کا یہ ایک اچھا موقع ہے۔"

"تم شہلا بہن سے کہہ دو۔ اس سے ذرا کھل کر کسی جگہ ملاقات کا موقع تلاش کرے۔" اس نے کہا۔ "یہ اسکول میں جانے سے یا مٹھائی کا ڈبا لے کر گھر جانے سے بات نہیں بن رہی ہے۔"

شریف صاحب بولے۔ "یار! اتنی بھی بے قراری اچھی نہیں۔ شہلا اس کے قریب ہونے لگی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں تم دونوں کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرو مگر میری مانو، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ مٹھائی دینے جاؤ تو ہمت سے کام لو۔ اسے جاننے اور اپنے بارے میں اس کے محسوسات پرکھنے کی کوشش کرو۔"

سراج الدین جس جذباتی کیفیت میں مبتلا تھا، شریف صاحب کی بات اسے ہمت دلا رہی تھی۔ کچھوے کی چال سے اس کے دل تک پہنچنے کے عمل سے وہ خود بھی نالاں تھا۔ عمر کی پہاڑیوں پر خاصی گہری برف پڑ چکی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو ہر طرف برف کی سفیدی پھیل جائے پھر اس کی زندگی میں بہار کبھی نہیں آسکے گی۔

☆☆☆

اس رات عجیب واقعہ ہوا۔ سراج الدین نیند میں تھا۔ اچانک کسی شور سے چونک کر بیدار ہوگیا۔ اس کے کمرے کے ساتھ سنجیدہ خاتون اور دونوں بیٹیوں کا کمرا تھا۔ رات کے ایسے پہر ان کے کمرے سے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لفظ واضح نہیں ہو رہے تھے، بس سنجیدہ خاتون کی آواز زیادہ بلند اور تیز سنائی دے رہی تھی۔

سراج الدین چند ثانیے تک ناگواری سے سنتا رہا پھر جھلا کر اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ سامنے ہی راہداری کی دوسری سمت کمرے کے کھلے دروازے سے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سنجیدہ اپنے بیڈ پر ننگے سر، بال بکھرائے بیٹھی تھی۔ وہ بلند آواز سے روتے ہوئے چلا رہی تھی۔ "میں اس کا خون پی جاؤں گی۔ اپنی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گی۔"

سراج الدین اپنے کمرے کے دروازے سے ہی غصے سے پکار کر بولا۔ "ثمر بیٹی! کیا بات ہے، تمہاری ماں اتنی رات گئے کس کا خون پینا چاہتی ہے؟"

بیٹی روہانسی ہو کر بولی۔ "ابو! آپ پریشان نہ ہوں۔ امی نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ ہم انہیں سنبھال لیں گے۔"

اس نے ناگواری سے کہا۔ "کیا مصیبت ہے۔ کسی معصوم بچی کی طرح ڈرنے کا ڈراما کر رہی ہے۔ اری نیک بخت! کچھ تو شرم کرو۔ جوان بچوں کی ماں ہو۔ ایسی حرکتیں

زیب نہیں دیتیں۔"

سنجیدہ ہسٹریائی انداز سے روتے ہوئے بولی۔ "میرے خدا، میں کدھر جاؤں؟ میرا سینہ پھٹ رہا ہے، میرا دماغ گھوم رہا ہے۔ تم کتنے ظالم لوگ ہو۔ میری حالت پر ترس کھانے کے بجائے میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ مجھے موت آجائے بس......"

سراج الدین اس کے مزاج سے واقف تھا۔ نرم لہجے میں بولا۔ "دوسروں پر غصہ ہونے سے موت نہیں آتی کمل کی ماں! خود پر آفت آتی ہے۔ اب اس آفت میں باقی سب کو کیوں گھسیٹتی ہو۔ آرام سے سوجاؤ۔"

سنجیدہ بجائے خاموش ہونے کے مزید ہائے وائے کرنے لگی۔ سراج الدین اتنی رات گئے کوئی سخت بات کہہ کر اس کا مزاج مزید بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ غصہ برداشت کرتے ہوئے پلٹ کر کمرے میں آیا اور زور سے دروازہ بند کر کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

دماغ نے سوال کیا۔ "سنجیدہ نے خواب میں ایسا کیا دیکھا تھا جس سے اس کی زندگی برباد ہو رہی تھی اور وہ کس کا خون پینا چاہتی تھی؟"

دل نے دھک دھک جواب دیا۔ "کہیں میرے خیالات اور جذبات کی اسے بھنک تو نہیں پڑ گئی ہے؟ کہیں جمیلہ کا خون پینے کی بات تو نہیں کر رہی تھی؟"

پھر اس نے خود کو سمجھایا۔ ابھی یہ بات شریف صاحب اور اس کی بہن کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں۔ بیگم اپنی بیماری اور کمزوری کے باعث کسی خود ساختہ وہم کے زیر اثر ایسی بات کر رہی ہوگی۔ ویسے اسے شک بھی ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ کل اس حقیقت کا سامنا تو کرنا ہے۔ اس سے پہلے ہی ایسا ماحول بن گیا تو برداشت کرنا آجائے گا۔

دوسری طرف کمرے میں سنجیدہ ابھی تک سنبھلی نہیں تھی۔ اس کی بیٹیاں پانی پلا کر، سر اور شانے دبا کر اس کی طبعی حالت معمول پر لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سنجیدہ خاتون کا سارا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ وہ ہلکے ہلکے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لرزتے ہونٹوں سے بار بار ایک ہی بات نکل رہی تھی۔

"وہ میرا گھر اجاڑ دے گی۔ تمہارے ابو مجھے چھوڑ دیں گے۔ میں اس چڑیل کو نہیں چھوڑوں گی۔"

بڑی بیٹی اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔ "امی! ہم سب اس کا خاتمہ کریں گے مگر پتا تو چلے وہ کون ہے؟"

وہ آگے پیچھے ڈولتی، لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "بیٹی! مجھے لگتا ہے تمہارے ابو کسی اور عورت کے چکر میں ہیں۔ میں نے خواب میں دیکھا ایک عورت ان کے کمرے میں تھی۔ میں کمرے میں گئی تو تمہارے ابو مجھے گالیاں دینے لگے۔ اس عورت کو اپنی بیوی کہہ کر پکارنے لگے۔ میں غصے سے اس عورت کو مارنے لپکتی ہوں، اسی وقت آنکھ کھل جاتی ہے۔"

دونوں بہنوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئیں کہ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے امی کے اعصاب منتشر ہو گئے ہیں۔ ابو اچھی صحت اور حلیے کے ساتھ امی سے جوان لگتے ہیں اس لیے احساس کمتری سے وہ ایسے وسوسے میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ جمال اور کمال بھی بیدار ہو کر اپنے کمرے سے نکل آئے تھے۔ وہ بھی اپنی ماں کے مزاج اور کمزور اعصاب سے واقف تھے۔

انہوں نے بڑی کوشش سے امی کو تسلی دلاسا دے کر بیڈ پر لٹا دیا۔ نیند کی ایک گولی لا کر پانی کے ساتھ کھلائی۔ کچھ دیر بعد ماں سوگئی۔

کہتے ہیں مرد اپنی عورت کا لباس ہوتا ہے۔ اس کی عزت .... کا محافظ ہوتا ہے۔ فطری بات ہے اس لباس پر داغ لگ جائے یا پھر پھٹ جائے تو بدن کو ہی سب سے پہلے اندازہ ہوتا ہے۔ سنجیدہ خاتون کو بھی شوہر کے دل کے داغوں اور اس کے ٹوٹنے پھوٹنے کا درست درست اندازہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن سراج الدین نے ہمت کی۔ شریف صاحب اور اس کی بہن کے مشورے کے مطابق اچھی سی مٹھائی لی۔ اس کا ڈبا بڑے خوشنما کاغذی غلاف سے سجا کر دھڑکتے دل کے ساتھ مس جمیلہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس سے پہلے جب بھی اس کے گھر گیا تھا، بیٹی کو ٹیوشن والے کمرے میں چھوڑ کر جمیلہ سے سرراہ دو چار باتیں کر کے لوٹ آتا تھا۔ آج ٹیوشن کا کمرا بند تھا۔ اس نے گھر کے بڑے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ ذرا ہی دیر بعد بغلی دروازہ کھل گیا۔ ایک صحت مند سفید ریش بزرگ نمودار ہوئے۔ سراج الدین نے قیافے سے سمجھ لیا کہ وہ جمیلہ کے ابا شیخ برکت اللہ ہوں گے۔ اس نے بڑے نستعلیق انداز میں انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سراج الدین نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر کہا۔

"محترم! میری بیٹی مس جمیلہ کی اسٹوڈنٹ ہے۔ وہ امتحانوں میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کامیابی کے پیچھے مس جمیلہ کی کوششیں شامل

ہیں۔ یہ حقیر سی مٹھائی ان کی محنت اور شفقت کا ایک عاجزانہ صلہ ہے۔"

بزرگ خوشدلی سے بولے۔ "شکریہ جناب! آپ بڑے اچھے انسان لگتے ہیں ورنہ اس دور میں ٹیچر کی عزت اور اس کا احسان ماننے والے لوگ کہاں رہے ہیں۔ بچوں کی ناکامی تو ٹیچر کے سر پر تھوپ دیتے ہیں، آپ کی طرح کامیابی کا سہرا اس کے سر پر نہیں سجاتے ہیں۔"

سراج الدین کا دل شرمندگی سے کٹ سا گیا۔ 'اب ان بزرگ کو کیا معلوم میں بحیثیت استانی یہ سب نہیں کر رہا ہوں۔ یہ تو دل کی کارستانی ہے۔ محض ایک بہانہ ہے۔ اصل بات ان کی بیٹی کے دل میں ٹھکانا بنانا ہے۔'

اس نے زبان سے کہا۔ "بس اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے محترم! ایک ٹیچر کو عزت دیں گے، اس کی قدردانی کریں گے تبھی علم کی قدر پیدا ہوگی۔ استاد کو صرف تنخواہ دار ملازم جیسا مقام دیں گے تو وہ استاد بھی بس تنخواہ حلال کرانے کی حد تک ڈیوٹی دے گا۔"

وہ سفید ریش بزرگ اس کے ہاتھ سے مٹھائی لیتے ہوئے بولے۔ "میاں! آپ کے خیالات بڑے اچھے ہیں۔ آپ سے بات کر کے خوشی ہوئی۔ میں جمیلہ کا والد ہوں۔ میری بیٹی اس وقت گھر پر موجود نہیں۔ اپنے بڑے بھائی کی طرف گئی ہے۔ آپ کی مٹھائی اس تک پہنچ جائے گی۔"

سراج الدین اس کی عدم موجودگی کا سن کر مایوس سا ہو گیا۔ دل اس تمنا میں اچھل کود کر رہا تھا کہ اسے ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے ملیح چہرے کی دھوپ چھاؤں میں لٹے قرار کی بازیافت کر لے۔ اب وہ گھر پر نہیں تھی مگر یہ احساس بھی بڑا شاندار تھا کہ اس کے دروازے پر کھڑا ہے، اس کے والد سے بات کر رہا ہے، اس کے لیے تحفہ لے کر آیا ہے۔

اس نے دل میں کہا۔ "میرے اظہارِ تمنا سے وہ انجان بنی ہوئی ہے۔ کم از کم اس مٹھائی کی صورت اسے اپنے جذبات تو پہنچا دیے کہ تم جتنا بھی تجاہل عارفانہ سے کام لو، میں یہ اندازِ عاشقانہ ہمت نہیں ہاروں گا۔"

جمیلہ کے والد شیخ برکت اللہ نے بہت اصرار کیا کہ وہ گھر میں آئے۔ چائے پی کر جائے۔ سراج الدین نے بادل ناخواستہ ان کا شکریہ ادا کیا۔ دل میں ملاقات کی حسرت لیے لوٹ آیا۔

جمیلہ رات دیر گئے بھائی کے گھر سے واپس آئی۔ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی تو ماں بولی۔

"جمیلہ! تمہارے لیے مٹھائی آئی ہے۔ شام کے وقت کوئی دے کر گیا ہے۔"

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ خیال کے پرندے ایک دم پر پھڑپھڑاتے ہوئے دور تک گئے۔ وہ بظاہر بے نیازی سے بولی۔ "کون تھا امی؟ کیا میرا ہی نام لے کر دے گیا ہے؟"

"تمہاری کسی طالبہ کا والد تھا۔ اس کی بیٹی نے شاید کلاس میں پوزیشن لی ہے۔ تمہارے ابا اس کی بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔ دیکھو تو لاؤنج کی الماری میں رکھی ہوگی۔ ابھی کسی نے کھولی بھی نہیں۔"

وہ بولی۔ "امی! میرا انتظار کیوں کیا؟ مٹھائی سب میں بانٹ دیتیں۔ میرے لیے مخصوص تحفہ تو نہیں تھا نا؟"

ماں نے کہا۔ "تمہارے ابا نے منع کیا تھا۔ اب تم آئی ہو، خود ہی تقسیم کر دو۔"

جمیلہ نے خاموشی سے مٹھائی کا ڈبا اٹھایا۔ بڑے خوش نما طریقے سے اس کی پیکنگ کی گئی تھی۔ اس کے ایک کونے میں خوبصورت روشنائی میں لکھا ہوا تھا۔ "جمیل کی طرف سے...... اپنی پسندیدہ ٹیچر کے لیے۔"

وہ ڈبے کا غلاف اتارنے لگی تھی کہ یکدم جی میں کچھ ناگفتنی سا خیال آیا۔ کیا پتا اندر صرف مٹھائی نہ ہو، دینے والے کے چور جذبات کی انگڑائی بھی ہو۔ یہ خیال آیا تو اسے لے کر اپنے کمرے میں آئی۔ ایک پھیکے پھیکے احساس کے ساتھ اسے کھولا۔ باہر کے دیدہ زیب کاغذی غلاف کے اندر ڈبے پر ایک طرف پنسل سے لفافے کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس میں سے تیر کے نشان کی چھوٹی چھوٹی لکیریں سی نکل کر دوسرے کونے میں بنے ایک موبائل کی تصویر میں داخل ہو رہی تھیں۔

لفافہ اور موبائل کے اس خاکے کے علاوہ اس پر کچھ لکھا نہیں تھا مگر یہ خاکہ ایک پورا واقعہ بیان کر رہا تھا۔ جمیلہ چند ثانیے اس خاکے پر نظریں جما کر بیٹھی رہی پھر بے اختیار اس کی نظریں اٹھ کر اس الماری سے چپک گئیں جس کے ایک خانے میں پڑے لفافے میں مقید لفظ باہر نکل کر اپنی پوری معنوی تاثیر کے ساتھ اس کے گرد جگنوؤں کی طرح اڑ رہے تھے۔

اس نے یکدم سر جھٹک دیا۔ مٹھائی کے ڈبے کے اوپر بنے اس لفافے اور موبائل کے بین السطور پیغام کو دل و دماغ سے باہر نکال دیا۔ ڈبا کھول کر دیکھے بنا ہی باہر لے گئی۔ امی کو دیتے ہوئے بولی۔

"امی! اسے سب میں تقسیم کر دیں۔ بچ جائے تو بھیا

کی طرف بھی بھیج دیں۔''

وہ واپس کمرے میں آگئی۔ دل بہت افسردہ تھا۔ زندگی کی لاحاصلی بے طرح کرب ابھار رہی تھی۔ کسی کی انگلی پکڑ کر خوش منظر جھیلوں کی سیر کی تمنا ہوک جگا رہی تھی۔ ایسے میں سراج الدین کی شخصیت کا عکس بن بن کر مٹ رہا تھا جیسے ساحل کی نم ریت پر کوئی نام لکھا ہو پھر سمندر کی گہرائیوں سے ایک دم لہریں اٹھ کر اسے بے نام پانیوں میں بہا رہی ہوں۔ لہروں کے واپس جا کر پھر لوٹ آنے تک لپک جھپک وہ نام ساحل کی ریت پر نقش کیا ہو پھر بے رحم لہریں اسے بے نشان بنا رہی ہوں۔

بڑی دیر وہ ان خیالات کی ہماہمی میں بے کل بیٹھی رہی۔ سراج الدین کی پیشرفت نے اسے سہا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا خط کے جواب میں خاموشی اختیار کروں گی تو وہ پیچھے ہٹ جائے گا مگر وہ استقامت دکھا رہا تھا۔ خط کی مہم ناکام ہوئی تو مٹھائی کو وسیلہ بنایا تھا۔

جمیلہ کے دل کی گہرائیوں میں کسی کونے سے ایک کپکپاتی آواز نے سر اٹھایا۔ ''کیا اس کا کہنا مان لوں؟ کوئی اس کا قدردان ہے تو ٹھکرانا نعمت کا کفران ہوگا۔ سب کہتے ہیں جوانی بہت تیزی سے گزر رہی ہے۔ اس وقت کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہ ملا تو عمر بھر کا ملال ہوگا۔ کیا سراج الدین میرے زخموں کا اندمال کرسکتا ہے؟''

وہ کئی دفعہ سراج الدین سے ملی تھی، اس سے گفتگو کی تھی۔ وہ بظاہر ایک شائستہ اور عمدہ شخصیت کا حامل شخص تھا۔ صحت اور شکل میں بھی اس کے لیے بے جوڑ نہیں۔ ایک اچھی ملازمت بھی تھی مگر ''سو سنار کی، ایک لوہار کی'' کے مصداق اس کی بیوی اور بچے ان سارے اچھے خیالات سے ڈراؤنی چڑیلوں کی طرح چمٹ جاتے تھے۔ رگوں کے اندر سے اس کا خون کشید کرلیتے تھے۔

سراج الدین کی مٹھائی نے اس کے خط کی طرح آج بھی اسے بہت مضطرب رکھا۔ وہ بڑی دیر اچھے برے خیالات کی لہروں پر ہچکولے کھاتی رہی پھر تھکے تھکے انداز میں نیند کے ساحل تک پہنچ گئی۔

☆☆☆

دن بہت سست روی سے گزر رہے تھے۔ سراج الدین عجب بے دلی کا شکار تھا۔ صبحیں پھیکی، شامیں بے رنگ اور راتیں بے سکون تھیں۔ جوانی ڈھلنے کے بعد دل پر جوان جذبوں کی پھوار پڑی تھی۔ کیا غضب تھا کہ پیار کی یہ پھوار اس کے لیے باعثِ آزار بنی ہوئی تھی۔

بہت سے دن گزر گئے۔ اس نے جو مٹھائی دی تھی، وہ بھی دل تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام ہوگئی تھی۔ جمیلہ نے خط کی طرح اس کے حوالے سے بھی مکمل خاموشی اختیار کرلی تھی۔ اب تو کوئی بہانہ بھی نہیں تھا اس کے گھر جانے کا۔ شریف صاحب کی بہن بھی چھٹیوں میں دوسرے شہر اپنے سسرال چلی گئی تھی۔

پھر اسکول کھل گیا۔ سراج الدین کی خشک آنکھوں کے سامنے ہریالی کے آثار پیدا ہوگئے۔ بے شک ہفتہ دس دن میں نہ سہی، مہینے میں کبھی تو بیٹی تمل کے بہانے اسکول جاسکتا تھا، اس سے بات کرسکتا تھا۔ شریف صاحب کی بہن شہلا کے ذریعے ٹوٹے رابطے بحال کراسکتا تھا۔

ایک دن شریف صاحب نے اسے اپنے گھر رات کے کھانے پر بلایا۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ شریف صاحب کے جنرل اسٹور میں جمع ہونے والے احباب ہر ہفتے کسی کے گھر دعوت کے بہانے اکٹھے ہوتے تھے۔ شریف صاحب اور سراج الدین الگ سے بھی ایک دوسرے کے گھر آتے رہتے تھے۔

اس رات وہ شریف صاحب کے گھر گیا تو وہ اکیلا مہمان تھا۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ اِدھر اُدھر کی کچھ دیر گفتگو کے بعد شریف صاحب اچانک بولے۔

''یار سراج! مس جمیلہ سے بہت دن ہوئے ملے نہیں ہو۔ اگر ملاقاتوں کی یہی صورت رہی تو سمجھو اسے پانے کی کوئی امید نہیں۔''

سراج الدین شدید مایوسی سے بولا۔ ''میں کیا کروں؟ اپنی طرف سے پوری کوشش کرلی ہے۔ اس تک دل کا حال بھی پہنچایا ہے۔ اب جوانوں کی طرح اس کی راہ روک کر کھڑا ہونا رہ گیا ہے۔ اسے پانے کے لیے میری جذباتی کیفیت ایسی ہوگئی ہے، ایسا بھی کر گزرنے کو جی کرتا ہے۔''

شریف صاحب نے کہا۔ ''شہلا اس کے بہت قریب ہوگئی ہے۔ تمہارا نام لیے بغیر تنہا زندگی چھوڑ کر ایک گھر بسانے پر آمادہ کرنے کی کوششوں میں لگی ہے۔ ایک اور ٹیچر ہے۔ دونوں مل کر بہت حد تک اسے منانے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔''

وہ بے تابی سے بولا۔ ''یار شریف! شہلا بہن سے کہہ دو، اس سے میرے بارے میں پوچھ لے۔ میں مزید کشمکش برداشت نہیں کرسکتا۔ بے شک وہ انکار ہی کردے۔ بس دل کی بات ظاہر کردے۔ اس طرح سولی پر لٹکے رہنے کی

آگے ہمت نہیں۔ کیا ہوگا...... یہ دل چند دن رو پیٹ کر یہ سانحہ بھی جھیل لے گا۔‘‘

شریف صاحب ہنس پڑے۔ ’’ایسی بھی بے صبری خوب نہیں سراج بھائی! یہ دل کے معاملات ہیں۔ بات بنتے بنتے برسوں بھی لگ جاتے ہیں۔‘‘

سراج الدین چلا کر بولا۔ ’’ایسی غضب کی بات مت کرو۔ مجھ سے ہفتے صبر نہیں ہورہے، تم برسوں کی بات کر کے کیوں زخموں پر نمک چھڑکتے ہو۔ یار! کچھ بھی ہو، بس میں نے فیصلہ کیا ہے ایک آخری بار اس سے ملاقات کروں گا۔ صاف صاف اس کا عندیہ پانے کی کوشش کروں گا۔‘‘

شریف صاحب شریری سی نظروں سے اسے دیکھتے رہے پھر زیرلب مسکرا کر بولے۔ ’’تم مس جمیلہ سے ملاقات کرنا چاہتے ہو؟ یہ بتاؤ ہمت بھی ہے صاف صاف دل کی بات منہ پر کہنے کی؟‘‘

وہ بہت ہی جذباتی لہجے میں بولا۔ ’’میرے بدن کا رُواں رُواں اسے دیکھنے کی تمنا میں سلگ رہا ہے۔ میری آنکھوں کے پیاسے صحرا اس کی ساگر آنکھوں کے منتظر ہیں۔‘‘

شریف صاحب چند لمحے اس کی جذباتی حالت کا لطف لیتے رہے پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ ’’میرے دوست! تمہارا جذبہ سچا ہے۔ تمہیں کل اسکول جا کر ملاقات کی ضرورت نہیں۔ یہ ملاقات اسی وقت ممکن ہے۔‘‘

سراج الدین چونک اٹھا۔ حیرت سے منہ کھلا رہ گیا پھر آنکھوں میں سوال بھر کر ان کی طرف دیکھا۔ شریف صاحب کہنے لگے۔ ’’جذبے میں جتنی شدت ہوتی ہے، اس کے اثرات ایسے ہی یقینی ہوتے ہیں۔ یہ شاید تمہارے جذبے کی صداقت ہے کہ جمیلہ اس وقت میرے گھر میں موجود ہے۔ اب بتاؤ اس سے ملاقات کی ہمت ہے کہ نہیں؟‘‘

سراج الدین گنگ سا رہ گیا۔ زبان جیسے بولنا بھول گئی۔ سینے کے اندر بس ایک شور تھا دل کی دھڑکنوں کا۔ دل جیسے دھڑ دھڑ سینے کی دیواریں توڑ کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ جس کے آنے کی نوید سنائی تھی، خود سینے سے نکل کر اس کے قدم چومنا چاہتا تھا۔

شریف صاحب اسے حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

شہلا اور عابدہ دل سے چاہ رہی تھیں جمیلہ کا گھر بس جائے، اس کی تنہائی دور ہو جائے۔ سراج الدین انہیں بہت مناسب اور معقول شخص لگ رہا تھا۔ شہلا نے عابدہ کو اس کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ عابدہ اسے جانتی تھی۔ اسکول میں ہوئی ایک آدھ ملاقات اسے یاد تھی۔ شہلا نے اس کے گھریلو حالات سے متعلق بھی اکثر باتیں بتادی تھیں۔ اس کی بیوی اور بچوں کا سن کر عابدہ نے کچھ پس وپیش کیا تھا مگر اس کی پرکشش شخصیت اور باوقار ملازمت ایسی اضافی خوبیاں تھیں کہ بیوی بچوں کی رکاوٹ زیادہ گمبھیر نہیں لگی تھی۔ شہلا سے اس کی بیوی کی بیماری اور بے دلی کا سن کر اس کی ہمدردیاں سراج الدین کے ساتھ پیدا ہوگئیں۔ شہلا نے یہ بھی بتادیا تھا کہ سراج الدین، جمیلہ کے حصول کے لیے بہت سنجیدہ ہے۔ اسی کے لیے دوسری شادی کا خیال فیصلے میں بدل گیا تھا۔ شہلا نے خط اور مٹھائی کا بھی واقعہ بیان کیا تھا۔

چند دن مزید غور کرنے اور شہلا سے طویل مذاکرات کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ سراج الدین کے حوالے سے جمیلہ سے بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس نے جمیلہ سے تفصیلی بات کی۔ جمیلہ تو سراج الدین کے بارے میں پہلے سے جانتی تھی۔ خط کے ذریعے پہلے سے ہی اس کے جذبات سے واقف تھی۔

عابدہ کی باتیں وہ خاموشی سے سنتی رہی پھر دھیرے دھیرے سب بتادیا کہ سراج الدین کے خیالات اور جذبات کا اسے پہلے ہی علم تھا۔ اس نے خط کی بات بھی کہہ دی۔ یہ بھی بتادیا کہ اس کے شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اس کے خط اور مٹھائی کے تحفے کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔

عابدہ بولی۔ ’’جمیلہ! یہ حقیقت ہے کہ ان کے بیوی بچے ایک زبردست رکاوٹ ہیں مگر تم جانتی ہو ایک شادی شدہ عورت کے لیے اکثر ایسے ہی رشتے آتے ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کسی غیر شادی شدہ کے انتظار میں رہی سہی جوانی برباد کرنی ہے یا کچھ سنجیدگی سے ان کے بارے میں سوچنا ہے۔‘‘

جمیلہ گہری اداسی اور پریشانی سے بولی۔ ’’میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ انہیں اچھی طرح جانتی نہیں ہوں۔ چند سرسری ملاقاتیں کسی کو جاننے کے لیے کافی نہیں ہوتیں۔‘‘

عابدہ نے کہا۔ ’’تمہاری بات درست ہے۔ اسے جانے پہچانے بغیر عندیہ دینا بھی نادانی ہے۔ شہلا باجی کے بھائی اور سراج الدین صاحب میں گہرا تعلق ہے۔ میں ان سے بات کرتی ہوں۔ تمہارے اور سراج صاحب کی ملاقات کی کوئی تدبیر کر لیتے ہیں۔ کھل کر ایک دوسرے کے بارے میں جان لو گے تو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔‘‘

پھر اس کے بعد شریف صاحب، ان کی بہن شہلا اور جمیلہ کی دوست عابدہ نے مل بیٹھ کر ان دونوں کی ملاقات کے لیے اس دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اصل میں یہ دعوت بہر ملاقات ایک بہانہ تھی۔

☆☆☆

سراج الدین کو یقین نہیں ہو رہا تھا۔ شریف صاحب اتنی بڑی خبر سنا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ اسے مذاق سمجھ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد شریف صاحب واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اسی وقت کھنکا ہوا۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا پھر جیسے ساکت رہ گیا۔ پلکیں جھپکنے لگا، کہیں یہ خواب تو نہیں۔ ڈرائنگ روم کے دروازے سے شہلا کے پیچھے پیچھے عابدہ اور جمیلہ داخل ہو رہی تھیں۔ پھر وہ سلام کرتی ہوئی سامنے صوفوں پر بیٹھ گئیں۔ جمیلہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ملیح چہرے پر شگفتگی بھی تھی، افسردگی بھی۔ سراج الدین بس ایک بار اسے دیکھ سکا تھا۔ اس کے بعد ہمت کے پر جل گئے۔

شریف صاحب ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔

''میرے اس مہمان خانے میں بہت سے لوگ آئے ہیں۔ ہر شعبے، ہر پیشے کے مگر آپ سے زیادہ محبوب اور عزیز کوئی نہیں تھا۔ سراج الدین! میں جانتا ہوں تم اس وقت کیا سوچ رہے ہو۔ اصل میں یہ ایک پیار بھری سازش تھی جو میری بہن شہلا اور عابدہ نے تیار کی تھی۔ اب ظاہر بات ہے ایسی سازش جس میں کسی کی زندگی گلزار بنانے کی کوشش شامل ہو، میں اس سے کیسے پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ یوں ہم تینوں نے مل کر اس محفل کے اہم افراد کے لیے اس تقریب کا اہتمام کیا۔ آپ دونوں اپنے فیصلے میں خود مختار ہیں۔ ہمارا کام آپ دونوں کو قریب بٹھانا تھا۔ اب اسے قربت تک کا سفر خود چل کر طے کرنا ہے۔''

سراج الدین ممنونیت بھری نظروں سے شریف صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔

عابدہ نے دھیرے سے کہا۔ ''شریف صاحب! میں جانتی ہوں جمیلہ کے پچھلے پانچ سال ازدواجی لحاظ سے بڑے افسوسناک گزرے ہیں۔ کسی بھی سمجھدار انسان کی طرح ہم یہ نہیں چاہیں گے کہ آئندہ اس کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ رونما ہو۔ ہم سراج صاحب کو بہت کم جانتے ہیں۔ ان کا بھرا پُرا گھر ہمیں اندیشوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔''

سراج الدین جانتا تھا یہ سوال اس سے پوچھا جائے گا۔ اس پہلو پر اس نے بہت سوچا تھا۔ اگرچہ مشکلات بے شمار تھیں، مخالفتیں بے حساب تھیں۔ بیوی اور جوان اولاد کی شکل میں ایک آگ کا دریا تھا جسے پار کرنا تھا مگر جمیلہ کی محبت اب جنوں آمیز ہو گئی تھی جس سے سرفروشی کی تمنا بھی جرأت آموز بن گئی تھی۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر متانت سے کہا۔

''میری بیوی اور بچے ایک اٹل حقیقت ہیں۔ میری ازدواجی زندگی بے شک خشک اور بے رنگ رہی ہے مگر اولاد کی صورت میں مجھ پر خاص کرم ہوا ہے۔ میں بڑا دعویٰ نہیں کروں گا لیکن اتنا بھروسا ہے اپنے بچوں پر کہ وہ ایک حد سے آگے مخالفت نہیں کریں گے۔ میں دوسری صورت کے لیے بھی تیار ہوں۔ یعنی اپنے بچوں اور بیوی کی مخالفت مول لے کر بھی یہ فیصلہ کر سکتا ہوں۔ بے شک یہ فیصلہ کتنا ہی کڑا کیوں نہ ہو۔''

شریف صاحب بولے۔ ''میں جانتا ہوں سراج بھائی کے لیے اپنی بیوی اور بچوں کو منانے کا مرحلہ بڑا کٹھن ہے۔ ویسے بھی اس طرح کے معاملات میں اس طرح تو ہوتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے سراج بھائی یہ مرحلہ طے کر لیں گے۔ مجھے یقین ہے یہ اپنے گھر والوں کو قائل کر سکیں گے۔ اگر اس کے برعکس بھی کوئی بات ہوئی تو جمیلہ کو الگ گھر میں رکھیں گے۔''

عابدہ نے کہا۔ ''ایک عورت آسمان کے نیچے نہیں تو ایک چھت کے نیچے کم از کم اپنے شوہر کو بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت سمجھتی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ سراج صاحب کی بیگم، جمیلہ کو قبول کر لے گی۔ دھونس اور جبر سے وقتی طور پر خاموش کرا سکتے ہیں، ہمیشہ کے لیے ممکن نہیں۔ اس صورت میں سراج صاحب کو الگ مکان کا ہی بندوبست کرنا پڑے گا۔''

سراج الدین مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں اس کے لیے بھی راضی ہوں۔ میری مالی حالت ایسی کمزور بھی نہیں مگر مجھے امید ہے اپنے گھر والوں کو سمجھاؤں گا۔ نہ ماننے کی صورت میں الگ مکان کا فیصلہ بھی قابلِ قبول ہے۔''

جمیلہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ بس سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ عابدہ اس کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اس نے سراج الدین کو بہت دفعہ دیکھا تھا۔ اس کی شائستگی اور شخصیت کی تابندگی سے متاثر ہوتی رہی تھی۔ اس نے خط میں کھل کر اپنی عمر بھی بتا دی تھی۔ یہ الگ بات ہے وہ اپنی عمر سے بہت کم لگ رہا تھا۔ سب کچھ اچھا تھا۔ بس بیوی بچوں والی بات حلق میں پھانس کی طرح اٹک رہی تھی۔

دوسری طرف سراج الدین کا مضبوط اور پُراعتماد لب و لہجہ اسے امید دلا رہا تھا۔ بیوی اور بچوں کی مخالفت کے باوجود اس کا ہاتھ تھام کر پھر نہ چھوڑنے کا یقین دلا رہا تھا۔ یہ

احساس بھی جمیلہ کے لیے شاندار تھا کہ وہ مجھے دل سے چاہتا ہے۔ میری حوصلہ افزائی نہ کرنے کے باوجود میری طلب سے باز نہیں آیا ہے۔ آئندہ بھی مجھے بیچ راستے میں تنہا نہیں چھوڑے گا۔

یہ ساری باتیں اس کے دل و دماغ میں سرسراتی رہیں۔ بہت سی باتیں سوال بن کر لبوں تک آتی رہیں مگر حیا کے قفل اتنے بھاری تھے کہ وہ لب بستہ رہی۔

اس دوران دوسرے کمرے میں کھانا لگ گیا۔ وہ سب کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ جمیلہ اور دیگر خواتین ایک طرف کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شریف صاحب اور سراج الدین نے دوسری طرف کی کرسیاں سنبھالیں۔ اتفاق سے سراج الدین کی کرسی کے بالکل سامنے ہی میز کی دوسری جانب جمیلہ کی کرسی تھی۔ شریف صاحب کی بیگم بھی کھانے میں شریک تھیں۔ ان کی بچیاں کھانا لا کر ٹیبل پر سجاتی گئیں۔ وہ سب کھاتے پیتے اور عمومی گفتگو کرتے رہے۔

سراج الدین کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ جمیلہ کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا ہے۔ پچھلے چند ہفتوں سے وہ جذباتی لحاظ سے بہت مضطرب اور منتشر تھا۔ اس کی سوچوں اور جذبوں کا محور جمیلہ تھی۔ اسے پانے کی خواہش ہر چیز پر غالب تھی۔ آج وہی محور تمنا پیش نگاہ تھی۔ ایسے میں نوالے اس کے حلق میں پھنس رہے تھے۔ گھونٹ گھونٹ پانی کے ساتھ وہ انہیں نگل رہا تھا۔ کبھی کبھار اچٹتی سی اک نظر جمیلہ کے چہرے پر ڈالتا تھا۔

وہ بھی سر جھکائے آہستہ آہستہ نوالے چبا رہی تھی۔ ایک آدھ بار ان کی نظریں ساتھ ہی اٹھی تھیں۔ ایک لمحے تک الجھ گئیں پھر بے اختیار جھک گئیں۔

کھانے کے دوران شریف صاحب کی بچیاں بھی موجود تھیں اس لیے اصل موضوع پر بات نہیں ہوئی۔ کھانے کے بعد بچیاں اور بیگم برتن سمیٹ کر لے گئیں تو شریف صاحب بولے۔

''میں جانتا ہوں زندگی کے فیصلے کرنے کے لیے ایسی مختصر سی ملاقات کافی نہیں مگر مجھے امید ہے اس موضوع پر ایک دوسرے سے بات کرنے کا آپ دونوں کو حوصلہ ملا ہوگا۔ جمیلہ صاحبہ! آپ اچھی طرح غور کر لیں۔ آپ کا ہر فیصلہ قبول ہوگا مگر ایک بات یاد رکھیں۔ سراج بھائی کو جتنا میں جانتا ہوں، یہ ایک شاندار انسان ہیں۔ انہیں محض بیوی بچوں کی وجہ سے ٹھکرانا دانشمندی نہیں ہوگی۔''

وہ پہلی دفعہ بولی۔ ''آپ بہت ہمدرد انسان ہیں۔ شہلا باجی ایک مخلص ساتھی ہیں۔ آپ یقیناً میرے بارے میں اچھا سوچ کر یہ سب کر رہے ہیں۔ میں جو بھی فیصلہ کروں ایک بات سچ ہے، میں خود مختار نہیں۔ میرے والدین ہیں۔ میرے بھائی بہنیں ہیں۔ ان کی رائے اور فیصلہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔''

شریف صاحب نے کہا۔ ''میری بہن! ہم بھی نہیں چاہیں گے کہ آپ اکیلے میں فیصلہ کر لیں۔ آپ کے والدین اور آپ کے بھائی بہن بھی یقیناً اس فیصلے میں شامل ہوں گے مگر یہ بعد کی بات ہے۔ آپ پہلے خود کو راضی کر لیں۔ دل و دماغ کے دروازے ہمارے اس دوست کے لیے کھول دیں۔ آپ کے گھر کے دروازے پر دستک دے کر سب کو منانے کی کوشش میں بھی کروں گا۔''

☆☆☆

اس رات سراج الدین بڑی دیر تک جاگتا رہا۔ جاگتی آنکھوں سے ایک رنگ و روپ سے بھری زندگی کے خواب دیکھتا رہا۔ جمیلہ کا ہاتھ تھام کر لالہ زاروں میں پھرتا رہا۔ اس ملاقات نے اس کی جذباتی کیفیت کو مزید جنوں آمیز کر دیا تھا۔

پانچ دن گزر گئے۔ شریف صاحب کے گھر میں دعوت کے بعد جمیلہ کی طرف سے خاموشی چھا گئی تھی۔ سوچنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے پانچ دن زیادہ ہوتے ہیں۔ کوئی جواب نہ ملا تو سراج الدین کے دل میں بڑے ہی متوحش خیالات پیدا ہونے لگے۔ اتنے دنوں تک تو اسے جواب دے دینا چاہیے تھا۔ کیوں میری بے قراری کا امتحان لے رہی ہے؟ ان پانچ دنوں میں کوئی دس بار اس نے شریف صاحب سے پوچھا تھا کہ شہلا نے کچھ بتایا ہے؟ جمیلہ کی طرف سے کوئی عندیہ ملا ہے؟

پانچویں دن کی شام شریف صاحب نے کہا۔ ''میری شہلا سے بات ہوئی ہے۔ ابھی جمیلہ کی طرف سے کوئی پیغام نہیں ملا ہے۔ اس نے اسکول سے ایک ہفتے کی رخصت بھی لے لی ہے۔ عابدہ کو بھی جمیلہ کے کسی فیصلے کا علم نہیں۔''

سراج الدین نے مایوسی کے بوجھ سے شکستہ آواز میں کہا۔ ''یار شریف! یہ جمیلہ اتنی پاس آ کر اتنی دور کیوں ہو جاتی ہے؟ اس کی طویل خاموشی میرا دل دہلا رہی ہے۔ کہیں اس نے میرا پیغام مسترد تو نہیں کر دیا ہے؟''

شریف صاحب بولے۔ ''میں خود بھی پریشان ہوں۔ شہلا کے مطابق اس کا موبائل بھی بند ہے۔ اسکول بھی نہیں جا رہی ہے۔ اب اس کے گھر سے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

"ٹیچر عابدہ اس کے بہت قریب ہے۔ خدارا اس سے کہیے۔ وہ جمیلہ سے مل کر مجھے اس اضطرابِ مسلسل سے نجات دلائے۔"

شریف صاحب نے کہا۔ "میں شہلا سے کہہ دوں گا، وہ عابدہ کو اس کے گھر بھجوا دے گی۔ تم مایوس مت ہو۔ ممکن ہے جمیلہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچی ہو۔ موبائل بند رکھنے اور اسکول سے چھٹی لینے کے پیچھے بھی یہی وجہ ہو کہ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہتی ہوگی۔"

سراج الدین کے دل کو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اب ایسی بھی کیا سوچ بچار کہ ساری دنیا سے کٹ کر بھی پانچ دنوں تک فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ رہ رہ کر دل میں یہی سوچ ٹیسیں جگاتی تھی کہ بس اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا نام زندگی کی کتاب سے نکال دیا ہے۔ میری بیوی اور بچوں کی موجودگی اس کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ وہ میرے لیے کتنی اہم ہو گئی ہے۔ وہ میرا ہاتھ تھام لے، میں اسے اپنی بیوی اور بچوں کی پرچھائیں سے بھی دور لے جاؤں گا۔

اس رات سراج الدین دیر تک جاگتا رہا۔ ساحل کے قریب پہنچ کر کشتی ڈوب رہی تھی۔ جب حالات موافق نہ ہوں، معاملات درست سمت میں نہیں جا رہے ہوں تب بدگمانیاں ذہن و دل پر دھاوا بول دیتی ہیں۔ ایک عام سی بات بھی اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے۔ ایسے میں قرار فرار ہو جاتا ہے، نیند اڑ جاتی ہے۔

وہ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ کروٹیں بدل بدل کر سراج الدین کی آنکھیں ابھی اک ذرا بوجھل ہونے لگی تھیں۔ ایک دم وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی خواب گاہ کی محدود فضا میں موبائل کی ہلکی ہلکی گھنٹی کسی ڈھول کی طرح بجنے لگی تھی۔ اس نے لپک کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھا لیا۔ اس کی اسکرین پر بغیر نام کا ایک غیر مانوس نمبر چمک رہا تھا۔ عام حالات میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ اس نے دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ موبائل کا بٹن دبا کر "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف کوئی نہیں بولا۔ اک ذرا توقف کے بعد وہ زور سے بولا۔ "آپ کون ہیں؟"

دوسری طرف سکوت چھایا رہا۔ اس نے چند ثانیے انتظار کیا۔ کسی کے بولنے کی آواز نہ آئی تو رابطہ منقطع کرنے کے لیے انگلی اٹھائی۔ اسی وقت سرسراتی، کپکپاتی ہوئی سی آواز ابھری۔

"مم...... میں بات کر رہی ہوں، جمیلہ!"

سراج الدین کا دل اس زور سے اچھلا جیسے ابھی سینے کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بہت ہی امید و بیم سے گزرنے کے بعد ڈھلتی رات کے اس پہر اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اس کی تپسیا پھل ہو گئی تھی۔

جمیلہ اپنا نام لے کر پھر خاموش ہو گئی۔ سراج الدین نے ایک گہری سانس لی۔ جذبوں کی پوری شدت سے کپکپاتے لہجے میں کہا۔ "آپ بولیے نا۔ خاموش کیوں ہیں؟ پتا ہے آپ کے فون کا مجھے کتنا انتظار رہا ہے جیسے سزائے موت کے کسی مجرم کو آخری پل تک مقتول کے لواحقین کی طرف سے رحم کی اپیل منظور ہونے کا انتظار رہا ہو۔"

دوسری طرف خاموشی رہی پھر اس کی بوجھل بوجھل سی آواز ابھری۔ "سراج صاحب! دیکھیے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے ان دنوں بہت سوچا ہے۔ اپنی تنہا زندگی، آپ کی پیشکش اور پھر آپ کی فیملی کے بارے میں خوب غور کیا ہے۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ آپ کی شخصیت بڑی شاندار ہے مگر آپ کی بیوی اور بچوں کا جب سوچتی ہوں تو ہمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ میرا دل ملامت کرتا ہے کہ میری وجہ سے آپ کا بھرا پُرا گھر متاثر ہو جائے گا۔ میری مختصر سی ازدواجی زندگی میں بھی ایک سوکن آئی تھی۔ اگرچہ ایک گھر میں کیا، ایک ملک میں بھی ہم ساتھ نہیں تھے۔ وہ شوہر کے ساتھ دبئی میں رہتی تھی لیکن اس کی شدت میں یہاں اپنے گھر میں محسوس کرتی تھی۔ میں ڈرتی ہوں آپ کی بیگم اور بچے مجھے بھی اسی طرح دیکھیں گے۔ میں اندر سے بہت بکھر گئی ہوں۔ مجھ میں سکت نہیں پھر کسی رشتے کے زخم سہنے کی۔ آپ پلیز مجھے حاصل کرنے کی تمنا سے باز آ جائیں۔"

سراج الدین نے بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں جانتا ہوں ہر عورت سوکن اور اس کے بچوں کے بارے میں ایسے ہی اندیشوں میں مبتلا رہتی ہے مگر ذرا سوچیے دنیا میں دوسری شادی ایسے ہی حالات میں ہوتی ہے۔ بیوی اور بچوں کی موجودگی میں اکثر لوگ شادیاں کرتے ہیں۔ یہ کسی بھی لحاظ سے غیر قانونی اور غیر شرعی فعل نہیں۔ اکثر ایسی شادیاں کامیاب بھی ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے گھر کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ پچیس سال ایک بے جان اور بے رونق بیوی کے کھونٹے سے بندھا رہا ہوں۔ شادی کے ابتدائی آٹھ دس سالوں کے بعد مجھے یاد نہیں بھی بیگم کی طرف سے میرے جذبات کی قدر ہوئی ہو، میرے ذوقِ جمال کی تسکین ہوئی ہو۔ اس کا بیمار جسم اور بے کشش چہرہ ہی میرے سامنے رہا ہے۔ میں بے شک جوان نہیں

ہوں مگر دور دور تک بہت سے جوانوں سے اب بھی تر و تازہ اور صحت مند ہوں۔ میرے بھی جذبات ہیں۔ میرے بھی ارمان ہیں۔"

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "بات پھر وہی ہے سراج صاحب! بے شک شرعی اور قانونی اعتبار سے ایک سے زیادہ شادی معیوب بات نہیں مگر ہر سماج میں، ہر گھر میں اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک عورت جتنی بھی شرع کی پابند ہو، اسلام کی تعلیمات سے واقف ہو، جذباتی طور پر وہ کبھی یہ برداشت نہیں کرے گی کہ اس کا شوہر تقسیم ہو جائے۔ مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں ہمیشہ گھر کو میدانِ جنگ بناتی رہتی ہیں۔ آپ کی بیگم بیمار رہتی ہے۔ وہ کمزور اور بے رونق ہے مگر وہ کبھی نہیں چاہے گی اس وجہ سے آپ دوسری عورت گھر لے آئیں۔ پھر کیا آپ کے بچے مجھے قبول کریں گے؟"

سراج الدین نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "جمیلہ! میری بات پر یقین کریں۔ میری اپنے گھر میں ایک حیثیت ہے۔ میں حکمت سے اور حاکمیت سے اپنی بات منوانے کی استطاعت رکھتا ہوں۔ اگر میرے گھر میں آپ کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا تو الگ مکان میں بھی آپ کو رکھ سکتا ہوں۔"

پھر اس نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ "جمیلہ پلیز! مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ سے اسکول میں ہوئی پہلی ملاقات کے بعد سے ہی ہر وقت آپ کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ یہ محض دل لگی کے لیے نہیں بلکہ آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل کی ملکہ بنانے کے ارادے سے ایسا کرتا رہا ہوں۔ میں نے دوسری شادی کا ارادہ آپ سے ملنے سے قبل ہی کر لیا تھا۔ یہ الگ بات ہے آپ سے مل کر میرا دل بھی جوان ہو گیا۔ آپ سے نہ ملتا تو کوئی اور عورت میری زندگی میں دوسری بیوی کی صورت میں داخل ہو جاتی۔ مگر آپ آ گئی ہیں تو ایک عورت ہی نہیں، میرے پچیس سالوں کی خشک اور بے رنگ ازدواجی زندگی کے بدلے آسمان سے اتری مورت بھی ہیں۔ اب خدا کے لیے مجھ پر بھروسا کریں۔ آپ کی زندگی بھی گل و گلزار بن جائے گی۔"

جمیلہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "سراج صاحب! اپنی تنہا زندگی سے میں بھی بہت عاجز آ گئی ہوں۔ مجھے بھی ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پتا نہیں کیوں اسکول میں ہوئی ملاقاتوں اور پھر اس خط کے بعد آپ کے بارے میں بہت سوچنے لگی ہوں۔ بہت سے اچھے رشتے میں نے ٹھکرا دیے ہیں۔ اب آپ پر بھروسا کرنے کو جی کرتا ہے مگر بے رحم وسوسے سکون برباد کر دیتے ہیں۔ آپ پلیز پھر سے سوچیں۔ اپنے حالات کا ایک بار پھر تجزیہ کریں۔ اپنی بیوی اور بچوں کے ردعمل کو جاننے کی کوشش کریں۔ میں بھی خود کو نئے سرے سے تیار کرتی ہوں۔ اپنی امی اور بہنوں سے مشورہ کرتی ہوں پھر شہلا باجی کے ذریعے اگلی بات کروں گی۔ آپ میرے فون کا انتظار مت کریں۔ خدا حافظ۔"

اس کی آواز رات کے سکوت میں تحلیل ہو گئی۔ کمرے کی محدود فضا میں بس سراج الدین کے سینے کے پنجرے میں قید دل کے پھڑکنے کی آوازیں تھیں۔ ان میں سرخوشی بھی تھی، سرمستی بھی۔ اسے پانے کے لیے سب سے ٹکر لینے کی سرکشی بھی تھی۔ اس کا انگ انگ جوشِ مسرت سے پھڑک رہا تھا۔ وہ اٹھ کر خوشی کے دفور میں ناچنا چاہتا تھا۔ چلا چلا کر کہنا چاہتا تھا۔ "اس نے مجھے قبول کیا ہے۔ رات کے اس پہر مجھ سے فون پر بات کرنے کا مطلب ہے میری محبت نے اس کے دل پر اثر کیا ہے۔"

☆☆☆

سراج الدین نے ایک معرکہ تو سر کر لیا تھا۔ جمیلہ نے اگرچہ کھل کر رضامندی ظاہر نہیں کی تھی مگر اس کے فون نے جمود توڑ دیا تھا۔ مایوسی کی برف کو پگھلا دیا تھا۔ ایک طرح سے سراج الدین نے محبت کا دریا پار کر لیا تھا۔ اب سنجیدہ خاتون اور بچوں کی شکل میں ایک اور دریا پار کرنا تھا۔ اس دریا کی تلاطم خیزی کا سراج الدین کو اندازہ تھا لیکن دل کے سمندر میں جو جوار بھاٹا اٹھا تھا اس کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ گھر کے دریا کے ان طوفانوں کا سامنا کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا تھا۔

سراج الدین کا اپنی فیملی پر اثر زیادہ تھا۔ وہ ایک سخت گیر باپ یا شوہر نہیں تھا مگر ایک رعب دار حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے بچوں کو ہمیشہ عمدہ کھلایا پہنایا تھا۔ ان کی تعلیم اور دیگر خواہشات کی تکمیل کے لیے مٹھی کھلی رکھی تھی مگر ان کی غلطیوں اور غلط کاریوں پر ہمیشہ کڑی نظر بھی رکھی تھی۔ اس کے بیٹے کمال اور جمال کی مجال نہیں تھی کہ باپ کی موجودگی میں کوئی بدتمیزی کریں۔ انہوں نے کبھی باپ کے آگے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ بچیاں بھی بڑی تمیز دار اور خاموش طبع تھیں۔ رہی بات سنجیدہ کی تو وہ بے چاری جنم جلی تھی۔ معدے کی بیماری نے اس کی توانائی ہی سلب کر لی تھی۔ اس کے دن کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹے لیٹے گزرتا تھا۔ ایسے میں سراج الدین کے فیصلے کے

خلاف گھر کی طرف سے تباہ کن قسم کا ردِعمل بظاہر دکھائی نہیں دے رہا تھا یا پھر وہ اس زعم میں مبتلا تھا کہ اس کے گھر والے اس کے فیصلے کے خلاف رونے دھونے اور کچھ دن کے لیے خفا ہونے سے زیادہ ہنگامہ آرائی نہیں کریں گے۔

جمیلہ سے فون پر بات کرنے کے دو دن بعد اس کے بھانجے کی شادی تھی۔ اس دن سب گھر والے شادی پر گئے۔ سراج الدین بھی آفس سے چھٹی لے کر بھانجے کی شادی میں شریک ہوا تھا۔ رات کے وقت وہ سنجیدہ خاتون کو لے کر گھر واپس آیا۔ اس کے بچے شادی والے گھر میں ٹھہر گئے تھے۔ اگلے دن ولیمہ تھا۔ گھر آ کر واپس جانے کے بجائے چاروں بچے پھوپی کے گھر رک گئے تھے۔ گھر آ کر سراج الدین اپنے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھتا رہا۔ وہ کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ٹی وی بند کیا پھر ایک کتاب اٹھا کر پڑھنا شروع کی۔ چند صفحے پڑھ کر بے دلی سے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ اس وقت پانی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ بچے موجود نہیں تھے۔ اب کس کو آواز دیتا۔ سنجیدہ تو مسہری پر پڑی ہوگی۔ اسے کہنا فضول تھا۔ یہ سوچ کر کمرے سے باہر نکلا۔ راہداری کے آخر میں کچن کے باہر فریج موجود تھا۔ اس طرف جاتے ہوئے اس نے بیگم کے کمرے کی جانب دیکھا۔ کھلے دروازے سے اندر سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سراج الدین کے دل میں چھناکے سے کچھ ٹوٹ گیا۔ اپنے کمرے کی تنہائی اور بیوی کی ہیئت کذائی سے دل میں دھواں سا بھر گیا۔ ایک دم خیال جمیلہ کی طرف گیا۔ اس کی خوب صورتی اور جسمانی رعنائی سے دھنک رنگ سا پھیل گیا۔ جی میں آیا یہ موقع ہے، بچے بھی موجود نہیں۔ آج بیگم سے دل کی بات کہہ دینی چاہیے۔ وہ روتے روتے صبح تک سنبھل جائے گی۔ کل تک میری بات کی شدت بھی کم ہو جائے گی۔ وہ بوجھل بوجھل قدموں سے فریج کے پاس جا کر پانی کی بوتل نکال کر واپس آیا۔ بیوی کے کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس کے کراہنے کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس نے بادل ناخواستہ جھانک کر دیکھا۔ وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ پلنگ کے تختے سے ٹیک لگائے اپنا سینہ دبا رہی تھی۔

”کیا ہوا، کوئی تکلیف ہے؟“ اس نے ناگواری سے پوچھا۔

”میرا سینہ جل رہا ہے۔ دم گھٹ رہا ہے۔ میں مر رہی ہوں۔“

سراج الدین سمجھ گیا بیگم کی ٹیپ پھر چل پڑی ہے۔ اب ہمیشہ کی طرح اک ذرا معدے کی تکلیف بڑھ گئی ہے اور اسے شور مچانے کا بہانہ مل گیا ہے۔

یہ المیہ تھا۔ سنجیدہ خاتون کی یہ حالت اتنے طویل عرصے سے تھی کہ سراج الدین اب زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اسے یہ بھی چڑ واہے کے جھوٹ موٹ کے ”شیر آیا، شیر آیا“ واقعے جیسا لگتا تھا۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے ڈاکٹروں سے علاج معالجے کے بعد بھی اس کی ہائے وائے میں کمی نہیں آتی تھی۔

اس نے بیزاری سے کہا۔ ”شادی میں کچھ زیادہ ہی کھا یا ہوگا۔ اب واویلا مچا رہی ہو۔“

سنجیدہ بھبک کر رو دی۔ ”اف اللہ! میں کدھر جاؤں؟ کسی کے منہ سے اچھا نہیں سنا۔ ان طعنوں سے بہتر ہے کچھ لا دیں۔ کھا کر مر جاؤں گی۔ سب سکھ کا سانس لیں گے۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”کیوں مرچیں چباتی ہو بیگم! کیا برا کیا ہے تمہارے ساتھ؟ کون سے ڈاکٹر کو نہیں دکھایا ہے؟ بداحتیاطی خود کرتی ہو۔ ڈاکٹروں نے کچھ چلنے پھرنے کو کہا ہے۔ لیٹے لیٹے رونے دھونے کا نہیں کہا ہے۔ صبح سے رات گئے تک اسی بستر پر لیٹی رہتی ہو۔ اس پر کوئی بات کریں تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو۔“

غم اور غصے سے سنجیدہ کا زرد چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ”بس یہ ڈاکٹروں کا طعنہ رہ گیا تھا۔ اسے بھی پتھر کی طرح دے مارا۔ مت لائیں دوا میرے لیے۔ اسی طرح پاؤں رگڑتی دنیا سے اٹھ جاؤں گی۔ آپ کی بھی جان چھوٹے گی۔ کسی جوان عورت کے ساتھ عیاشیاں کریں گے۔“

سراج الدین کا دماغ گھوم گیا۔ ویسے بھی جمیلہ جب سے دل کی مہمان بنی تھی، سنجیدہ خاتون دل بدر ہو گئی تھی۔ بس ایک رشتۂ قدیمی تھا۔ اب تو دماغ میں بھی جمیلہ ہی بسی تھی۔ اس کو شریکِ حیات بنانے کی پس پردہ منصوبہ بندی تھی۔ اس لیے رشتۂ کہنہ کے شیشے میں بھی بال آ گیا تھا۔

اس نے تڑخ کر کہا۔ ”یہ مجھے بار بار دوسری شادی کا الزام مت دو۔ میں نے ایسا کیا بھی تو برائی کیا ہے؟ خود سوچو، کتنے عرصے سے تم مجھ سے دور ہو؟ میرے جذبات بھڑکتے ہیں۔ ایسے میں کسی دوسری عورت کی بات کروں بھی تو تعجب کی کیا بات ہے؟“

سنجیدہ خاتون نے دکھ اور افسوس سے شوہر کی طرف دیکھا۔ غصہ، بے بسی اور نفرت کے آنسوؤں سے لبریز بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اس گھر کو بنایا، بچوں کو لکھایا پڑھایا۔ اپنی بیماری کے باوجود ان کی صحیح تربیت کی۔ آپ تو دفتر اور اپنے دوستوں کی دنیا میں گم رہے۔ میں نے ہی دن رات ایک کر کے انہیں

پالا پوسا۔ اب آپ ہیں کہ اپنے جذبات کا ڈھنڈورا پیٹ کر دوسری شادی کی بات کرتے ہیں۔ خوشی سے کیجیے۔ میں بھی دیکھتی ہوں ایسی کون حور پری آتی ہے آپ کی بناوٹی جوانی میں۔" وہ پھُس پھُس کر کے رونے لگی۔

سراج الدین بھڑک اٹھا۔ "اری کمبخت! یہ گھر، یہ بچے میرے بھی ہیں۔ میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق ان پر توجہ دی ہے۔ میں مرد ہوں۔ کما کر لاتا ہوں۔ تبھی تم نے یہ گھر اور ان بچوں کی ضروریات پوری کی ہیں۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہوں۔ اس میں حرج کیا ہے؟ تمہاری کڑوی کسیلی باتوں سے فرار ہونے کے لیے تو میں باہر نکل جاتا ہوں۔ یہاں بیٹھ کر تمہاری ہائے وائے سن سن کر تمہاری طرح نفسیاتی مریض بن جاتا کیا؟ مجھے طعنہ مت دو کہ میری جوانی بناوٹی ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو، کوئی عورت مجھ سے شادی نہیں کرے گی؟ ایسی بات ہے تو سن لو، میں جلد ہی دوسری شادی کرنے والا ہوں۔"

سنجیدہ یہ سن کر ساکت ہی تو رہ گئی۔ وہ تو اس نے غصے میں شوہر سے دوسری شادی کی بات کہہ دی تھی۔ اسے گمان ہی نہیں تھا سراج الدین یوں بے دھڑک ایسا طمانچہ مار دے گا۔ وہ بے یقینی اور بے بسی سے شوہر کو تکتی رہ گئی۔

سراج الدین سنجیدگی سے بولا۔ "میں تم سے یہ بات کہنے ہی والا تھا۔ چلو منہ سے بات نکل ہی گئی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں دوسری شادی کا ارادہ کر چکا ہوں۔ بہت جلد اس کا نام بھی بتا دوں گا۔ تم ذہنی اور دلی طور پر تیار ہو جاؤ۔"

اس نے یہ کہا، پلٹ کر دھماکے سے دروازہ بند کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ سنجیدہ شدید دکھ اور بے چارگی سے بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔ اس کی سانسیں جیسے پھانس بن کر اٹک گئیں۔ جسم کا رُواں رُواں جہنم کی آگ اگلنے لگا۔ اندر دھڑام دھڑام دیواریں زمین بوس ہونے لگیں پھر دماغ بڑے زور سے چکرایا اور وہ اپنے بستر پر بے جان سی ہو کر ڈھے گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح سراج الدین بیدار ہوا۔ بڑی بیٹی ثمر اس کا ناشتا بنا کر کمرے میں ہی لاتی تھی۔ آج وہ شادی میں گئی تھی۔ بیگم سے امید نہیں تھی۔ ویسے بھی رات کے واقعے کے بعد اس کا پارہ چڑھا ہو گا اس لیے سراج الدین تیار ہو کر آفس جانے کے لیے باہر نکلا۔ بچے نہ ہونے کی وجہ سے خاموشی تھی۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا سنجیدہ ہو گی۔ ایک لمحے کو خیال آیا کہیں اس کے لیے

عورت کیا ہے؟

یہ بات وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جن کے دماغ ناقص ہیں۔ ذرا سوچو تو تمہارے وجود نے کہاں پرورش پائی، کس نے تخلیق کا دکھ اٹھا کر زندگی بخشی۔

وہ عورت ہی تو ہے جو اگر ماں ہے تو پاؤں کے نیچے جنت لیے ہوئے ہے، بہن ہے تو تمہارے لیے بے شمار دعائیں لیے ہوئے ہے، بیٹی ہے تو تمہاری آبرو بن کر چمکنے والی اور اگر بیوی ہے تو تمہیں مجازی خدا کا رتبہ دینے والی ہے۔

عورت کے وجود اور چاندنی میں کوئی فرق نہیں۔ بکھر کر چھا جانے والی اور کائنات کو روشن کر دینے والی عظیم ہستی عورت ہی ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ)

نمک پارے

☆ وہ شخص واقعی خوش نصیب ہے جو صرف اپنے آپ سے محبت کرتا ہے کیونکہ اس کا کوئی رقیب نہیں ہوتا۔

☆ بیوی وہ ہوتی ہے جو شوہر کی ان تمام مصیبتوں میں اس کا ساتھ دیتی ہے جو کبھی پیدا نہ ہوتیں اگر وہ اس سے شادی نہ کرتا۔

ناشتا تو نہیں بنا رہی؟ ہمدردی کی ایک لہر سی اٹھی۔ دوسرے لمحے اس پر جمیلہ کا فسوں چھا گیا۔ وہ آہستہ سے باہر کی طرف آیا پھر تیز تیز چلتا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ بازار آ کر کسی ہوٹل میں ناشتا کیا، سیدھا آفس آیا۔ وہاں دفتری فائلوں اور افسروں کے ساتھ مصروف رہ کر رات کی بات بھول گیا۔

دوپہر سے ذرا پہلے آفس سے اٹھا۔ بھانجے کے ولیمے کا وقت ہوا تھا۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ولیمے کی دعوت میں آیا۔ بڑا بیٹا کمال نظر آیا تو سنجیدہ خاتون کے بارے میں پوچھا۔

بیٹے نے کہا۔ "ابو! صبح میں امی کو لانے گیا تھا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ رو بھی رہی تھیں۔ میں نے بہت اصرار کیا مگر انہوں نے یہاں آنے سے منع کر دیا۔"

سراج الدین کو اندازہ تھا آج بیگم شدید مضطرب ہو گی۔ یہ بھی ممکن تھا وہ بچوں کو بھی باپ کے اس فیصلے سے آگاہ کر دیتی۔ سراج الدین نے خود کو ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

اس نے بیٹے سے کہا۔ "ولیمے کے بعد تم اپنی بہن ثمر کو لے جا کر ماں کے پاس چھوڑ دو پھر ادھر آ جاؤ۔"

ولیمے کی دعوت کے بعد سراج الدین واپس گھر نہیں

گیا۔ سیدھا شریف صاحب کے حضور پہنچ گیا۔ اس نے رات کو بیگم سے ہوئی ساری بات ان کے گوش گزار کی۔

شریف صاحب بڑی دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ''سراج بھائی! تم جس راستے پر چل پڑے تھے، یہ مرحلہ تو آنے والا تھا۔ اچھا ہے بیگم کو اپنے ارادے سے باخبر کر دیا۔ اب بچوں کے ردِعمل کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔''

سراج الدین ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''یار شریف! وہ مشہور ضرب المثل ہے نا کہ ''اوکھلی میں سر دے دیا ہے تو موسلوں سے کیا ڈر''، میں بھی پریشان نہیں ہوں۔ ویسے مجھے امید ہے میرے بچے سرکشی نہیں کریں گے۔''

شریف صاحب بولے۔ ''تمہارا بڑا بیٹا سمجھدار لڑکا ہے مگر جوان ہے۔ گرم مزاجی دکھائے گا۔ میں بھی اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

''یہ سب تو وقت آنے پر دیکھیں گے۔ یہ بتایئے جمیلہ کی طرف سے کچھ خیر خبر ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم بھی بڑے بے صبرے بن جاتے ہو۔ عورت ذات کا معاملہ ہے۔ اتنی جلدی جواب نہیں مل جاتا۔ ویسے بھی اس نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔ اب اپنے گھر والوں سے بات کرنے کے لیے وقت لگے گا۔ اس وقت اگر تمہارے پاس وقت ہے تو میرے ساتھ آ جاؤ۔ میرے گیسٹ ہاؤس چلتے ہیں۔ ٹورسٹ سیزن شروع ہونے والا ہے۔ کچھ تزئین و آرائش کا کام کروا رہا ہوں۔ وہ دیکھ کر آتے ہیں۔''

شریف صاحب کا شہر سے ہٹ کر پہاڑی کے دامن میں ایک بلند سی وادی میں گیسٹ ہاؤس تھا۔ یہ ایک پہاڑی نالے کے ساتھ ہی واقع تھا۔ اس جگہ شریف صاحب کی بڑی پرانی زمین تھی۔ اس پر انہوں نے یہ گیسٹ ہاؤس تعمیر کرایا تھا۔ انگور، شہتوت، خوبانی اور اخروٹ کے درختوں سے گھرا یہ علاقہ ایک دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں دور دور گرم علاقوں سے لوگ ادھر آتے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کے ساتھ کچھ اور ہوٹل بھی بنے ہوئے تھے۔ گرمیوں کے چھ سات مہینے بڑی رونق لگی رہتی تھی۔

سراج الدین پہلے بھی وہاں گیا تھا۔ اس وقت بھی فوراً تیار ہو گیا۔ ویسے بھی وہ اتنی جلدی گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ رات کی تکرار نے نئے اندیشے جگا دیے تھے۔ بیگم اور بچوں کے متوقع ردِعمل کا سامنا کرنے کے لیے حوصلہ بن بھی رہا تھا، ٹوٹ بھی رہا تھا۔ شریف صاحب کے ساتھ شہر سے کوئی پندرہ بیس کلومیٹر دور ان کے گیسٹ ہاؤس چلا گیا۔

وہاں گیسٹ ہاؤس کی تزئین و آرائش کے معاملات دیکھتے ہوئے رات کے نو بج گئے۔ واپس گھر پہنچتے تک ایک گھنٹا اور گزر گیا۔

وہ گھر میں آیا تو بیرونی دروازہ لاک نہیں تھا۔ گھر میں اس وقت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ٹی وی لاؤنج بھی بند تھا۔ اب اتنی رات بھی نہیں ہوئی تھی کہ سب بچے سو گئے ہوں۔ وہ راہداری سے ہو کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔ بیگم کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس بند دروازے کے پیچھے سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سراج الدین کے دل میں چور تھا۔ اس لیے خیالات شور مچانے لگے۔ بیوی اور بچے مل کر اس کے خلاف کوئی محاذ تو نہیں بنا رہے ہیں؟ اس کی آرزوؤں کی عمارت مسمار کرنے کی تدبیر تو نہیں کر رہے ہیں؟

پھر اس کے دل نے سر اٹھا کے دبنگ انداز میں کہا۔ ''وہ کچھ بھی کریں۔ مجھے اس ارادے سے روک نہیں سکتے۔ میری ایک حیثیت ہے۔ اس گھر کا مالک ہوں۔ وہ رو دھو کر ناراضی ظاہر کر سکتے ہیں، بغاوت نہیں کر سکتے۔''

یہ خیال آتے ہی اس نے جھٹکے سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کھانا شریف صاحب کے ساتھ کھا کر آیا تھا۔ واش روم سے آ کر کپڑے تبدیل کر کے ابھی ٹی وی کھولا ہی تھا کہ اس کا بڑا بیٹا کمال اندر آیا۔ سراج الدین کرسی پر بیٹھا تھا، بیٹا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا پھر بڑے ہی جارحانہ انداز میں بولا۔

''ابو! ہم یہ کیا سن رہے ہیں؟ امی بتا رہی تھیں آپ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں؟''

سراج الدین نے جوان بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں غصہ تھا، غم تھا، جوانی کی گرمی تھی۔

اس نے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں برائی کیا ہے؟ مذہب میں یا معاشرے میں ایسا کرنا ناجائز بات تو نہیں ہے؟''

بیٹے نے غصے سے کہا۔ ''یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ دنیا والے کیا کہیں گے؟ جوان بچوں کی موجودگی میں عورتوں کے پیچھے چلتے ہیں آپ۔''

وہ گرج کر بولا۔ ''منہ سنبھال کر بات کرو کمال! ایسی بازاری باتیں مجھے پسند نہیں۔''

بیٹا بھی چیخ کر بولا۔ ''میری بات آپ کو بازاری لگتی ہے ابو! مگر آپ کی بات سے ہماری کتنی دل آزاری ہوئی ہے، اس کا اندازہ ہے آپ کو؟ میں سچ کہتا ہوں۔ آپ کا یہ فیصلہ ہمیں قبول نہیں۔''

سراج الدین نے غصے سے کہا۔ ''تم میرا باپ بننے کی کوشش مت کرو۔ اس انداز میں بات کرو گے تو بہت سختی سے پیش آؤں گا۔''

کمال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم نے پہلے کبھی آپ کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کی ہے ابو! لیکن آپ ہمیں سرکشی پر مجبور کر رہے ہیں۔ پلیز! اس ارادے سے باز آجائیں۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

سراج الدین نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھے مت سمجھاؤ۔ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ دنیا کچھ بھی کہے، میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔''

کمال غم اور غصے کی شدت سے کپکپاتی آواز میں بولا۔ ''سوچ لیں ابو! اس فیصلے کے بعد آپ کو ایک جوان عورت تو ملے گی، ایک بھرے پُرے خاندان کا پیار اور سکون نہیں ملے گا۔''

کمال یہ کہہ کر غصے سے پاؤں پٹختا، منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا، کمرے کے دروازے کو زور سے بند کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

سراج الدین کے لیے مزید سوچنے کے لیے اب کچھ نہیں رہا تھا۔ جمیلہ کے عشق کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا اس لیے دماغ میں بھی اس کے حسن اور جوانی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ایسے میں بیٹے کی سرکشی سے یہ خللِ دماغ دور نہیں ہو سکتا تھا۔ جمیلہ کی فسوں کاری کے مقابلے میں خاندان کے پیار اور سکون کی کچھ حیثیت ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

اس دن کے بعد سراج الدین اور گھر والوں میں ایک سرد جنگ جاری رہی۔ اس کی اولاد جو اس پر جان چھڑکتی تھی، کبھی اس کے حکم سے سرتابی کی ہمت نہیں کرتی تھی، اب سراپا احتجاج بنی ہوئی تھی۔ انہیں کسی صورت یہ قبول نہیں تھا کہ ماں کے ہوتے ہوئے کسی اور عورت کو اس گھر کی ملکیت میں شریک بنالیں۔

سراج الدین رات دیر گئے آتا تھا تب تک سب گھر والے سو چکے ہوتے۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتا، صبح اٹھ کر بغیر ناشتا کیے دفتر چلا جاتا۔ بڑی بیٹی چپکے سے اس کے کپڑے استری کر کے کمرے میں رکھ دیتی تھی۔ کھانے کے وقت وہ گھر سے غائب رہتا تھا۔

اس دوران دوسرا محاذ بھی بڑا گرم تھا۔ جمیلہ نے اپنی ماں اور بہنوں کو ساری بات بتادی تھی۔ ماں نے شوہر اور بیٹوں سے بات کی۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ جمیلہ کے لیے کسی کنوارے یا بغیر فیملی کے رشتے کا انتظار کرتے اس کی رہی سہی جوانی بھی بیت جائے گی۔

سراج الدین کے بارے میں انہوں نے جاننے والوں سے پوچھا۔ شیخ برکت اللہ کو وہ شام بھی یاد آگئی جب سراج الدین مٹھائی لے کر ان کے گھر آئے تھے۔ بڑے دروازے پر اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی گفتگو سے بڑے میاں اس وقت بہت متاثر ہوئے تھے۔ اس سے بھی سراج الدین کے بارے میں اچھا تاثر پیدا ہو گیا۔ اس اثنا میں ٹیچر عابدہ اور شہلا کی کوششوں سے شریف صاحب کی جمیلہ کے والد اور بھائیوں سے ملاقات ہو گئی۔ شریف صاحب علاقے کے معتبر اور عزت دار انسان تھے۔ انہوں نے بھی سراج الدین کے بارے میں تسلی کرادی۔ تب جا کر انہوں نے اپنی رضامندی ظاہر کردی۔

سراج الدین کی جذباتی کیفیت دیوانگی کو چھو رہی تھی۔ جسے پہلی نظر دیکھ کر دل کی منڈیروں پر محبت کے چراغ جل اٹھے تھے اب اس کی قربت کے تصور سے وہ چراغ ہر سو چراغاں کر رہے تھے۔

بات اب بھی بنی نہیں تھی۔ گھر کے محاذ پر اب بھی جنگ جاری تھی۔ محبت کی فتح ہو گئی تھی مگر اس سے قربت کے فاصلے ابھی دراز تھے۔ ان فاصلوں کو سمیٹنے کے لیے وہ ایسا بے قرار تھا کہ بیوی اور بچے دل و دماغ سے فرار ہو گئے تھے۔ ہر طرف جمیلہ کی دلربائی کی پھوار پڑ رہی تھی۔

☆☆☆

اس رات سراج الدین نے گھر کے میدان میں فیصلہ کن داؤ آزمایا۔ اس نے ساری طاقت مجتمع کی اور صاف صاف بتادیا کہ وہ جمیلہ سے شادی کر رہا ہے۔

اس وقت بیوی بچے سب موجود تھے۔ اس کی بات سن کر سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ غم اور غصے سے وہ جیسے ساکت رہ گئے پھر سنجیدہ خاتون کے رونے کی آواز بلند ہوئی تو سب ہوش میں آگئے۔ ماں کے ساتھ بیٹیاں بھی رونے لگیں۔

کمال نے سرکشی سے کہا۔ ''آپ ظلم کر رہے ہیں ابو! اس فیصلے سے باز آجائیں۔ ہم اس چڑیل کو کبھی اس گھر میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔''

سراج الدین دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''بکواس بند کرو۔ یہ گھر تمہارا نہیں۔ میں بڑی شرافت سے بتا رہا ہوں کہ میرے فیصلے کی مخالفت مت کرو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

چھوٹا بیٹا جمال کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ بھی غصہ دکھاتے ہوئے بولا۔ ''جو برائی آپ کر رہے ہیں، اس سے

بڑی برائی اور کیا ہوگی؟ آپ ہمیں گھر سے بھی نکال دیں گے تب بھی ہم اپنی ماں کی بے قدری اور بے بسی پر خاموش نہیں رہیں گے۔ میں اس عورت کو جان سے مار ڈالوں گا جو میری ماں کی جگہ لینے آئے گی۔''

سراج الدین کا سر گھوم گیا۔ پاؤں سے چپل نکال کر جمال کو دے ماری پھر گرج کر کہا۔ ''میری بات کان کھول کر سن لو۔ تم سب کو میرا فیصلہ ماننا ہوگا ورنہ کسی کو بھی اس گھر میں رہنے نہیں دوں گا۔ جدھر مرضی آئے، دفع دور ہو جاؤ۔''

یہ کہہ کر وہ تیز تیز چلتا اپنے کمرے میں آیا۔ دھڑا کے سے دروازہ بند کر کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

دوسری طرف بیوی بچے بڑی دیر اسی طرح غم و غصے کی آگ میں جھلستے رہے پھر کمال ماں سے بولا۔

''آپ مت روئیں امی! ابھی ہم مرے نہیں، زندہ ہیں۔ اس ظالم شخص نے ہم سب کی محبت ٹھکرا کر اپنے جذبات کو ترجیح دی ہے۔ ہمیں بھی اس کی اور اس کے گھر کی ضرورت نہیں۔ ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے۔ میری تنخواہ سے الگ کرائے کا مکان لے کر رہیں گے۔''

جمال نے کہا۔ ''بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں امی! ہم روکھی سوکھی کھائیں گے لیکن اس چڑیل کی وجہ سے اس گھر میں آپ کی بے قدری نہیں دیکھ سکیں گے۔''

بڑی بیٹی ثمر بولی۔ ''اف اللہ! اولاد جوان ہو تو ماں باپ ان کی شادی کی فکر کرتے ہیں مگر ہمارے ابو یہ کیسا تماشا کر رہے ہیں۔ میری سہیلیاں کتنا مذاق اڑائیں گی؟''

سب سے چھوٹی کمل ہچکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ ''امی! میں ابو کو بہت چاہتی تھی مگر اب دل سے ان پر غصہ آرہا ہے۔ ٹیچر جمیلہ کو بہت پسند کرتی تھی لیکن اب وہ زہر لگتی ہیں۔ میں اسے ماں کی شکل میں برداشت نہیں کر سکتی۔''

یہ وہی اولاد تھی جو کل تک سراج الدین کو ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ اس کے سامنے تمیز سے سر جھکا کر بات کرتی تھی۔ اب سب کے لب و لہجے میں نفرت اور بغاوت تھی۔ اب خدا جانے یہ کس بات کا پیش خیمہ بننے والی تھی۔

☆☆☆

شریف صاحب اور ان کی بہن شہلا نے بہت فعالیت دکھائی۔ سراج الدین گھر کی طرف سے تنہا ہو گیا تھا۔ بات پھیل گئی تو عزیز رشتے داروں نے بھی کشادہ ظرفی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پیٹھ پیچھے خوب اس کے لتے لیتے تھے۔ طنز اور طعنوں سے خود اپنی نا آسودہ خواہشات ظاہر کرا دیتے تھے۔ سراج الدین کی ایک جوان عورت سے شادی خاندان کے بہت سے مردوں کے لیے حسد کا باعث بن گئی تھی۔

ایسے میں شریف صاحب اور ان کی بہن نے سراج الدین کی طرف سے سارے معاملات اپنی ذمے داری میں لے لیے۔ شادی کی تاریخ طے کرنا، حق مہر پر متفق ہونا، نکاح، رخصتی اور ولیمے کے سارے انتظامات کو حتمی شکل دینا...... یہ سب انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیے۔ جمیلہ کے گھر والوں کی طرف سے سراج الدین کے مشترکہ خاندانی نظام پر خدشات ظاہر کیے گئے تو شریف صاحب نے انہیں اطمینان دلایا کہ اگر سراج الدین کے بیوی بچے جمیلہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے تو اسے الگ مکان میں رکھے گا۔

اس دوران شریف صاحب نے سراج الدین کے بیٹوں کمال اور جمال کو اپنے جنرل اسٹور میں بلایا، پیار اور نرمی سے انہیں حالات سے سمجھوتا کرنے کی تلقین کی۔ جمیلہ کی نیک سیرتی اور شرافت کی تعریفیں کیں۔ جمال اور کمال خاموشی سے ان کی بات سنتے رہے۔ انہوں نے بظاہر غصہ یا گرم مزاجی نہیں دکھائی مگر ان کے چہرے کے تاثرات دل کی ترجمانی کر رہے تھے اور دل میں ماں کی بے قدری کا احساس شعلوں کی طرح لپک رہا تھا۔

وہ خاموشی سے بیٹھ کر، چپکے سے چلے گئے۔

پھر وہ دن بھی آگیا۔ سراج الدین کے ارمان پہاڑی پھولوں کی طرح کھل اٹھے۔ پچیس سال بعد وہ پھر سے دُلہا بن گیا۔ شریف صاحب نے شہر کے بڑے میرج ہال میں شادی کی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے بعد شریف صاحب نے ان دونوں کی ازدواجی زندگی کی شروعات کے لیے پہاڑی کے دامن میں نالے کے ساتھ اپنے گیسٹ ہاؤس کا ایک بڑا کمرا خصوصی طور پر سجایا تھا۔ تین دنوں کے لیے سراج الدین اور جمیلہ کے لیے مختص کرایا تھا۔

نکاح والے دن آخر تک سراج الدین کی نگاہ دروازے پر لگی رہی۔ نہ جانے کیوں اسے امید سی تھی سنجیدہ بیگم نہ سہی، اس کے بچے نکاح کی تقریب میں شرکت کریں گے۔ وہ خود دو دنوں سے گھر نہیں گیا تھا۔ شریف صاحب کے گھر میں بیٹھ کر سارے معاملات طے کیے تھے۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے بڑی نرمی سے بچوں کو نکاح میں شریک ہونے کی تاکید کی تھی لیکن وہ نہیں آئے۔ سراج الدین کو ان کی عدم موجودگی آخر تک چبھتی رہی مگر اس کی شدت زیادہ نہیں تھی۔ جمیلہ کو پانے کا احساس ایسا سحر آگیں تھا کہ ہر فکر، ہر پریشانی سے آزاد ہو گیا تھا۔

شریف صاحب کی قیادت میں سادہ سی برات کی شکل

میں سراج الدین اور جمیلہ کو وادی کے گیسٹ ہاؤس میں لے جایا گیا۔ چند عورتیں بھی ساتھ تھیں جن میں شہلا اور عابدہ خصوصی طور پر شریک تھیں۔ انہوں نے جمیلہ کو نئے سرے سے نکھارا سنوارا۔ اسے شب زفاف کے لیے تیار کروایا۔ خوب صورتی سے سجے ہوئے حجلۂ عروسی کی دھیمی سی مسحور کن سی روشنی میں جمیلہ کو بٹھایا۔ تازہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر کمرے کی تنہائی میں اسے چھوڑ دیا پھر سراج الدین اس تنہائی میں بدن کا چور بن کر داخل ہوگیا۔

سب لوگ جو ساتھ آئے تھے اب تین دنوں کے لیے ان کی دنیا سے دور چلے گئے تھے۔ بس وہ دو ہی تھے۔ صبحیں بھی ان کی تھیں، شامیں بھی ان کی تھیں۔ راتوں کی محشر بہ دامانی بھی انہی کی تھی۔

☆☆☆

تین دن جیسے پلک جھپکتے گزر گئے۔ برسوں سے وہ دونوں دل زار زار کا ماتم کرتے رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح کاٹتے رہے تھے۔ لب دریا بھی وہ صحراؤں سی پیاس سے بلکتے رہے تھے۔ اب تو دامن دل پر خود سمندر اتر آیا تھا۔ اس کے باوجود غٹا غٹ پی کر بھی گھونٹ گھونٹ پیاس اتر رہی تھی۔ اندر کی پیاس بجھنے کے لیے زمانے چاہیے تھے۔

سراج الدین نے بند موبائل آن کیا۔ شریف صاحب کو میسج کیا۔ تین دن مزید گیسٹ ہاؤس میں رہنے کی اسے اطلاع دے دی۔ اس کے بعد موبائل بند کر کے ایک طرف ڈال دیا۔

گیسٹ ہاؤس اس وادی میں ذرا بلندی پر تھا۔ ایک کچی سڑک نیچے آبادی سے بل کھاتی ہوئی اوپر آتی تھی۔ گیسٹ ہاؤس کے ساتھ ہی پہاڑی نالے کے پہلو بہ پہلو گھنے پیڑوں کے سائے سائے آگے جاتی تھی۔ نالے کا پانی اوپر بلند پہاڑوں کے دامن سے پھوٹ کر تیزی سے نشیب میں بہتا تھا۔

ان کے لیے غضب کا شاعرانہ ماحول تھا۔ دامن کہسار بھی تھا۔ سبزے اور پیڑوں کی بہار بھی تھی۔ ایسے میں وہ دونوں ہر شام کمرے سے نکل کر گیسٹ ہاؤس کے طویل برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ جاتے۔ چائے پیتے اور دھیمی دھیمی باتیں کرتے۔ ان کی باتوں میں سلگتے موسموں کا کرب بھی ہوتا، منزل کے دھوکے میں بھٹکتے رہ جانے کا افسوس بھی ہوتا۔ دونوں کے الگ الگ فسانے تھے۔ وہ دونوں محبت کے ترسے ہوئے تھے۔ شریک حیات پا کر بھی تنہائی کے ڈسے ہوئے تھے۔

شادی کے ابتدائی دن بڑے رنگین اور سنگین ہوتے ہیں۔ ان پانچ چھ دنوں میں سراج الدین اور جمیلہ بھی ایسی صورت حال سے دوچار تھے۔ بہت آبلہ پائی کے بعد پھولوں کی سیج نصیب ہوئی تھی۔ زندگی نے اتنا تھکا دیا تھا کہ اب ایک دوسرے کی قربت میں ساری تکان مٹا رہے تھے۔ جذبوں کی نرم گرم انگلیوں سے ایک دوسرے کو سہلا رہے تھے۔

سراج الدین کو زندگی کی مٹھاس کا اب علم ہوا تھا۔ ایک بے ذائقہ شریک حیات نے اس کے پچیس سالوں کو پھیکا پھیکا بنا دیا تھا۔ جمیلہ نے اس پھیکی زندگی میں شہد آمیز ذائقہ بھر دیا تھا۔

جمیلہ کو لگ رہا تھا جیسے درد کی تاریک گھپاؤں سے وہ نکل آئی ہے۔ ایک آزاد اور خوش کن فضا میں وہ سانس لے رہی ہے۔ پہلی شادی کے بعد ان سات سالوں میں جتنے کانٹے بدن میں ترازو ہوئے تھے، ان چھ دنوں میں سراج الدین نے بڑی نرمی سے، بڑی گرمی سے ایک ایک کانٹا چن لیا تھا جس سے اس کی روح تک طمانیت سے سرشار ہوگئی تھی۔

گیسٹ ہاؤس کے یہ چھ دن انہوں نے بلا شرکت غیرے ایک دوسرے کی سنگت میں گزارے مگر ان کی اصل زندگی کے حقائق کچھ اور بھی تھے۔ انہیں پرانے رشتوں کا بھرم بھی رکھنا تھا۔ لوٹ کر اس زندگی اور ان رشتوں کے بیچ جانا بھی تھا اس لیے ساتویں دن وہ واپس پرانی زندگی میں آگئے۔

☆☆☆

سراج الدین نے شادی سے پہلے ہی اپنے کمرے کا فرنیچر تبدیل کر دیا تھا۔ نئے پردے لگوا کر اور رنگ و روغن کروا کر یہ کمرا کسی حد تک نئی دلہن کے شایان شان بنا دیا تھا۔ اس کا دروازہ لاک کر کے چابی اپنے پاس ہی رکھی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا اس کے بیوی اور بچے کچھ عرصہ ناراضی ظاہر کر کے ایک دن مان جائیں گے۔ جمیلہ کو اس کی بیوی کے رشتے سے قبول کر لیں گے۔ اسے ان چھ دنوں میں جمیلہ کے مزاج سے یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ وہ تحمل اور محبت سے ان کا دل جیت لے گی۔

شام سے ذرا پہلے وہ شہر پہنچ گئے۔ سراج الدین گاڑی سے اتر کر پُراعتماد قدموں سے چلتا ہوا گھر کے دروازے پر آیا۔ بڑے دروازے پر قفل لگا دیکھ کر وہ چونک گیا۔ کچھ تکلیف دہ سوچیں دل و دماغ پر یورش کرنے

لگیں۔ اس نے سر جھٹک دیا۔ موبائل نکال کر بڑے بیٹے کمال کو فون کیا۔ بیٹے کا موبائل بند تھا۔ اس نے جھلا کر چھوٹے بیٹے جمال کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے پھر وہی کمپیوٹرائزڈ جواب تھا۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔'' بڑی بیٹی ثمر کے پاس بھی موبائل تھا۔ ایک موہوم سی امید کے ساتھ اس کے نمبر پر کال کی۔ اس بار بھی دوسری طرف کا بند موبائل اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ کھنک سا گیا۔ غصے کی ایک شدید لہر رگوں میں دوڑنے لگی۔ گلی میں گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے شرارت سے کھلنے لگے تھے۔ ایک آدھ چہرہ تضحیک اور ترحم کا اشتہار بن کر نمودار ہوا تھا پھر ایک دم غائب ہو گیا تھا۔ بے توقیری کے شدید احساس سے سراج الدین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کسی بڑے پتھر کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک بڑا پتھر نظر آیا۔ اسے اٹھا کر قفل پر مارنے والا تھا کہ اسی وقت ہمسائے کا دروازہ کھل گیا۔ یہ اس کے قریبی عزیز بھی تھے۔

اس گھر کی عورت باہر آ کر بولی۔ ''سراج بھائی! تالا مت توڑیں۔ اس کی چابی میرے پاس موجود ہے۔ آپ کے بیوی بچوں نے ناتا توڑ دیا ہے، یہی بہت ہے۔''

اس کے دل پر جیسے کسی نے زور سے گھونسا مارا۔ اس نے کن انکھیوں سے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ متفکر اور دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ سراج الدین نے خاموشی سے خاتون سے چابی لی، دروازہ کھول کر جمیلہ کو لے کر اندر آیا۔ اسے اندر چھوڑ کر واپس باہر نکلا۔ وہ خاتون ابھی تک گلی میں موجود تھی۔ قریب جا کر آہستہ سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بہن! میرے گھر والے کدھر گئے ہیں؟ آپ کو یہ چابی کب دی تھی؟''

وہ خاتون بولی۔ ''آپ کی شادی کے دوسرے ہی دن وہ یہ گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ سنا ہے کمال نے کسی دوسرے علاقے میں کرائے پر مکان لیا ہے۔ مجھے چابی دے کر سنجیدہ بہن نے روتے ہوئے کہا تھا۔ اب آئندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھیں گے۔ آپ کا بڑا بیٹا کمال سخت غصے میں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ابو کو بتائیں، ہمیں ان کا گھر نہیں چاہیے۔ ہمیں اپنی ماں کی محبت اور عزت عزیز ہے۔''

سراج الدین کا دل جیسے چکی کے دو پاٹوں کے بیچ دب گیا تھا۔ وہ شدید دکھ کے ساتھ منوں وزنی قدموں سے چلتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ جمیلہ برآمدے میں کھڑی سخت متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اور پریشانی تھی، بہت سے سوال بھی تھے۔

وہ متفکر لہجے میں بولی۔ ''سنیے! آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟ وہ کدھر چلے گئے؟ آپ نے تو ان کے بارے میں مجھے کچھ اور بتایا تھا؟''

سراج الدین نے خالی خالی نظروں سے جوان اور حسین بیوی کی طرف دیکھا پھر کھوکھلے سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''چلے گئے...... سب چلے گئے۔ یہ گھر میرا ہے نا۔ میں نے کہہ دیا تھا میرا فیصلہ تسلیم نہیں کرو گے تو گھر سے نکال دوں گا۔ میرے نکالنے سے پہلے خود چلے گئے۔ چلو اچھا ہوا۔ اب ہمیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ ہم کسی کی مداخلت کے بغیر ہی ایک حسین اور رنگین زندگی گزاریں گے۔''

سراج الدین یہ کہہ کر پلٹ گیا۔ تیز تیز چلتا ہوا اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا پھر باتھ روم میں داخل ہو کر ایک طرف کی دیوار کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ دماغ میں کمال کی بات گونجنے لگی۔ چند دن پہلے اس نے غصے سے کہہ دیا تھا کہ ایک جوان عورت تو مل جائے گی، ایک بھرے پُرے خاندان کی محبت نہیں ملے گی۔

اب اتنے بڑے گھر کو سونا سونا دیکھ کر اس کے اندر شدید اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ پرانے رشتوں کی دیواریں دھڑام دھڑام زمین بوس ہو رہی تھیں۔ ان کے نیچے آ کر وہ کچلا جا رہا تھا۔

وہ اسی طرح باتھ روم کی دیوار کے ساتھ لگا دل کا غبار نکالتا رہا پھر یکایک چونک اٹھا۔ جمیلہ باتھ روم کا دروازہ پیٹ کر اسے آوازیں دے رہی تھی۔ اس نے جلدی سے واش بیسن میں منہ دھویا پھر باتھ روم سے باہر آیا۔

''آپ نے اتنی دیر لگا دی اندر۔ میں تو ڈر گئی تھی۔''

جمیلہ اس کے سینے پر اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے بولی۔ سراج الدین نے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر زور سے بھینچا۔ اپنے اندر کا کرب چھپانے کے لیے اس کے گھیرے سیاہ بالوں میں منہ دے کر آنکھیں بند کر لیں۔

اسی وقت سینے کے اندر، بہت ہی اندر جیسے کوئی چلا چلا کر کہنے لگا۔

''ایک جوان عورت کو پہلو میں لے کر سمجھتے ہو کہ تنہائی دور ہو گئی۔ نہیں نہیں...... تمہارا دل تو اب پہلے سے زیادہ تنہا ہو گیا ہے۔ پہلے نا آسودہ جذبوں کی آنچ سلگاتی تھی، اب اپنوں کو کھو دینے کی آگ میں ہمیشہ جلتے رہو گے۔''

دل کی وہی تنہائی اب بھی تجھے ڈستی رہے گی۔

⌘⌘⌘